مطالب
بانگِ درا
مولانا
غلام رسول مہر

مطالب

بانگِ درا

از

غلام رسول مہر

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز
لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پرنٹرز
جامعہ اشرفیہ، اچھرہ، لاہور

اشاعت پنجم ۱۹۸۷ء

اشاعت ششم ۱۹۹۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"بانگِ درا" اقبال کے اُردو کلام کا پہلا مجموعہ ہے۔ جسے مرتّب کرتے وقت انھوں نے بہت سی نظمیں، غزلیں یا اشعار اس وجہ سے قلمزد کر دیے کہ وہ ان کے نزدیک معیاری نہ تھے، لیکن اس میں "طلوعِ اسلام" تک ان کی وہ تمام نظمیں اور غزلیں آ گئی ہیں جنھیں انھوں نے فکر و بیان کے لحاظ سے معیاری سمجھا اور جن میں سے اکثر ہزاروں لوگوں نے خود مرحوم کی زبان سے سنیں یا وہ مختلف رسالوں اور اخباروں میں چھپ کر ملک کے طول و عرض میں پھیل چکی تھیں۔ ان میں سے بہت سے اشعار بچّوں، جوانوں اور بوڑھوں کی زبانوں پر تھے۔ انھیں نظموں نے ان کی شہرت و ہردلعزیزی کے لیے وہ مستحکم بنیاد استوار کی جس پر آگے چل کر ایک سربفلک قصر تعمیر ہونے والا تھا اور اقبال کو مشاہیرِ عالم میں وہ بلند مقام ملنے والا تھا جو صدیوں کے بعد کسی خوش نصیب کو ملتا ہے۔

"بانگِ درا" کو آج بھی اقبال کی تصانیف میں مختلف وجوہ سے امتیاز کا ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ مثلاً:

۱۔ اسی میں ان کے کمالِ فکر کی گوناگوں گلکاریاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جیسے قدرتی مناظر پر نظمیں، قومی نظمیں فلسفیانہ نظمیں، غزلیں، مرثیے وغیرہ۔ حسنِ خیال اور دلآویزیِ بیان کے ایسے رنگا رنگ مرقعے کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتے۔

۲۔ فکرِ اقبال کے ارتقائی مدارج کا مکمّل اور جامع اندازہ "بانگِ درا" ہی سے ہو سکتا ہے۔

۳۔ اگرچہ اس کتاب میں ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جنھیں اقبال کے پیغامِ خاص کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے شاید چنداں اہم نہ سمجھا جائے، لیکن جن خداداد جوہروں نے کمالِ بلوغ کے بعد اقبال کو عظمت کے بلند مقام پر پہنچایا، ان کے جلوے "بانگِ درا" کے صفحات پر بھی بکثرت نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مرحوم زندگی کے ابتدائی دور میں بھی ممتاز و یگانہ سمجھے جاتے تھے۔

عزیزی شیخ نیاز احمد صاحب مدّت سے اصرار کر رہے تھے کہ کلامِ اقبال کے لیے ایک معاون تیّار کر دیا جائے۔ جو مختلف نظموں کے پس منظر، تلمیحات کی تشریح اور شعروں کے صحیح مفہوم مختصر توضیح پر مشتمل ہو تاکہ پڑھنے والوں کے لیے کلام

کا سمجھنا اور اس سے استفادہ کرنا ایک حد تک آسان ہو جاتے۔ لیکن اس فرمائش کو قبول کرنے سے طبیعت گریزاں تھی۔ اوّل اس لیے کہ اقبالؔ جیسے شاعر کے کلام کی شرح کرنا ایک گراں بار ذمہ داری کا کام تھا۔ وہ محض شاعر نہ تھے بلکہ ایک صاحبِ پیغام شاعر تھے جن کی زندگی اسی پیغام کی تبلیغ میں گزر گئی۔ ان کے کلام کی شرح کا حق وہی شخص ادا کر سکتا ہے جو اصل پیغام کی روح اور تعلیم کے مختلف گوشوں سے پوری طرح آگاہ ہو۔ میرے دل پر اس تصوّر ہی سے ایک لرزہ سا طاری ہو جاتا تھا۔ دوسرے میری طبیعت اقبالؔ کی مفصل سیرت مرتب کر دینے پر جمی ہوئی تھی اور میں اس ضروری کام کو اپنی ناچیز بساط کے مطابق مکمل کر دینے سے پیشتر کوئی دوسرا کام شروع نہ کرنا چاہتا تھا۔

سیرت کے متعلق پورا سامان چودھری محمد حسین مرحوم کے پاس جمع تھا اور ہم نیاز مندوں میں سے ان کے سوا کوئی شخص نہ تھا۔ جو سیرت نگاری کا حق ادا کر سکتا۔ ان کے برابر حالات کی تحقیق و تنقیح کا موقع بھی کسی دوسرے کو نہ مل سکا۔ افسوس کہ ان کی بے وقت اور ناگہانی موت نے وہ خواب پریشان کر ڈالا۔ میں بھی اگرچہ اقبالؔ کی خدمت میں ہوش مندی کے بارہ چودہ سال کا بیشتر حصّہ گزار چکا تھا اور ان کی سیرت کے متعلق بہت سی باتیں خود ان کی زبان مبارک سے سن چکا تھا۔ لیکن چودھری صاحب مرحوم یہ کام سنبھال چکے تھے۔ اور کبھی خیال تک نہ آیا کہ وہ اس کام کو دوسروں پر چھوڑ کر رہ گزار عالم بقا ہو جائیں گے۔ ان کی وفات کے بعد مشکلات کے باوجود طے کر لیا گیا کہ یہ کام جس طور بھی ممکن ہو انجام پانا چاہیئے۔ خصوصاً اس لیے کہ سیرت کے نام سے جو متعدّد کتابیں چھپ چکی ہیں وہ مل کر بھی اصل ضرورت کو پورا نہیں کرتیں۔

اس سلسلے میں اقبالؔ کے کلام اور تصنیفات کا از سر نو مطالعہ شروع کیا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ سیرت سے بھی پہلے ان کتابوں کے مطالعے کے لیے معاون تیار کر دینے حد درجہ ضروری ہیں۔ اس لیے کہ اب تک کلام کے متعلق جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو اصل کلام کو حقیقی مقام سے ہٹا کر ایسی شکل دے دینے کی کوششیں کی گئیں جو غالباً اقبالؔ کے پیشِ نظر نہ تھی یا جو کچھ بیان کیا گیا وہ اصل مفہوم واضح نہیں کرتا بلکہ کچھ اور ہی بتاتا ہے۔ الّا ماشاء اللہ!

یہ طے کر لینے کے بعد سوال پیدا ہوا کہ معاون کا درجہ کیا رکھا جائے۔ آیا وہ صرف معاون ہو جس میں اتنی ہی تصریحات پر اکتفا کی جائے۔ جو شعروں کے سمجھنے کے لیے اشد ضروری ہوں؟ یا ایسی شرحیں لکھی جائیں جن میں لفظوں کی بحث سے شعروں کے مفہوم اور ان کے مختلف موارد تک ہر شئے آ جاتی ہے؟ غور و فکر کے بعد یہی مناسب سمجھا گیا کہ معاون اپنے جائز حدود سے تجاوز نہ کرے، یعنی وہ صرف اعانت و امداد کا فرض ادا کرے۔ اس میں محض ان چیزوں کی اجمالی تشریح ہو جو ہر پڑھنے والے پر واضح نہیں ہوتیں۔ اگر وہ واضح ہو جائیں تو شعر فہمی کا سلجھا ہوا ذوق حاصل نہ ہونے کے باوجود دل و دماغ معانی کی لذت و تاثیر سے محروم نہیں رہتے۔ نیز اس قسم کا معاون چنداں ضخیم نہ ہو گا کہ اس کی خرید عام شائقین کی دسترس سے باہر ہو۔

میرے پیش نظر وہ ماخذ بھی تھے جن سے متعدد نظموں کا تاریخی پس منظر معلوم ہو سکتا تھا اور بعض نظموں یا شعروں کے متعلق خود اقبال کی تصریحات بھی فراہم ہو گئی تھیں۔ میں نے ان تمام معلومات کو معاون میں شامل کر لیا۔ اس طرح یہ کتاب شعروں کی سرسری شرح کے علاوہ ان کے تاریخی پس منظر کا مُرقع بھی بن گئی ہے۔ شرح کو نہ اتنا پھیلایا گیا ہے کہ پڑھنے والے پر بار ہو یا عام خوانندہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ نہ اتنا مجمل رکھا گیا ہے کہ مفہوم تشنہ رہ جائے۔ جہاں جہاں ضروری تھا اشعار کے محاسن کی طرف بھی اشارے کر دیے گئے ہیں۔ پوری احتیاط ملحوظ رہی ہے کہ اقبال کے مفہوم میں اپنی طرف سے کوئی آمیزش ہو، نہ اسے کھینچ تان کر انفرادی تصورات کے مطابق بنایا جائے۔ نہ کسی ایسی تصریح کا اضافہ کیا جائے۔ جسے نظموں کے اوقات و مواقع سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔ کوشش یہی رہی کہ اقبال نے جس ماحول میں خاص تاثرات و تصورات کے پیش نظر جو کچھ کہا اسے دیانت داری سے اسی رنگ میں پیش کر دیا جائے۔

"بانگ درا" میں بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جن کی حقیقت سمجھنے میں مختلف اصحاب نے ٹھوکر کھائی اور اقبال کے کلام کو تضاد کا مورد قرار دے کر اپنے اطمینان کے لیے یہ توجیہہ کر لی کہ اقبال ایک خاص وقت میں وطنیت کے معتقد تھے۔ پھر وہ اسلام کے ترجمان بن گئے۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ فکر و نظر کے بلوغ کے ساتھ جزئیات کی تشریح میں ہر انسان کا انداز، اسلوب اور طریق استدلال بدلتا رہتا ہے، لیکن مقاصد اور مبادی نہیں بدلتے۔ اقبال جیسے ابتدا میں وطن پرور تھے، ویسے ہی آخری دم تک رہے۔ وہ پہلے بھی اپنے ملک کی آزادی اور خدمت گزاری کے سرگرم حامی تھے۔ اور یہ طبعی انسانی جذبہ آخری دور تک ان کے سینۂ صافی میں بدستور جوشاں رہا۔ وہ وطن پروری کے مخالف کبھی نہ ہوئے۔ البتہ وطنیت کے یورپی مفہوم کی مخالفت برابر کرتے رہے۔ اور اسے ملّتِ اسلامیہ کی اساس تنظیم کے منافی بتاتے رہے۔ یہ صدائے حق انھوں نے اس وقت بلند کی جب اہلِ وطن قومیت کے یورپی مفہوم تک سے ناآشنا تھے، لیکن یہ تعلیم یا دعوت وطن پروری کے خلاف نہ تھی۔ اس کا مطلب قطعاً یہ نہ تھا کہ یہاں کے مسلمان ملک کی آزادی یا اہلِ ملک کی صحیح خدمت سے بے تعلق ہو جائیں۔

جیسے جیسے حالات بدلتے گئے نئی نئی قوتوں کے ظہور اور سرگرمیٔ عمل نے نئے نئے مسئلے پیدا کر دیے اقبال بھی طبیب حاذق کی طرح قوم کے سامنے ضرورت و اقتضائے وقت کے مطابق نسخے پیش کرتے رہے جن باتوں پر انھوں نے خاص اوقات میں زیادہ زور دیا اور انھیں بہ تکرار پیش کیا، یقین رکھنا چاہیے کہ وہ ان کے نزدیک بہ لحاظ وقت زیادہ ضروری تھیں لیکن ان کی بنیادی تعلیم اوّل سے آخر تک یکساں رہی۔ وہ ابتدا میں بھی بے لوث محبّت، پُر خلوص خدمت، مردانہ جدوجہد اور محکم یقین و ایمان کے داعی تھے

آخر تک وہ رہبر بھی ان کی تعلیم کے ابتدائی تھے۔ وہ شروع میں بھی تفریق و تعصب یا تنگ نظری و تنگ حوصلگی کو برا سمجھتے تھے۔ بعد میں بھی ان کی رائے یہی رہی۔

بہر حال میں نے اسے ایک ضروری کام سمجھتے ہوئے انجام دیا تاکہ کلامِ اقبال غلط استعمال اور معنوی تحریفات سے محفوظ ہو جائے اور اس کا اصل مطلب ذہن نشین کر لینے میں کوئی دقّت نہ رہے۔ نہیں کہا جا سکتا، یہ مقصد میری آرزو کے مطابق پُورا ہوا یا نہ ہوا۔ البتّہ میں نے اپنی طرف سے سعیٔ بلیغ میں کوتاہی نہیں کی۔ اگر خوانندگانِ کرام کو اطمینان ہو جائے کہ میں نے اقبال کا مفہوم ٹھیک ٹھیک ادا کیا تو اُسے مرحوم و مغفور کے رُوحانی تصرّف کا کرشمہ سمجھنا چاہیے۔ جہاں یہ احساس ہو کہ مفہوم ٹھیک ادا نہیں ہوا تو اسے میرے فہم کی کوتاہی اور میری سمجھ کی نارسائی کا نتیجہ قرار دیا جائے۔ اقبال انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کا معلّم، اسلامی حقایق کا شارح اور اسلام کی آفاقیت کا بہت بڑا داعی ہے۔ وہ ان برگزیدہ اصحابِ فکر و نظر میں شامل ہے جن سے قدرت صدیوں کے بعد عالمِ انسانیت کو شرف بخشتی ہے۔ اس کی تعلیمات پیش کرنے کے سلسلے میں احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے علم و تحقیق کی کوتاہی کے اعتراف میں تامّل نہ کیا جائے اور یہ رسمی انکساری نہیں بلکہ حقیقی احساس ہے۔

ایک نکتے کی توضیح ضروری ہے؛ اقبال نے مختلف منظوم مجموعوں کے جو نام رکھّے، وہ سخن طرازی کا کرشمہ نہیں بلکہ ان مجموعوں کی معنویت کے آئینہ دار تھے۔ اس مجموعے کا نام "بانگِ درا" قرار دیا۔ قافلے میں درا یا جرس کا وظیفہ یہ ہوتا تھا کہ کوچ سے پیشتر قافلے کے سوئے ہوئے حصّوں کو جگا دے تاکہ وہ رختِ سفر باندھ کر چلنے کے لیے مستعد ہو جائیں۔ پھر پورا قافلہ بانگِ درا کی رہنمائی میں متحداً منزل طے کرے۔ اقبال کا یہ مجموعہ قوم کے لیے پیغامِ بیداری، تہیّۂ سفر اور متحدہ حیثیت میں منزلِ مقصود کی طرف سفر کا وسیلہ تھا، لہٰذا اس کا نام "بانگِ درا" رکھا گیا۔ اسلامی ترانے کا آخری شعر اسی حقیقت کا مظہر تھا۔

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

آخر میں عام خوانندگانِ کرام سے عموماً اور اہلِ علم سے خصوصاً میری التجا ہے کہ اگر میرے قلم سے کوئی ایسی بات نکل گئی ہو جو ان کی معلومات کے مطابق درست نہ ہو تو لطفاً مجھے مطلع فرمائیں۔ میں دلی شکریے کے ساتھ ان کے ارشادات سے استفادہ کروں گا۔ مقصود یہ نہیں کہ اپنی معلومات پر بے وجہ اصرار کیا جائے۔ مقصودِ حقیقی یہ ہے کہ کلامِ اقبال کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے مستند معلومات کا ذخیرہ یک جا ہو جائے۔

فہرست
مطالبِ بانگِ درا

ہمالہ

تمہیدی نوٹ: شیخ عبدالقادر مرحوم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ صدی کے اوائل میں ایک ادبی مجلس لاہور میں قائم ہوئی تھی جس میں مشاہیر شریک ہونے لگے۔ اقبال نے اس کے ایک جلسے میں یہ نظم پڑھ کر سنائی۔ اس میں انگریزی خیالات تھے اور فارسی بندشیں۔ اس پر خوبی یہ کہ وطن پرستی کی چاشنی موجود تھی۔ مذاقِ زمانہ کے موافق ہونے کے سبب بہت مقبول ہوئی۔ شیخ صاحب مرحوم نے اپریل ۱۹۰۱ء میں "مخزن" نکالا۔ تو اس کی پہلی اشاعت میں یہ نظم چھاپی اور لکھا کہ انگریزی خیالات کو شاعری کا لباس پہنا کر ملک الشعرائے انگلستان ورڈس ورتھ کے رنگ میں یہ نظم کہی گئی ہے۔ "مخزن" میں اس کے بارہ بند چھپے تھے۔ اقبال نے اپنی اردو نظموں پر نظرِ ثانی کی تو چار بند حذف کر دیے اور بعض شعروں میں جزوی ترمیمیں فرما دیں۔

پہلا بند | **ہمالہ:** لفظی معنی برف کا گھر۔ وہ پہاڑ جو ہندوستان کے شمال میں پندرہ سو میل کی لمبائی تک ایک مضبوط دیوار کی صورت میں کھڑا ہے۔ **فصیل:** دیوار، خصوصاً وہ دیوار جو قلعے یا شہر کی حفاظت کرے۔ شہر پناہ۔ **دیرینہ روزی**۔ لمبی عمر۔ بڑھاپا۔ **کلیم طُورِ سینا**۔ کوہ طُور پر بات کرنے والا۔ حضرت موسٰی علیہ السلام۔

اے ہمالہ! اے ولایتِ ہندوستان کی حفاظت کرنے والی دیوار۔ تو اتنا بلند ہے کہ آسمان بھی سب سے اونچا ہونے کے باوجود تیری عظمت کے احترام میں جھک کر تیری پیشانی چومتا ہے۔ تجھ میں بڑھاپے کا کوئی نشان ظاہر نہیں۔ صبح و شام کی گردش کے درمیان تو بدستور جوان ہے، یعنی تجھ پر زمانے کی گردش کا کوئی اثر نہیں۔ حضرتِ موسٰیؑ کو کوہِ طور پر صرف ایک مرتبہ جلوہ نظر آیا تھا، تو دیکھنے والی آنکھ کے لیے سر سے پاؤں تک جلوہ ہی جلوہ ہے۔

شاعر نے ہمالہ کو جوان اس وجہ سے قرار دیا کہ یہ ابتدا سے ایک حالت پر چلا آ رہا ہے اور اس میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا۔ بڑھاپے کا تقاضا ہی یہ ہے کہ توانائی باقی نہ رہے اور ظاہری صورت بگڑ جائے۔

دوسرا بند | **امتحان**۔ جانچنا۔ **مطلعِ اوّل**۔ پہلا شعر۔ **دامن کش**۔ دامن کھینچنے والا۔ **کلاہِ مہرِ عالم تاب:** دنیا کو روشن کرنے والے سورج کی ٹوپی۔

ظاہری آنکھ سے تجھے جانچا جائے تو تو صرف ایک پہاڑ ہے لیکن دراصل تو ہندوستان کے لیے حفاظتی دیوار ہے۔ اسی وجہ سے ہم تجھے اپنا پاسبان اور نگہبان سمجھتے ہیں۔ اگر تجھے شعروں کا ایک مجموعہ فرض کیا جائے تو بلندی کے سبب آسمان

اس دیوان کا پہلا شعر ہے، یعنی تیری بلندی آسمان سے جا ملی ہے۔ تو انسان کا دامن خلوت گاہِ دل کی طرف کھینچتا ہے۔ مطلب یہ کہ تیری فضا حد درجہ خاموش ہے اور اس میں پہنچ کر یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ انسان گیان دھیان میں مگن ہو جائے۔ تیری چوٹیوں پر برف پڑی ہوئی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ تیرے سر پر فضیلت کی دستار باندھ دی گئی ہے جو دنیا کو روشن کرنے والے سورج کی ہنسی اڑا رہی ہے۔

آخری شعر میں یہ نکتے قابلِ غور ہیں کہ اوّل برف کو سفیدی کے اعتبار سے دستارِ فضیلت قرار دیا۔ دوم مہرِ عالم تاب پر خندہ زنی کی دو توجیہیں ہو سکتی تھیں اور شاعر نے آخری مصرع میں دونوں کے لیے گنجایش رکھی یعنی (۱) سورج چمکتا ہے تو اس کی کرنیں برف کے جمے ہوئے تودوں پر پڑتے ہی ایک جھلک پیدا کرتی ہیں، جیسے آئینے میں کرن کا عکس پڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ (۲) سورج کی حرارت سے برف پگھل جاتی ہے، لیکن ہمالہ کی بلند چوٹیوں کی برف کبھی نہیں پگھلتی۔ اس اعتبار سے وہ سورج کی ہنسی اڑاتی ہے، یعنی زبانِ حال سے کہتی ہے کہ تو اپنی حرارت کے تمام کرشمے آزما دیکھ، مجھ پر ان کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔

تیسرا بند **عمرِ رفتہ**: گزری ہوئی عمر۔ **عہدِ کہن**: پرانا زمانہ۔ **خیمہ زن**: ڈیرہ ڈالے ہوئے۔ **ثریّا**: بلند ستاروں کا ایک خاص گچھا۔ پروین۔ **سرمِ گرمِ سخن**: باتوں میں مصروف۔ **پہنائے فلک**: آسمان کا پھیلاؤ۔ **آئینۂ سیّال**: بہتا ہوا آئینہ۔

تو اتنی مدت سے موجود ہے کہ تیری گزری ہوئی عمر کے مقابلے میں پرانا زمانہ ایک لمحہ معلوم ہوتا ہے۔ تیرے ہرے بھرے میدانوں میں کالی گھٹاؤں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ تیری بلند چوٹیاں ثریّا سے باتوں میں مصروف ہیں۔ تو خود زمین پر ہے اور آسمان کا پھیلاؤ تیرا وطن ہے۔ تیرے دامن سے جو چشمہ نکلا ہے، وہ بہتا ہوا آئینہ معلوم ہوتا ہے۔ ہوا کی لہریں کا دامن اس کے لیے رومال کا کام دیتا ہے۔

اس بند میں پہلے مصرع کے سوا پانچوں مصرعوں میں شاعر نے منظر کشی کا کمال دکھایا ہے اور پہاڑ کی سچّی تصویر کھینچ کر سامنے رکھ دی ہے۔ دامنِ کوہ کے چشمے کو صفائی اور پاکیزگی کے لحاظ سے بہتا ہوا آئینہ قرار دینا ایک نادر تشبیہ ہے۔ چہرہ صاف رکھنے کے لیے رومال کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہاڑیں عموماً ہوائیں چلتی رہتی ہیں، وہی ہوائیں چشموں کے لیے رومال کا کام دیتی ہیں۔

چوتھا بند **رہوار ہوا**۔ ہوا کا گھوڑا۔ **عناصر**۔ عنصر کی جمع یعنی آگ، پانی، مٹّی اور ہوا۔ **فرطِ طرب**۔ خوشی کی زیادتی۔

جو بجلی پہاڑ کی چوٹیوں پر چمکتی ہے اس نے ہوا کے گھوڑے کے لیے بادل کے ہاتھ میں کوڑا دے دیا ہے۔ اے ہمالہ! معلوم ہوتا ہے کہ تو بھی کھیل کا کوئی میدان ہے جسے قدرت کے ہاتھ نے عناصر کی اچھل کود کے لیے بنایا ہے۔ آہا، بادل خوشی

کے جوش میں کیا جھومتا جا رہا ہے۔ وہ اس طرح اڑا جا رہا ہے، جیسے کسی ہاتھی کے پاؤں سے زنجیر اتار دی گئی ہو۔

اس بند میں بھی شاعر نے منظر کشی کا اعجاز دکھایا ہے اور اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے کہ انسان برشام کسی بلند پہاڑ پر کھڑا ہو، بادل گھرا ہوا ہو، بجلی چمک رہی ہو، ہوا چل رہی ہو، اس وقت جو کیفیت ہوتی ہے، شاعر نے اس بند میں بڑی خوبی سے پیش کر دی ہے۔ وہ منظر کو دیکھتا ہے تو خیال ہوتا ہے کہ ہوا کے گھوڑے کے لیے بادل کو بجلی کی شکل میں ایک کوڑا مل گیا تاکہ اسے اور تیز چلا سکے۔ بجلی کی تشبیہ کوڑے سے حد درجہ موزوں ہے۔ ساتھ ہی اسے احساس ہوتا ہے کہ یہاں ہوا، پانی، خاک اور آگ موجود ہیں اور یہ سب چیزیں ایک دوسری سے بازی لے جانے کے لیے سرگرم کار ہیں۔ دل پر یہ اثر پڑتا ہے کہ قدرت نے عناصر کی کھیل کود کے لیے پہاڑ کی صورت میں ایک میدان مہیّا کر دیا ہے۔ ہوا کی لہروں پر بادل اڑا جا رہا ہو تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرور کی حالت میں جھومتا جا رہا ہے یا ایک ہاتھی ہے جو زنجیریں توڑ کر بھاگا چلا جا رہا ہے۔

پانچواں بند **جنبشِ موجِ نسیم**: ہوا کی لہر کی روانی۔ **گہوارہ**: پنگوڑا۔ **نشۂ ہستی**: زندگی کا نشہ۔ **زبانِ برگ**: پتے کی زبان۔ **گویا**۔ کہنے والی۔ **کنجِ خلوت خانۂ قدرت**: قدرت کی تنہائی کا گوشہ۔ **کاشانہ**: گھر۔

ہر پھول کی کلی زندگی کے نشے میں جھوم رہی ہے۔ صبح کے وقت ہوا کی جو لہریں چلتی ہیں، وہ اس کے لیے پنگوڑا بن گئی ہیں۔ پتے کی زبان سے کلی کی خاموشی کہہ رہی ہے کہ میں نے کبھی پھول توڑنے والے کے ہاتھ کی جھٹک نہیں دیکھی۔ میری خاموشی ہی میری کہانی سنا رہی ہے۔ قدرت کے خلوت خانے کا گوشہ میرا گھر ہے۔

مطلب یہ کہ میرا گھر اتنی بلندی پر ہے جہاں کسی گلچیں کا گزر نہیں۔

چھٹا بند **فرازِ کوہ**: پہاڑ کی بلندی۔ **کوثر و تسنیم**: بہشت کی دو نہریں۔ **شاہدِ قدرت**: قدرت کا محبوب۔ **عراق**: ایک راگنی۔

ندی پہاڑ کی بلندی سے گاتی ہوئی آ رہی ہے۔ اس کی صفائی کا یہ حال ہے کہ کوثر و تسنیم کی لہریں بھی اسے دیکھ کر شرماتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ محبوبِ قدرت کے سامنے ایک آئینہ پیش کر رہی ہے۔ چلتے چلتے وہ کبھی راستے کے پتھر سے بچ نکلتی ہے اور کبھی اس سے ٹکرا جاتی ہے۔ اے چلنے والی ندی! تو دل میں گھر کرنے والے راگ کا ساز چھیڑتی جا، دل تیری آواز کو خوب سمجھ رہا ہے۔

ساتواں بند **لیلئ شب**: رات کی لیلیٰ۔ رات کو سیاہی کے باعث لیلیٰ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ **زلفِ رسا**: لمبی زلف۔ **تکلم**: بات چیت۔ گویائی۔ **تفکر**: سوچ بچار۔ غور و فکر۔

غازہ: اُبٹنا۔

جب رات کی لیلیٰ اپنی لمبی زُلف کھولتی ہے، تو آبشاروں کی آواز دل کا دامن کھینچنے لگتی ہے۔ شام کی خاموشی اتنی دلکش معلوم ہوتی ہے جس پر گویائی قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ درخت چُپ چاپ کھڑے ایسے نظر آتے ہیں، گویا غور و فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ شفق کا رنگ پہاڑ پر کانپتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اے ہمالہ! یہ اُبٹنا تیرے رُخسار پر نہایت خوش نما لگتا ہے۔

پانچویں، چھٹے اور ساتویں بند میں شاعر نے منظر کشی کے عجیب کمالات دکھائے ہیں جن کی صحیح کیفیت ان نظاروں میں پہنچ کر ہی واضح ہو سکتی ہے۔ مثلاً اس کی نظر پھولوں پر پڑتی ہے۔ جنھیں ہوا جھولا جھلاتی ہے۔ یہ پھول توڑنے کے لیے ہر شخص ہمالہ کی بلندی پر نہیں پہنچ سکتا۔ شاعر نے اس سے یہ اثر قبول کیا کہ ان پھولوں تک گلچیں کا ہاتھ کبھی نہیں پہنچا اور یہ حقیقت تپتے کی زبانِ حال سے بیان کی۔ پھر اس نے دیکھا کہ ندی پہاڑ کی بلندی سے نیچے چلی آرہی ہے۔ اس کا پانی اتنا صاف اور شفاف ہے، جس سے کوثر و تسنیم کی لہریں بھی شرما جائیں۔ اس کی حیثیت ایک آئینے کی سی ہے جس میں ہر شے کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔ پھر وہ کسی مقام پر پتھروں سے بچ کر گزر جاتی ہے اور کہیں ان سے ٹکراتی ہوئی نکلتی ہے۔ اس کے چلنے اور جا بجا بلندیوں سے نیچے گرنے کی آواز کو شاعر نے ندی کے گانے سے تعبیر کیا ہے۔ اس گانے کو وہ ایک دل نشین راگنی قرار دیتا ہے۔ پھر جوشِ تاثر سے ندی کو "مُسافر" کہہ کر پکارتا ہے اور کہتا ہے تو گائے جا تیری آواز کا صحیح اندازہ دل ہی کر سکتا ہے۔ آخر جب رات کی تاریکی چھانے لگتی ہے تو آبشاروں کی صدا دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ہر طرف خاموشی چھا جاتی ہے، لیکن کیسی خاموشی جو گفتگو سے بھی بدرجہا زیادہ دل کش ہے۔ سامنے درخت کھڑے ہیں اور بالکل چپ چاپ گویا کسی گہری فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ شفق کی ہلکی ہلکی سُرخ جھلک پہاڑوں پہ کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ شاعر نے حُسنِ بیان کا کمال دکھاتے ہوئے اسے یوں تعبیر کیا کہ رنگِ شفق پہاڑوں پر کانپتا پھرتا ہے اور یہ رُخسارِ کوہ کے لیے ایک خوش نما غازہ بن گیا ہے۔

آٹھواں بند | **مسکن:** رہنے کی جگہ۔ **آبائے انسان:** انسان کے باپ دادا۔ (آبا جمع ہے اب کی)

اے ہمالہ! ہمیں اس وقت کی کوئی کہانی سنا جب تیرے دامن میں انسان کے بزرگوں نے پہلے پہل رہنا سہنا شروع کیا تھا۔ اس سیدھی سادی زندگی کا کچھ حال بتا جس پر تکلّف کے اُبٹنے کا داغ نہ لگا تھا، یعنی جو تکلّف سے بالکل پاک تھا۔ اے تصوّر! وہ صبح و شام پھر ہمارے سامنے لے آ۔ اے زمانے کی گردش! تو پیچھے کی طرف لوٹ جا، تاکہ ہم پُرانے زمانے میں پہنچ جائیں۔

آبائے انسان سے شاعر کی مراد کیا ہے؟ اس کے دو جواب ہو سکتے ہیں:

ایک یہ کہ انسان پہلے پہل ہمالہ میں آباد ہوا اور یہ میدانی علاقے جنھیں ہمالہ سے نکلنے والے دریا سیراب

کرتے ہیں، بعد میں بنے ۔

دوسرے یہ کہ اشارہ آریاؤں کے آباؤ اجداد کی طرف ہے ۔ ان کے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ وہ سائبیریا سے آئے ۔ دوسرا یہ کہ وسط ایشیا سے اُٹھ کر ہندوستان پہنچے ۔

تیسرا اور ہندوؤں میں زیادہ مقبول نظریہ یہ ہے کہ ان کا وطن کوہستان ہمالہ تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ اے ہمالہ! تو اس وقت کی کوئی بات سنا، جب پہلے پہل تیرے دامن میں انسان آباد ہوئے ۔ ان کا رہنا سہنا بہت سادہ اور بے تکلف تھا اور بناوٹ کا اس پر کوئی داغ نہ لگا تھا ۔ اسی عہد کی طرف شاعر لوٹنا چاہتا ہے اور شدتِ آرزو کا یہ عالم ہے کہ زمانے کی گردش کو پیچھے کی طرف دوڑنے کی دعوت دیتا ہے ۔

گُلِ رنگیں

تمہیدی نوٹ: یہ نظم بھی ابتدائی دور کی ہے ۔ مئی ۱۹۰۱ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی اور اس کے چھ بند تھے ۔ نظرثانی میں دو بند خارج کر دیے گئے اور باقی بندوں میں یوں ترمیم ہو گئی ۔

پہلا بند | **شناسا:** واقف ۔ **خراش:** کھٹک، چبھن ۔ زخم چھل جانا ۔ **عقدۂ مشکل:** وہ گتھی جسے سلجھانا آسان نہ ہو ۔ **زیبِ محفل:** محفل کی رونق ۔ **شریکِ شورشِ محفل:** محفل کے ہنگامے میں حصہ لینے والا ۔ **سوز و سازِ آرزو:** آرزو میں گھلنا اور راحت پانا ۔ **گداز:** گھلنا ۔

اے رنگین پھول! معلوم ہوتا ہے کہ تیرے پہلو میں دل موجود نہیں ۔ اس لیے کہ تو اس چبھن اور کھٹک سے واقف نہیں، جو کسی مشکل گتھی کو سلجھانے کا نتیجہ ہوتی ہے ۔ تو زندگی کی محفل کے لیے رونق کا سامان ضرور ہے، لیکن اس محفل کے ہنگامے میں شریک نہیں۔ جو فرصت اور آرام تجھے حاصل ہے وہ زندگی میں مجھے نصیب نہیں ۔ میں دنیا کے باغ میں سر سے پاؤں تک آرزو سے گھلتا اور راحت پاتا ہوں اور تیری زندگی آرزو کے گداز سے بالکل خالی ہے ۔

تیسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ تو زندگی کی محفل میں زیب و زینت کا باعث ضرور ہے، لیکن اس محفل کے عام مقاصد سے تیرا کوئی تعلق نہیں اور نہ تیرے دل میں آرزو کا سوز و گداز ہے ۔ اس کے برعکس انسان ایک لمحے کے لیے بھی اس سوز و ساز سے فارغ نہیں ۔ تو نے کبھی کوئی پیچیدہ گتھی سلجھانے کی زحمت نہیں اٹھائی ۔ انسان کے شب و روز اسی شغل میں بسر ہوتے ہیں ۔ گویا جو فراغت زندگی میں تجھے حاصل ہے اور جس بےفکری سے تو جی رہا ہے، وہ انسان کو میسر نہیں ۔

دُوسرا بند

آئین: طریقہ، شیوہ۔ دستور۔ **چشمِ صورت بیں:** صورت دیکھنے والی آنکھ۔
دستِ جفاجو: ظالم ہاتھ۔ **دیدۂ حکمت:** چیزوں کی چھان بین کرنے والی آنکھ

میرا دستور یہ نہیں کہ تجھے شاخ سے توڑ لوں۔ میری نظر وہ ہی ہے جو صورت دیکھنے والی آنکھ میں ہوتی ہے۔ اسے رنگین پھول! میرا ہاتھ ظالم نہیں۔ تجھے کیونکر سمجھاؤں کہ میں پھول توڑنے والا نہیں۔ مجھے چھان بین کرنے والی آنکھ کی کشمکش سے کوئی مطلب نہیں۔ میں تو بلبل کی آنکھ سے یعنی محبّت بھری نظر سے تجھے دیکھتا ہوں۔

گلچیں پھول اس غرض سے توڑتا ہے کہ اسے بازار میں فروخت کرے۔ پھول کی حقیقت پر غور کرنے والا شخص اسے اس غرض سے توڑتا ہے کہ دیکھے، وہ کس طرح بنا ہے اور کن چیزوں کا مجموعہ ہے۔ بلبل پھول پر عاشق ہوتی ہے۔ عاشق اپنے محبوب کو ہمیشہ محبّت بھری نظر سے دیکھتا ہے۔

تیسرا بند

مستور: چھپا ہوا۔ **ریاض:** روضہ کی جمع۔ باغ۔ **ذوقِ جستجو:** تلاش کا شوق اور لذّت۔

اگرچہ تیری پنکھڑیاں سوز بانوں جیسی ہیں، پھر بھی تجھے چُپ رہنا پسند ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بھید کیا ہے، جو تیرے سینے میں چھپا ہوا ہے۔ میری طرح تو بھی طُور کے باغ کا ایک پتّا ہے۔ میں بھی اپنے اصلی وطن سے دُور ہوں اور تو بھی، لیکن ہم دونوں میں فرق یہ ہے کہ تو اس حالت پر مطمئن اور بے فکر بیٹھا ہے اور میں بُو کی طرح پریشان رہتا ہوں۔ مجھے تلاش کے شوق کی تلوار نے زخمی کر رکھا ہے۔

مطلب یہ کہ میں ہر وقت اپنی اصل کی تلاش میں مصروف ہوں اور یہ مصروفیت مجھے برابر پریشان رکھتی ہے تیرے دل میں تلاش کی کوئی تڑپ نہیں۔ اپنی اصل سے ہم دونوں بچھڑے ہوئے ہیں، لیکن میں اس کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں ہوں اور تجھے ایسی کوئی سرگردانی نہیں۔

چوتھا بند

سامانِ جمعیّت: دل کی تسلّی کا سامان۔ **جگر سوزی:** جگر کی جلن۔ **جامِ جمشید:** جمشید بادشاہ کا پیالہ جس کے متعلق مشہور تھا کہ اس سے دنیا کے تمام حالات معلوم ہو جاتے ہیں۔ **تلاشِ متصل:** لگاتار تلاش۔ **جہاں افروز:** دنیا کو روشن کرنے والی۔ **توسنِ ادراک:** عقل کا گھوڑا۔ **خرام آموز:** چال سکھانے والا۔

میری یہ پریشانی ہی کہیں دل کی تسلّی کا سامان نہ ہو اور میرے جگر کی یہ جلن ہی حکمت کے گھر کا چراغ نہ ہو۔ میری کمزوری ہی میری قوّت کا سرمایہ نہ بن جائے اور میری حیرانی کا آئینہ جمشید کے جام کے لیے رشک کا باعث نہ ہو۔ یہ میری لگاتار تلاش دنیا کو روشن کرنے والی شمع ہے۔ یہ انسانی عقل کے گھوڑے کو چلنا سکھاتی ہے۔

شاعر کہتا ہے: ہو سکتا ہے تلاش میں میرا پریشان رہنا ہی زندگی میں میرے لیے باعثِ اطمینان ہو اور مجھے اپنی اصل سے ملا دے۔ میں تنگ و دو میں اپنے جگر کو جلاتا ہوں۔ ہو سکتا ہے یہی جلن میرے لیے حکمت کا چراغ بن جائے اور میری ناتوانی قوت کا سرمایہ فراہم کرے۔ میں حیرت میں پڑا ہوا ہوں لیکن یہ آئینہ جامِ جم کے لیے باعثِ رشک بن سکتا ہے۔ یہ تمام برکتیں میری مسلسل سعی و تلاش کا ثمرہ ہیں۔ مسلسل تلاش ہی سے اس دنیا میں روشنی ہے اور یہی چیز انسان کی عقل کو آگے بڑھنے کا راستہ دکھاتی ہے۔

عہدِ طفلی

تمہیدی نوٹ: یہ نظم جولائی ۱۹۰۱ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی اور اس کے پانچ بند تھے۔ نظرِ ثانی میں صرف دو باقی رکھے گئے اور ان میں بھی جزوی ترمیم کر دی گئی۔

پہلا بند | **دیارِ نو:** نیا ملک۔ نئی جگہ۔ **وسعت:** پھیلاؤ۔ **آغوشِ مادر:** ماں کی گود۔ **حرفِ بے مطلب:** ایسی بات جس کا کوئی مطلب نہ ہو۔ **شورشِ زنجیرِ در:** دروازے کی کنڈی کی کھڑکھڑاہٹ۔

بچپن میں زمین اور آسمان میرے لیے ایک نئی جگہ اور ایک نیا ملک تھے۔ ماں کی گود ہی میرے لیے ایک دنیا تھی۔ ہر حرکت میری جان کے لیے آرام کا نشان تھی، یعنی مجھے ہر حرکت میں لطف آتا تھا۔ اگرچہ میرے منہ میں زبان تو تھی لیکن اس سے مطلب کی کوئی بات ادا نہ ہوتی تھی۔ بچپن میں اگر کوئی درد یا دکھ مجھے رُلاتا تھا تو دروازے کی کنڈی کھٹکھٹانے میں مجھے آرام ملتا تھا۔

آخری مصرع میں ہمارے ہاں کے اس رواج کی طرف اشارہ ہے کہ روتے ہوئے بچے کو چپ کرانے کے لیے عورتیں عموماً دروازے کی زنجیر کھڑکاتی ہیں تاکہ بچے کی توجہ اس آواز کی طرف پھر جائے[1]۔

دوسرا بند | **بے آوازِ پا:** پاؤں کی آہٹ کے بغیر۔ **دروغِ مصلحت آمیز:** اچھا نتیجہ پیدا کرنے والا جھوٹ۔ **وقفِ دید:** دیکھنے میں گم۔ **مائلِ گفتار:** بات چیت کی چاہ رکھنے والا۔ **ذوقِ استفسار:** سوال کرنے کا شوق۔ پوچھنے کی لذّت۔

وہ حالت کیا اچھی تھی کہ میں پہروں چاند کی طرف تکتا رہتا تھا اور چاند کی یہ کیفیت کہ پھٹے ہوئے بادل میں سے گزر

---

[1] بانگِ درا میں اس بند کے پانچویں مصرع میں درد کے نیچے غلطی سے کاتب نے اضافت لگا دی۔ اس صورت میں مصرع کے معنی کچھ نہیں بنتے۔ اضافت کٹ جانی چاہیے۔

جاتا تھا اور آہٹ تک سنائی نہ دیتی تھی۔ میں بار بار اپنی ماں سے چاند کے پہاڑوں اور بیابانوں کا حال پوچھتا تھا اور مجھے خوش کرنے کے لیے جھوٹ موٹ جو کچھ کہ دیا جاتا تھا اُسے سُن کر حیران رہ جاتا تھا۔ میری آنکھ دیکھنے میں مگن تھی میرے لب میں بات چیت کی چاہ تھی۔ پہلو میں دل کی جگہ سوال کرنے کا شوق رکھ دیا گیا تھا۔

اس نظم میں بچپن کی کیفیت بڑے ہی دل کش انداز میں بیان کی گئی ہے۔ بچہ کبھی نچلا نہیں بیٹھتا، ہر وقت ہاتھ پاؤں ہلاتا رہتا ہے۔ زبان سے جو کچھ کہتا ہے، اس کا مفہوم کچھ نہیں ہوتا۔ لہٰذا شاعر نے خود زبان کو "حرف بے مطلب" قرار دے دیا۔ پھر بچہ چارپائی پر لیٹا ہوا اس وجہ سے پہروں چاند کو تکتا رہتا ہے کہ وہ ایک نہایت روشن چیز ہوتی ہے اور اس کی روشنی سے آنکھیں چندھیاتی نہیں۔ چھٹے ہوئے بادل سے چاند گزرتا ہے تو واقعی آہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ مائیں عموماً بچوں کو بہلانے کے لیے کہتی ہیں کہ وہ دیکھو چاند میں پہاڑ ہیں اور بیابان ہیں۔ بچے کچھ پوچھتے ہیں تو انھیں خوش کرنے کے لیے جھوٹ موٹ کوئی بات کہ دیتی ہیں اور وہ حیران رہ جاتے ہیں۔ یہ بچوں کی عام کیفیت ہے۔ آخری بند میں شاعر نے بچے کا نقشہ کھینچتے ہوئے تین باتیں ایسی جمع کر دی ہیں۔ جو معجزے سے کم نہیں۔ یعنی اس کی آنکھ ہر شے کو دیکھنے میں مگن رہتی ہے، اس کے لب بات کرنا چاہتے ہیں اور دل میں یہ شوق ہوتا ہے کہ سب کچھ پوچھ کر معلوم کرلے۔

مرزا غالب

تمہیدی نوٹ: یہ نظم ستمبر ۱۹۰۱ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی۔ اس کا کوئی بند حذف نہ کیا گیا، لیکن نظرِ ثانی میں بعض جگہ ترمیم کر دی گئی۔ اقبال نے ابتدائی دور میں جن شاعروں کے کلام سے بہ طورِ خاص استفادہ کیا، ان میں غالب سب سے پہلے آتا ہے اور یہ نظم اس کی بارگاہ میں ایک ایسا گراں بہا خراج ہے، جو کوئی دوسرا شاعر پیش نہ کر سکا۔ غالب ۱۷۹۶ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوا۔ عنفوانِ شباب ہی میں دہلی آ گیا اور یہیں ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔

پہلا بند | **مُرغِ تخیل:** خیال کا پرندہ **پیکر:** جسم

تیرے وجود سے انسانی فکر پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ خیال کے پرندے کی اڑان کہاں تک ہو سکتی ہے۔ تو سر سے پاؤں تک رُوح تھا اور شعر کی محفل تیرا جسم تھی۔ تو محفل کی رونق بھی بنا رہا اور اس سے چھپا بھی رہا۔ تیری آنکھ کو اُس حُسن کا دیکھنا منظور ہے، جو زندگی کی جلن اور حرارت بن کر ہر چیز میں پوشیدہ ہے۔

چوتھے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ تیری شاعری شعر کی محفل کے لیے زینت اور رونق کا باعث تھی لیکن وہ محفل تیری عظمت کا صحیح اندازہ نہ کر سکی اور حقیقت اس سے پوشیدہ رہی۔ حُسن سے یہاں مراد حُسنِ مطلق ہے جس کا جلوہ حقیقت کے دیکھنے والے کو ہر چیز میں نظر آتا ہے۔

دوسرا بند

بربط: سارنگی۔ **سرمایہ دار**: مالا مال۔ **سکوتِ کوہسار**: پہاڑ کی خاموشی۔ **فردوسِ تخیل**: وہ بہشت جو تیرے خیال نے پیدا کی۔ **کشتِ فکر**: خیال کی کھیتی۔ **مضمر**: چھپی ہوئی۔ **تابِ گویائی**: بولنے کی طاقت۔

زندگی کی محفل تیرے سازِ شعر کے نغموں سے اسی طرح مالا مال ہے جس طرح پہاڑ کی خاموشی ندی کے نغموں سے مالا مال ہوتی ہے۔ تیرے خیال نے جو جنّت پیدا کی اس سے قدرت کے باغ میں بہار آ گئی۔ تیری فکر کی کھیتی میں سبزے کی طرح دُنیائیں اگتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تیری فکر نے رنگ رنگ کے نظارے پیدا کر دیے ہیں۔ تیری تحریر کی شوخی میں زندگی چھپی ہوئی ہے، اور تیرے بولنے کی قوت سے تصویر کے لبوں میں بھی حرکت پیدا ہوتی ہے یعنی تصویر بھی بولنے لگتی ہے۔

مطلب یہ کہ غالب کے ترانوں سے زندگی کی محفل مالا مال ہوئی۔ اس کے افکار قدرت کے چمن میں بہار لائے۔ اس نے رنگ رنگ کے مضامین باندھے، گویا جس طرح سبزہ زمین سے اگتا ہے، اسی طرح غالب کے خیال نے نئی نئی دنیائیں پیدا کر دیں۔ اس کے شعروں میں زندگی کی روح ہے۔ وہ بولتا ہے تو اس کی اثر سے تصویروں میں جان پڑ جاتی ہے اور ان کے لب حرکت میں آ جاتے ہیں۔

تیسرا بند

نطق: بولنا۔ گویائی۔ **لبِ اعجاز**: وہ لب جس کی باتیں معجزہ ہوں۔ **رفعتِ پرواز**: اڑان کی بلندی۔ **شاہدِ مضمون**: مضمون کا محبوب یعنی مضمون کا حُسن۔ **غنچۂ دلّی**: سے مراد خود غالب ہے۔ **گلِ شیراز** سے اشارہ حافظ شیرازی کی طرف ہے۔ **آرامیدہ**: آرام پائے ہوئے۔ **ویمر**: جرمنی کا ایک شہر جہاں نہایت مشہور شاعر گوئٹے دفن ہے۔ **ہم نوا**: ہم زبان۔

بولنے کی قوت تیرے معجزہ بھرے لب پر سو فخر و ناز کرتی ہے۔ تیری فکر کی اونچی اڑان دیکھ کر ثریا بھی حیرت میں گم ہے۔ تجھے بات کہنے کا ایسا طریقہ عطا ہوا ہے کہ مضمون کا محبوب اس پر قربان ہو رہا ہے یعنی تو نے شعروں میں نہایت اعلیٰ مضمون بیان کیے ہیں۔ دلّی کی کلی شیراز کے پھول کی ہنسی اڑا رہی ہے۔ تو اس دلّی کی خاک میں آرام کر رہا ہے جو اجڑ چکی ہے اور تیرا ہم زبان گوئٹے ویمر کے باغ میں سو رہا ہے۔

چوتھے مصرع میں غالب کو حافظ شیرازی کے لیے باعثِ رشک بتایا ہے اور بند کے آخری مصرع میں اسے جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کا ہم نوا کہا ہے۔ بلاشبہ غالب بہ لحاظ حُسنِ بیان حافظ سے ملتا جلتا ہے اور مضامین کی بلندی

حکیمانہ نکتہ نوازی اور حقیقت نگاری کے اعتبار سے گوئٹے کا ہمسر ہے۔ شعر میں بیان کی خوبیاں بھی قابلِ غور ہیں۔ غالب کو "غنچۂ دلی" اور خواجہ حافظ کو گلِ شیراز کہا۔ یعنی ایک پھول کر اپنی خوشبو دنیا بھر میں بکھیر رہا ہے۔ دوسرا ابھی کھلا نہیں ایک شہرۂ آفاق ہے دوسرے کو ابھی شہرت پانا ہے۔ پھر غنچہ کا کھلنا ہی ہنسی اڑانا، قہقہے لگانا یا مسکرانا ہے اور ہنسی گلِ شیراز کی اڑائی گئی۔

چوتھا بند | **نظارہ آموز**: دیدار سکھانے والا۔ **نگاہِ نکتہ بیں**: باریکیوں تک پہنچنے والی نظر۔ **منّت پذیر**: احسان مند۔ محتاج۔

تیرے کلام میں جو خوبی ہے اس کی برابری اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک فکر کمال کے درجے تک نہ پہنچ جائے اور تخیل برابر اس کا ساتھ نہ دے۔ افسوس، اب ہندوستان کی سرزمین کو کیا ہو گیا۔ اسے باریکیوں تک پہنچنے والی نظر کو دیدار کے آداب سکھانے والے! اُردو کی زلف ابھی تک کنگھی کی محتاج ہے اور یہ شمع پروانے کے دل کی جلن پر لٹو ہے یعنی اسے ابھی ضرورت ہے کہ پروانے اس پر جل جل کر قربان ہوں۔

اقبال کہنا یہ چاہتا ہے کہ اب ہندوستان کی سرزمین میں غالب جیسا شاعر موجود نہیں، حالانکہ اُردو کو پھولنے پھلنے کے لیے ایسے ہی شاعروں کی ضرورت ہے اور یہ شمع ایسے ہی پروانوں کی طلب گار ہے۔ بند کے چوتھے مصرع میں نکتہ بیں نگاہ کو دیدار کے آداب سکھانے والے سے اشارہ غالب کی طرف ہے۔

پانچواں بند | **جہان آباد**: شاہ جہاں آباد یعنی دلی کا دوسرا نام ہے۔ **بام و در**: در و دیوار۔ **فخرِ روزگار**: زمانے کے لیے باعثِ ناز۔

اے شاہ جہاں آباد! اے علم و ہنر کے گہوارے! تیرے در و دیوار ایسی فریاد بن گئے ہیں جس کی آواز نہ ہو۔ تیرے ایک ایک ذرّے میں علم و ہنر کے چاند اور سورج سوئے پڑے ہیں۔ تیری مٹی میں اگرچہ لاکھوں گوہر پوشیدہ ہیں، لیکن کوئی غالب جیسا بھی تجھ میں دفن ہے جو زمانے بھر کے لیے باعث ناز تھا۔ اور تجھ میں کوئی ایسی چمک دمک والا موتی بھی چھپا ہوا ہے؟

ابرِ کوہسار

تمہیدی نوٹ: یہ نظم نومبر ۱۹۰۱ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی اور اس کے دس بند تھے۔ نظرِ ثانی میں صرف چار بند باقی رکھے اور ان میں جزوی ترمیمیں کر دی گئیں۔

پہلا بند | **فلک بوس:** آسمان کو چُومنے والا۔ **نشیمن:** آرام کی جگہ۔ مسکن۔ **گل پاش:** پھول برسانے والا۔

بلندی کے سبب سے میرا مسکن آسمان کو چُوم رہا ہے، یعنی آسمان سے باتیں کرتا ہے۔ میں پہاڑ کا بادل ہوں اور میرا دامن پھول برساتا ہے یعنی میں جب برستا ہوں تو زمین سے رنگ رنگ کے پھول پیدا ہوتے ہیں چونکہ یہ پھول بادل کا کرشمہ ہیں، اس لیے بادل نے کہا کہ میرا دامن پھول برساتا ہے۔ کبھی میں بیابان میں ہوتا ہوں کبھی باغ میں۔ شہر، ویرانہ، سمندر، اور جنگل سب جگہیں میرے لیے ہیں۔ میں کسی پہاڑی میدان میں سونا چاہوں تو پہاڑ کا سبزہ میرے لیے مخمل کے بچھونے کا کام دیتا ہے۔

آخری شعر کی صحیح کیفیت اسی صورت میں واضح ہو سکتی ہے کہ برسات میں پہاڑ پر جاکر بادل کا نظارہ کیا جائے۔ بادل میں جب پانی نہیں رہتا، تو وادی میں جاکر ٹھہر جاتا ہے۔ دُور سے نظر آتا ہے کہ اس میں کوئی حس و حرکت باقی نہیں رہی اور وہ وادی اور اطراف کے پہاڑوں سے بالکل ملا ہوا نظر آتا ہے۔ شاعر نے اس نظارے سے یہ مضمون پیدا کر لیا کہ بادل کو سونے کی چاہت ہوئی اور وہ سبزے کو مخمل کا بچھونا سمجھ کر محوِ خواب ہو گیا۔

دوسرا بند | **دُر افشاں:** موتی بکھیرنے یا برسانے والا۔ **ناقہ:** سانڈنی۔ **شاہدِ رحمت:** رحمت کا محبوب یعنی رحمت۔ **حُدی خواں:** حُدی اُس گیت کو کہتے ہیں جو ساربان اونٹوں کا قافلہ لے جاتے وقت گاتے ہیں۔ حدی خواں۔ گیت گانے والا۔ **غم زدا:** غم دور کرنے والا۔ **جوانانِ گلستان:** باغ کے خوبصورت پیڑ بوٹے۔ **موجۂ صرصر:** تیز ہوا کی لہر یا جھونکا۔

قدرت نے مجھے موتی برسانا سکھایا ہے۔ میں رحمت کے محبوب کی سانڈنی کا حدی خواں ہوں یعنی خدا کی رحمت کا قافلہ لے کر آتا ہوں۔ میں کسان کے مرجھائے ہوئے دل کا غم دُور کر دیتا ہوں۔ باغ کے خوب صورت پیڑ بوٹوں کی محفل میں رونق پیدا کر دیتا ہوں۔ میں زلف بن کر دنیا کے چہرے پر بکھر جاتا ہوں تو ہوا کے جھونکوں کی کنگھی مجھے سنوار دیتی ہے۔

اس بند میں ابر کی عام حالت بیان کی گئی ہے۔ اس کے قطرے موتیوں کی مانند ہوتے ہیں۔ دنیا اسے خدا کی رحمت کا پیامی سمجھتی ہے۔ اس کے برسنے سے کسان کا مرجھایا ہوا دل کھل جاتا ہے، اس لیے کہ کھیت سیراب ہو جاتے ہیں۔ باغ کے پیڑ بوٹوں پر نئی رونق آ جاتی ہے۔ بادل بکھر جائے تو ہوا اسے پھر اکٹھا کر دیتی ہے۔

تیسرا بند

لبِ جُو: ندّی کا کنارہ ۔ **گرداب**: بھنور ۔ **مزرعِ نوخیز**: نئی اُگی ہوئی کھیتی
زادۂ بحر: جو سمندر سے پیدا ہوا ہو ۔ **پروردۂ خورشید**: جسے سُورج نے پالا ہو

میں جب کسی بستی سے برسے بغیر چُپ چاپ گزر جاتا ہوں تو امید بھری آنکھ دور سے مجھے دیکھ کر ترستی ہے ۔ جب میں ٹہلتا ہوا ندّی کے کنارے آتا ہوں تو اس کے پانی کو بھنور کی بالیاں پہنا دیتا ہوں اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ۔ اوّل یہ کہ جب بوندیں ندی کے پانی پر گرتی ہیں تو چھوٹے چھوٹے چکّر بناتی ہیں ۔ شاعر نے انھیں بالیوں سے تشبیہہ دی دُوم یہ کہ بادل کے برسنے سے ندّی میں زور کا پانی آتا ہے تو اس میں جابجا بھنور بن جاتے ہیں ۔ بھنور میں پانی کے گھومنے سے جو چکّر یا گولائی سی پیدا ہو جاتی ہے ، اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے بھنور کو ندی کی بالی قرار دیا ۔ اس شعر میں منظر کشی کا کمال دکھایا ہے ۔

کھیتوں میں جو سبزہ ابھی اُگا ہے ، اس کی اُمید مجھ سے وابستہ ہے کہ میں برسوں تو اس کی نمی سے سبزہ پرورش پائے ۔

میں سمندر سے پیدا ہوا ہوں اور مجھے سُورج نے پالا ہے ۔

آخری مصرع میں بادل بننے کے اس نظریے کی طرف اشارہ ہے جو اب سائنس کا مسلّمہ نظریہ ہے ۔ یعنی سورج کی کرنیں سمندر کے پانی کو بخارات کی شکل میں اٹھاتی ہیں ۔ وہ اوپر جاکر بادل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں ۔ جب کسی ٹھنڈی فضا میں پہنچتے ہیں تو پانی سے بوجھل ہو کر ذرا نیچے آجاتے ہیں اور بوندیں برسنے لگتی ہیں ۔ نیچے آنے کو بادل کا جھکنا کہتے ہیں زادۂ بحر اس لیے کہا کہ بادل کی اصل سمندر کا پانی ہے جو بخارات کی شکل میں اوپر اٹھا ۔ پروردۂ خورشید اس لیے کہا کہ بخارات بنا کر اٹھانے کی ذمّہ دار سُورج کی کرنیں ہیں ۔

چوتھا بند

شورشِ قلزم: سمندر کا شور و غل ۔ **محوِ ترنّم**: گانے میں مگن ۔ **قُم**: اُٹھ
یہ عربی میں امر کا صیغہ ہے ۔ اشارہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے قُم بِاِذنِ اللہ (اُٹھ خدا کے حکم سے) کہنے کی طرف ہے ۔ فارسی اور اردو شعر و ادب میں یہ معروف اصطلاح ہے ۔ جس سے عیسٰیؑ مردوں کو زندہ کرتے تھے ۔

ذوقِ تبسّم: مسکرانے کا شوق اور لذّت ۔ **شبستان**: رات کو امیروں کے سونے کی جگہ

میں نے پہاڑ کے چشمے میں سمندر کا شور و غل پیدا کر دیا ۔ میرے برسنے سے فضا میں خوش گوار ٹھنڈک پیدا ہو گئی اور ہر چیز پر تازہ رونق آگئی تو پرندے خوش ہو کر گانے میں مگن ہو گئے ۔ زمین پر سبزے کا نشان تک نہ تھا ۔ میں نے خاک کو شادابی بخشی تو سبزہ اگ آیا ۔ گویا میں نے قم کہہ کر مُردہ سبزے کو زندہ کر دیا ۔ پھول کی کلی کو میں نے مسکرانے کا شوق اور لذّت عطا کی ۔ پہاڑ کے دامن میں کسانوں کے جو جھونپڑے تھے ان میں خوشیاں منائی جانے لگیں ۔ گویا میرے فیض سے وہ امیروں

کی خوابگاہوں کے نمونے بن گئے، جہاں ان کے عیش و نشاط کی محفلیں گرم ہوتی ہیں۔

بادل جب زور سے برستا ہے اور پہاڑوں کی چوٹیوں کا پانی چشموں میں پہنچتا ہے، تو ان میں خاصا شور پیدا ہوتا ہے۔ شاعر نے اسے سمندر کے شور و غل سے تشبیہہ دی ہے۔

ایک مکڑا اور مکھی

تمہیدی نوٹ: اس نظم میں بچّوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ دشمن خواہ لاکھ چکنی چپڑی اور خوشامد کی باتیں کرے اس کے بہکانے پھسلانے میں ہرگز نہ آنا چاہیے۔

پہلا بند | ایک دن کوئی مکڑا کسی مکھّی سے کہنے لگا کہ تم ہر روز اس راستے سے گزرتی ہو، لیکن کبھی میرے گھر کے بھاگ نہ جاگے۔ کسی دن بھولے سے بھی یہاں نہ آئیں۔

بیگانوں سے نہ ملا جائے تو کوئی حرج نہیں، مگر اپنوں سے اس طرح الگ تھلگ نہ رہنا چاہیے۔ اگر تم میرے گھر آؤ تو میرے لیے یہ بڑی عزّت اور فخر کی بات ہے۔ اگر تم آنا پسند کرو تو وہ سامنے سیڑھی لگی ہوئی ہے، اس سے آ سکتی ہو۔

مکھّی نے مکڑے کی بات سن کر جواب دیا۔ جناب! یہ دھوکا کسی احمق کو دیجیے گا۔

مکھّی اس فریب کے جال میں کبھی نہیں آ سکتی۔ جو کوئی آپ کی سیڑھی پر ایک دفعہ بھی چڑھ جائے، وہ پھر زندہ سلامت نہیں اتر سکتا۔

دوسرا بند | مکڑا بولا۔ واہ! تم مجھے فریبی سمجھتی ہو؟ تم جیسا مغرور کوئی بھی دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ میں تو تمھاری آؤ بھگت کرنا چاہتا تھا ورنہ اس میں میرا ذاتی فائدہ تو کچھ نہ تھا۔

خدا جانے تم کہاں سے اُڑتی ہوئی آئی ہو۔ میرے گھر میں جو ٹھہر جاؤ تو اس میں کیا بُرائی ہے؟

میرا گھر باہر سے تو ایک چھوٹا سا ناچیز جھونپڑا نظر آتا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس میں بہت سی چیزیں تمھارے دکھانے کے لائق ہیں۔

اس کے دروازے پر باریک اور نفیس پردے لٹک رہے ہیں اور میں نے دیواروں میں آئینے لگا کر انھیں سجا رکھا ہے، مہمانوں کے آرام کرنے کو بچھونے موجود ہیں، یہ سامان ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔

مکھّی بولی، خیر یہ سب باتیں ٹھیک سہی، لیکن میں اور آپ کے گھر آؤں؟ یہ امید ہرگز نہ رکھیے گا۔ خدا مجھے ان نرم

بچھونوں سے بچائے ہی رکھے۔ ان پر کوئی سو جائے تو پھر زندہ اُٹھ نہیں سکتا۔

مکڑے نے اس کی بات سُنی توجی میں کہا، میں اسے کیونکر پھانسوں، یہ کم بخت تو سیانی ہے اور

تیسرا بند مجھے خوب جانتی بوجھتی ہے۔

دنیا میں چاپلوسی سے سینکڑوں کام انجام پاتے ہیں۔ زمانے میں جسے دیکھو، بس یہی چاہتا ہے کہ لوگ میری خوشامد کرتے رہیں۔ بہتر یہ ہے کہ میں بھی اسی ہتھکنڈے سے کام لے دیکھوں۔

یہ سوچ کر مکھی سے کہنے لگا، بڑی بی! خدا نے آپ کو بڑا اونچا مرتبہ دیا ہے۔

جو کوئی آپ کو ایک نظر ہی دیکھ لے، اسے آپ کی صورت سے بڑا پیار ہو جاتا ہے۔

واہ وا آپ کی آنکھیں ہیں یا ہیرے کے چمکتے ہوئے ریزے! خدا نے آپ کا سر کلغی سے سجا رکھا ہے۔

یہ خوبصورتی یہ لباس، یہ اچھائی، یہ صفائی سبحان اللہ! پھر اس پر اڑتے ہوئے گانا تو قیامت ڈھا رہا ہے۔

مکھی نے چاپلوسی کی یہ باتیں سنیں تو اس کا دل نرم ہو گیا۔ بولی، مجھے آپ سے کوئی اندیشہ نہیں۔

میں کسی کی بات نہ ماننے کی عادت کو برا سمجھتی ہوں۔ سچ یہ ہے کہ کسی کا دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا۔

یہ بات کہتی ہوئی اپنی جگہ سے اڑی اور مکڑے کے پاس پہنچی تو اس نے اُچھل کر اسے پکڑ لیا۔

وہ بہت دنوں سے بھوکا تھا۔ اب جب اسے شکار (مکھی) ہاتھ لگا تو گھر بیٹھ کر اُسے مزے سے کھا گیا۔

ایک پہاڑ اور گلہری

تمہیدی نوٹ: یہ نظم امریکہ کے مشہور ادیب، فلسفی اور شاعر آر۔ ڈبلیو ایمرسن کے کلام سے اخذ کی گئی ہے۔ اس مکالمے کے ذریعے سے بچوں کو سمجھایا گیا ہے کہ دنیا میں کوئی بھی چیز نکمی اور بری نہیں۔

ایمرسن ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۸۲ء میں وفات پائی۔

پہلا بند کوئی پہاڑ ایک گلہری سے کہہ رہا تھا کہ تجھے کچھ بھی شرم ہو تو جا کر پانی میں ڈوب مرے۔ تو ذرا سی چیز ہو کر اتنا گھمنڈ کر رہی ہے۔ واہ کیا کہنا! اس عقل، دانائی اور سمجھ بوجھ کی کیا بات ہے!

خدا کی قدرت ہے کہ اس کی ایک نہایت کم درجے کی مخلوق اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھ رہی ہے۔ جو بے وقوف ہے۔

وہ خود کو عقل مند خیال کرتی ہے۔

میری اُونچی شان اور مرتبے کے آگے تیری کیا حیثیت ہے؟ میرے ٹھاٹھ باٹھ اور بلندی کے سامنے زمین نیچی ہے۔

جو خوبی مجھ میں ہے وہ تیری قسمت میں کہاں ہے؟ بھلا کہاں پہاڑ اور کہاں ایک غریب جانور۔

دوسرا بند | یہ سُن کر گلہری نے کہا: ذرا منہ سنبھال کر بول۔ یہ باتیں فضول اور بے اصل ہیں۔ انھیں دل سے نکال دے۔

اگر میں تیری طرح بڑی نہیں تو کیا پروا ہے! تو بھی تو آخر میری طرح چھوٹا نہیں۔

ہر چیز سے خدا کی قدرت ظاہر ہے۔ کوئی بڑا ہے کوئی چھوٹا۔ یہ بھی اس کی کاریگری ہے۔

تجھے اس نے دنیا میں بڑا بنا دیا اور مجھے درخت پر چڑھنا سکھا دیا۔

تجھ میں پاؤں تک اٹھانے کی طاقت نہیں۔ بس بڑائی ہی بڑائی ہے اور کیا خوبی ہے؟

اگر تُو بڑا ہے تو مجھ سا کوئی کمال دکھا۔ اور نہیں تو یہ چھالیا ہی ذرا توڑ دے۔

دنیا میں کوئی بھی چیز نکمّی نہیں۔ قدرت کے کارخانے میں کوئی بُرا نہیں۔

ایک گائے اور بکری

تمہیدی نوٹ: اس نظم سے یہ نصیحت بچّوں کے دل میں بٹھائی گئی ہے کہ جو کوئی نیکی کرے، اس کا احسان ضرور ماننا چاہیے۔ مفت میں اُس کی برائی اور گلہ کرنا عقل اور انصاف کے سراسر خلاف ہے۔

کسی جگہ ایک ہری بھری چراگاہ تھی، جس کی زمین بہار کا پُورا نقشہ پیش کر رہی تھی۔

اس بہار کا حال کیا بیان کیا جائے۔ ہر طرف صاف و شفاف ندیاں بہ رہی تھیں۔

وہاں اناروں کے اَن گنت پیڑ اور پیپل کے سائے والے درخت تھے۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آ رہی تھیں اور پرندوں کی آوازیں دل لبھا رہی تھیں۔

ایک بکری کہیں سے چرتے چرتے کسی ندّی کے پاس آ نکلی۔

جب اس نے ٹھہر کر ادھر اُدھر دیکھا تو اپنے پاس ایک گائے کو کھڑے پایا۔

پہلے اُسے جُھک کر سلام کیا۔ پھر ادب قاعدے سے یوں بات کی۔
بڑی بی! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ گائے بولی کہ خیر اچھّی ہے۔
بُرا بھلا وقت گزر رہا ہے۔ زندگی میں مصیبت پر مصیبت آ رہی ہے۔
کیا کہوں میری نوجان پر آ بنی ہے۔ قسمت ہی بُری ہے۔
میں خدا کی قدرت کو دیکھ رہی اور بُردں کی جان کو رو رہی ہوں۔
غریبوں کا کچھ بس نہیں چلتا۔ تقدیر کا لکھا آگے آیا۔
آدمی سے نیکی نہ کرنی چاہیے۔ خدا کرے، اس سے کسی کو بھی واسطہ نہ پڑے!
اگر میں دُودھ کم دوں تو وہ بُڑبُڑ کرتا ہے۔ دُبلی اور کمزور ہو جاؤں تو بیچ کر پیسے کھرے کر لیتا ہے۔
وہ طرح طرح کی فریب بھری تدبیروں سے مجھے موہ لیتا ہے اور قسم قسم کے دھوکوں سے غلام کر لیتا ہے۔
میں اس کے بچّوں کو پالتی اور دودھ پلا کر ان میں جان ڈالتی ہوں۔
نیکی کے بدلے وہ مجھ سے یہ بُرائی کرتا ہے۔ یا اللہ! تیری دہائی ہے!
بکری نے یہ ساری بات سُن کر کہا: ایسی شکایت اچھی نہیں۔
سچّی بات بے مزہ بلکہ کڑوی لگتی ہے لیکن میں تو انصاف سے کھری کھری کہ دوں گی۔
یہ ہمارے چرنے کی جگہ، یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، یہ ہری ہری گھاس، یہ سُہانی چھاؤں۔
ایسی خوشیاں ہماری قسمت میں کہاں! یہ نعمتیں کہاں اور ہم بے زبان غریب کہاں!
سچ ہے کہ تمام آرام اور مزے آدمی ہی کی بدولت ہیں۔ یہ سب سُکھ چین اسی کے دم سے ہیں۔
اسی کے دم سے ہم آباد اور خوش ہیں۔ ہمیں قید اچھی ہے یا آزادی؟
جنگلوں میں سینکڑوں قسم کے خطرے ہیں۔ وہاں کی زندگی سے تو اللہ بچائے!
ہم پر آدمی کا بڑا احسان ہے۔ مناسب نہیں کہ ہم اس کی شکایت کریں۔
اگر تم آرام کی قدر پہچانو تو کسی آدمی کی شکایت نہ کرو۔
گائے یہ بات سُن کر شرم سے پانی پانی ہو گئی اور آدمی کی شکایت کرنے سے پچھتانے لگی۔
اس نے دل ہی دل میں بات کی اچھائی بُرائی جانچی۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔
یوں تو بکری ایک چھوٹا سا جانور ہے لیکن اس کی بات دل میں گھر کر جاتی ہے۔

بچّے کی دُعا

تمہیدی نوٹ: اس نظم میں دُعائیہ طریق سے بچّوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ انھیں علم حاصل کرکے اپنے وطن، غریبوں، دُکھی اور کمزور لوگوں کی خدمت کرتے ہوئے نیکی کے راستے پر چلنا اور بُرائی سے بچنا چاہیے۔

پہلا بند اے خدا! میری یہ آرزو دُعا بن کر لب پر آتی ہے کہ میں شمع کی طرح زندگی بسر کروں۔ میری روشنی سے دُنیا کا اندھیرا دور ہو جائے اور میرے چمکنے سے جہان کا کونا کونا جگمگا اٹھے۔ میرے ذریعے سے وطن اسی طرح آباد اور بارونق رہے، جس طرح پھولوں سے باغ بنا ٹھنا رہتا ہے۔

دوسرا بند اے پروردگار! میری زندگی پروانے کی مانند ہو۔ میں علم کی شمع سے پیار کرتے ہوئے اس پر قربان ہو جاؤں یعنی مجھے تعلیم سے بے حد محبّت ہو۔ میرا کام صرف یہ ہو کہ غریبوں کی مدد کروں دُکھی اور کمزور لوگوں سے ہمدردی کرکے ان کی خدمت بجا لاؤں۔ اے میرے اللہ مجھے بُرائی سے بچانا اور ہمیشہ نیکی کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا کرنا!

خدمتِ خلق کے یہ ایسے پاکیزہ جذبات ہیں، جو ہر بچّے کے دل میں پرورش پانے چاہییں۔

ہمدردی

تمہیدی نوٹ: یہ نظم انگلستان کے نامور شاعر ولیم کوپر کے کلام سے اخذ کی گئی ہے، اس میں بچّوں کو ہمدردی کا سبق دیتے ہوئے سمجھایا گیا ہے کہ دنیا میں سب سے اچھا آدمی وہ ہے، جو دوسروں کے کام آئے۔ ولیم کوپر ۱۷۳۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۰۰ء میں اس نے وفات پائی۔ وہ انگلستان کا بڑا ہی مقبول شاعر تھا۔

کسی پیڑ کی ٹہنی پر کوئی بُلبل اکیلا اُداس بیٹھا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا کہ رات ہونے کو آئی، سارا دن اڑنے اور دانہ دُنکا چُگنے میں گزار دیا۔

میں اپنے گھونسلے تک کیونکر پہنچوں۔ جدھر دیکھو اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا ہے۔

بُلبل کی یہ چیخ پکار سُن کر پاس ہی سے ایک جگنو بول اُٹھا:

اگرچہ میں ننّھا سا کیڑا ہوں، پھر بھی جان اور دل سے مدد کے لیے حاضر ہوں۔
اگر رات اندھیری ہے تو کوئی فکر کی بات نہیں، میں تمھارے راستے میں روشنی کروں گا۔
خدا نے مجھے نُور عطا کیا ہے اور چمکا کر چراغ بنا دیا ہے۔
دُنیا میں وہی لوگ اچھے ہیں، جو دوسروں کے کام آتے ہیں۔

ماں کا خواب

تمہیدی نوٹ: اس نظم میں ماؤں کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ انھیں بچّوں کی یاد میں زیادہ رونا نہ چاہیے اور صبر سے کام لینا چاہیے۔

زمرّد: سبز رنگ کا ایک پتّھر جو بہت قیمت پاتا ہے۔

ماں کہتی ہے کہ میں ایک رات سو گئی تو خواب دیکھا جس سے میری پریشانی بڑھ گئی۔
میں نے دیکھا کہ کہیں جا رہی ہوں اور اندھیرا اتنا ہے کہ راستہ نہیں ملتا۔
میرا بال بال خوف کے مارے کانپ رہا تھا اور دہشت کے باعث پاؤں اُٹھنا مشکل تھا۔
میری کچھ ہمّت بندھی اور آگے بڑھی تو لڑکوں کی ایک قطار دیکھی۔ وہ سب زمرّد جیسے سبز لباس پہنے ہوئے تھے۔
اور ان کے ہاتھوں میں دیے روشن تھے۔
وہ آگے پیچھے چپ چاپ چلے جا رہے تھے۔ خدا جانے انھیں کہاں جانا تھا؟
میں اسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اس گروہ میں مجھے اپنا بیٹا دکھائی دیا۔
وہ سب سے پیچھے تھا اور آہستہ آہستہ چلا جاتا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں جو دیا تھا، وہ روشن نہ تھا۔
میں نے اُسے پہچان کر کہا، میری جان! تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلے آئے؟
تمھاری جدائی میں ہر وقت بے چین رہتی ہوں اور آنسوؤں کا ہار پرونا میرا کام ہے یعنی رات دن روتی دھوتی رہتی ہوں۔
تم نے ہماری ذرا پروا نہ کی اور چھوڑ کر چلے گئے۔ واہ! تم نے وفاداری کا کیسا اچھا ثبوت دیا۔
بچّے نے میری بے قراری دیکھی تو میری طرف سے منہ پھیر لیا اور یوں جواب دیا:

امّاں جان! بے شک میری جُدائی تمھیں رُلاتی ہوگی، لیکن اس میں میری تو کوئی بہتری نہیں۔
یہ کہہ کر وہ کچھ دیر چُپ رہا، پھر اپنا دیا مجھے دکھا کر کہنے لگا:
تو جانتی ہے، اسے کیا ہو گیا؟ تیرے آنسوؤں ہی نے اسے بُجھا دیا۔

پرندے کی فریاد

تمہیدی نوٹ: یہ نظم بھی بچّوں ہی کے لیے لکھی گئی تھی اور بہت مقبول ہوئی۔ یہ اگرچہ قیدی پرندے کی فریاد ہے لیکن اس کے بعض حصّے اُس زمانے میں محکوم ہندوستان کی فریاد سمجھے گئے تھے۔ قومی حلقوں میں بھی یہ نظم بے حد پسند کی گئی۔ یہ اس زمانے میں "مخزن" میں چھاپی گئی تھی۔ جب اقبال ولایت میں تھے اور اس پر نوٹ لکھا گیا تھا کہ ٹیکسٹ بُک کمیٹی کی اجازت سے چھاپی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کی دوسری نظموں کی طرح یہ نظم بھی ٹیکسٹ بک کمیٹی نے لکھوائی تھی۔

پہلا بند **کامنی سی:** خوبصورت اور نازک سی۔ **قفس:** پنجرہ۔

قیدی پرندہ کہتا ہے کہ مجھے وہ گزرا ہوا زمانہ یاد آتا ہے، جب میں آزادی کی حالت میں باغ کی بہاریں لُوٹ رہا تھا۔ میں اور میرے تمام ساتھی چہچہاتے تھے۔

میں آزاد تھا تو جب جی چاہتا تھا اپنے گھونسلے میں آجاتا تھا، جب جی چاہتا تھا چلا جاتا تھا۔ اب پنجرے میں قید ہوں۔ پہلے کی آزادیاں اب کہاں؟

صبح کے وقت کلیاں کھلتی تھیں اور ان پر اوس کی بوندیں بہت اچھّی معلوم ہوتی تھیں۔ میں سمجھتا تھا کہ اوس رو رہی ہے اور کلیاں اس پر ہنس رہی ہیں۔ یہ نظارہ آزادی کے وقت ہر روز دیکھتا تھا۔ اب قید میں یہ حالت یاد آتی ہے تو دل پر چوٹ لگتی ہے یعنی بڑا دُکھ ہوتا ہے۔

اپنے ساتھی پرندے کو یاد کر کے کہتا ہے کہ آہ! وہ پیاری پیاری شکل اور وہ خوبصورت اور نازک مورت جس کے سبب سے میرے گھونسلے میں آبادی کی رونق تھی۔ اب مجھ سے بچھڑی ہوئی ہے۔

اب اس کے ترانوں کی آواز میرے پنجرے میں سُنائی نہیں دیتی اور میں آزاد نہیں کہ اُڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میری رہائی میرے بس میں ہوتی۔

دوسرا بند میرا نصیبا کتنا بُرا ہے کہ مَیں گھر کے لیے ترس رہا ہوں۔ میرے تمام ساتھی وطن میں ہیں اور میں قید ہوں۔
بہار آئی اور پھولوں کی کلیاں ہنسنے لگیں۔ میں پنجرے کے اندھیرے گھر میں اپنی قسمت کو رو رہا ہوں۔ اے خدا! اس قید کی دُکھ بھری کہانی کسے سُناؤں؟ مجھے تو یہ ڈر لگا ہوا ہے کہ غم سے گھُلتے گھُلتے پنجرے ہی میں نہ مر جاؤں۔

تیسرا بند جب سے باغ چھُوٹا ہے۔ میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ دل ہر وقت غم کھا رہا ہے اور غم دل کو گھلائے جا رہا ہے۔
جن کے کانوں میں میری آواز پہنچ رہی ہے، وہ اسے میرا گانا سمجھ کر خوش ہو رہے ہیں۔ انھیں ایسا نہ کرنا چاہیے یہ آواز تو دُکھے ہوئے دلوں کی چیخ پکار ہے۔
اے قید کرنے والے! تو مجھے چھوڑ دے۔ میں بے زبان قیدی ہوں۔ مجھے چھوڑے گا تو میں تجھے دُعا دوں گا۔

خفتگانِ خاک سے استفسار

تمہیدی نوٹ: یہ نظم فروری ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی اور اس کے چالیس شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں صرف چھبیس ۲۶ شعر باقی رکھے گئے۔ اقبال نے اچھوتے انداز میں حالات بعد الموت کے متعلق کچھ سوالات ان لوگوں سے کیے ہیں جو موت کی منزل سے گزر چکے ہیں۔ درحقیقت یہ نظم ان افکار و احساسات کا ایک جامع مرقع ہے جو زندگی کے مسائل پر غور و فکر کرنے والے بالغ نظر انسان کے قلب و دماغ میں اوّل اوّل پیدا ہوتے ہیں۔ اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ دنیا میں جتنے مسائل ایک سلیم الفطرت انسان کے لیے دُکھ اور تکلیف کا باعث ہیں، وہ سب پیش کر کر کے خاک میں سونے والوں سے پوچھا ہے کہ آیا موت کے بعد کی زندگی میں وہ بھی موجود ہیں یا نہیں؟

پہلا بند **استفسار:** سوال۔ **خفتگانِ خاک:** قبروں میں سونے والے۔ **نقاب:** چہرے کا پردہ۔ **سیاہ پوشی:** ماتم میں کالا لباس پہننا۔ **لبِ گفتار:** بولنے والا ہونٹ۔ **ساحر:** جادوگر۔ **غوطہ زن:** ڈبکی لگانے والی یعنی ڈوبی ہوئی۔ **درا:** قافلے کی گھنٹی۔ **نفور:** نفرت کرنے والا۔ **حرماں نصیبی:** محرومی، مایوسی۔

پہلے بند میں سُورج ڈوبنے اور رات ہونے کا سماں پیش کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

چمکنے والا سُورج چھُپ گیا۔ شام کے چہرے سے پردہ اُٹھ گیا یعنی وہ ظاہر ہوگئی۔ دُنیا کے کندھے پر شام کی زلفیں بکھر گئیں یعنی شام ہوگئی اور اندھیرا چھانے لگا۔ یہ حالت دیکھتے ہی شاعر کے دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیاہ لباس تو ماتم کا لباس ہے، دنیا سیاہ پوشی کی جو تیاری کر رہی ہے، یہ کسی کے غم میں ہونی چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کی محفل سُورج کے ڈوبنے کا ماتم کرنے لگی ہے۔ بولنے والے ہونٹ بند ہو رہے ہیں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ آسمان ان پر جادو کر رہا ہے ہیں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ آسمان ان پر جادو کر رہا ہے۔ رات کا جادو گر جاگنے والی آنکھ پر نظر جمائے بیٹھا ہے۔ مطلب یہ کہ رات کے آنے ہی سارا شور و غل ختم ہو رہا ہے۔ بولنے والے ہونٹ چُپ ہو رہے ہیں۔ جاگنے والی آنکھ کو نیند آ رہی ہے۔ ہوا کی لہر خاموشی کے دریا میں ڈوب گئی ہے یعنی ہوا کے چلنے کی آواز بھی باقی نہیں رہی۔ بس دُور سے کسی قافلے کی گھنٹی کی آواز آ رہی ہے۔ میرا دل محبّت کے درد سے بے چین ہے۔ وہ دُنیا سے دُور بھاگتا ہے۔ چنانچہ مجھے جہان کے ہنگاموں سے کھینچ کر دُور لے آیا ہے۔ میرے سامنے مایوسی کا سماں ہے اور مَیں اُسے دیکھ رہا ہوں۔ مَیں اُن سونے والوں کے پاس بیٹھا ہوں۔ جنھوں نے قبر کی تنہائی کا گوشہ اختیار کر لیا ہے یعنی میں قبرستان میں پہنچ گیا ہوں۔

دوسرا بند **حیرت خانہ**: حیرانی کا مقام۔ **اِمروز و فردا**: آج کل۔ **پیکارِ عناصر**: عنصروں کی لڑائی۔ **حصارِ غم**: غم کی چار دیواری۔ **معیشت**: زندگی۔ روزگار۔ **افتاد**: مصیبت۔ آفت۔ **خرمن**: کھلیان۔ **اندیشۂ رہزن**: ڈاکو کا خوف۔ **خشت و گِل**: اینٹ اور گارا۔ **امتیازِ ملت و آئین**: قوم اور شرع کا فرق۔

اے دل کی بے قراری! تو ذرا ٹھہر جا اور مجھے بیٹھ جانے دے تاکہ اس بستی پر چار آنسو بہا لوں۔ اس کے بعد شاعر خاک میں سونے والوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

اے غفلت کی شراب کے نشے میں چور لوگو! تم کہاں رہتے ہو؟ جہاں بھی رہتے ہو، اس دیس کی کچھ باتیں سُناؤ اور مجھے بتاؤ، کیا وہ بھی حیرت کا کوئی ایسا ہی مقام ہے جیسی یہ دنیا جہاں وقت کے احساس نے آج اور کل کا امتیاز قائم کر رکھا ہے۔ کیا وہاں بھی عنصروں کی جنگ کا سماں نظر آتا ہے؟

اس شعر میں شاعر نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ دنیا آج کل کے امتیاز سے حیرت کا مقام بنی ہوئی ہے اور یہاں حادثے پیش آتے رہتے ہیں جو عنصروں کی جنگ کا نتیجہ ہیں۔ انسان موت کے بعد جس دنیا میں پہنچتا ہے، کیا اس کی بھی ایسی ہی کیفیت ہے؟

کیا وہاں بھی آدمی غم کی چار دیواری میں گھرا رہتا ہے؟ کیا اس دیس میں بھی انسان کا دل مجبور ہے؟

شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ کیا وہاں بھی انسان کو غم سے سابقہ پڑتا ہے اور وہاں بھی اس کی بے بسی کا وہی حال ہے جو یہاں ہے؟ واضح رہے کہ غم ہمیشہ مجبوری کا نتیجہ ہوتا ہے۔

کیا وہاں بھی چراغ روشن ہو تو اس پر پروانے گر کر جلتے رہتے ہیں؟ کیا اس باغ میں بھی گل و بلبل کے عشق و محبّت کا چرچا ہے؟ یعنی کیا وہاں بھی عشق و محبّت کے وہ دکھ سہنے پڑتے ہیں جو یہاں شمع نے عشق میں پروانہ اور گل کے عشق میں بلبل برداشت کرتی رہتی ہے؟

یہاں تو ایک مصرع سُن کر دل اتنا تڑپ اٹھتا ہے گویا پہلو سے باہر نکلا پڑتا ہے۔ کیا اُس دنیا میں بھی شعر کی گرمی دلوں کو پگھلا دیتی ہے؟ مطلب یہ کہ ہمارے ہاں تاثّرات کی ایک خاص کیفیت ہے اور اس کے خاص اسباب ہیں۔ کیا اُس دُنیا کی بھی یہی حالت ہے؟

یہاں کے تعلقات خواہ وہ رشتہ داروں کے ہوں یا دوستوں کے، جان کے لیے تکلیف کا باعث ہیں۔ یعنی وبالِ جان بنے ہوئے ہیں۔ کیا اُس باغ میں بھی ایسے نوک دار کانٹے موجود ہیں یعنی کیا وہاں بھی تعلقات تکلیف ہی کا باعث ہیں؟

اس دُنیا میں روزگار کی کشمکش کے ساتھ سینکڑوں مشکلیں اور بلائیں لگی ہوئی ہیں۔ کیا اُس دُنیا میں رُوح اس غم سے آزاد ہے؟ یعنی کیا وہاں جینے کے لیے وہ محنت و مشقت تو اٹھانی نہیں پڑتی جو ہم لوگ رات دن یہاں اُٹھاتے ہیں؟

کیا وہاں بھی بجلی، کسان اور کھلیان ہے؟ کیا وہاں بھی قافلے والے موجود ہیں اور انھیں لٹیروں کا خدشہ پریشان کرتا رہتا ہے؟

شاعر اس شعر میں اُن چند مشکلوں اور بلاؤں کا ذکر کرتا ہے جن کی طرف پہلے شعر میں اشارہ کر چکا ہے، یعنی اس دنیا میں کسان محنت و مشقت اٹھا کر کھلیان جمع کرتا ہے۔ اُسے ڈر لگا رہتا ہے کہ بجلی گرنے سے وہ جل نہ جائے۔ قافلے سامان لے کر تجارت کی غرض سے باہر جاتے ہیں۔ بیابانوں میں انھیں یہ خوف رہتا ہے کہ ڈاکو لوٹ نہ لیں۔ اس طرح واضح ہو گیا کہ روزگار کی ہر کشمکش کے ساتھ طرح طرح کی مشکلیں اور بلائیں ملی ہوتی ہیں۔

ہماری دنیا میں انسان اپنی اصلیت یعنی انسانیت سے بے خبر ہیں۔ وہ مذہب اور قانون پر جان دے رہے ہیں کیا اُس دُنیا میں بھی یہی نقشہ ہے؟ کیا وہاں بھی مذہب اور قانون کے فرق اور امتیاز نے انسانوں کو ان کی حقیقت بھلا کر ایک دوسرے سے بیگانہ بنا رکھا ہے؟

یہاں بلبل کی فریاد پر باغ کے دل میں درد پیدا نہیں ہوتا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری نہیں ہوتے۔ کیا ہماری دنیا کی طرح اُس دنیا میں بھی دردِ دل موجود نہیں؟

تیسرا بند

حُسنِ ازل: وہ حُسن جو اس دنیا کی پیدائش سے پہلے موجود تھا اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ حُسنِ باری تعالیٰ یعنی حُسنِ مطلق۔ **معصیت سوزی:** گناہوں کو جلانا۔ **تادیب:** فہمائش۔سزا۔گوشمالی۔ **ہست و بود:** رہنا سہنا۔زندگی۔ **مہجور:** جُدا۔ ہجر کا مارا ہوا۔

لَنْ تَرَانِی: یہاں اشارہ ہے حضرت موسیٰؑ کے واقعے کی طرف جس کا ذکر سورۂ اعراف میں آیا ہے۔ یعنی حضرت موسیٰؑ طور پر پہنچے تو خدا نے ان سے کلام کیا۔ حضرت موسیٰؑ نے جوش طلب میں بے اختیار ہو کر عرض کیا: رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ ـــــ پروردگار! مجھے اپنا جمال دکھا کہ تیری طرف نگاہ کر سکوں۔ جواب میں ارشاد ہوا: لَنْ تَرَانِیْ ـــــ تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا۔ **قتیل:** مارا ہوا۔شہید۔یہاں مراد شیدائی ہے۔ **ذوقِ استفہام:** پوچھنے کی لذّت۔سوال کا شوق۔ **معمورہ:** بھری ہوئی۔ **گنبدِ گرداں:** گھومنے والا گنبد۔آسمان۔یہاں اس سے مراد دُنیا ہے۔

کیا جنّت ایک باغ ہے یا رستانے کی ایک منزل ہے؟ یا یہ سمجھا جائے کہ یہ اس مقام کا دوسرا نام ہے، جہاں باری تعالیٰ کا حُسن بے پردہ جلوہ دکھاتا ہے؟ شاعر کی مُراد یہ ہے کہ آیا جنّت صرف ایک باغ ہے یا کوئی ایسی جگہ ہے کہ انسان چلتے چلتے تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر جائے اور ذرا آرام لے کر آگے چلے یا اسے حُسنِ باری تعالیٰ کی خاص جلوہ گاہ سمجھا جائے جہاں وہ حسنِ ازل اصل صورت میں نظر آتا ہے؟

کیا دوزخ گناہوں کو جلانے کی ایک تدبیر ہے؟ کیا آگ کے شعلے وہاں اس غرض سے بھڑکائے جاتے ہیں کہ گنہگاروں کی سرزنش ہو اور انھیں سزا دے کر صحیح راستے پر لگانا مقصود ہو؟

شاعر کہتا ہے کہ یہاں تو لوگ چلتے پھرتے ہیں، کیا اس دنیا میں وہ اڑتے پھرتے ہیں؟ زمین پر بسنے والے جس چیز کو موت کہتے ہیں۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟

یہاں رہنا سہنا دل کی پریشانی کا باعث ہے اس لیے کہ ہر ضروری سامان دوڑ دھوپ سے حاصل ہوتا ہے اور انسانی علم اس قدر محدود ہے کہ دوڑ دھوپ کے نتیجے کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا یعنی انسان کی بعض کوششیں بالکل بے نتیجہ رہتی ہیں۔ اگر اس کا علم تنگ اور محدود نہ ہوتا تو وہ ہر انجام کا اندازہ کرتے ہوئے کوشش کرتا۔ قبروں میں سونے والوں سے شاعر پوچھتا ہے کہ کیا ہمارے دیس کی طرح تمھارے دیس میں بھی انسان کا علم تنگ اور محدود ہے؟

یہاں تو جدائی کا مارا ہوا دل تڑپتا ہے اور اسے محبوب کا دیدار نصیب نہیں ہوتا، جو تسکین کا سامان ہے۔ کیا اُس دنیا میں بھی یہی کیفیت ہے؟ اور کیا وہاں کے طُور پہاڑ بھی لن ترانی کی صدا بلند کر رہے ہیں؟ یعنی کیا وہاں بھی دیدار کے طالب کو یہی جواب ملتا ہے کہ تو میرا جمال ہرگز نہ دیکھ سکے گا؟

یہاں انسان تلاش وجستجو میں لگا رہتا ہے تو اُس کی رُوح کو تسکین حاصل ہوتی ہے کیا اُس دُنیا میں بھی انسان نئی نئی باتیں دریافت کرنے کی لذّت کے شیدائی ہیں؟ یعنی آیا وہاں بھی تلاش وجستجو آرام حاصل کرنے کا سامان ہے؟

ہماری دنیا میں تو محبّت کی کوئی کرن نظر نہیں آتی اور یہاں سراسر اندھیرا ہی اندھیرا ہے، کیا اُس دنیا کی حالت بھی یہی ہے؟ یا وہ محبّت کے جلووں سے بقعۂ نور بنی ہوئی ہے؟

موت انسان کے دل میں ایک ایسا کانٹا ہے جس کی چبھن ہر وقت محسوس ہوتی رہتی ہے۔ یعنی انسان موت کے خیال سے کبھی آزاد نہیں ہوتا۔ اسے قبروں میں سونے والو! تم موت کی منزل سے گزر کر اس گھومنے والے گنبد (آسمان) کا بھید پا چکے ہو۔ وہ بھید ہمیں بھی بتا دیتے تاکہ یہ چبھتا ہوا کانٹا دل سے نکل جائے اور انسان کو معلوم ہو جائے کہ موت کیا ہے؟ اس میں کیا بھید ہے؟ اس کے بعد کیا حالت پیش آتی ہے؟ یہ معلوم ہو جائے تو موت موت نہ رہے گی۔

شمع و پروانہ

تمہیدی نوٹ: یہ نظم اپریل ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی اور اس کے بارہ شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں صرف آٹھ باقی رکھے گئے۔ اس میں شمع پر پروانے کے جل مرنے کی بے خودی کا نقشہ نہایت دلکش انداز میں کھینچا گیا ہے۔ اس کا اصل مضمون آخری شعر میں ہے یعنی روشنی کی طلب اور تڑپ، جس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان میں اشیا کی حقیقت معلوم کرنے کا ذوق لازم ہے اور پروانے سے اسے یہی سبق ملتا ہے۔

سیماب وار: لفظی معنی پارے کی طرح۔ مراد ہے بے قرار۔ **طواف:** چکّر لگانا۔ کسی چیز کے اردگرد گھومنا **برقِ نگاہ:** نظر کی بجلی۔ **آزارِ موت:** مرنے کا دُکھ۔ **زندگیِ جاوداں:** ہمیشہ کی زندگی۔ وہ زندگی جو موت کی فکر سے پاک ہو۔ **تفتہ دل:** دل جلا۔ **نخلِ تمنا:** آرزو کا پودا یعنی آرزو۔ **حسنِ قدیم:** حُسنِ ازل، حسنِ باری تعالیٰ۔ عاشقِ حسنِ قدیم سے اشارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے جنھوں نے کوہِ طور پر جمالِ الٰہی دیکھنے کی آرزو کی تھی۔

شاعر پوچھتا ہے کہ اسے شمع! پروانہ تجھ سے پیار کیوں کرتا ہے؟ یہ تڑپنے والی جان تجھ پر کس وجہ سے قربان ہوئی جاتی ہے؟

تیری ادا دیکھ کر یہ پارے کی طرح تڑپنے لگتا ہے۔ تُو نے اسے عشق کے کیا طور طریقے سکھا دیے ہیں؟
جہاں تیرا جلوہ ہو، وہاں یہ بار بار گھومنے اور چکر کھانے لگتا ہے۔ کیا یہ تیری نظر کی بجلی کا جلایا ہوا ہے؟
بے قرار ہو کر بار بار گرنا اس کے لیے موت کا سامان ہے کیا اس کی جان کو موت کا دکھ سہہ سہہ کر ہی آرام ملتا ہے؟
کیا تیری لَو میں اسے وہ زندگی نظر آتی ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتی؟
دنیا غم کا گھر ہے۔ یہاں اگر تیری روشنی نہ ہو تو اس دل جلے کی آرزو کا پودا کبھی ہرا بھرا نہ ہو یعنی اس کی آرزو کبھی پوری نہ ہونے پائے۔

ہر وجود کے لیے ایک نماز ہے۔ پروانے کی نماز یہ ہے کہ تیرے سامنے جل کر گر جائے۔ اگرچہ اس کے پہلو میں ننّھا سا دل ہے۔ تاہم اس میں جلنے اور پگھلنے کی لذّت موجود ہے۔
معلوم ہوتا ہے، اس میں وہی جوشش ہے جو حضرت موسیٰؑ کے دل میں لہریں لے رہا تھا۔ شاعر شمع کو مخاطب کرتا ہوا کہتا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا طُور ہے اور پروانہ اس طُور کا ذرا سا کلیم ہے۔
یہ بات کتنی عجیب ہے کہ پروانے کو روشنی کے دیدار کا ایسا شوق ہے۔ یہ ذرا سا کیڑا اور اس کا دل روشنی کی آرزو سے بھرا ہوا ہے۔

عقل و دل

تمہیدی نوٹ: یہ نظم مئی ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی اور اس کا عنوان تھا "خطِ منظوم" (پیغامِ بیعت کے جواب میں) اس کے دو بند تھے۔ پہلا بیس شعر اور دوسرا اکیّس شعر کا۔ نظرِ ثانی میں پہلا بند بالکل حذف کر دیا گیا اور دوسرے بند کے اکیس شعروں میں سے صرف تیرہ باقی رکھے گئے اور ان کا عنوان "عقل و دل" تجویز کیا گیا۔

رسا: پہنچی ہوئی۔ **خجستہ پا:** مُبارک قدموں والا۔ **مُفسّر:** تفسیر کرنے والی۔ مطلب کو کھول کر بیان کرنے والی۔ **مَظہر:** ظاہر کرنے والی۔ **بے بہا:** ان مول **مظاہر:** مظہر کی جمع۔ وہ چیزیں جو ظاہر دکھائی دیتی ہیں۔ **باطن:** ہر شے کی حقیقت۔ چھپی ہوئی چیزیں۔
معرفت: خدا کی پہچان۔ **خدا جُو:** خدا کو ڈھونڈھنے والی۔ **خدا نما:** خدا کو دکھانے والا۔

صداقت: سچائی۔ **زمان و مکاں:** وقت اور جگہ (Time and space) اس سے مراد ہے مادّی دنیا۔ **رشتہ بپا:** پاؤں میں دھاگا بندھا ہوا یعنی قیدی۔ اسیر۔ **طائر:** پرندہ **سدرہ:** عربی میں بیری کو کہتے ہیں۔ یہاں مراد وہ مقام ہے جس کا ذکر سورۂ نجم میں آیا ہے یہ سات آسمانوں سے اوپر ایک حد ہے، جس سے آگے کوئی بھی جا نہیں سکتا، لہٰذا اسے سدرۃ المنتہٰی (وہ مقام جو آخری حد ہے) کہا گیا۔ سدرہ آشنا سے مراد ہے وہ خوش نصیب پرندہ جو سدرہ سے واقف ہو یعنی وہاں تک پہنچ چکا ہو۔

ایک دن عقل نے دل سے کہا کہ میں ہر بھولے بھٹکے کو راستہ دکھاتی ہوں۔ اگرچہ زمین پر رہتی ہوں لیکن آسمان پر بھی آتی جاتی ہوں۔ دیکھ میں کتنی دور پہنچی ہوئی ہوں۔ یعنی میری رسائی کہاں تک ہے۔ دنیا میں میرا کام یہ ہے کہ لوگوں کو راستہ دکھاتی رہوں۔ میں حضرت خضرؑ کی طرح مبارک قدم والی ہوں، مطلب یہ کہ حضرت خضرؑ جس طرح سمندروں اور بیابانوں میں لوگوں کو راستہ دکھاتے رہتے ہیں، اسی طرح میں بھی رہبری کرتی ہوں۔ میں دُنیا کی کتاب کو کھول کر بیان کرنے والی ہوں یعنی زندگی کے بھید بتاتی ہوں اور خدا کی شان کو دنیا پر ظاہر کرنے والی ہوں۔ اسے دل! تو صرف لہو کی ایک بُوند ہے۔ میں اس لعل سے بہت بڑھ چڑھ کر ہوں جو انمول ہو۔

دل یہ سُن کر بولا کہ اسے عقل! تو نے جو کچھ کہا، وہ سچ ہے، لیکن مجھے بھی تو دیکھ میں کیا چیز ہوں؟ تو تو زندگی کے بھیدوں کو صرف سمجھتی ہے میں ان بھیدوں کو آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ تیرا تعلق صرف چیزوں کے ظاہر سے ہے لیکن میں ان کے باطن سے بھی واقف ہوں۔ تجھ سے دنیا کو صرف علم حاصل ہوتا ہے، مجھ سے وہ معرفت سیکھتی ہے۔ تو خدا کو ڈھونڈتی ہے، میں خدا کو دکھاتا ہوں۔ علم اپنی آخری منزل پر پہنچ کر بے چینی اور بے اطمینانی کا سامان بن جاتا ہے۔ یہ ایک بیماری ہے، جس کی دوا میں ہوں۔ تو سچائی کی محفل کی شمع ہے، میں حُسن کی بزم کا چراغ ہوں۔ تو زمان اور مکان کی قیدی ہے۔ اور اس دنیا کی فضا سے اُوپر نہیں اڑ سکتی۔ میں وہ پرندہ ہوں جو سات آسمانوں تک آتا جاتا ہے۔ دیکھ! میرا مقام کتنا اونچا ہے؟ سمجھنا چاہیئے کہ میں جلال والے خدا کا عرش ہوں۔

صدائے درد!

تمہیدی نوٹ: یہ نظم جون ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی۔ اس کے تیس شعر تھے۔ نظر ثانی میں صرف نو باقی رہے ہیں۔ یہ نظم اس دَور سے تعلق رکھتی ہے، جب ملکی حالات پہلی مرتبہ اقبال کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوئے تھے اور انھوں نے باہمی نفرتوں کا ماتم کیا۔ یہی افکار و احساسات انھوں نے اپنی مشہور نظم "تصویرِ درد" میں بھی پیش کیے تھے، جو انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھی گئی تھی، اور جس کا خاصا بڑا حصہ انھوں نے "بانگِ درا" میں محفوظ رکھا۔ پوری نظم میں اقبال نے ان تمام نزاعات کی مذمت کی ہے، جن سے ہندوستانیوں کے مختلف طبقوں میں تفرقے کو تقویت پہنچتی تھی۔ یہ پس منظر پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس نظم کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

پہلا بند

محیطِ آبِ گنگا: محیط کے لفظی معنی گھیر لینے والا۔ احاطہ، گھیرا۔ محیطِ آبِ گنگا سے مراد ہے دریائے گنگا۔ **نفاق انگیز:** نفاق پیدا کرنے والی یعنی ایسی چیز جس کا ظاہر کچھ ہو اور باطن کچھ۔ **قربِ فراق آمیز:** ایسی نزدیکی جس میں جدائی ملی ہوئی ہو۔ یعنی ظاہرا نزدیکی اور اصل میں جدائی۔ **اخوّت:** بھائی چارا۔ اتّحاد۔ **نغمہ پیرائی:** گیت گانا۔ راگ الاپنا۔ **اختلاط:** میل جول۔

دل کی جلن کے باعث میری حالت ایسی ہے جیسے آگ لگی ہوئی ہو اور چین کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اے دریائے گنگا کی لہرو! مجھے ڈبو دو۔ جلن کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے وطن کے ذرّے ذرّے سے نفاق کے چشمے اُبل رہے ہیں، گویا ہر طرف نفاق چھایا ہوا ہے۔ یہاں میل ملاپ کی کیا صورت ہے؟ لوگوں میں جو نزدیکی دکھائی دیتی ہے۔ وہ بھی صرف ظاہری اور اوپری ہے۔ دل ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ سب میں یک رنگی اور اتحاد ہونا چاہیے تھا لیکن یہ کیسا غضب ہے کہ ان میں بیگانگی موجود ہے۔ اگرچہ سب ایک ہی کھلیان کے دانے ہیں تاہم ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں جس باغ کے پھولوں کو بھائی چارے اور اتحاد کی ہوا تک نہ لگی ہو، اس باغ میں گیت گانا اور راگ الاپنا بالکل بے مزہ ہے۔ میں تو اس بات پر مٹا ہوں کہ سب میں دلی نزدیکی پیدا ہو جائے۔ سب کے سب ہزار قالب و یک جان بن جائیں۔ دریا کے کنارے اور لہروں کے میل جول سے دل گھبراتا ہے۔ اس لیے کہ اوّل وہ مجبوری کا میل جول ہوتا ہے۔ لہروں کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ کنارے سے ٹکرائیں۔ دوسرے اس میل جول میں محبت کے بجائے دشمنی کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ لہریں کنارے سے اس لیے ٹکراتی ہیں کہ اسے توڑ دیں اور کنارہ لہروں کے جوش کو روکنے کی غرض سے دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ لہر اور کنارے کے میل جول کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ بالکل عارضی ہوتا ہے۔

یعنی لہر آتی ہے اور کنارے سے ٹکرا کر فوراً پلٹ جاتی ہے۔ گویا موج و ساحل کے میل جول میں تینوں پہلو نا مطلوب ہیں ایک اضطرار کا پہلو، دوسرا تصادم کا پہلو اور تیسرا ہنگامی پہلو، ایسا میل جول کس کام کا؟ اسے کون پسند کر سکتا ہے؟ اُس میل جول کی ضرورت ہے جو محبّت اور ایک رنگی پر مبنی ہو۔

دوسرا بند | دانۂ خرمن نما: وہ دانہ جو کھلیان کا پتا بتائے۔ **شاعرِ معجز بیان**: وہ شاعر جس کا کلام معجزہ معلوم ہو۔ **خود نما**: اپنے آپ کو نمایاں کرنے والا۔ **ذوقِ گویائی**: بولنے کی لذّت۔ بات کہنے کا شوق۔ **آتشِ پیکار**: لڑائی کی آگ۔

جس شاعر کو خدا کی طرف سے اعلیٰ درجے کے شعر کہنے کا ملکہ عطا ہوا ہو، جس کے بیان میں معجزے کا سا رنگ ہو، وہ ایسا دانہ ہوتا ہے جو کھلیان کا پتا دیتا ہے، لیکن جب کھلیان ہی موجود نہ ہو تو بیچارے دانے کا وجود کہاں باقی رہ سکتا ہے؟ جب کوئی آنکھ حُسن کو دیکھنے ہی کی طرف متوجہ نہ ہو تو وہ اپنے آپ کو کس برتے پر نمایاں کرے؟ جب کوئی محفل ہی موجود نہ ہو، تو شمع کے روشن رہنے سے کیا غرض؟ شاعر گرد و پیش کے حالات سے بددل ہو کر کہتا ہے کہ میرے بولنے اور شعر کہنے کی لذّت خاموشی کا رنگ کیوں اختیار نہیں کرتی؟ اور میرا آئینہ آب و تاب سے محروم کیوں نہیں ہو جاتا؟

اس شعر میں شاعر نے ذوقِ گویائی کو اپنے آئینے کا جوہر یعنی آب و تاب قرار دیا ہے۔ اگر یہ خاموشی کی صورت اختیار کر لے تو ظاہر ہے کہ آئینے کی آب و تاب ختم ہو جائے گی۔

دیکھو بات کہنے کی لذّت نے ہماری زبان کیسے ناخوش گوار وقت میں کھولی یعنی ہمیں کس زمانے میں شعر کہنے پر آمادہ کیا۔ جب باغ کو لڑائی اور پھوٹ کی آگ نے جلا کر راکھ بنا دیا۔

آفتاب

ترجمہ گایتری

تمہیدی نوٹ: یہ نظم اگست ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی اور خود اقبال نے اس پر ایک طویل تمہید نثر میں لکھی تھی جس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ یہ رگ وید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہے ——— دعا اعترافِ عبودیت کی صورت

میں ان تاثرات کا اظہار ہوتی ہے جنھوں نے نظامِ عالم کے حیرت ناک مظاہر کے مشاہدے سے اوّل اوّل انسان کے دل پر ہجوم کیا۔

۲۔ یہ دعا چاروں ویدوں میں مشترک ہے۔

۳۔ اس سلسلے میں سر ولیم جونس کو جو تکلیف اور محنت برداشت کرنی پڑی تھی۔ وہ ان لوگوں کو معلوم ہے، جنھوں نے السنۂ شرقیہ کے محققین کی تصانیف دیکھی ہیں۔

۴۔ مغربی زبانوں میں اس دعا کے بہت سے ترجمے کیے گئے ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ زبان سنسکرت کی نحوی پیچیدگیوں کے باعث زمانۂ حال کی زبانوں میں اس کا مفہوم وضاحت سے ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔

۵۔ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اصل سنسکرت "سوتر" استعمال کیا گیا ہے۔ جس کے لیے اُردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث میں نے لفظ "آفتاب" رکھا۔ اس سے مراد وہ آفتاب ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسبِ ضیا کرتا ہے۔

۶۔ اکثر قدیم قوموں نے، نیز صوفیہ نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے:
اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

۷۔ ترجمے کی مشکلات سے ہر شخص واقف ہے لیکن اس خاص صورت میں یہ دقّت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ گایتری کے مصنّف نے ٹینی سن کی طرح اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں، جن میں حروفِ علّت اور حروفِ صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک لطیف موسیقی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے غیر زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں۔ اس مجبوری کی وجہ سے میں نے اپنے ترجمے کی بنیاد اس سوکت (گفتارِ زیبا) پر رکھی ہے جسے سر یا نرائن اپنیشد میں گایتری مذکور کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے۔

شیرازہ بند: شیرازہ اس دھاگے کو کہتے ہیں جو کتاب کے ورقوں اور جزوں کو اکٹھا کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ شیرازہ بند سے مراد ہے باندھنے والا۔ جوڑنے والا۔ وجود و عدم: ہونا اور نہ ہونا ہستی اور نیستی۔ ثبات: قیام۔ سامان طراز: آراستہ کرنے والا۔ یزدان: اقبال نے خود اس نظم حاشیے پر لکھا ہے کہ یزدان کو قدیم حکمائے ایران اصل نور تصور کرتے ہیں۔ اس لیے خالق کی جگہ یہ لفظ استعمال کیا گیا۔ ("مخزن" بابت اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۴۳) زائیدگانِ نور: اقبال نے خود اس کے معنی دیوتا لکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: دیوتا کے معنی زائیدۂ نور کے ہیں۔ یعنی ایسی ہستی جس کی پیدائش نور سے ہوئی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو عام مخلوقات کی طرح دیوتاؤں کو بھی مخلوق تصور کرتے تھے۔ ان کا

مفہوم یہی ہوگا جسے ہم لفظ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ پس ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گردانا میرے نزدیک صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ ("مخزن" بابت اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۴۳)

اے کائنات کو زندگی بخشنے والے نورِ مطلق! تو دنیا کی جان ہے اور تیری برکت سے کون و مکان کے دفتر کا شیرازہ بندھا ہوا ہے یعنی تیری وجہ سے یہ دنیا قائم ہے اور تیری ہی وجہ سے اس کا کاروبار ایک خاص نظام کے مطابق باقاعدہ جاری ہے، وجود اور عدم صرف تیری وجہ سے ظاہر ہوئے۔ زندگی کا باغ تیرے ہی دم سے سرسبز اور شاداب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں وجود اور عدم، فنا اور بقا ہونے اور نہ ہونے کا پتا صرف تیری وجہ سے چلا اور تیرے ہی دم سے زندگی کا سلسلہ جاری ہے۔

اس دنیا میں جو کچھ ہے وہ عنصروں کے میل جول سے بنا ہے۔ اے نورِ مطلق! یہ نظارہ تُو نے ہی پیدا کیا اور تُو ہی اسے چلا رہا ہے۔ ہر چیز نے تجھی سے زندگی کی طلب اور تڑپ پائی ہے۔

ہر چیز تیرے ہی جلوے سے زندہ اور قائم ہے۔ تیرے ہی بخشے ہوئے سوز و ساز کا دوسرا نام زندگی ہے۔

جس نورِ مطلق کو میں آفتاب کہتا ہوں، اس سے وہ آفتاب مراد نہیں جو صبح کو طلوع ہو کر شام کو غروب ہو جاتا ہے، اور اس دنیا کو روشن کرتا ہے، میری مراد اس آفتاب سے ہے جس سے زمانے میں نور ہے اور جس سے انسان کو احساس کے لیے دل ملا۔ سوچ سمجھ اور نیک و بد کی تمیز کے لیے عقل ملی، جس سے اسے رُوحِ رواں عطا ہوئی اور جس سے شعور کی دولت میسّر آئی۔

دعا کرنے والا اس نورِ مطلق اور اس آفتاب کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ہمیں بھی شعور کی روشنی دے اور عقل کی آنکھ کو اپنے جلوے سے نورانی کر۔

اے آفتاب! تو ہی زندگی کی محفل کے لیے سجاوٹ کا باعث ہے۔ پست و بلند میں جو کچھ ہے اس کا خالق تو ہے۔ (اوپر بتایا جا چکا ہے کہ اقبال کے ارشاد کے مطابق ایرانی حکما یزدان کو اصل نور سمجھتے تھے۔ اس لیے شعر میں یہ لفظ خالق کی جگہ استعمال کیا گیا۔)

ہر جان دار ہستی میں تیرے پیدا کرنے اور بنانے کا کمال ظاہر ہے۔ پہاڑوں کے سلسلے میں بھی تیرا ہی جلوہ نظر آتا ہے ہر چیز کی زندگی کا پالنے والا تُو ہے اور جو نوری مخلوق ہے یعنی دیوتا، تو ہی ان سب کا سُلطان ہے۔

نہ تیری کوئی ابتدا ہے نہ تیری کوئی انتہا ہے۔ نہ کسی کو یہ پتا ہے کہ تو کب سے ہے۔ نہ کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ تو کب تک رہے گا۔ تیری روشنی اوّل و آخر اور آغاز و انجام کی قید سے آزاد ہے۔

شمع

تمہیدی: یہ نظم دسمبر ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی۔ اس کے چالیس شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں گیارہ حذف کر دیے گئے اور انتیس باقی رہے۔ بعض میں جزوی ترمیمیں بھی ہوئیں۔

نظم شایع کرتے وقت مدیر نے ایک طویل تمہیدی نوٹ لکھا تھا جس میں بتایا تھا کہ متعدد اصحاب نے اقبال کی مشکل پسندی کی شکایت کی۔ مدیرِ "مخزن" نے یہ شکایت اقبال تک پہنچا دی۔ انھوں نے جواب دیا "جہاں خیالات دقیق اور مشکل ہوں گے۔ وہاں زبان کا آسان ہونا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ اسی بنا پر اقبال غالب کی دشوار پسندی کو نہ صرف معذوری بلکہ ضرورت قرار دیتے ہیں اور یہی بربان اپنے مرغوب انداز کے حق میں رکھتے ہیں۔" ("مخزن" بابت دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۷۵)

پہلا بند **فریاد در گرہ:** جس کی گرہ میں فریاد ہو یعنی فریادی۔ **سپند:** ہرمل۔ چھوٹے چھوٹے کالے دانے ہوتے ہیں جو بری نظر کا اثر دور کرنے کے لیے جلائے جاتے ہیں۔ ان دانوں ہی کی وجہ سے شاعر نے "فریاد در گرہ" کی ترکیب استعمال کی جو نہایت موزوں ہے۔ **سوزِ دروں:** دل کی جلن۔ **گل فروش:** پھول بیچنے والا۔ پھلیرا۔ **اشکِ شفق گوں:** شفق جیسے سرخ آنسو یعنی خون کے آنسو۔ **ہم کنار:** بغل گیر۔

اے شمع! میں بھی دنیا کی محفل میں تیری طرح دکھی ہوں اور حرمل کے دانوں کی طرح میری گرہ میں بھی آہ و فغاں ہے۔ حرمل کے دانے آگ پر پڑتے ہی تڑتڑ جاتے ہیں تو ان سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ شاعر نے اس آواز کو حرمل کی فریاد قرار دیا اور کہا کہ میں بھی اسی طرح فریادی ہوں۔ عشق نے تجھے سوزِ دل کی تپش عطا کی اور خون کے آنسو بہانا میرا کام ٹھہرایا۔ گویا میں سرخ رنگ کے پھول بیچ رہا ہوں۔ اے شمع! تو عیش و عشرت کی محفل کو روشن کر رہی ہو یا کسی قبر پر جل رہی ہو، دونوں حالتوں میں تو غم کے آنسوؤں سے بغل گیر رہتی ہے یعنی غم کے آنسو بہاتی رہتی ہے۔

واضح رہے کہ یہاں شمع سے دیا مراد نہیں بلکہ موم بتی مراد ہے جو جلتی ہے تو موم پگھل پگھل کر قطروں کی شکل میں نیچے بہتا رہتا ہے۔ ان قطروں کو شاعر نے غم کے آنسو قرار دیا۔

دوسرا بند **یک بیں:** ایک دیکھنے والی یعنی وہ چیز جس کی نظر نیک و بد، پست و بلند اور من و تُو کے امتیاز سے آزاد ہو۔ **مایۂ آشوبِ امتیاز:** فرق و تمیز کے فساد

کاسرمایہ یعنی وہ نظر جو تمام چیزوں کو الگ الگ دیکھنے کی خرابیوں میں الجھی ہوئی ہو ــــ آنکھ آنے کو آشوبِ چشم کہتے ہیں۔ یہ آنکھ کی خرابی کی دلیل ہوتی ہے۔ شاعر نے اپنی نگاہ کے لیے آشوب کا جو لفظ استعمال کیا۔ یہ بہت موزوں ہے اس لیے کہ نگاہ کی خرابی کی دلیل ہے۔

اے شمع! تیری نظر خدا کے عاشقوں کی طرح ہر چیز کو ایک ہی رنگ میں دیکھتی ہے۔ میری نگاہ فرق و تمیز کے بکھیڑوں میں الجھی ہوئی ہے۔ تیری روشنی کعبے اور بت خانے میں یکساں ہوتی ہے اور اس میں ذرا فرق نہیں آتا۔ میں دیر و حرم کے امتیاز میں پھنسا ہوا ہوں یعنی یک بینی کے جوہر سے محروم ہوں۔ تجھ سے جو سیاہ دھواں اٹھتا ہے، اس میں آہ کی شان نظر آتی ہے۔ آہ وہی کرتا ہے جس کے پہلو میں دل ہو۔ کیا تیری جلوہ گاہ میں بھی کوئی دل چھپا ہوا ہے؟

تیسرا بند اے شمع! تو اس لیے جل رہی ہے کہ خدائی جلوے کی بجلی سے جدا ہے۔ جن لوگوں کا دل درد سے خالی ہے، وہ تیرے اس جلنے کو روشنی سمجھتے ہیں۔ تو جلتی ہے اور تجھے اس جلنے کی کچھ خبر نہیں۔ تیری آنکھیں تو ہیں اور تو سب کچھ دیکھتی ہے، لیکن اپنے دل کی جلن سے واقف نہیں۔ میں بے چینی اور بے قراری کے جوش سے پارے کی طرح تڑپ رہا ہوں اور اپنے بے قرار دل کی بیتابی سے آگاہ بھی ہوں۔ یہ بھی کسی بے نیاز کی ایک ادا تھی کہ مجھے اپنے گداز کا احساس دے دیا۔

پہلے بند میں شاعر نے سوز و گداز کی رعایت سے اپنے آپ کو شمع سے مشابہ قرار دیا تھا۔ دوسرے بند میں یہ بتایا کہ شمع عاشقانِ راز کی طرح امتیاز سے پاک ہوتی ہے۔ اور میں امتیاز میں پھنسا ہوا ہوں۔ تیسرے بند میں یہ حقیقت واضح کی کہ شمع جلتی ہے، آنکھیں رکھتی ہے، مگر اپنے دل کی جلن سے آگاہ نہیں اور میں تڑپتا بھی ہوں اور اس تڑپ کا احساس بھی مجھ میں ہے۔

چوتھا بند **آگہی:** واقفیت۔ احساس۔ **آتش کدے:** وہ مقام جہاں رات دن آگ جلتی رہتی ہے۔ آگ کو پوجنے والوں کے عبادت خانے۔ **رفعت:** بلندی۔ **کشاکش:** کھینچ تان۔ **من و تو:** لفظی معنی مَیں اور تُو۔ اس سے مراد وہ فرق و امتیاز ہے جو مختلف وجودوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔

یہی احساس اور یہی آگاہی ہے جو مجھے بے چین رکھتی ہے۔ یہی چنگاری ہے جس میں ہزاروں آتش کدے سوئے ہوئے ہیں۔ یعنی آگاہی اور احساس ہی سے امتیاز کی دنیائیں پیدا ہو گئی ہیں۔ مثلاً پستی اور بلندی کا امتیاز اسی آگاہی کا نتیجہ ہے۔ یہی آگاہی ہے جس نے پھول کی رُوح کو خوشبو اور شراب کی رُوح کو مستی کا نام دے دیا۔ یہ باغ، یہ بلبل، یہ پھول، یہ خوشبو غرض ہر شے آگاہی سے پیدا ہوئی۔ من و تو کی کھینچ تان کا اصل سبب یہی آگاہی ہے۔

شاعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر مجھے احساس عطا نہ ہوتا اور اگر آگاہی نہ دی جاتی تو میں بھی شمع کی طرح یک بیں رہتا، لیکن اس آگاہی نے میرے لیے امتیاز کے ہزاروں سامان پیدا کر دیے اور میں وجود کی وحدت و یگانگی سے دُور جا پڑا۔

پانچواں بند **دلستانِ عشق**: عشق کا دل لینے والا۔ **آوازِ کُن**: کُن کے لغوی معنی ہیں ہو جا۔ یہی لفظ ہے جو خدائے بزرگ کی زبان پر جاری ہوا اور ساری کائنات وجود میں آ گئی۔ آوازِ کُن سے یہی آواز مراد ہے۔ **تپش آموز**: تڑپ سکھانے والی۔ **گلشنِ کُن**: وہ باغ جو کُن کہنے سے پیدا ہوا یعنی کائنات۔ **حجابِ وجود**: وجود کا پردہ۔ تصوّف میں وحدت الوجود کے مطابق ساری کائنات اور اس کا ہر وجود وجودِ مطلق یعنی باری تعالیٰ سے پیدا ہوا۔ حجابِ وجود سے مراد یہ ہے کہ ہر ہستی کا وجود ہی اس کے اور خدا کے درمیان پردہ بن کر حائل ہو گیا۔ یہ پردہ اٹھ جائے تو ہر شے اپنی اصل سے مل جائے۔

ازل کی صبح کو اس کائنات کی آفرینش کے وقت حُسنِ مطلق (حُسنِ ذات باری تعالیٰ) نے جب عشق کا دل چھینا اور کُن کی آواز سے عشق کی جان میں تڑپ کی لہر پیدا ہوئی تو عشق کو حکم ہوا کہ جا اور کُن کے کہنے سے جو باغ پیدا کیا ہے اس کی بہار دیکھ۔ ایک آنکھ سے ہزاروں پریشان خواب دیکھ۔ میں اپنے وجود کے پردے کے متعلق کیا بتاؤں؟ صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ جس صبح کو میں پیدا ہوا وہی صبح میرے لیے جدائی کی شام بن گئی۔ اب وہ وقت نہیں رہا جب میں آزاد تھا اور وجود کی قید سے مجھے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس وقت میرا گھونسلا طُور کے درخت کی زینت بنا ہوا تھا یعنی مجھ میں اور تجلّیٔ مطلق میں دوری نہ تھی۔ اب تو میں وجود کا قیدی ہوں اور جس پنجرے میں بند ہوں اسی کو چمن سمجھ رہا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے وجود سے اور دنیا سے ویسا ہی گہرا تعلق پیدا کر لیا ہے جیسا پرندے کو چمن سے ہوتا ہے۔ یہ دنیا میرے لیے غریبی اور بے وطنی کا غم خانہ تھی لیکن میں نے اسے وطن سمجھ لیا۔ اب اسی وطن کی یاد میرے لیے بے وجہ اداسی کا موجب بنی ہوئی ہے۔ کبھی وہ نظر کا شوق بن جاتی ہے اور کبھی جستجو کا ذوق۔

یہ پورا بند وجود کی اس تشریح پر مبنی ہے جو اہلِ تصوف کے ہاں عام ہے یعنی انسان نورِ مطلق کا جز و تھا۔ اس نے الگ وجود قبول کیا تو اصل سے علیحدہ ہو گیا۔ یہ زندگی اس کے لیے بے وطنی ہے، لیکن وہ بے خبری سے اسے وطن سمجھ رہا ہے۔

چھٹا بند **انتہائے فریبِ خیال**: خیال کے دھوکے کی آخری حد۔ **مسجود**: وہ جسے سجدہ کیا جائے۔ **ساکنانِ فلک**: قدسی۔ فرشتے۔ مسجودِ ساکنانِ فلک سے مُراد ہے

آدمؑ جیسے فرشتوں نے سجدہ کیا تھا۔ **مآل**: انجام۔ **آہنگ**: ارادہ۔ آدا نہ۔ **ناظمِ کون ومکاں**: کائنات کا انتظام کرنے والا یعنی خدا۔ **چشمِ غلط نگر**: وہ آنکھ جسے صحیح چیز نظر نہ آئے۔ **ذوقِ شعور**: آگاہی کا شوق۔ **طوقِ گلو**: گردن کا حلقہ۔ **حُسنِ تماشا پسند**: وہ حُسن جس نے نظارہ بازی کے شوق میں اور اپنی شان کے اظہار کی خاطر یہ کائنات پیدا کی۔ **گم کردہ راہ**: جو راستہ بھول گیا ہو۔ **اسیرِ فریبِ نگاہ**: نظر کے دھوکے کا قیدی۔ **رازِ کہن**: پُرانا بھید یہ اشارہ ہے حسین ابن منصور کے قصے کی طرف جیسا کہ اگلے مصرع سے ظاہر ہوتا ہے۔ **قصۂ دار و رسن**: لفظی معنی پھانسی یا سُولی اور رسّے کا قصّہ یعنی حسین ابن منصور حلّاج کا قصّہ جسے عام روایت کے مطابق **انا الحق** (میں خدا ہوں) کہنے کے باعث سولی پر چڑھا دیا گیا تھا۔

اے شمع! میری حالت دیکھ! میں اپنے خیالات کے دھوکے کی آخری منزل میں پہنچا ہوا ہوں۔ کسی زمانے میں مجھے یہ بلند مقام حاصل تھا کہ آسمان کے رہنے والے یعنی قدّوسی اور فرشتے مجھے سجدہ کرتے تھے۔ اب میرا انجام کس قدر دردناک ہے۔ میں جدائی کا مضمون ہوں یعنی ہجر کا مارا ہوا ہوں، لیکن میرا رُتبہ ثریّا کے برابر ہے۔ میں اس کائنات کا انتظام کرنے والے خدا کے ذہن کا ارادہ ہوں۔ پہلے شعر کے نفسِ مضمون کی مناسبت سے کہتے ہیں کہ جب خدا نے مجھے مرتّب کر لیا یعنی بنا لیا تو چاہا کہ میری نمایش کرے۔ ساتھ ہی مجھے زندگی کے دیوانِ شعر میں سب سے پہلے لکھ دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو خدا نے اشرف المخلوقات بنایا اور کائنات میں سب سے اونچا درجہ دیا۔ اگرچہ میں گوہر ہوں، لیکن مجھے زمین کی خاک ہی میں رہنا پسند ہے۔ شعر کی اصطلاحات میں یوں کہ سکتے ہیں کہ میری بندش اگرچہ چُست نہیں لیکن مضمون بہت اونچا ہے۔ اس شعر میں خاک کو بندش کی سستی اور گوہر کو مضمون کی بلندی سے تعبیر کیا ہے۔ دنیا آگاہی کے شوق کی تجلّی کا ظہور ہے جو آنکھ کسی چیز کو صحیح نہیں دیکھ سکتی وہ اس حقیقت کو نہیں پا سکتی۔ قصور اس کا ہے۔ حقیقت کا کوئی قصور نہیں۔ زمان ومکان کا سلسلہ ایک کمند کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ حسن کی گردن میں طوق کی طرح پڑا ہوا ہے جس نے نظارہ بازی کے شوق میں یہ کائنات پیدا کی اور اسے اپنی تماشا پسندی کے لیے آئینہ بنایا۔ مجھے اپنی منزل کا شوق ہے اور میں راستہ بھول چکا ہوں۔ اے شمع! میں نظر کے دھوکے میں قید ہوں۔ اگر اس دھوکے میں مبتلا نہ ہوتا تو حقیقتِ حال پا لیتا۔ وہ حقیقت کیا ہے؟ یہ کہ ہر وجود کی اصل ایک ہے۔ شکاری بھی وہی ہے، ظلم کے جال کا حلقہ بھی وہی ہے، کعبے کی چھت بھی وہی اور اس چھت کا پرندہ بھی وہی ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آیا میں حُسن ہوں یا وہ عشق ہوں جو سر سے پاؤں تک گداز ہی گداز ہو۔ پتا نہیں چلتا کہ میں ناز ہوں یا نیاز۔ حسن کے لیے ناز اور عشق کے لیے نیاز کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، لیکن یہ پرانا بھید ہے، اسے لب پر آنا چاہیے ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں حسین ابن منصور کی طرح سولی اور رسّے کا قصہ تازہ نہ ہو جائے یعنی یہ بھید اگر میری زبان پر نہ آجائے جو حسین ابن

منصور کے لیے سُولی کی سزا کا باعث بنا تھا۔

ایک آرزو

تمہیدی: یہ نظم دسمبر ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی اور اس کے تیس شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں صرف بیس باقی رکھے۔ آخری بند پُورا حذف کر دیا۔ بعض اور شعر بھی قلم زد کر دیے۔ اس کا انداز بالکل نیا ہے اور قدرتی مناظر کی تصویر نہایت سادہ الفاظ میں بڑے ہی دلکش طریق سے کھینچی ہے۔

عزلت: تنہائی۔ گوشہ نشینی۔ **جلوت:** لفظی معنی ظاہر ہونا یعنی سب کے سامنے منظرِ عام پر رہنا **خلوت:** جلوت کے برعکس یعنی تنہائی۔ گوشہ نشینی۔ **مانوس:** جان پہچان رکھنے والی۔ **سحر نما:** صبح دکھلانے والا یعنی صبح کا پتا دینے والا۔

اے خدا! میں دنیا کی محفلوں کے ہنگاموں سے اُکتا گیا ہوں۔ جب دل ہی بُجھ گیا ہو تو جمگھٹے میں بیٹھنے کا کیا مزہ ہے؟ میں شور و غل سے بھاگتا ہوں۔ میرا دل ایسی خاموشی ڈھونڈتا ہے جس پر گفتگو قربان ہو یعنی ایسا سکوت جس کی لذّت بات چیت میں نہ پائی جاتی ہے۔

میں خاموشی پر جان دیتا ہوں۔ میری آرزو یہ ہے کہ پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا مجھے مل جائے۔ فکر سے آزاد ہو جاؤں۔ تنہائی میں بیٹھ کر دن گزاروں۔ دنیا کے غم کا کانٹا دل سے نکل چکا ہو۔

چڑیاں چہچہائیں تو اس میں مجھے گانے کی لذّت ملے۔ پہاڑوں کے چشمے کا شور میرے لیے باجے کا کام دے۔ پھول کی کلی چٹکے تو میں سمجھوں کہ میرے محبوب کا پیغام آگیا۔ یہ چھوٹا سا پیالہ میرے لیے جامِ جہاں نما بن جائے۔ اس شعر میں پھول کو ساغر سے تشبیہ دی ہے۔

جھونپڑے میں میرے لیے سبزے کا بستر ہو اور ہاتھ کا سرہانا۔ اس تنہائی میں وہ رنگ اور وہ شان پیدا ہو جائے جس کے مقابلے میں مجمع کے اندر بیٹھنا بھی بے حقیقت معلوم ہو۔

پرندے انسان سے دُور بھاگتے ہیں لیکن بلبل میری صورت کو اس طرح جان پہچان جائے کہ اُسے دُور بھاگنے کا خیال تک نہ آئے اور اس کے ننھے سے دل میں میری طرف سے کوئی کھٹکا نہ رہے۔

میرے جھونپڑے کے سامنے دونوں طرف ہرے بھرے بوٹے صفیں باندھے کھڑے ہوں۔ بیچ میں ندی بہ رہی ہو اور بوٹوں کا عکس ندی کے پانی میں پڑ رہا ہو۔ ایسا معلوم ہو کہ ندی کا پانی بوٹوں کی تصویر لے رہا ہے۔

پہاڑ کا سماں اس قدر دل لبھانے والا ہو کہ ندی کا پانی اسے دیکھنے کے لیے لہر بن کر اُٹھے۔ آخری مصرع میں خوبی یہ ہے کہ لہریں ندی کی سطح سے اوپر اُٹھتی ہیں۔ شاعر نے ان کی اس طبعی حرکت سے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ پہاڑ کا دلکش نظارہ دیکھنے کے لیے بے قرار ہو ہو کر اُٹھ رہی ہیں۔

سبزہ زمین کی گود میں آرام سے سویا ہوا ہو اور اسے پامالی کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔ چشموں کا پانی جھاڑیوں میں پھرتا ہوا چمک رہا ہو۔ اس شعر میں شاعر نے منظر کشی کا جو کمال دکھایا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو پہاڑ یا اس کے دامن میں کسی تنہائی کی جگہ کچھ مدت گزاریں۔

پھول کی ٹہنی جھک جھک کر پانی کو اس طرح چھو رہی ہو، جیسے کسی حسین نے آئینہ سامنے رکھ لیا ہو اور اُسے دیکھ رہا ہو۔

سُورج ڈوبنے لگتا ہے تو افق پر شفق ظاہر ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے پہاڑوں کی ہر چیز پر سُرخی مائل سنہرا رنگ پھر جاتا ہے۔ شاعر نے اس سے یہ مضمون پیدا کیا کہ سورج شام کی دلھن کو جب مہندی لگاتا ہے تو ہر پھول کا دامن سُرخی مائل سنہرا ہو جاتا ہے۔

جو لوگ رات کے وقت چلتے ہیں، وہ جب تھک کر چُور ہو جائیں تو میرا اُوٹا ہوا دیا ان کے لیے آرام کا سہارا بن جائے۔

جب آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہوں تو بجلی کی چمک سے ان تھکے ہوئے مسافروں کو میری کُٹیا نظر آجائے اور وہ اس میں آرام کر لیں۔

رات کے پچھلے پہر کویل بولتی ہے۔ شاعر اسے صبح کی مؤذن (بانگ دینے والی) قرار دیتا ہے۔ میں اس کے ساتھ مل کر گاؤں اور وہ میرے ساتھ مل کر گائے۔

صبح کے وقت بُت خانے میں گھنٹے بجتے ہیں۔ کعبے سے اذان کی صدا بلند ہوتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں صبح ہونے کا اعلان کرتی ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میں بُت خانے اور کعبے کے اس سر و سامان کا احسان اپنے کانوں پر نہیں لینا چاہتا۔ میں اپنی جھونپڑی کے سوراخ ہی کو صبح کا پتا دینے کے لیے کافی سمجھتا ہوں۔

صبح کے وقت شبنم پھولوں پر گرتی ہے۔ شاعر سمجھتا ہے کہ شبنم پھولوں کو وضو کراتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شبنم جب اپنا کام شروع کرے تو میں رونا شروع کر دوں۔ میرا رونا ہی میرا وضو ہو اور نالہ میری دعا بن جائے۔

خاموشی کے اس عالم میں میرے نالے اتنی اونچے جائیں کہ وہ تاروں کے قافلے کے لیے گھنٹے کی آواز بن جائیں

میرا رونا ہر درد بھرے دل کو رُلا دے اور جو بے ہوش پڑے ہیں شاید انہیں جگانے کے کام آئے۔
نظم کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر دنیا کے تفرقوں سے بہت پریشان ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تنہائی میں جا بیٹھے اور ایسے درد سے روئے کہ لوگ تفرقے چھوڑ کر اتفاق اور اتحاد پر مائل ہو جائیں۔ اسی کو وہ بے ہوشوں کی بیداری سے تعبیر کرتا ہے۔

آفتابِ صبح

تمہیدی نوٹ: یہ نظم بھی اُسی دور سے تعلق رکھتی ہے جب اقبال کے دل و دماغ پر "آفاقیت" غالب تھی۔ وہ انسانی طبقوں کی باہمی کشمکشوں اور گروہ بندیوں سے سخت نالاں تھے اور چاہتے تھے کہ تمام انسان بھائیوں کی طرح مل جل کر رہیں۔ اور ان میں زیادہ سے زیادہ ہمدردی کا جذبہ موج زن ہو۔ اس عہد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اقبال جب انسان کا مقابلہ قدرت کے دوسرے مظاہر سے کرتے تھے تو سب سے بڑھ کر اس امر پر زور دیتے تھے کہ ان مظاہر میں حقیقی وظائف کا احساس موجود نہیں اور انسان میں احساس ہے۔ اسی کو وہ انسان کی اشرفیت کا ثبوت قرار دیتے تھے۔

پہلا بند **دُرِ گوش:** لفظی معنی کان کا موتی۔ اس سے مقصود وہ زیور ہے جو کان میں پہنا جاتا ہے۔ یعنی آویزہ۔ **سیمائے افق:** افق کی پیشانی۔ افق سے فضا کا وہ کنارہ مراد ہے، جہاں زمین اور آسمان ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ **مدادِ شب:** رات کی سیاہی یعنی اندھیرا۔ **نقشِ باطل:** وہ نشان جو غلط ہونے کے باعث مٹا دیا جاتا ہے۔ **کوکب:** ستارہ۔

انسان کے میخانے میں جو شور و غل ہے، اسے آفتاب! تو اس سے بہت اونچا ہے یعنی دنیا کے ہنگاموں سے تجھے کوئی واسطہ نہیں تو وہ پیالہ ہے جس سے آسمان کی محفل سجتی ہے۔ اسے آفتاب! تو وہ گوہر ہے جو صبح کی دُلھن کے کان میں آویزے کا موتی بن کر چمک رہا ہے۔ تو وہ زیور ہے جس پر افق کی پیشانی کو ناز ہے۔ تو طلوع ہوا تو زمانے کے صفحے سے رات کے اندھیرے کا داغ مٹ گیا۔ آسمان پر جو تارے چمک رہے تھے وہ نقشِ باطل کی طرح ختم ہو گئے۔

دوسرا بند **معمور:** بھرا ہوا۔ بھرپور۔

جب تیرا حسن آسمان کی چھت سے جلوہ دکھاتا ہے تو آنکھ سے نیند کی شراب کا اثر ایک دم اڑ جاتا ہے یعنی نیند باقی نہیں رہتی۔ نظر کا دامن نور سے بھر جاتا ہے لیکن اے آفتاب! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تیری روشنی ظاہر کی آنکھ کو ضرور کھول دیتی ہے تاہم

تیری آنکھیں جس نظارے کو ڈھونڈتی ہیں اس سے تو محروم ہے۔ مجھے وہ جلوہ درکار ہے جس سے باطن کی آنکھ کھل جائے۔

تیسرا بند **سرشکِ آباد**: آنسوؤں کا گھر۔ **امتیازِ ملّت و آئین**: قوم اور شرع کا فرق جس کی وجہ سے انسانوں کے مختلف گروہ بن گئے۔

اس دنیا میں آزادی کا شوق پورا نہ ہوا اور ہم زندگی بھر مختلف تعلقات اور رشتوں کی زنجیروں میں جکڑے رہے۔ اے آفتاب! تیری نظروں میں بلند و پست ایک ہیں یعنی اونچ نیچ کی کوئی تمیز نہیں۔ مجھے بھی اسی طرح دیکھنے والی آنکھ کی آرزو ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری آنکھ دوسروں کے غم میں آنسوؤں کا گھر بن جائے یعنی میں دوسروں کے رنج پر روتا رہوں اور یہ جو ملّت اور شرع کے فرق یہاں پیدا کر لیے گئے ہیں۔ ان سے میرا دل بالکل پاک ہو جائے۔

چوتھا بند **بستۂ رنگِ خصوصیت**: خصوصیت کے رنگ میں بندھی ہوئی۔ مراد یہ ہے کہ انسان نے مختلف تعلقات کی بنا پر جو خاص گروہ بندیاں کر لی ہیں اور اپنی ہمدردی انھیں گروہ بندیوں سے وابستہ کر رکھی ہے ان سے میں الگ رہوں۔ **رازِ نظمِ قدرت**: قدرت کے انتظام کا بھید۔ **اضداد**: جمع ہے ضد کی یعنی ایک دوسری کے برعکس چیزیں۔ **عقدہ**: گتھی۔ **کاوش**: کھودنا۔ کریدنا۔ کھولنا۔ کھوج۔ **عشق انگیز**: عشق پیدا کرنے والا۔

میں نہیں چاہتا کہ میری زبان خاص خاص گروہ بندیوں سے بندھی رہے۔ میری آرزو یہ ہے کہ تمام انسان میری قوم ہوں اور ساری دنیا کو میں اپنا وطن سمجھوں۔ باطن کی آنکھ پر قدرت کے انتظام کا بھید ظاہر ہو جائے۔ یعنی میں جان لوں کہ کائنات میں ہر شے کی اصل ایک ہے۔ پھر اختلاف اور کشمکش کا کیا مطلب اور انسان کیوں ایک دوسرے سے الگ الگ ہوں؟ میرے خیال کی شمع کا دھواں یعنی میرا خیال دنیا کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھا نہ رہے بلکہ اتنا اونچا اٹھ جائے کہ آسمان کی خبر لائے۔ مطلب یہ ہے کہ گروہ بندیاں خیال کے پست ہونے کی دلیل ہیں۔ بلند خیال انسان ان چیزوں کی پروا نہیں کرتے اور ہمیشہ اصل پر نظر رکھتے ہیں۔ اس دنیا میں ایک دوسری کے برعکس جو چیزیں نظر آ رہی ہیں ان کی گتھی کھولنے اور سلجھانے میں کیوں تڑپتا رہوں؟ میری آرزو تو یہ ہے کہ ہر شے میں وہ حسن دکھائی دے جس سے دل میں عشق و محبت کی آگ بھڑک اٹھے۔

پانچواں بند اگر پھول کی پتّی کو صدمہ پہنچ جائے تو اس سے مجھ پر ایسا اثر پڑے کہ آنکھ سے آنسو بہنے لگیں۔ میرے دل میں سوزِ محبت کی ایسی چنگاری پیدا ہو جائے جس کی روشنی میں حقیقت کا بھید مجھ پر کھل جائے۔ میرا دل، دل نہ رہے، بلکہ قدرت کے محبوب کا آئینہ بن جائے اور میرے سر میں انسان کی ہمدردی کے سوا کوئی سودا نہ ہو۔

چھٹا بند **زحمت کش**: تکلیف اٹھانے والا۔ **نیّرِ اعظم**: آسمان کے چمکنے والوں میں سب سے بڑا یعنی سورج۔ **عالم آرا**: دنیا کو سجانے والا۔ **ہمسر**: ہم پایا۔ برابر۔ **نورِ مسجودِ ملک**: وہ نور جسے

فرشتوں نے سجدہ کیا یعنی انسان۔ **منّت پذیر**: احسان مند۔ محتاج۔ **فردا**: آنے والی کل۔

اے آفتاب! اے آسمان کے سب سے بڑے چمکنے والے وجود! تو اگر دنیا کے ہنگاموں کی تکلیف نہیں اٹھا سکتا اور ان ہنگاموں میں شریک نہیں ہو سکتا تو یہ کوئی برتری کا نشان نہیں۔ تجھے اگر اپنے اس حُسن سے آگاہی نہیں جو جہان کے لیے سجاوٹ کا سامان ہے تو تیری حیثیت انسان کے دروازے کے ایک ذرّۂ خاک کے برابر بھی نہیں۔ دیکھ! جس نور کو فرشتوں نے سجدہ کیا تھا یعنی انسان، وہ نظارے میں محو ہے اور تو اپنے طلوع کے لیے ہر روز آنے والی صبح کا محتاج ہے یعنی تجھے اس محتاجی سے ابھی تک نجات نہیں ملی۔

ساتواں بند **لیلیٰ ذوقِ طلب**: طلب کے شوق کی لیلیٰ یعنی طلب اور جستجو۔ **محمل**: کجاوہ جس کی مناسبت لیلیٰ سے ظاہر ہے۔ **کشود**: کھولنا۔ **عقدۂ مشکل**: وہ گتھی جسے سلجھانا مشکل ہو **لطفِ صد حاصل**: حاصل کے لفظی معنی ہیں جو چیز ہاتھ آئے۔ اس سے مراد وہ سرمایہ یا پیداوار ہے جو انسان محنت سے کمائے۔ مثلاً غلّے کا ذخیرہ یا تجارت سے کمایا ہوا روپیہ وغیرہ۔ لطف صد حاصل کا مطلب ہے ان گنت سرمائے اور ذخیرے پانے کا مزہ۔ **سعیِ بے حاصل**: بے نتیجہ کوشش۔ **دردِ استفہام**: استفہام کے معنی ہیں سوال کرنا۔ ڈھونڈنا۔ معلوم کرنا۔

اے آفتاب! ہمارے یعنی انسانوں کے دل میں حقیقت کے نور کی آرزو ہے۔ اسی کجاوے میں طلب کے شوق کی لیلیٰ کا گھر ہے یعنی طلب ہمارے دل میں رہتی ہے۔ تجھے کیا بتائیں کہ مشکل گتھی کو سلجھانے میں کتنی لذّت ہے۔ اگرچہ وہ گتھی سلجھی نہیں اور ہماری کوشش بے نتیجہ رہی، لیکن ہمیں اس میں وہ مزا ملا جو ان گنت ذخیرے اور سرمائے حاصل کرنے میں ملتا ہے۔ تیرا پہلو اُس درد اور اس تڑپ سے واقف نہیں جو حقیقت کے معلوم کرنے میں حاصل ہوتی ہے تو قدرت کے بھید ڈھونڈنے سے آشنا نہیں ہوا۔

دردِ عشق

تمہیدی نوٹ: اس نظم میں عشق سے مراد وہ پُرخلوص جذبۂ خدمت و ایثار ہے جس کی مثالیں دورِ قدیم میں بہت زیادہ ملتی تھیں لیکن دورِ حاضر میں اس درجہ کم ہو گئیں، گویا ان کا وجود ہی نہ رہا۔ یہ پُرخلوص جذبۂ خدمت و ایثار خواہ قوم و ملک سے متعلق ہو یا دین و مذہب سے یا انسانیت سے، اقبالؔ

اسے صرف اصل قدیم حالت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ واضح رہے کہ اقبال کا مدعا اسی حقیقی جذبۂ عشق کو بیدار کرنا ہے جو زندگی کی نہایت بیش قیمت متاع ہے۔ اگرچہ نظم میں انداز ایسا اختیار کیا گیا ہے گویا کہ دورِ حاضر کے اوضاع و اطوار اس عشق کے لیے ساز گار نہیں۔ تاہم ایک نئے اور نہایت پُرتاثیر انداز میں دعوت اسی کی دی گئی ہے۔

پہلا بند | ظاہر پرست: چیزوں کے ظاہر پر مرنے والی یعنی وہ نگاہ جو حقیقت کو نہ دیکھے اور صرف نمود و نمایش پر مرتی رہے۔ غمّاز: چغلی کھانے والا۔ نشان بتانے والا۔ پتا دینے والا۔ گویا: بولنے والی۔ مکین: رہنے والا۔ مقیم۔

اے دردِ عشق! تو ایک چمکیلا موتی ہے جس کی آب و تاب کا اندازہ ہر آنکھ نہیں کر سکتی جو لوگ تیری حقیقت اور اصلیت سے بے گانے ہیں، ان کے سامنے تجھے ظاہر نہ ہونا چاہیے۔ تیرے جلوے کی جگہ پردے میں چھپی ہوئی ہے اور نئے زمانے کی نگاہ پردے میں چھپی ہوئی چیزوں کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتی۔ وہ تو صرف نمود و نمایش کو دیکھتی ہے اور ظاہر پر مرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن دردمندوں کو انسانیت یا قوم و ملک یا دین و مذہب کی خدمت کا سچّا جذبہ عطا ہوا ہے۔ وہ اس کی نمایش نہیں کرتے اور خدمت کے فرائض چُھپ چُھپا کر انجام دیتے ہیں۔ سچّے عشق کا تقاضا یہی ہے لیکن دورِ حاضر میں اس مخلصانہ خدمت کی کوئی قدر نہیں۔ یہاں تو صرف وہی لوگ آگے بڑھتے ہیں جنھیں نمود و نمایش میں مہارت ہوتی ہے یعنی اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اپنے کارناموں کے افسانے سُناتے رہتے ہیں۔

زندگی کے باغ میں نئی ہوا چلنے لگی۔ اس کے پرانے رنگ ڈھنگ بدل گئے۔ خلوص و نیک نیتی کی کوئی قدر باقی نہ رہی اے دردِ عشق! بتا اب ظاہر ہونے میں کیا مزہ ہے؟ تو ہمیشہ دکھاوے سے بے پروا رہا۔ تو نے کبھی اپنی کسی خدمت کی نمایش نہ کی۔ اب بھی تجھے خود نمائی سے کوئی واسطہ نہ ہونا چاہیے۔ بُلبُل کی فریاد کا احسان نہ اُٹھا۔

مطلب یہ ہے کہ بُلبل پھول کے فراق میں آہ و نالہ کرتی ہے۔ یہ اس کے دردِ عشق کا اظہار ہے۔ اب چونکہ زمانے کا رنگ بدل گیا، اس لیے ایسا اظہار بھی بالکل مناسب ہے۔

لالے کے پھول میں داغ ہوتا ہے، جسے شاعر عشق کا داغ سمجھتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر دردِ عشق زمانے کی ناموافقت کے باعث الگ ہو کر بیٹھ جائے تو لالے کا پیالہ عشق کی شراب سے خالی ہو جائے اور شبنم کے آنسو دردِ عشق سے محروم ہو کر صرف پانی کی بوندیں رہ جائیں۔ آنسو اگرچہ بظاہر پانی کے قطرے ہوتے ہیں لیکن دردِ دل کی وجہ سے ان کی حیثیت بہت بلند ہو جاتی ہے۔ درد نہ رہے تو آنسوؤں اور پانی کے قطروں میں کوئی فرق نہیں رہ سکتا۔

اے دردِ عشق! تیرا بھید سینے کے اندر چُھپا رہنا چاہیے اور جگر کے گھلنے سے جو آنسو پیدا ہوتے ہیں وہ بھی آنکھوں میں نہ

آنے چاہییں تاکہ تیرا بھید ظاہر نہ ہو جائے۔ رنگین بیان شاعر کی زبان بھی بند ہو جانی چاہیے۔ بنسری کی آواز میں جدائی کا گلہ چھپا ہوتا ہے۔ یہ گلہ بھی نہ ہونا چاہیے۔

واضح رہے کہ بُلبل کی فریاد، لالے کا داغ، شبنم کا گریہ، آنسو کا بہنا، شاعر کا شعر کہنا، بنسری کا گیت، یہ سب دردِ عشق کے اظہار کی مختلف صورتیں ہیں، شاعر ان تمام صورتوں کو ختم کر دینے کا آرزومند ہے۔ اس لیے کہ زمانہ دردِ عشق کے موافق نہ رہا۔ وہ کہتا ہے کہ اے دردِ عشق! موجودہ زمانہ نکتہ چینی کرنے اور عیب نکالنے والا ہے، لہٰذا کہیں چھپ کر بیٹھ جا اور جس دل میں تیرا مقام ہے، وہیں پوشیدہ رہ۔

دوسرا بند | **حیرتِ علم آفریدہ :** وہ حیرانی جو علم سے پیدا ہوتی ہے۔ **جویا :** ڈھونڈنے والی! **نگہِ نارسیدہ :** نہ پہنچی ہوئی نگاہ یعنی وہ نگاہ جو حقیقت تک نہ پہنچ سکے۔ **کشتۂ نظّارۂ مجاز :** ظاہر کے نظّارہ کی ماری ہوئی یعنی وہ انجمن جو ظاہر پر مٹی ہوئی ہو۔ **خلوت سرائے راز :** رازِ حقیقت کے پوشیدہ رہنے کا مقام۔

اے دردِ عشق! موجودہ دور کے علوم نے جو حیرانی پیدا کر رکھی ہے وہ تیری حقیقت سے بالکل بے پروا ہے۔ اس کے نزدیک تیری کوئی قدر و منزلت نہیں۔ جو نگاہ حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی، اسے تیری تلاش کب ہو سکتی ہے؟ ان علوم کے شیدائی اپنے خیالات کی بلندی سے حقیقت کو پالینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ تیری رہنمائی کے بغیر وہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے۔ چونکہ انھیں تجھ سے کوئی واسطہ نہیں، لہٰذا اگر الگ ہو کر بیٹھ جائے اور انھیں تلاش کرنے میں سرگرداں رہنے دے۔ جو آنکھ حکمت اور فلسفے کے ذریعے سے اس گتھی کو سلجھانا چاہتی ہے (حالانکہ تیرے بغیر یہ گتھی نہیں سلجھ سکتی) وہ آنکھ حیرانی کی حالت میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی ہے۔ اسے ایسی حالت میں چھوڑ دے۔

شاعر کی مراد یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے علوم خصوصاً فلسفہ اور حکمت بطورِ خود حقیقت تک پہنچنے کے لیے کوشاں ہیں لیکن یہ منزل عشق کی رہنمائی کے بغیر طے نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ فلسفہ و حکمت پر شیدا ہیں وہ منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتے اور حیرانی ہی میں عمر گزار دیں گے۔ مراد کو پہنچنے کا ذریعہ صرف عشق ہے۔

موجودہ دور کا باغ ایسا نہیں جس کے لیے تو بہار بن سکے۔ عہدِ حاضر کی انجمن تیری جلوہ گری کے قابل نہیں۔ یہ انجمن صرف مجاز اور ظاہر کے نظّاروں پر مٹی ہوئی ہے۔ اے دردِ عشق! تیری منزلِ مقصود وہ خلوت گاہ ہے جہاں حقیقت کا راز چھپا ہوا ہے۔ آج کل ہر دل خیالی شراب کے نشے میں چُور ہے۔ یہ لوگ کلیم ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں، لیکن اُن کا طُور وہ نہیں جہاں کلیم اللہ کو حقیقت کی تجلّی نظر آتی تھی یعنی یہ لوگ حقیقت تک پہنچنے کا راستہ چھوڑ کر دوسری ہی وادیوں میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

گُلِ پژمردہ

گُلِ پژمردہ: مُرجھایا ہوا پُھول۔ **گہوارۂ جنباں:** ہلنے والا پنگوڑا۔ **طبلۂ عطّار:** عطر فروش کا صندوقچہ یعنی ایسا مقام جو خوشبوؤں سے بھرا ہوا ہو۔ **تعبیر:** بیان کرنا خصوصاً خواب کا نتیجہ بیان کرنا۔ **نیستاں:** لفظی معنی سرکنڈوں کی جگہ۔ مراد ہے اصل مقام، وطن۔

اے مرجھائے ہوئے پھول! میں تجھے کس زبان سے پھول کہوں؟ کس طرح کہوں کہ تو بُلبل کے دل کی آرزو ہے۔ مراد یہ ہے کہ پھول مرجھا جائے تو وہ پھول نہیں رہتا اور بُلبل اسے اپنا محبوب نہیں سمجھ سکتی۔

جب تو پھول تھا تو ہوا کی لہر تیرے لیے ہلنے والا پنگوڑا بنی ہوتی تھی یعنی ہوا کی لہر آتی تھی تو تُو اپنی شاخ پر جُھولا جھولتا تھا۔ اُس وقت باغ میں تیرا نام ہنسنے والا پُھول تھا۔ صبح کو چلنے والی ہوا تیری خوشبو سے مہک اُٹھتی تھی اور اسے تیرے اس احسان کا اقرار تھا۔ باغ تیرے دم سے عطر فروش کا صندوقچہ بنا ہوا تھا یعنی تیری خوشبو سے سر بسر مہک رہا تھا۔

اب وہ حالت باقی نہیں رہتی اب شبنم تجھ پر نہیں گرتی۔ میری رونے والی آنکھ تجھ پر آنسو بہاتی ہے اور یہی تیری شبنم ہے۔ تو اداس ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا اجڑا ہوا دل تیری اداسی میں جا چھپا ہے۔ تو موجودہ حالت میں میری بربادی کی ایک چھوٹی سی تصویر بنا ہوا ہے۔ میری زندگی ایک خواب تھی اور تو اس خواب کا نتیجہ پیش کر رہا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح پھول مرجھا کر اپنی حقیقی حیثیت کھو بیٹھا ہے، اسی طرح میں بھی برباد ہو چکا ہوں میں بھی بنسری کی طرح اپنے نیستاں کی کہانی سُناتا ہوں۔ اے پُھول! سُن، میں بھی جدائی کا گلہ کرتا ہوں۔

آخری شعر مولانا رُوم کی مثنوی کے پہلے شعر سے اخذ کیا گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح مرجھایا ہوا پھول زبانِ حال سے اپنی پہلی کیفیت اور چمن کی حکایت سُناتا ہے، اسی طرح شاعر بھی اپنے اصل مقام یعنی ذاتِ مطلق کو یاد کرتا ہے اور اس سے جدائی کا گلہ کر رہا ہے۔

سیّد کی لوحِ تربت

تمہیدی نوٹ: یہ نظم جنوری ۱۹۰۳ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی۔ اصل نظم کے تیس شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں صرف چودہ باقی رکھے۔

سیّد احمد خان وہ بزرگ رہنما تھے جنھوں نے زوالِ حکومت کے بعد مسلمانوں کی مستقل ملّی ہستی کی بنیاد رکھی اور قومی زندگی کے احیا کا وہ کارنامہ انجام دیا، جس کی بدولت مسلمان اس سرزمین میں اعزاز و اکرام کے بلند رتبے پر پہنچے۔ سیّد مرحوم مسلمانوں کے شہرۂ آفاق رہنما، مصلح اور مدبّر تھے۔ مسلمانوں میں جدید تعلیم کا آغاز انھیں نے کیا۔ علی گڑھ رہتی دنیا تک ان کا نام زندہ رکھّے گا۔ وہ ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۹۸ء میں وفات پائی۔ قومی اصلاح میں عزیمت کا جو مقام انھیں حاصل ہوا، وہ کسی دوسرے رہنما کے حصّے میں نہ آیا۔

"مخزن" نے یہ نظم چھاپتے وقت مندرجۂ ذیل تمہیدی نوٹ لکھا تھا:

تخیّل کے کانوں نے سرسیّد مرحوم کی قبر سے وہ صدائے پُردرد سُنی، جس کی ایسے دل سے جو مرحوم کے پہلو میں تھا، توقع ہوسکتی تھی۔ خوبی یہ ہے کہ سرسیّد زندگی میں کئی حیثیتوں کا جامع تھا۔ اسی طرح اس کی لوحِ تربت سے وہ کلماتِ نصیحت شیخ محمد اقبال کی طبعِ رسا نے اخذ کیے ہیں جو زندگی کے مختلف مشاغل کے جامع ہیں اور جن سے ہر طبقے کے لوگ مستفید ہوسکتے ہیں۔ اس زمانے میں جب دہلی میں محمڈن کانفرنس کے جلسے زور و شور سے ہورہے ہیں۔ ان کا شایع ہونا ایک لطفِ مزید رکھتا ہے۔

("مخزن" بابت جنوری ۱۹۰۳ء، صفحہ ۷۳)

پہلا بند گرویدۂ تقریر: تقریر کا شیدائی۔

اے میری قبر کی زیارت کرنے والے! تیری جان کا پرندہ سانس کے رشتے میں قید ہے اور تیری رُوح کا طائر پنجرے میں بند ہے یعنی تو زندہ ہے۔ ذرا اس باغ میں رنگ الاپنے والوں کی آبادی تو دیکھ! جو شہر اجڑا ہوا تھا، دیکھ کس طرح دوبارہ آباد ہوگیا ہے۔ بظاہر اشارہ علی گڑھ کی طرف ہے جو ایک غیر معروف مقام تھا اور سرسید کے قائم کیے ہوئے کالج کی وجہ سے دنیا بھر میں شہرت کا حق دار بن گیا۔ شاعر کہتا ہے کہ دیکھ اس دارالعلوم میں طلبہ کس انداز سے تعلیم حاصل کررہے ہیں اور ان کی وجہ سے ملّت کا اجڑا ہوا شہر پھر آباد ہوگیا ہے۔

جس مجلس کو سجانے کی مجھے فکر رہتی تھی، وہ یہی ہے۔ یہ سب کچھ صبر اور استقلال کا پھل ہے دیکھ!
میری قبر کا پتھر بولنے کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ تو باطن کی آنکھ کھول اور اس پر جو کچھ لکھا ہوا ہے، اسے پڑھ۔

دوسرا بند وا نہ کرنا : نہ کھولنا۔

اب لوحِ تحریر شروع ہوتی ہے۔ سر سیّد کی رُوح کہتی ہے اے میری قبر کی زیارت کے لیے آنے والے! اگر تیرا مقصد اس دنیا میں یہ ہے کہ اپنی قوم کو دین کی تعلیم دے تو یہ بہت ہی نیک کام ہے، لیکن دنیا کو چھوڑ کر الگ ہو جانے کی تعلیم نہ دینا، جس سے اسلام نے منع کر رکھا ہے۔ فرقہ بندی کے لیے زبان نہ کھولنا یعنی فرقہ بندی کی تعلیم نہ دینا، اس لیے کہ فرقہ بندی کے اندر قیامت کا ہنگامہ چھپا ہوا ہے، وہ بپا ہو گا تو سب کچھ تلپٹ کر ڈالے گا یعنی باہمی جھگڑوں میں قوم تباہ ہو جائے گی۔ تو اگر کوئی دینی تصنیف کرے تو اس کا انداز ایسا ہونا چاہیے جس سے قوم کے افراد میں ایک دوسرے سے میل جول اور اتحاد کو ترقی ہو۔ اگر تو کسی دینی مسئلے کے متعلق تقریر کرے تو یہ امر بہ طور خاص پیشِ نظر رکھنا کہ کوئی ایسی بات زبان پر نہ آجائے، جس سے کسی کا دل دُکھے۔ اس لیے کہ دل دُکھا کر میل جول اور اتحاد بڑھایا نہیں جا سکتا۔ زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ نئے زمانے میں پُرانے قصّے چھیڑنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ جن کہانیوں میں اب کوئی لطف نہیں اور جو بے وقت کی راگنی معلوم ہوتی ہیں، انھیں کیوں چھیڑا جائے؟

تیسرا بند مدبّر : لفظی معنی تدبیر کرنے والا۔ اصطلاحی معنی سیاست دان۔ اربابِ سیاست : سیاسی لوگ یعنی ملکی اور قومی کاموں میں حصّہ لینے والے حضرات۔ بیم وریا : خوف اور ریاکاری یا دکھاوا۔

اگر تو سیاست دان ہے تو میری یہ بات سن لے کہ سیاست دانوں کے ہاتھ میں دلیری عصا کا کام دیتی ہے یعنی اربابِ سیاست کے لیے لازم ہے کہ وہ دلیری سے کام لیں اور اپنے حقوق کے لیے بے خوف ہو کر لڑیں۔ جب کوئی مطالبہ پیش کرنا ہو اور وہ حق پر مبنی ہو تو تیرے لیے جھجک سے کام لینا مناسب نہیں۔ اگر تیری نیت ٹھیک ہے تو تجھے کسی کی پروا کیوں ہو؟ ایمان دار انسان کا دل خوف اور ریاکاری سے بالکل پاک ہوتا ہے۔ وہ کوئی سچا مطالبہ پیش کرتا ہوا ڈرتا نہیں اور نہ کسی کے سامنے ریاکاری اور دکھاوے پر عمل کرتا ہے۔ فرماں روا اور حاکم کتنا ہی قوی ہو، ایمان دار آدمی اس کے سامنے بالکل نڈر ہوتا ہے۔

چوتھا بند خامۂ معجز رقم : ایسا قلم جس کی تحریر معجزہ ہو۔ تلمیذِ رحمانی : لفظی معنی خدا کا شاگرد یعنی خدا سے فیض پانے والا۔

اگر تیرے ہاتھوں میں ایسا قلم ہے جس کی تحریر معجزہ ہو اور اگر تیرے دل کا شیشہ جمشید کے پیالے کی طرح ہے، جس میں

۳۔ اگر وہ شاعر ہے تو ایسی باتیں زبان پر لائے جو اس کے پیغام کی آبرو بڑھائیں اور اس کے کلام میں زندگی کی روح پیدا ہو جائے ۔ مخالف قوتیں جل کر خاک ہو جائیں ۔

ماہِ نو

پہلا بند | طشتِ گردوں : آسمان کا تھال یعنی آسمان ۔ خونِ ناب : خالص خون یعنی سُرخی ۔
سیمِ خام : خالص چاندی ۔

ہلال کے متعلق تشبیہیں دیتا ہوا شاعر کہتا ہے کہ سورج کی کشتی ٹوٹ کر دریائے نیل میں غرق ہو گئی یعنی سورج نیلے آسمان کا سفر ختم کر کے ڈوب گیا اور نیل کے پانی کی سطح پر صرف ایک ٹکڑا رہ گیا جو تیرتا پھرتا ہے ۔

مراد یہ ہے کہ سورج ڈوبا اور ہلال نمودار ہوا ۔ شاعر اسے سورج کی ٹوٹی ہوئی کشتی کا ایک ٹکڑا قرار دیتا ہے ۔

آسمان کے تھال میں شفق کا لہو ٹپک رہا ہے یعنی شفق کی سُرخی آسمان پر پھیل گئی ہے ۔ کیا ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ قدرت کے نشتر نے سورج کی فصد کھولی ہے یعنی اس کی رگ سے خون نکالا ہے ؟ اس شعر میں ہلال کو قدرت کا نشتر کہا ہے ۔

یا کیا یہ سمجھیں کہ آسمان نے شام کی دُلھن کے کان سے بالی چُرالی ہے ؟ یا یہ فرض کریں کہ نیل کے پانی میں چاندی کی مچھلی تیرتی پھرتی ہے ؟ اس شعر میں ہلال کو عروسِ شام کی بالی اور سیمِ خام کی مچھلی قرار دیا ہے ۔

دوسرا بند | سیارۂ ثابت نما : وہ سیارہ جو چلتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کھڑا ہے ۔ طفلکِ سیماب پا : وہ بچہ جس کے پاؤں پارے کی طرح بے قرار ہوں یعنی مدرسے سے بھاگنے والا بچہ ۔

شاعر ہلال کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تیرا قافلہ چلا جا رہا ہے اور وہ بانگ درا کا احسان بھی نہیں اٹھاتا یعنی سب قافلوں میں گھنٹے ہوتے ہیں اور قافلے گھنٹوں ہی کی آواز پر چلتے ہیں لیکن ہلال کا قافلہ ایسا ہے جس کے لیے گھنٹے کی کوئی آواز نہیں ۔ انسان کے کان اس کے پاؤں کی آہٹ نہیں سُن سکتے ۔

اسے ہلال ! تو کبھی گھٹتا ہے کبھی بڑھتا ہے ۔ اس طرح ہمیں گھٹنے بڑھنے کا سماں دکھاتا رہتا ہے ۔ یہ تو بتا کہ تیرا وطن کہاں ہے اور تو کس دیس کو جا رہا ہے ۔ اسے وہ مسافر ! جو ٹھہرا ہوا نظر آتا ہے ، مجھے بھی اپنے ساتھ لے چل ۔ میرے دل میں حسرت کا کانٹا کھٹک رہا ہے اور اس کھٹک نے مجھے بے کل کر رکھا ہے ۔ میں نور کا طلب گار ہوں اور اس دنیا

کے اندھیرے سے گھبراتا ہوں۔ زندگی کے مدرسے میں میری مثال اس بچے کی ہے جو ہر وقت بھاگ جانے کی فکر میں ہو۔

انسان اور بزمِ قدرت

پہلا بند | **معمورۂ ہستی**: زندگی کی بستی یعنی دنیا۔ **پرتوِ مہر**: سورج کی روشنی۔ **سیمِ سیّال**: بہتی ہوئی چاندی۔ **سورۃ والشمس**: قرآن کی ایک سورت جو والشمس سے شروع ہوتی ہے۔

سطوت: رعب۔ دبدبہ۔ شوکت۔

صبح کے وقت مَیں نے چمکتے ہوئے سورج کو دیکھا تو دنیا کی محفل سے پوچھا کہ تجھ میں جو اجالا ہے، وہ سورج کی روشنی کے دم سے ہے۔ اسی روشنی کے باعث تیرے دریاؤں کا پانی بہتی ہوئی چاندی معلوم ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ سورج کی روشنی دریا کے پانی پر پڑے تو پانی چاندی کا رنگ اختیار کر لیتا ہے چونکہ وہ بہتا ہے اس لیے اسے بہتی ہوئی چاندی کہا۔ سورج نے تجھے نور کا زیور پہنا دیا ہے اور تیری محفل میں اسی شمع نے اجالا کیا ہے۔ تیرے پھول اور باغ جنت کی تصویریں معلوم ہوتے ہیں اور یہ سب سورج ہی کی بدولت اُگے، بڑھے اور پھولے پھلے ہیں۔ اس وجہ سے یہ کہنا بالکل مناسب ہوگا کہ یہ سورۂ والشمس کی تصویریں ہیں۔

پھولوں نے سُرخ لباس پہن رکھا ہے۔ درختوں کا جامہ سبز ہے۔ گویا تیری محفل میں کوئی لال پری ہے اور کوئی سبز پری۔ شام کے وقت افق پر لال لال سی بدلیاں نظر آتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ آسمان کے خیمے کی سنہری جھالریں۔ شفق کی لالی بہت پیاری لگتی ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ شام کے مٹکے میں گلابی شراب ڈال دی گئی ہے۔ تیرا رتبہ بہت بڑا ہے۔ تیری شان بہت اونچی ہے۔ تیری ہر چیز نور کے پردے میں لپٹی ہوئی ہے۔ صبح ہوتی ہے تو تیری عظمت و شوکت کا رنگ ہر شے پر چڑھ جاتا ہے، گویا صبح تیری شوکت کا ایک گیت ہے۔ سورج نکلتا ہے تو اندھیرے کا کہیں نشان تک باقی نہیں رہتا۔ میں بھی نور کی اسی بستی میں آباد ہوں۔ پھر میرے نصیبے کا ستارہ کیوں سیاہ ہو گیا اور کس سبب سے ڈوب گیا؟ میں روشنی سے دُور ہوں اور اندھیرے میں پھنسا ہوا ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ یہ تو بتا کہ آخر میرے دن کیوں تاریکی میں گزر رہے ہیں؟ میرے نصیبے پر کیوں اندھیرا چھایا ہوا ہے اور میرے کاروبار میں روشنی کی کوئی جھلک کیوں نظر نہیں آتی؟

دوسرا بند | **وابستہ**: بندھا ہوا۔ **بود و نبود**: ہونا نہ ہونا۔ وجود اور عدم۔

دنیا بھر کے حالات نظر آتے تھے تو تُو اپنی زبان کو پاک رکھ۔ اس لیے کہ تُو نے خدا نے پاک سے فیض حاصل کیا ہے۔ زبان پاک نہ رکھے گا تو تیری آواز کی آبرو جاتی رہے گی۔ تو شعر کے اعجاز سے سونے والوں کو جگا دے اور اپنی آواز کی چنگاری سے باطل کے انبار کو جلا کر راکھ کر دے۔

اس نظم میں اقبال نے سرسیّد کی زبان سے عالمِ دین، مدبّر اور شاعر کو صحیح راہِ عمل بتائی ہے:

۱۔ عالمِ دین کا فرض ہے کہ قوم کو دین کی صحیح تعلیم دے۔ دنیا سے الگ تھلگ رہنے کی ہدایت نہ کرے۔ فرقہ بندی سے بچا رہے۔ قوم میں اتحاد پیدا کرے۔ کسی کا دل نہ دُکھائے اور پرانے زمانے کے جھگڑے تازہ کر کے قومی جمعیّت میں خلل نہ ڈالے۔

۲۔ سیاسی کارکن کے لیے لازم ہے کہ قومی مطالبات میں دلیری سے کام لے۔ فرماں رواکی قوت سے نہ ڈرے۔ اپنا دل خوف اور ریاکاری سے پاک رکھے۔ اس کی نیت نیک ہو اور ہر ذاتی غرض سے بے پروا رہے۔

صحیفہ: کتاب۔ آسمانی کتاب۔

مَیں یہی کہہ رہا تھا کہ کہیں سے آواز آئی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آسمان کی چھت سے آئی یا زمین کے صحن سے۔ اس آواز نے بزمِ قدرت کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ اے انسان! تیرے ہی نور سے میرا ہونا نہ ہونا بندھا ہوا ہے۔ یعنی میرا وجود و عدم تجھ پر موقوف ہے۔ تو بھی نہ ہوتا تو میں بھی نہ ہوتی۔ جب تو نہ رہے گا تو میں بھی نہ رہوں گی۔ اس دنیا کے باغ کے لیے باغبانی کا کام تو انجام دے رہا ہے۔ اگر تجھے حُسن کی انجمن مان لیا جائے تو میں تیری تصویر ہوں۔ اگر تجھے عشق کی کتاب تسلیم کر لیا جائے تو میں تیری تفسیر ہوں۔ یعنی اس کتاب میں جو کچھ ہے۔ اسے کھول کر بیان کرتی ہوں۔ میرے تمام بگڑے ہوئے کام تو نے بنا ئے۔ امانت کا جو بوجھ مجھ سے نہ اُٹھ سکا، وہ تو نے اٹھایا۔ بارِ امانت سے اشارہ قرآن مجید کی اس آیت کی طرف ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۙ	ہم نے دکھلائی امانت آسمانوں کو اور زمین کو اور پہاڑوں کو۔ پھر کسی نے قبول نہ کیا کہ اس کو اٹھائیں اور اس سے ڈر گئے اور اُٹھا لیا اس کو انسان نے۔ یہ ہے بڑا بے ترس، نادان۔
(الاحزاب)	(الاحزاب)

میری ہستی سُورج کے نور کی محتاج ہے اور تیری چمک کو سورج کا احسان اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر سورج نہ ہو تو میرا باغ بالکل اجڑ جائے۔ مجھے عیش کا گھر کہا جاتا ہے لیکن یہ قید خانہ بن جائے۔

اے کھلے ہوئے بھید کے نہ سمجھنے والے! اے خواہشات کے جال میں الجھنے والے! کتنے افسوس کا مقام ہے کہ غفلت کے باعث تیری نگاہ چیزوں کے ظاہر میں پھنس کر رہ گئی ہے اور حقیقت تک نہیں پہنچتی۔ تجھے تو فخر و ناز بجا تھا۔ اس لیے کہ تُو سب سے اونچا تھا مگر اپنی کم فہمی کے باعث عجز و نیاز میں محو ہے اور سب کے آگے جھکا پھرتا ہے۔ اگر تُو اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جائے تو نہ تیرے دن تاریک رہیں اور نہ تیرا کاروبار روشنی سے محروم ہوتے پائے۔

اس نظم میں شاعر نے انسان کو اشرف المخلوقات اور بزمِ قدرت کی ہر شے سے افضل ثابت کیا ہے۔ خوبی یہ ہے کہ انسان اپنی نافہمی کے باعث بزمِ قدرت کو اپنے سے بہتر قرار دیتا ہے اور بزمِ قدرت انسان کے اشرف ہونے کا اعلان کرتی ہے۔

پیامِ صبح

تمہیدی نوٹ: یہ نظم مشہور امریکی شاعر لانگ فیلو کی ایک نظم سے ماخوذ ہے۔ لانگ فیلو ۱۸۰۷ء میں بمقام پورٹ لینڈ (امریکہ) پیدا ہوا۔ مختلف درس گاہوں میں ادبیات عالیہ کا پروفیسر رہا۔ ۱۸۸۲ء میں وفات پائی۔ بہت سادہ نظمیں لکھتا تھا اور اس کا پورا مجموعۂ کلام فضائلِ اخلاق کا درس ہے۔ وہ خود بھی بڑا ہی شریف اور نیک دل انسان تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ شکار کے لیے گیا اور ایک جانور مارا۔ اس کے تڑپنے کی کیفیت دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا کہ پھر عمر بھر شکار نہ کھیلا۔ امریکہ کے شاعروں میں وہ سب سے زیادہ مشہور و ہر دلعزیز ہے۔

افشاں: گوٹے یا مقیش کے باریک ٹکڑے یا ستارے جو عورتیں آرائش کی غرض سے پیشانی پر چن لیتی ہیں یا بالوں پر چھڑکتی ہیں۔ **سورۂ والنّور:** قرآن کی ایک سورت کا نام ہے نظم میں اس سے سورج کا اجالا مراد ہے۔ **خوابیدگانِ دیر:** بُت خانے میں سونے والے۔ **افسونِ بیداری:** جگانے کا منتر۔ **شہرِ خموشاں:** چُپ رہنے والوں کی بستی یعنی قبرستان۔

جب رات کی پیشانی سے افشاں کا اُجالا رخصت ہو گیا یعنی ستارے غروب ہو گئے۔ شاعر نے ستاروں کو محبوبۂ شب کی پیشانی کی افشاں قرار دیا ہے یہ نہایت عمدہ تشبیہہ ہے۔ زندگی کی نسیم مسکراتی ہوئی صبح کا پیغام لائی یعنی صبح ہو گئی۔ دلکش

گیت گانے والی بُلبل کو اس نسیم نے گھونسلے میں جگا دیا۔ کسان جو کھیت کے کنارے لیٹا ہوا تھا، اس کا کندھا ہلایا کہ جاگ اٹھ، صبح کا نور چمکا تو رات کے اندھیرے کا طلسم ٹوٹ گیا۔ امیروں کی خواب گاہوں میں جو شمعیں جل رہی تھیں، ان کے سنہری تاج اڑا دیے گئے یعنی وہ بجھ گئیں۔ بُت خانے میں سونے والوں پر اس نسیم نے جگانے کا منتر پڑھا، یعنی انھیں جگا دیا اور برہمن کو یہ پیغام دیا کہ چمکتا ہوا سورج نکلنے والا ہے۔ اُٹھ اور اس کی پُوجا کر لے۔ کعبے کی چھت پر یہ نسیم اذان دینے والے سے بولی کہ سُورج نکلنے والا ہے۔ تجھے یہ خیال نہیں کہ اس سے پہلے نماز پڑھ لینی چاہیئے؟ یہ نسیم باغ کی دیوار پر کھڑے ہو کر پکاری کہ اے پھول کی کلی! کھِل جا، تیرا چٹکنا اذان کی آواز ہے اور تو اس باغ کی مؤذّن ہے۔

جو قافلے والے صحرا میں سستانے کی غرض سے ٹھہرے ہوئے تھے۔ انھیں اس نسیم نے جگایا اور بولی کہ جلد چلنے کیلئے تیار ہو جاؤ۔ سُورج نکلنے والا ہے اور اس کی روشنی سے بیابان کا ہر ذرّہ اس طرح چمکنے لگے گا، جیسے جگنو چمکا کرتے ہیں۔

زندگی کی نسیم زندوں کی بستی سے ہوتی ہوئی غریبوں کے قبرستان کی طرف آئی اور اس کا سماں دیکھ کر بولی! تم لوگ ابھی آرام سے سوتے رہو۔ میں پھر بھی آؤں گی۔ دنیا کو سُلا دوں گی یعنی یہ جہان ختم ہو جائے گا اور تمھیں اس وقت نیند سے جگا دوں گی۔ مطلب یہ کہ قیامت کے دن تمام مُردے جی اٹھیں گے اور یہ دنیا باقی نہ رہے گی۔

عشق اور موت

تمہیدی نوٹ: یہ نظم انگلستان کے ملک الشعراء لارڈ ٹینی سن کے کلام سے لی گئی ہے۔ ٹینی سن ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا اور اکتوبر ۱۸۹۲ء میں وفات پائی۔ یہ نظم نومبر ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی اور اس کے انتیس شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں صرف تیئیس باقی رہ گئے۔

پہلا بند: تبسّم فشاں: مسکراہٹ چھڑکنے والی یعنی مُسکراتی ہوئی۔ تابندگی: چمک۔ تشنہ کام: پیاسی۔

اس کائنات کے پیدا ہونے کا وقت بڑا ہی سہانا تھا۔ اس وقت زندگی کی کلی مسکراہٹ بکھیر رہی تھی۔ سُورج کو سنہرا تاج مل رہا تھا۔ چاند کو چاندنی دی جا رہی تھی۔ شام کو سیاہ لباس دیا جا رہا تھا۔ ستاروں کو چمک سکھائی جا رہی تھی۔ زندگی کی شاخ میں پتّے لگ رہے تھے یعنی وہ ہری بھری ہو رہی تھی اور کہیں کہیں اس سے کلیاں پھوٹ رہی تھیں فرشتے شبنم

کو سکھا رہے تھے کہ رو پا کس طرح جاتا ہے۔ پھول کو پہلے پہل ہنسی آرہی تھی۔ یعنی اس نے کھلنا سیکھا تھا۔ شاعر کے دل کو درد عطا ہو رہا تھا اور اس کی خودی شرابِ بے خودی کی پیاسی تھی۔

مراد یہ ہے کہ کوئی انسان درد کے بغیر اپنی ذات کو چھوڑ کر دوسروں کی تکلیف کا احساس نہیں کرسکتا۔ شاعر کو درد اس لیے بخشا جا رہا تھا کہ وہ اپنی ذات کو بھول جائے اور دوسروں کی بہتری میں اپنے آپ کو گم کر دے۔

کالی گھٹا پہلے پہل اُٹھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی حور نے بال کھول دیے ہیں۔ زمین اترا رہی تھی کہ میں مرتبے کی بلندی میں آسمان ہوں۔ مکان اپنے آپ کو لامکاں سمجھ رہا تھا یعنی ہر چیز اپنے درجے سے اونچی اُڑ رہی تھی۔

دوسرا بند **نظّارگی:** دیکھنے والا۔ **قضا:** موت۔ **قضارا:** اتفاق سے۔

غرض یہ نظّارہ اتنا پیارا تھا کہ دیکھنے والا خود سر سے پاؤں تک نظّارہ بن جائے۔ فرشتے اپنے اڑنے کی قوّت آزما رہے تھے۔ ان کی پیشانیوں پر ازل کا نور روشن تھا۔ ایک فرشتہ ایسا تھا جس کا نام عشق تھا۔ تمام ہستیوں کو اسی کی رہنمائی کا سہارا تھا۔ وہ فرشتہ کیا تھا، بے قراریوں کا ایک پُتلا تھا۔ ذات کے لحاظ سے دیکھو تو فرشتہ اور بے قراری کے اعتبار سے دیکھو تو پارا۔ وہ بہشت کی سیر کو جا رہا تھا۔ اتفاقیہ راستے میں موت سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ عشق کے فرشتے نے موت سے پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے اور تو کیا کام کرتی ہے؟ تیری دید آنکھوں کو بالکل اچھی نہیں لگتی۔

یہ سنتے ہی وہ بولی کہ موت ہوں اور میرا کام سب پر روشن ہے۔ میں لباسِ ہستی کے پُرزے اڑاتی ہوں اور زندگی کی چنگاری کو بجھا دیتی ہوں۔ میری نگاہ میں فنا کا جادو ہے۔ جس پر پڑ جائے اسے مٹا دیتی ہے۔ میرا ہی اشارہ سب کے لیے فنا کا پیغام ہے۔ لیکن دنیا میں ایک ہستی ایسی بھی ہے، جس میں آگ کی خاصیّت ہے اور میں اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔ جس طرح پارہ آگ کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ وہ ہستی چنگاری بن کر انسان کے دل میں رہتی ہے۔ وہ نورِ مطلق کی آنکھ کا تارا ہے۔ وہ کبھی کبھی آنسو بن کر آنکھوں سے ٹپکتی ہے لیکن اُن آنسوؤں کی تلخی خوش گوار ہوتی ہے۔

عشق نے موت کی یہ بات سنی تو اس کے لب پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ یہ مسکراہٹ بجلی بن کر موت پر گری اور اُسے بھسم کر گئی۔ بھلا اندھیرا روشنی کے سامنے کیا ٹھہر سکتا ہے؟ موت نے حقیقی زندگی کو دیکھا تو مر گئی۔ اگرچہ وہ قضا تھی، لیکن خود قضا کا شکار ہو گئی۔

اس نظم میں شاعر نے عشق کو غیر فانی قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ موت بھی اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔ گویا خواجہ حافظ کے اس شعر کا مضمون دلکش انداز میں پیش کیا ہے:

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

زہد اور رندی

تمہیدی نوٹ: یہ نظم دسمبر ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی اور غالباً انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں مستقل نظم کے علاوہ پڑھی گئی تھی۔ نظرثانی میں دو شعر حذف کر دیے اور ایک آدھ جگہ جزوی ترمیم فرمائی۔ اس کا مفہوم کسی تشریح کا محتاج نہیں۔

صُوفی منش: صوفی مزاج۔ **اعالی:** اعلیٰ کی جمع۔ اونچے طبقے کے لوگ۔ **ادانی:** ادنیٰ کی جمع۔ چھوٹے طبقے کے لوگ۔ **مضمر:** چھپے ہوئے۔ **دُرد:** تلچھٹ۔ گاد۔ **ہمہ دانی:** سب کچھ جاننا۔ **کلیم ہمدانی:** جہانگیر و شاہ جہاں کے عہد کا مشہور فارسی شاعر جس کا وطن ہمدان (ایران) تھا۔ ۱۰۶۱ھ (۱۶۵۱ء) میں اس نے بمقام سری نگر (کشمیر) وفات پائی۔ **تشیّع:** شیعہ پن۔ **تفضیلِ علیؓ:** حضرت علیؓ کو خلفائے ثلاثہؓ سے افضل سمجھنا۔ **مجموعۂ اضداد:** جس میں ایسی خصلتیں جمع ہوں جو ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ **خفقانی:** سودائی۔ **نغز بیانی:** خوش گوئی۔ **احبّا:** حبیب کی جمع۔ دوست احباب۔ **قُربِ مکانی:** مکان کی نزدیکی یعنی پڑوس۔ **اشک فشانی:** آنسو بہانا۔

میں ایک مولوی صاحب کی کہانی سناتا ہوں۔ اس سے یہ مقصود نہیں کہ اپنی طبیعت کی تیزی دکھاؤں یعنی اپنے شاعرانہ کمالات کی نمایش کروں۔

ان مولوی صاحب کے صوفی مزاج ہونے کی بہت شہرت تھی۔ بڑے چھوٹے سب ان کا ادب کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ شریعت تصوّف میں اسی طرح چھپی ہوئی ہے، جس طرح لفظوں میں معنی چھپے ہوتے ہیں۔ اُن کے دل کی صراحی پرہیزگاری کی شراب سے لبالب بھری ہوتی تھی البتہ اس میں ہمہ دانی کے خیال کی تلچھٹ بھی بیٹھی ہوئی تھی یعنی وہ اگرچہ بڑے پرہیزگار معلوم ہوتے تھے، لیکن انھیں یہ خیال بھی تھا کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔

وہ اپنی کرامتیں بھی بیان کیا کرتے تھے۔ اس طرح چاہتے تھے کہ مریدوں کی تعداد بڑھ جائے۔ وہ مدّت سے میرے پڑوس میں رہتے تھے۔ مجھ رند اور اس پرہیزگار میں پرانی ملاقات تھی۔

ایک دن ان مولوی صاحب نے میرے ایک واقف سے پوچھا کہ اقبال جو معنی کے شمشاد کی قمری ہے یعنی جس کا مرتبہ شعر کہنے میں بہت اونچا ہے۔ وہ اگرچہ سخن گوئی میں کلیم ہمدانی جیسے مشہور شاعر کے لیے بھی باعثِ رشک ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ شریعت کے حکموں کی پابندی میں اس کا کیا حال ہے؟

سنتا ہوں کہ وہ ہندو کو کافر نہیں سمجھتا۔ ایسا عقیدہ اس کے فلسفہ جاننے کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی طبیعت

میں ذرا سا شیعہ پن ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ سے افضل سمجھتا ہے۔

وہ راگ کو خدا کی بندگی کا جزو مانتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اسے مذہب کی ہنسی اڑانا منظور ہے۔

اسے بازاری عورتوں سے ملتے ہوئے بھی شرم نہیں آتی۔ ہمارے شاعروں کی یہ پرانی عادت ہے۔

وہ رات کو گانا سنتا ہے اور صبح کے وقت قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے۔ یہ نکتہ اب تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

لیکن میں نے اپنے مریدوں سے سنا ہے کہ اس کی جوانی صبح کے دامن کی طرح اجلی ہے جس پر دھبّا نہیں۔

اقبال کیا ہے، ایسی عادتوں کا ایک مجموعہ ہے جو ایک دوسری کی ضد ہیں۔ اس کا دل حکمت اور دانش مندی کی کتاب ہے، لیکن طبیعت سودا داری پائی ہے۔

ایک طرف وہ رندی میں ڈوبا ہوا ہے، دوسری طرف شریعت کی بھی پیروی کر رہا ہے۔ تصوّف کا ذکر چھیڑو تو دوسرا منصور معلوم ہوتا ہے۔

ہمیں تو اس شخص کی حقیقت اب تک معلوم نہ ہو سکی۔ ہو نہ ہو یہ کسی دوسرے ہی اسلام کی بنیاد ڈال رہا ہے۔

غرض مولوی صاحب نے بہت لمبا وعظ فرمایا اور دیر تک آپ کی خوش گوئی کا سلسلہ جاری رہا۔

لاہور کی یہ خصوصیّت ہے کہ جو بھی بات ہو، ہر جگہ پھیل جاتی ہے۔ مجھے بھی دوست احباب کی زبانی یہ قصّہ معلوم ہو گیا۔

ایک دن حضرت مولوی صاحب مجھے راستے میں مل گئے اور باتیں کرتے کرتے میں نے اس پرانی بات کا ذکر چھیڑا۔

مولوی صاحب نے فرمایا کہ میں نے محبّت کی بنا پر شکایت کی تھی اور شریعت کا راستہ دکھانا میرا فرض تھا۔

میں نے عرض کیا۔ مجھے کوئی گلہ نہیں۔ میں آپ کا پڑوسی ہوں اور آپ کا یہ حق تھا کہ مجھے نصیحت فرماتے۔

میرا سرِ تسلیم آپ کے سامنے جھکا ہوا ہے۔ اگرچہ جوان ہوں، لیکن تواضع اور عاجزی کے سبب سے میری جوانی بڑھاپے کی شکل اختیار کر گئی ہے۔

اگر آپ کو میری حقیقت معلوم نہیں تو اس سے آپ کی ہمہ دانی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

میں خود بھی اپنی حقیقت کو نہیں پہچانتا۔ میرے خیالات کا پانی بہت گہرا ہے اور اس میں غوطہ لگا کر تہ کی خبر پالینا بہت مشکل ہے۔

مجھے بھی اقبال کو دیکھنے کی آرزو ہے۔ میں اس کی جدائی میں بہت آنسو بہا چکا ہوں۔

اقبال بھی اقبال کو نہیں جانتا خدا کی قسم یہ سچّی بات ہے مذاق نہیں۔

شاعر

تمہیدی نوٹ: یہ تین شعر دسمبر ۱۹۰۳ء کے "مخزن" میں شایع ہوئے تھے اور بجنسہٖ "بانگِ درا" میں لیے گئے۔

رہ پیما: راستہ چلنے والے۔

اگر قوم کو جسم فرض کر لیا جائے تو قوم کے لوگ اس کے جوڑ بند ہیں۔ یعنی جس طرح جسم اعضا اور جوڑ بند کے بغیر نہیں ہوتا، اسی طرح قوم بھی افراد کے بغیر نہیں بنتی۔ قوم کے جو لوگ صنعت و حرفت کی منزلیں طے کر رہے ہوں، یعنی صنعت کار اور صنعت گر، وہ قوم کے ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کا انتظام ہوتا ہے، انھیں قوم کا خوش نما چہرہ ماننا چاہیے۔ خوش کلام شاعر کو قوم کی روشن آنکھ سمجھنا چاہیے۔ جسم کے کسی جوڑ کو دکھ پہنچے تو آنکھ رونے لگتی ہے۔ دیکھو آنکھ میں سارے جسم کی ہمدردی کس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

اقبال نے اس نظم میں افراد کو قوم کے جوڑ بند بتایا۔ صنعت گروں کو ہاتھ پاؤں۔ گویا قوم افراد سے ترکیب پاتی ہے، صنعت گر اس کے لیے ضرورت کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ حکمران قوم کا چہرہ ہوتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر ہر شخص کو ایک ہی نظر میں قوم کی حقیقی حیثیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ شاعر کو قوم کے جسم میں آنکھ کا مقام حاصل ہے۔ اس لیے کہ وہ ہر ایک کے دکھ درد پر تڑپ کر آنسو بہانے لگتا ہے۔

دل

تمہیدی نوٹ: اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام کے اٹھارویں سالانہ اجلاس منعقدہ مارچ ۱۹۰۳ء میں بارہ بند کی ایک نظم پڑھی تھی، جس کا عنوان تھا: "ابرِ گہر بار یعنی نعت عاشقانہ جناب سرورِ کائنات و فریادِ امّت بہ آستانۂ آں ذات بابرکات۔" یہ نظم عوام میں "فریادِ امّت" کے نام سے مشہور ہوئی اور رسالے کی شکل میں الگ بھی چھپ گئی تھی۔ "بانگِ درا" مرتب کرتے وقت اقبال نے اپنی کئی نظمیں حذف کر دیں۔ مثلاً "نالۂ یتیم" "یتیم کا خطاب ہلالِ عید کو" "اسلامیہ کالج لاہور کا خطاب مسلمانانِ پنجاب کو"۔ "فریادِ امّت" میں سے گیارہ بند حذف کر دیے اور صرف تیسرا بند باقی رکھا، جس کا عنوان معنویت کے علاوہ ردیف کی رعایت سے **دل** تجویز فرمایا۔

بازیٔ طفلانہ: بچوں کا کھیل۔ **جادہ:** پگ ڈنڈی۔ راستہ۔ **پیمانہ:** شراب ناپنے کا وہ پیالہ جس میں ہر وزن کے لیے الگ الگ خط یا لکیریں بنی ہوتی ہیں۔ کوئی شخص جتنی شراب لینا چاہے پیمانے میں اتنی مقدار کے خط کے برابر بھر کر دے دی جاتی ہے۔ فارسی اور اردو میں پیمانہ شربت کے عام پیالہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ **مزرع:** کھیتی۔ کھیت۔ **لغزشِ مستانہ:** مستِ شراب کی لڑکھڑاہٹ

منصور کو سولی پر چڑھانے کا واقعہ دل کے لیے بچوں کا کھیل ہے، یعنی ایک بے حقیقت سا کام ہے۔ دل کے افسانے کا عنوان یہ ہوتا ہے کہ تجلیٔ الٰہی کی طلب میں سراپا التجا بن جائے۔ جس طرح حضرت کلیم اللہ نے طور پر جا کر اَرِنی کی صدا بلند کی تھی۔ یعنی خدا کا جلوہ دیکھنے کی آرزو دل کا سب سے پہلا اور اونچا جذبہ ہے۔

اے خدا! دل کا پیالہ لبالب بھرا ہوا ہو تو کیا جانے اس کی شراب کیا اثر پیدا کرے گی؟ دل کے پیمانے میں جو لکیر بنی ہوئی ہے، وہ ہمیشہ کی زندگی کا راستہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس پیمانے کی تھوڑی سی شراب پی کر ہمیشہ کی زندگی مل جاتی ہے، وہ اگر بھرا ہوا پی لیا جائے تو کیا کہا جا سکتا ہے کہ کیا کیفیت ظاہر ہو؟

اے خدا! یہ رحمت کا بادل تھا یا عشق کی بجلی؟ زندگی کا کھیت جل گیا تو اس میں سے دل کا دانہ اُگا۔

مراد یہ ہے کہ زندگی عشق کی نذر ہو گئی تو دل وجود میں آیا۔ ایک لحاظ سے یہ بجلی تھی کہ زندگی کو ختم کر دیا۔ دوسرے لحاظ سے یہ رحمت کا بادل تھا جس کے برسنے سے دل زندہ ہو گیا۔[1]

اے فرہاد! تو بے ستون پہاڑ کو کاٹتا رہا۔ اگر دل کا ویرانہ کھودتا تو تجھے حُسن کا قیمتی خزانہ مل جاتا۔ جو باتیں شاعری میں مانی ہوئی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ خزانہ ویرانے میں ہوتا ہے۔

مجھے کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ میرا دل کعبہ ہے۔ کبھی سمجھتا ہوں کہ یہ عرش ہے۔ اے خدا! میرے دل کے مکان میں کون رہتا ہے؟

دل اپنے جنون میں الجھا ہوا ہے۔ میرے سر میں اپنا سودا سمایا ہوا ہے۔ میں دل پر جان دیتا ہوں، دل کسی اور کا دیوانہ ہے۔

اے نادان زاہد! تو اس حقیقت سے آگاہ نہیں۔ دل کی ایک مستانہ لڑکھڑاہٹ سینکڑوں سجدوں کے لیے باعثِ رشک ہے۔ یعنی سینکڑوں سجدوں سے بہتر ہے۔

دل کے پروانے کی راکھ میں وہ اثر ہے کہ وہ خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے۔

---

[1] "بانگِ درا" میں "مزرع" کو کاتب نے "مزرعہ" بنا دیا ہے جو غلط ہے۔ اس سے مصرع کا وزن غلط ہو جاتا ہے۔

دل عشق کے جال میں پھنس جاتا ہے تو اسے حقیقی آزادی ملتی ہے یعنی وہ اپنا حقیقی مقام حاصل کرتا ہے۔
عام درخت بجلی گرنے سے جل جاتے ہیں لیکن دل کے پیڑ کی یہ خاصیت عجیب و غریب ہے کہ بجلی گرتی ہے تو یہ ہرا بھرا ہوتا اور پھولتا پھلتا ہے۔ گویا دل کی رونق عشق سے ہے۔

موجِ دریا

پہلا بند پایاب : تھوڑا پانی جس سے آدمی پیدل گزر جائے۔ **حلقۂ گرداب** : بھنور کا چکر۔
توسن : گھوڑا۔ **خارِ ماہی** : مچھلی کا کانٹا۔

موج کہتی ہے کہ میرا بے قرار دل مجھے تڑپاتا رہتا ہے۔ پارے کی طرح تڑپتے رہنا ہی میری زندگی ہے۔ میرا نام موج ہے میں سمندر سے پیدل گزر جاتی ہوں۔ بھنور کا چکر میرے پاؤں کے لیے زنجیر نہیں بن سکتا اور میں کبھی نہیں رک سکتی۔ پانی میں میرا گھوڑا ہوا کی طرح چلتا ہے۔ میرا دامن مچھلی کے کانٹے میں کبھی نہیں الجھتا۔

دوسرا بند **جذب** : کھینچنا، کشش۔ **مہِ کامل** : پورا چاند۔ چودھویں رات کا چاند۔ **رہرو** : راستہ چلنے والی، مسافر۔ **گریزاں** : بھاگنے والی۔ **وسعتِ بحر** : سمندر کی فراخی۔

میں کبھی چودھویں رات کے چاند کی کشش سے اوپر اچھلتی ہوں۔ مراد یہ ہے کہ جب چاند کمال کو پہنچ جاتا ہے تو سمندر کی لہروں میں خاص جوش پیدا ہوتا ہے۔ طبعی جغرافیہ کے مطابق چاند سمندر کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس لیے موجیں زور شور سے اٹھتی ہیں۔ کبھی میں جوش کی حالت میں اپنا سر کنارے سے جا ٹکتی ہوں یعنی ٹکراتی ہوں۔ میں وہ مسافر ہوں جسے چلتے رہنے سے محبت[1] ہے۔ میں کیوں تڑپتی ہوں؟ یہ حقیقت میرے دل سے پوچھنی چاہیے۔ میں اس لیے تڑپتی ہوں کہ دریا کی تنگی کی تکلیف نہیں اٹھا سکتی اور اس سے دور بھاگتی ہوں۔ مجھے سمندر کی فراخی چاہیے، میں اس فراخی کی جدائی میں پریشان ہوں۔

---

[1] اس مصرع میں لفظ "منزل" کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ اول منزلِ مقصود، لیکن اس موج کی کوئی خصوصیت نہیں۔ ہر رہرو کو منزلِ مقصود سے محبت ہوتی ہے۔ اور رہروی کا مدعا ہی یہ ہوتا ہے کہ منزلِ مقصود پر پہنچ جائے۔ دوسرے معنی مسافت یا چلنے کے ہیں۔ "منزل" اردو زبان میں یہ معنی بھی دیتا ہے اور یہی معنی ہم نے مراد لیے ہیں۔

رخصت اے بزمِ جہاں!

تمہیدی نوٹ: جیسا کہ اقبال نے خود لکھا ہے۔ یہ نظم ایمرسن کے کلام سے ماخوذ ہے۔ مارچ ۱۹۰۴ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی۔ اس کے ستائیس شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں صرف اکیس باقی رکھے گئے۔

مدیرِ "مخزن" نے اس پر نوٹ لکھا کہ اقبال انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ جلسے کے لیے نظم لکھنے کے لیے بے حد مصروف تھے۔ "مخزن" کی ترتیب کا وقت آیا تو ان کے پاس کوئی نئی نظم نہ تھی۔ یہ دل پذیر نظم انھیں دنوں میں "دکن ریویو" میں چھپی تھی۔ اسے بعض ضروری ترمیمات کے بعد "مخزن" میں بہ غرض اشاعت عنایت فرمایا۔ ("مخزن" بابت ماہ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۴۲)

پہلا بند | **درخورِ محفل:** محفل کے قابل۔ محفل کے لایق۔ محفل کے شایاں۔ **اجنبیّت:** بے گانگی۔

خود آرا: لفظی معنی اپنے آپ کو سجانے والے۔ مراد ہے خود پسند، خود بین۔

اے دنیا کی محفل! میں تجھ سے رخصت ہو کر اپنے اصلی وطن کی طرف جا رہا ہوں تو اگرچہ خوب آباد ہے اور تیری وسعت میں قریوں، بستیوں، شہروں اور انسانوں کی کمی نہیں، لیکن ان میں اپنا کوئی نہیں۔ سب خود غرض ہیں اور ایک دوسرے سے بیگانہ۔ ان سب کی بے گانگی کو سامنے رکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ تیری محفل آباد نہیں بلکہ ویرانہ ہے یعنی بظاہر آباد ہے حقیقت میں آباد نہیں۔ اس بہ ظاہر آباد اور حقیقتاً غیر آباد مقام سے بہت گھبراتا ہوں۔ وطن سے یہاں مراد ہے دنیا کو ترک کر کے الگ تھلگ ہو جانا۔

میرا دل بہت بجھا ہوا ہے۔ میں محفل میں بیٹھنے کے لایق نہیں۔ اے دنیا کی محفل! نہ تو میرے قابل ہے، نہ میں تیرے قابل ہوں۔ یہاں بادشاہوں کے دربار لگتے ہیں۔ وزیروں کی عشرت گاہیں ہیں۔ ان میں جانے کے آداب ہیں۔ جب تک انسان ان آداب کی پابندی نہ کرے، اسے درباروں اور عشرت گاہوں میں بار نہیں مل سکتا۔ یہ سنہری زنجیریں ہیں جنھوں نے انسان کو قید کر رکھا ہے۔ میں ان زنجیروں کو توڑ کر نکل جاؤں گا۔ تیرے ہنگاموں میں اگرچہ بظاہر بڑی لذت ہے، لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ تیری جان پہچان اور تیری دوستی میں بیگانگی سی پائی جاتی ہے یعنی حقیقی محبّت اور خلوص کہیں نہیں۔

میں بڑی دیر تک تیرے خود پسند اور خود بین لوگوں کی صحبت میں بیٹھتا رہا لیکن اس زمانے میں اس طرح بے قرار رہا جس طرح لہر سمندر میں بے قرار ہوتی ہے۔ میں دیر تک تیرے عیش و عشرت کے ہنگاموں میں شریک رہا اور اندھیرے

میں بیٹھ کر روشنی کی تلاش میں لگا رہا۔ میں دیر تک ڈھونڈتا رہا کہ شاید اس کانٹے میں پھول نظر آجائے۔ اس خود غرض اور خود پسند دنیا میں سچی محبت اور خلوص کی جنس مل جائے۔ افسوس وہ جنس نہ ملی اور وہ یوسف تیرے بازار میں میرے ہاتھ نہ آیا۔ میری حیران آنکھ اب کسی اور نظارے کو ڈھونڈتی ہے۔ طوفان کے تھپیڑوں نے مجھے بے دم کر رکھا ہے۔ اب مجھے کنارے کی تلاش ہے یعنی تیری خود غرضیوں میں بڑے دکھ اٹھائے، بڑی تکلیفیں سہیں۔ وہی حالت ہو گئی جو سمندر میں طوفان کے مارے کی ہوتی ہے۔ اب میں پُرسکون مقام پر بیٹھ کر سستانا اور آرام لینا چاہتا ہوں۔ لہٰذا فیصلہ کر لیا ہے کہ تیرے باغ سے خوشبو کی طرح باہر نکل جاؤں۔ اے دنیا کی محفل! میں تجھے چھوڑ کر وطن جا رہا ہوں۔

دوسرا بند | **نرگسِ شہلا**: نرگس کے پھول کی ایک قسم جس میں زردی کے بجائے سیاہی ہوتی ہے اور جو بہت بڑھیا سمجھی جاتی ہے۔ **کنجِ تنہائی**: اکیلے رہنے کا گوشہ۔

میں نے پہاڑ کے دامن میں گھر بنا لیا ہے۔ وہاں کا سماں شور و شر اور ہنگاموں سے بالکل پاک ہے۔ ہر طرف خاموشی ہی خاموشی چھائی ہے۔ جو مزہ اس خاموشی میں ہے، وہ بات چیت کے راگ میں کب نصیب ہو سکتا ہے؟ میں کالی نرگس کے پاس بیٹھتا ہوں۔ میں پھول کا ساتھی ہوں۔ باغ میرا وطن ہے۔ میں بلبل کا پڑوسی ہوں۔ شام کے وقت بہنے والے چشموں کی آواز میرے لیے لوری بن جاتی ہے اور میں سو جاتا ہوں۔ سبزہ میرا بستر ہوتا ہے اور صبح کے وقت کوئل اپنی کوک سے مجھے جگا دیتی ہے۔ زندگی کی محفل میں ہر شخص چاہتا ہے کہ اپنے ہم جنسوں میں بیٹھے اور عیش و عشرت سے دل بہلائے، لیکن شاعر کے دل کو تنہائی کا گوشہ پسند ہے۔ وہ سب سے الگ تھلگ رہنا چاہتا ہے۔

تیسرا بند | **پیامی**: پیغام سنانے والا۔ **گوش برآواز**: جس کے کان صدا پر لگے ہوئے ہوں۔ **حیرت کدہ**: حیرانی کا مقام۔ وہ جگہ جہاں حیرانی کے سوا کچھ نہ ہو۔

کیا میں دیوانہ ہوں کہ آبادی سے دور بھاگتا ہوں؟ میں پہاڑ کی وادی میں کسے ڈھونڈتا پھرتا ہوں؟ کس کا عشق مجھے سبزہ زاروں میں پھراتا اور چشموں کے کناروں پر سلاتا ہے؟ اے غافل! تو مجھے طعنہ دیتا ہے کہ میں تنہائی کے گوشے کا شیدائی ہوں۔ تجھے یہ معلوم نہیں کہ میں قدرت کی محفل کا پیغام پہنچانے والا ہوں۔ میں شمشاد کا ہم وطن ہوں۔ میں قمری کے بھید سے واقف ہوں۔ اس باغ کی خاموشی میں کسی کی صدا پر کان لگائے بیٹھا ہوں۔ جو سنتا ہوں، اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ وہی اوروں کو سناؤں۔ کچھ دیکھتا ہوں تو وہ بھی اوروں کو دکھانے کے لیے۔ میرا دل تنہائی کا عاشق ہے اور مجھے اپنی تنہائی کی جگہ پر اپنا تنہائی فخر ہے۔ یہاں تک کہ میں دارا اور سکندر جیسے عظیم الشان بادشاہوں کے تخت کی بھی ہنسی اڑاتا ہوں۔ شام کا وقت ہو، انسان درخت کے نیچے لیٹا ہوا ہو۔ شام کے تارے پر رہ رہ کر نظر

پڑتی ہو۔ یقین جانو کہ یہ کیفیت جادو کا اثر رکھتی ہے۔ علم سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ حیرانی کے سوا کیا ہے؟ حیرانی کے اس گھر میں وہ کیفیت کہاں پیدا ہو سکتی ہے کہ پھول کی ایک پتّی میں کائنات کا بھید کھلا ہوا نظر آتا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ جس آنکھ میں حقیقت کو دیکھنے والی نظر ہو اور اس پر علم کی حیرانی کا کوئی اثر نہ ہو۔ وہ پھول کی ایک پتّی میں کائنات کا راز دیکھ سکتی ہے۔

طفلِ شیرخوار

تمہیدی نوٹ: یہ نظم فروری ۱۹۰۵ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ "رخصت اے بزمِ جہاں" اگرچہ اس سے ایک مہینہ بعد "مخزن" میں چھپی تھی لیکن وہ پہلے لکھی جا چکی تھی۔ اس لیے کہ "مخزن" نے اسے "دکن ریویو" سے لے کر چھاپا تھا۔ "طفلِ شیرخوار" کے بیس شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں صرف بارہ رکھے گئے۔

پہلا بند | **نو واردِ اقلیمِ غم:** غم کے ملک میں نیا نیا آنے والا یعنی وہ وجود جسے غم اور رنج کا احساس پہلے پہل ہو۔

اے بچّے! میں نے تجھ سے چاقو چھین لیا تو تو نے رونا شروع کر دیا۔ میں نے تو پیار اور ہمدردی سے ایسا کیا تو نے سمجھ لیا کہ میں نے تجھے دکھ پہنچانا چاہا۔ دیکھ! قلم کی باریک نوک ہاتھ میں چُبھ جائے گی۔ اے غم و رنج کی ولایت میں نئے نئے آنے والے! پھر روتا رہے گا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ دکھ دینے والی چیزیں تجھے کیوں پیاری لگتی ہیں؟ یہ کاغذ کا ٹکڑا پڑا ہے جس سے تجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔ لے اس سے کھیلا کر۔

دوسرا بند | **آزادِ غبارِ آرزو:** آرزو کی گرد سے پاک۔ **نوزائیدہ:** جو نئی نئی پیدا ہوئی ہو۔ **آزادِ قیدِ امتیاز:** فرق و تمیز کی پابندی سے آزاد۔ **ہویدا:** ظاہر۔ روشن۔

بچّوں کے عام کھلونوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیری گیند کہاں ہے اور وہ چینی کی بلّی کدھر ہے؟ وہی چھوٹی سی بلّی جس کا سر ٹوٹا ہوا ہے۔ تیرے دل کا آئینہ آرزو کی گرد سے پاک تھا یعنی اسے کوئی خواہش نہ تھی۔ جونہی تیری آنکھ کھلی، آرزو کی چنگاری چمک اٹھی۔ تیری آرزو تیرے ہاتھ کی حرکت اور تیرے دیکھنے کے طریقے میں چھپی ہوئی ہے۔ جس طرح اس دنیا میں نیا آیا ہے، اسی طرح تیری آرزو بھی ابھی پیدا ہوئی ہے۔

مطلب یہ کہ بچّہ ہر شے کو دیکھتے ہی اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ گویا اس کے ہاتھ کی جنبش اور دیکھنے کے انداز میں اس کی آرزو نمایاں ہوتی ہے۔

اے بچّے! تیری زندگی فرق و تمیز کی پابندیوں سے آزاد ہے۔ شاید تیری آنکھوں پر قدرت کا بھید ظاہر ہے۔

مطلب یہ کہ جو وجود قدرت کے بھید سے آگاہ ہو وہ فرق و امتیاز کی زنجیروں میں جکڑا نہیں رہ سکتا۔

تیسرا بند | ہم آہنگ: ہم نوا۔ ساتھی۔ تلوّن آشنا: جس کا مزاج ایک حالت پر قائم نہ رہتے اور لحہ بہ لحہ بدلتا جائے۔

اے بچّے! جب تو کسی چیز کے لیے مجھ سے ناراض ہو جاتا ہے تو رونے چلاّنے لگتا ہے۔ یہ عجیب تماشا ہے کہ ردّی کا غذ کا ٹکڑا تیرے ہاتھ میں دے دیا جائے تو راضی ہو جاتا ہے۔ میں بھی جلد بگڑنے اور آسانی سے راضی ہو جانے کی عادت میں تجھی سا ہوں۔ تیرا مزاج بھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتا اور لحہ بہ لحہ بدلتا جاتا ہے۔ میری بھی یہی کیفیت ہے۔ میں بھی عارضی لذّت پر مرتا ہوں اور وہ حاصل نہ ہو تو چلاّنے لگتا ہوں۔ جس طرح جلد غصّہ آجاتا ہے اسی طرح جلد راضی ہو جاتا ہوں۔ تیری طرح میری آنکھوں کو بھی ظاہری حسن مزہ لیتا ہے۔ تیری بے سمجھی سے میری بے سمجھی کم نہیں۔ تیری طرح میں بھی کبھی روتا ہوں اور کبھی ہنستا ہوں۔ دیکھنے کو میں نوجوان ہوں، حقیقت میں بے سمجھ بچّہ ہوں۔

تصویرِ درد

تمہیدی نوٹ: ولایت جانے سے پہلے اقبال نے پانچ طویل نظمیں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں میں پڑھیں۔ اوّل "نالۂ یتیم" دوم "یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے"، سوم "اسلامیہ کالج کا خطاب مسلمانانِ پنجاب سے"، چہارم "ابرِ گہر بار یا فریادِ اُمّت"، پنجم "تصویرِ درد"۔ ان میں سے پہلی چار نظمیں "بانگِ درا" میں شامل نہ کیں۔ فریادِ اُمّت کا صرف ایک بند "دل" کے عنوان سے باقی رکھا۔ "تصویرِ درد" کے دس بند اور ایک سو اٹھائیس شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں اس کا تیسرا اور ساتواں بند بالکل حذف کر دیے گئے۔ دوسرے بندوں کے بھی متعدد اشعار نظر انداز فرما دیے اور صرف انہتّر شعر باقی رکھے۔ یہ نظم الگ بھی چھپ گئی تھی۔ "مخزن" نے اسے مارچ ۱۹۰۴ء کی اشاعت کے ساتھ بطور ضمیمہ چھاپا اور اس پر نوٹ دیا کہ یہ دل پذیر نظم انجمن حمایتِ اسلام کے انیسویں سالانہ جلسے میں پڑھی گئی تھی۔ رسالہ تیار ہو چکا تھا۔ زائد

صفحے لگا کر اسے چھاپا جا رہا ہے۔ تاکہ ناظرین جلد اس سے محظوظ ہو سکیں اور انھیں ماہ آیندہ تک انتظار نہ کرنا پڑے۔ نظم کے ابتدائی دو بند تمہیدی ہیں۔ تیسرے بند سے اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔ ترکیب بند اگرچہ بہت پہلے سے اردو شاعری میں رواج پا چکے تھے لیکن اس نظم یا اس سے پیشتر "فریادِ اُمّت" میں اقبال نے بالکل نیا طریقہ اختیار کیا، یعنی کچھ بند ابتدا میں بہ طور تمہید لکھے تھے، جیسے شعرا کے قصیدوں میں تشبیبیں ہوتی تھیں۔ پھر نفسِ مطلب پہ آتے تھے۔ اس کے بعد بھی کچھ اشعار نفسِ مطلب سے متعلق ہوتے تھے، کچھ بیان و معانی کی نُدرت اور محاسن کے لحاظ سے موزوں معلوم ہوتے تھے، اگرچہ انھیں بالتصریح نفسِ مطلب سے زیادہ گہرا تعلق نہ ہوتا تھا۔ اس نظم کے ابتدائی دو بند بھی تمہیدی ہیں۔

پہلا بند **منّت کشِ تابِ شنیدن**: سننے کی طاقت کا احسان اٹھانے والی۔ **حیاتِ جاوداں**: ہمیشہ کی زندگی۔ **مرگِ ناگہاں**: اچانک موت۔

میری کہانی سننے کی احسان مند نہیں۔ میری خاموشی ہی میری گفتگو ہے اور میری بے زبانی ہی میری زبان بنی ہوئی ہے، یعنی میرے دُکھ درد کا حال کوئی نہیں سنتا، لہٰذا میں نے خاموشی کو اپنی گفتگو سمجھ لیا ہے اور بے زبانی کو زبان۔ سنائے بغیر ہی میری حالت سے سب کچھ ظاہر ہے۔ اس محفل میں زبان بند رکھنے کا کیا قاعدہ جاری ہے کہ میری زبان بات کرنے کو ترس رہی ہے۔ میری کہانی کی کتاب کا شیرازہ کھل گیا ہے اور اس کے اجزا باغ میں ہر طرف بکھر گئے ہیں۔ کچھ ورق لالے نے اٹھا لیے، کچھ نرگس نے اور کچھ گلاب کے پھول نے، یعنی باغ میں جا بجا قسم قسم کے پھول نظر آتے ہیں وہ بھی میرے ہی درد کے ترجمان ہیں۔ باغ کے پرندوں میں سے قمریاں، طوطیاں اور بلبلیں آہ و فریاد میں بہت شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ ان پرندوں نے بھی مجھی سے فریاد کا طریقہ سیکھا ہے، گویا میری ہی طرزِ فغاں لُوٹ لی ہے۔

میں سر سے پاؤں تک درد اور دُکھ ہوں۔ میری کہانی اتنی حسرت بھری ہے کہ شمع کو سنا دوں تو وہ آنسو بن کر پروانے کی آنکھ سے ٹپک پڑے یعنی یہ کہانی عاشق و معشوق دونوں کو رلا دینے والی ہے۔ اس دنیا میں رہنے کا مزہ جب ہو کہ مرنا جینا اپنے اختیار میں ہو۔ اے خدا! جب مجھے نہ ہمیشہ کی زندگی نصیب ہے، نہ جب چاہوں مر سکتا ہوں تو یہاں پھر رہنے کا کیا مزہ ہے اور یہ زندگی کس کام کی؟ میں جو روتا ہوں تو اسے صرف میرا رونا نہ سمجھو، یہ تو سارے باغ کا رونا ہے، یعنی میرے رونے کا سبب ہی یہ ہے کہ باغ آفتوں کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ اور یہ دردناک حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ بے اختیار آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ گویا میں خود نہیں رو رہا۔ باغ کی حالت مجھے رلا رہی ہے۔ میں وہ پھول ہوں کہ ہر پھول کی خزاں میری خزاں ہے، یعنی میں اپنے ہم جنسوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتا ہوں۔ اس حسرت بھرے مقام میں مدّت سے جرس بنا بیٹھا ہوں، یعنی میری حیثیت جرس کی ہے جس کی آواز پر قافلے منزلیں طے کرتے ہیں، لیکن دل کی تڑپ کے باعث

میری آواز باہر نہیں نکلتی۔ مجھ میں فریاد کا جوش موجود ہے۔ وہ فریاد بے صدا ہے، دل اندر تڑپتا رہتا ہے اور لب پر آہ نہیں آتی۔

دوسرا بند: حرفِ زیرِ لب: وہ بات اتنی آہستہ کہی جائے کہ سنائی نہ دے۔ شرمندۂ گوشِ سماعت: سماعت کے کان تک پہنچنے سے شرمندہ، یعنی جو بات کان تک نہ پہنچ سکے اور سنی نہ جائے۔ ممنون: احسان مند۔ سیرِ عرصۂ ہستی: زندگی کے میدان کی سیر۔

میں زندگی کے باغ میں وہ وجود ہوں جو عشرت کی محفل سے کبھی آشنا نہیں ہوا، یعنی جس نے خوشی کا منہ کبھی نہیں دیکھا۔ میں خوشی سے اس درجہ بے نصیب ہوں کہ خود خوشی کو بھی میری حالت پر رونا آرہا ہے۔ میں وہ بات ہوں جو اتنی آہستہ کہی جائے کہ سنائی نہ دے سکے اور کان تک نہ پہنچ سکے۔ اس بنا پر گویائی بھی میری بگڑی ہوئی تقدیر پر آنسو بہاتی ہے یعنی اگرچہ میرا مدّعا لب پہ آیا، لیکن کسی کے کان تک نہ پہنچ سکا لہٰذا اس کی بگڑی تقدیر پر گویائی کا رونا ہر لحاظ سے مناسب ہے۔ گویائی کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ دوسرے سنیں۔ جب کوئی بات کسی کو سنائی ہی نہ دے تو اس کی قسمت کے بگڑ جانے میں کسی کو شبہ نہیں رہ سکتا اور اس پر گویائی ہی کے لیے ماتم کرنا زیبا ہے کہ کہنے کی قوت صرف ہوئی اور نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

میں خاک کی ایک مٹھی ہوں جو ہر طرف پریشان پھر رہی ہو۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ میں سکندر ہوں یا آئینہ ہوں یا کدورت کی گرد ہوں یعنی انسان مشتِ خاک ہے، لیکن وہ اپنی ہمّت سے سکندر بھی بن سکتا ہے، صفائے باطن سے آئینہ بھی بن سکتا ہے اور کدورت کا گرد و غبار بھی بن سکتا ہے۔ یہ جو کچھ میں نے کہا، بلاشبہ درست ہے۔ پھر بھی میرا وجود قدرت کا مدّعا ہے۔ میں اگرچہ اندھیرا ہوں لیکن میری حقیقت سر سے پاؤں تک نور ہی نور ہے یعنی انسان اس کائنات کے بنانے کا اصل مدّعا ہے۔ وہ بہ ظاہر خاک کا پتلا ہے جس میں روشنی کی کوئی کرن نہیں، لیکن اگر اس کی حقیقت پر غور کیا جائے تو وہ سراپا نور ہے۔ وہ خود اپنی حقیقت کو پہنچ جائے تو نور ہی نور نظر آئے گا۔

میں وہ خزانہ ہوں جسے بیابان کی مٹھی بھر خاک نے چھپا رکھا ہے۔ کوئی کیا جانے کہ میں کہاں چھپا ہوا ہوں اور اس خزانے سے کون فائدہ اٹھائے گا؟ کون اس پر قبضہ کرے گا؟ میری نگاہ دنیا کے میدان کی سیر کا احسان نہیں اٹھاتی۔ میں بجائے خود ایک چھوٹی سی دنیا ہوں اور اپنے آپ ہی کو اپنی ولایت سمجھتا ہوں۔ میں نہ شراب ہوں، نہ شراب پلانے والا ساقی ہوں۔ نہ شراب کی مستی ہوں، نہ شراب کا پیالہ ہوں۔ میں زندگی کے شراب خانے میں ہر چیز کی اصل ہوں۔ میرے دل کا آئینہ دونوں جہانوں کے بھید مجھے دکھاتا ہے اور وہی کہتا ہوں جو میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔

اس آخری شعر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۰۲ء میں بھی، جب یہ نظم کہی گئی تھی۔ اقبال کی حقیقت بیں نگاہیں عام انسانی سطح سے بہت بلند تھیں۔ وہ عام شاعروں کی طرح محض فکر و تخیّل سے اشعار کے بُت نہ تراشتے تھے بلکہ اس

زمانے میں بھی صرف حقیقتیں ہی بیان کرتے تھے۔ اگرچہ اس دور کے کلام میں حقیقتوں کی جھلک کہیں کہیں نظر آتی ہے، بعد کے کلام کی یہ کیفیت ہے کہ قدم قدم پر حقیقتیں ہی جلوہ گر دکھائی دیتی ہیں۔

تلیسر ابند | جنونِ فتنہ ساماں : وہ دیوانگی جو فتنے اٹھائے۔ رزم آرائیاں : لڑائیوں کے لیے صفیں باندھنا۔ عنادل : عندلیب کی جمع۔ بلبلیں۔ اسلوبِ فطرت : قدرت کا دستور۔ گام زن : چلنے والا۔

دلکش شعر کہنے والے شاعروں میں قدرت کی طرف سے مجھے بیان کا ایسا انداز بخشا گیا ہے کہ عرش کی چھت کے پرندے میرے ہم نوا ہیں یعنی میں جو کچھ کہتا ہوں، اس کی گونج آسمان سے سنائی دیتی ہے۔ یہ بھی میری فتنے اٹھانے والی دیوانگی کا کرشمہ ہے کہ میرے دل کا آئینہ قضا کا رازدان بن گیا ہے، یعنی میرے دل پر وہی وارد ہوتا ہے جس کا فیصلہ قضا کر چکی ہے۔

اے ہندوستان! تیری حالت مجھے رلا رہی ہے۔ تیری کہانی سب کہانیوں سے زیادہ عبرت دلانے والی ہے۔ قدرت کے قلم نے مجھے تیرا ماتمی بنا دیا۔ یہ ماتم اور یہ گریہ وزاری ایسی ہے، گویا مجھے سب کچھ دے دیا، یعنی اے ہندوستان تیری حالت پر رونا بھی قدرت کی سب سے بڑی بخشش ہے

اے پھول چننے والے! اس باغ میں پھول کی ایک پتی تک کا نشان بھی نہ چھوڑنا۔ تو خوش نصیب ہے کہ باغ کے رکھوالے ایک دوسرے سے لڑائی کے لیے صفیں باندھے ہوئے ہیں۔

اس شعر میں باغ سے مراد ہے ہندوستان، گلچیں سے مراد ہے انگریزی حکومت، باغبانوں سے مراد ہے، ملک کے باشندے۔ اقبال کہتا ہے کہ جب ملک کے باشندے آپس میں لڑ رہے ہیں اور اپنے بچاؤ کے لیے متحد ہو کر کوئی تدبیر نہیں کر سکتے تو پھر حکمران کو اس ملک کے لوٹنے میں کیوں سوچ بچار ہو؟ یہ تو اس کی خوش نصیبی ہے کہ اسے روکنے کے لیے کہیں سے انگلی تک نہیں اٹھ سکتی۔ پھر کیوں نہ وہ ساری دولت سمیٹ کر لے جائے۔ واضح رہے کہ یہ شعر حکمران کے لیے لوٹ مار کی دعوت نہیں بلکہ اہلِ ملک کی پھوٹ پر طنز کا ایک چبھتا ہوا نشتر ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان سے کہا گیا ہے کہ آپس میں لڑتے رہو گے تو ملک کی کوئی بھی چیز سلامت نہ بچے گی۔

آسمان نے اپنی آستین میں بجلیاں چھپا رکھی ہیں۔ وہ کسی وقت بھی گھونسلوں پر گر سکتی ہیں۔ باغ کی بلبلوں کو چاہیے کہ اپنے گھونسلوں میں غافل ہو کر نہ بیٹھیں۔ اس نے پہلے شعر کی طرح اس شعر میں بھی اہلِ ملک کو غفلت کی نیند سے چونکایا گیا ہے کہ دیکھو، اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھو۔ آفت کی بجلیاں کسی وقت بھی تم پر گر سکتی ہیں۔

اے غفلت کے ماتو! میری فریاد سنو۔ یہ ایسی چیز ہے، جسے باغوں کے پرندوں نے اپنا وظیفہ بنا رکھا ہے اور ہر روز یہی وظیفہ پڑھتے ہیں۔

مطلب یہ کہ میں جو کچھ کہتا ہوں، یہ کوئی انوکھی چیز نہیں بلکہ اس ملک کے در و دیوار زبانِ حال سے یہی فریاد کر رہے ہیں۔

اسے بے سمجھ! وطن کو بچانے کی کوئی تدبیر کر۔ دیکھ! مصیبت آنے والی ہے اور آسمانوں میں تیری بربادیوں کے مشورے ہو رہے ہیں۔ شاعر کا مقصود یہ نہیں کہ آسمانوں میں خوامخواہ بربادی کے مشورے ہو رہے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ جس سرزمین کے رہنے والے اپنی اچھائی بُرائی میں تمیز نہ کر سکیں اور بچاؤ کی ہر تدبیر سے غافل ہوں، قدرت کا دستور یہی ہے کہ اسے برباد کر دیتی ہے۔

تم پرانے زمانے کی کہانیوں میں الجھے ہوئے ہو۔ کوئی کہتا ہے، فلاں نے یہ کیا کوئی کہتا ہے، فلاں نے یہ کیا۔ بھلا ان پرانی کہانیوں میں کیا رکھا ہے اور انھیں کھول کھول بیان کرتے رہنے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ دیکھنے اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے، اس پر نظریں جاؤ۔ اسے سامنے رکھتے ہوئے اپنے بچاؤ کا کوئی سامان کرو۔

پرانے زمانے کی کہانیوں سے اقبال کی مراد بظاہر یہ ہے کہ انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کے لیے بعض مسلمان بادشاہوں کے ظلم و ستم کی کہانیاں گھڑیں اور بعض تنگ نظر ہندوؤں نے ان کہانیوں کو فرقہ داری کی آگ بھڑکانے کا ذریعہ بنا لیا۔ اقبال ان کہانیوں کے سچ جھوٹ سے قطع نظر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو کچھ ہو چکا اس کا ماتم کرتے رہنے سے کیا فائدہ؟ ماضی کو لوٹایا نہیں جا سکتا اور اس کے دامن کے داغ دھوئے نہیں جا سکتے۔ جو کچھ اب ہو رہا ہے، یا آئندہ ہونے والا ہے، اس کی طرف سے آنکھیں کیوں بند کر رہے ہو؟

اسے ہندوستانیو! کب تک چپ چاپ بیٹھے رہو گے؟ فریاد کی لذت پیدا کرو۔ تم پر جو ظلم ہو رہے ہیں ان کے خلاف اس زور سے آواز بلند کرو کہ زمین سے آسمانوں میں گونج پیدا ہو جائے۔ اگرچہ تم زمین ہی پر رہو۔ اسے ہندوستان والو! اگر تم سوچ سمجھ سے کام نہ لو گے اور موجودہ حالت کو نہ بدلو گے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مٹ جاؤ گے اور تاریخ کے صفحات پر بھی تمھارا کوئی نشان باقی نہ رہے گا۔ قدرت کا قاعدہ یہی ہے۔ فطرت کا دستور یہی ہے کہ جو عمل کرتا ہے، جو ہمت و جواں مردی سے کام لیتا ہے اور اپنی مدد آپ کرنے کے اصول پر چلتا ہے، وہی فطرت کا چہیتا بن جاتا ہے، اسی کو دنیا میں عزت اور اقبال نصیب ہوتا ہے۔

چوتھا بند۔ شغل سینہ کاوی: مراد ہے غم کھانے اور تڑپنے میں مشغول رہنا۔

میں آج اپنے چھپے ہوئے زخموں کو سب کے روبرو ظاہر کر کے رہوں گا اور لہو رو رو کر محفل میں باغ کا رنگ پیدا کر دوں گا میں اپنی چھپی ہوئی جلن سے ہر دل کی شمع روشن کر دینا چاہتا ہوں۔ اسے ہندوستان! تیری اندھیری راتوں میں اسی طرح

چراغاں کا سماں پیدا کر دوں گا۔ میں اپنی مٹھی بھر خاک کو باغ میں ہر طرف پھیلا کر رہوں گا۔ شاید اسی طرح کلیوں کی شکل میں درد والے دل پیدا ہو جائیں۔ اگر ان بکھرے ہوئے دانوں کو ایک ہی تسبیح کی شکل میں پرونا مشکل ہے تو میں اس مشکل کو آسان کیے بغیر دم نہ لوں گا۔ اے دوست! مجھے غم کھانے اور تڑپنے میں مصروف رہنے دے اس لیے کہ میں محبّت کے داغ کو ظاہر کیے بغیر نہ رہوں گا اور وہ اسی طرح ظاہر ہو سکتا ہے کہ میں غم کھاتا اور تڑپتا رہوں۔
داغِ محبّت نمایاں کرنے سے مراد یہ ہے کہ اہلِ ملک میل جول اور اتحاد کی برکتوں کا اندازہ کر لیں اور پھوٹ کی آفتوں سے نجات پائیں۔

میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ ساری دنیا کو دکھاؤں گا۔ اے دوست! تو بھی اسے دیکھ کر آئینے کی طرح حیران رہ جائے گا جو کچھ پردوں میں چھپا ہوا ہے وہ دیکھنے والی آنکھ سے چھپا نہیں رہ سکتا۔ وہ زمانے کے طور طریق دیکھ کر بھانپ لیتی ہے کہ کیا کچھ ہونے والا ہے اور کیا کرنا چاہیے۔

پانچواں بند | مثالِ نقشِ پا: پاؤں کے نشان کی طرح جو ہمیشہ زمین پر ہوتا ہے یعنی پست۔ دل بستۂ محفل: جس کا دل محفل سے بندھا ہوا ہو، یعنی محفل کا شیدائی۔ حیرت آشنا: حیرانی سے آشنائی رکھنے والا یعنی حیران۔ چلیپا: صلیب۔ سُولی۔ بُتِ پندار: تصوّر کا بُت یعنی تصوّر۔ مطلق: پوری طرح آزاد۔ مقیّد: قید کیا ہوا۔

اس بند میں کہیں ہندوستانی مخاطب ہیں، کہیں عام انسان اور زیادہ تر مسلمانوں سے خطاب ہے۔

تو نے اپنے دل کو بلندی کی لذت سے آشنا نہ کیا اور پاؤں کے نشان کی طرح ساری عمر پستی میں گزار دی۔ مراد یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں بلندی کی کوئی آرزو نہیں، وہ ایک زمانے سے پستی میں وقت گزار رہے ہیں۔ اگر ان کے حوصلے اونچے ہوں اور نگاہیں بلند تو کوئی وجہ نہیں کہ محکومی کی اس حالت پر قناعت کیے بیٹھے رہیں۔

تو صرف اپنی ہی محفل میں دل لگائے بیٹھا رہا اور اپنی نگاہوں سے محفل کی باہر کی حالت نہ دیکھی، ورنہ حیران رہ جاتا۔ مراد یہ ہے کہ ہندوستانیوں نے کبھی باہر کی قوموں کے حوصلوں اور ہمّتوں کی کیفیت نہیں دیکھی۔ انہیں ما لکل معلوم نہیں کہ قومیں کس طرح اوپر اڑی جا رہی ہیں اور ان کی حالت دیکھ کر انسان کس درجہ حیران رہ جاتا ہے۔

یہاں کے لوگ حسینوں کی اداؤں پر دل قربان کر رہے ہیں مگر دل کے آئینے میں اپنی ادا نہیں دیکھتے۔ اے بے سمجھ! تعصب چھوڑ دے۔ دنیا کے آئینہ خانے میں جو تصویریں تجھے نظر آ رہی ہیں اور تو انہیں برا سمجھتا ہے، یہ سب تیری ہی تصویریں ہیں یعنی سب انسان ہیں، لیکن تعصّب کی وجہ سے انھوں نے گروہ بندیاں کر لی ہیں اور ایک دوسرے کو بُرا قرار دے رہے ہیں۔

تو نے ہر ل کے دانے کی طرح اپنی فریاد گرہ میں باندھ رکھی ہے یعنی تیرے لب پر کوئی فریاد نہیں آتی حالانکہ یہ زندگی سراسر جلن ہے اور اس کے ظلم کے خلاف تجھے سر تا پا فریاد بن جانا چاہیے۔

اگر دل صاف ہو تو تعلقات کے رنگ کی سجاوٹ سے کیا حاصل ؟ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی بے سمجھ آدمی آئینے کی ہتھیلی پر مہندی لگائے۔

آئینے پر مہندی لگا کر اسے رنگین نہیں بنایا جا سکتا۔ اسی طرح صاف دل انسان بھی گروہ بندیوں کے جنجال میں نہیں پھنس سکتا۔ وہ سب کو اچھی نظر سے دیکھے گا، سب سے محبت کرے گا اور سب کی خیر خواہی کے لیے کوشاں رہے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک گروہ سے وابستہ ہو کر دوسروں کا مخالف بن جائے۔

تو ہر شے کو غلط رنگ میں دیکھتا ہے اور تیری اس حالت پر زمین کیا، آسمان بھی آنسو بہاتا ہے۔ اے مسلمان! اس سے بڑھ کر ظلم کیا ہو سکتا ہے کہ تو نے قرآن کی آیات کو صلیب بنا دیا ہے ؟ اس سے اقبال کی مراد غالباً یہ ہے کہ قرآن میں اطاعت امیر کے لیے جو ہدایت آئی ہے اس سے وقت کے بعض مولوی حضرات نے انگریزوں کی اطاعت کا مفہوم نکال لیا۔ اقبال کے نزدیک یہ ایسا ہی جرم تھا، جیسے قرآن کی سطر کو صلیب بنا دیا جائے۔ یہاں سے اقبال نظر بہ ظاہر واعظ کو خطاب کرتا ہے جیسا کہ اس بند کے ٹیپ والے شعر سے واضح ہے۔

اے واعظ! تو نے زبان سے خدا کے ایک ہونے کا دعویٰ کیا تو اس سے کیا حاصل ہوا ؟ حالت یہ ہے کہ تو نے اپنے تصور کے بت کو خدا بنا رکھا ہے۔ یعنی تو خدا کی پرستش نہیں کرتا تو اس کے حکموں پر نہیں چلتا بلکہ ان حکموں کو اپنے تصور کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور ان کی پیروی کرتا ہے۔

توحید عالمگیر تھی۔ اس کے جلوے ہر جگہ نظر آتے تھے۔ تو نے اسے اپنے تصورات کے سانچے میں ڈھال کر محدود کر دیا۔ اس طرح جو شے مطلق تھی وہ مقید ہو گئی۔ اے غفلت کے ماتے! یہ ایسی ہی بات ہے جیسے حضرت یوسفؑ کنویں میں بند ہو جائیں، حالانکہ وہ دنیا بھر کے لیے ہدایت کا نور بن کر آئے تھے۔ پھر تو منبر پر چڑھ کر دلکش انداز میں وعظ کہنے کی بھی آرزو رکھتا ہے، لیکن تیری زبان پر جو نصیحت آتی ہے وہ بھی ایک افسانہ ہوتی ہے۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ہمارے واعظ منبروں پر بیٹھ کر قوم کی ہدایت و رہنمائی کے بجائے عموماً ایسی باتیں کہا کرتے تھے جن کی حیثیت افسانوں سے زیادہ نہ تھی۔

چھٹا بند بوالہوس : ہوس میں الجھا ہوا۔ لوبھی۔ لالچی۔ خواہشات کا غلام۔ مجروحِ الفت : محبت کے زخمی۔ فکرِ درماں : علاج کی فکر۔

تو اپنی آنسوؤں بھری آنکھ کو وہ حسن دکھا جو دنیا کے دل میں عشق کی جلن پیدا کر دیتا ہے۔ وہی پروانے کو تڑپاتا ہے۔

وہی شبنم کو رلاتا ہے۔ آدمی کی آنکھ بنانے والے نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی بنائی ہے۔ اس کا مقصد یہی نہیں کہ چیزوں کو دیکھ لے۔

مراد یہ ہے کہ جو شے جس صورت میں نظر آتی ہے اُسے دیکھ لینا ہی کافی نہیں بلکہ اس کی حقیقت کو پہنچنا ضروری ہے۔

جمشید کے پیالے نے اگرچہ ساری دنیا کو دیکھ لیا تو کیا دیکھا۔ اس میں جمشید کو اپنی حقیقت تو نظر نہ آئی۔ فرقہ بندی ایک درخت ہے اور تعصّب اس کا پھل۔ یہی پھل ہے جو آدم کو جنّت سے نکلواتا ہے۔

اقبال برابر وہی پیغام دیتا آرہا ہے کہ فرقہ بندی چھوڑ دو، انسانیت کی وحدت پر نظر رکھو۔ سب کو ایک سمجھو، سب متحد ہو جاؤ تعصّب سے دور رہو۔

سورج کی کشش تو پھول کی ایک پتی بھی نہ اٹھا سکی۔ شبنم کو وہ کشش کیا اٹھائے گی ؟ شبنم تو خود اوپر اٹھنے کی آرزو میں اڑ جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب تک کسی کے دل میں سربلند ہونے کی آرزو پیدا نہ ہو اور وہ اس کے لیے جدوجہد نہ کرے۔ سربلند نہیں ہو سکتا۔ قدرت کسی کو اوپر نہیں اٹھاتی اور نہ کسی کو نیچے گراتی ہے۔ اس نے سربلندی کے جو قاعدے اور ضابطے مقرر کیے ہیں، ان پر جو چلے گا وہ اونچا مرتبہ حاصل کرے گا۔

محبت کے زخمی علاج کی فکر میں نہیں پھرا کرتے۔ وہ اپنا مرہم[1] آپ پیدا کر لیتے ہیں۔ یعنی انسان کے دل میں بنی نوع سے محبّت کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے۔ اور یہی محبت تمام بیماریوں کا علاج ہے۔ جس دل میں محبّت کی چنگاری پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ سراپا نور ہو جاتا ہے۔ محبّت ایسی شے ہے کہ ذرا سے بیج کو طُور کا باغ بنا دیتی ہے یعنی اس چنگاری سے ہر طرف تجلّی نظر آتی ہے۔

ساتواں بند **آزادِ احسانِ رفو**: زخم سلوانے کا احسان نہ لینے والا۔ **اسیرِ امتیازِ ما و تو**: ما و تو کے فرق کا قیدی۔ ایک دوسرے میں فرق کرنے والا۔ **استغنا**: بے پروائی۔

ہر دکھ کی دوا یہ ہے کہ انسان آرزو کی تلوار کا زخمی رہے۔ یعنی جب تک دل میں کسی مقصد کی آرزو پیدا نہ ہو، انسان اس کے لیے کام نہیں کر سکتا، لہٰذا ہر دکھ کی دوا آرزو ہے۔ زخم کا علاج یہ ہے کہ اسے سلوانے کا احسان نہ لیا جائے۔ یعنی ہر لحظہ انسان کا دل آرزو کے زخم سے تڑپتا رہے اور وہ جدوجہد جاری رکھے۔ میں بے خودی کی شراب پی کر آسمان تک اڑتا ہوں۔ میں نے رنگ کا امتیاز اڑا دیا ہے اور خود شیشے بن کر رہتا ہوں جس کا کوئی رنگ نہیں۔

اس شعر میں بے خودی کی شراب سے بظاہر یہ مراد ہے کہ شاعر کی نظر گروہوں میں محدود نہیں۔ وہ تمام انسانوں کو ایک جیسا سمجھتا ہے۔ شکستِ رنگ سے بھی اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے۔

وطن کا نوحہ پڑھنے میں میرے آنسو تھم نہیں سکتے۔ شاعر کی آنکھ کے لیے عبادت یہی ہے کہ ہر دم آنسو بہاتی رہے اور

---

[1] "بانگِ درا" میں کاتب کی غلطی سے "اپنے مرہم" کے بجائے "اپنی مرہم" لکھا گیا۔

انھیں آنسوؤں میں ڈوبی رہنے کو اپنا وضو سمجھے۔ ہم پھول کی شاخ پر کیا گھونسلا بنائیں۔ اس باغ میں رہنے کا کیا لطف ہے۔ جس میں بے آبروئی کے بغیر رہا نہ جاسکے۔ اگر تجھے حقیقتِ حال کا اندازہ ہو تو جان لے کہ آزادی محبت میں چھپی ہوئی ہے۔ یعنی محبت کے ذریعہ ہی سے آزادی مل سکتی ہے۔ اگر تو اپنے پرائے کے فرق میں قید رہے گا تو یقین رکھ کہ تجھے غلامی سے نجات نہیں مل سکتی۔ بلبلے کو دیکھ، وہ بے نیازی اور بے پروائی کی بدولت پانی میں بھی اپنا پیالہ الٹا رکھتا ہے۔ تجھے بھی اسی کے بلبلے کی طرح بے نیاز و بے پروا رہنا چاہیے۔

مراد یہ ہے کہ نہ حاکموں کی پروا کر، نہ ان سے دولت اور عزت کی امید رکھ۔ نہ اپنی کسی قومی خدمت کے لیے معاوضے کا طلب گار ہو۔ بلکہ بقول اقبال: عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر۔

تیری بہتری اسی میں ہے کہ اپنوں سے بے پروا نہ رہے۔ اے بیگانگی کے عادی! اس دنیا میں رہنا منظور ہے تو اس کا یہی ڈھنگ ہے۔ بنی نوعِ انسان کی محبت روح کو تازگی بخشنے والی شراب ہے۔ اسی شراب نے مجھے پیالے اور مٹکے کے بغیر مست رہنا سکھا دیا ہے۔ یعنی یہ شراب ایسی ہے جو نہ مٹکوں میں بھری جاتی ہے، نہ پیالوں سے پی جاتی ہے۔ میں اسی شراب سے سرشار ہوں۔ محبت ہی سے بیمار قوموں کو شفا ملی ہے۔ محبت ہی سے انھوں نے اپنے سوئے ہوئے نصیبے کو جگایا ہے۔ ان شعروں میں محبت کا لفظ اتحاد و اتفاق کے لیے استعمال ہوا ہے۔

آٹھواں بند سکوت آموز: خاموشی سکھانے والا۔ چپ کرا دینے والا۔

محبت کا بیابان غربت اور بے وطنی کا صحرا بھی ہے اور وطن بھی۔ یہ ویرانہ پنجرا بھی ہے، گھونسلا بھی اور باغ بھی۔

مطلب یہ ہے کہ محبت کے سلسلے میں ہر قسم کے حالات سے سابقہ پڑتا ہے۔ کبھی انسان کو سخت تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ محبت صرف مشکلات کا گھر ہے۔ اس لحاظ سے اسے وطن کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ آشیانے کی بھی اور باغ کی بھی۔ انسانوں کے جن خیر خواہوں نے اپنے ہم جنسوں کو آرام اور راحت پہنچانے کے لیے خوفناک تکلیفیں اٹھائیں، انسانی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ہر قسم کی سختیاں سہیں۔ قیدیں کاٹیں، اپنا خون پانی کی طرح بہایا، وہ سب انسانوں کی محبت ہی کا مقصد لے کر اٹھے تھے۔ ان کی یہی مصیبتیں لاکھوں ہم جنسوں کے لیے خوشیوں کی بہار بن گئیں۔

محبت ہی وہ منزل مقصود ہے جو منزل بھی ہے اور صحرا بھی۔ کشتی بھی ہے اور قافلہ بھی۔ راہبر بھی ہے اور ڈاکو بھی۔ یہ شعر بھی پہلے شعر کا ہم معنی ہے۔

محبت کو سب لوگ ایک بیماری سمجھتے ہیں، لیکن یہ ایسی بیماری ہے جس میں آسمان کے الٹ پھیر کا علاج چھپا ہوا ہے یعنی محبت کو اس لحاظ سے بیماری کہا جاتا ہے کہ اس میں پڑ کر انسان کو اپنی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ وہ اپنے نفع نقصان سے بے پروا ہو کر چاہتا ہے کہ اپنے محبوب و مطلوب کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے اور اس کی بہتری میں کوشش کا کوئی

دقیقہ اٹھا نہ رکھّے۔ قوموں کی آزادی اور بہبود کے لیے جن لوگوں نے اپنی زندگیاں قربان کر دیں وہ دیوانے نہ تھے۔ اپنے ہم جنسوں کی محبّت نے انھیں ان قربانیوں پر آمادہ کر دیا۔ اس لحاظ سے عام لوگ محبّت کو بیماری کہنے لگے۔ اس نقطۂ نگاہ سے بھی بیماری ہے کہ جب انسان کے دل میں محبّت کی تڑپ پیدا ہوتی ہے تو پھر وہ اپنی زندگی اسی تڑپ میں گزار دیتا ہے اور اور جب تک مقصد حاصل نہ ہو جائے چین نہیں لیتا، لیکن یہی بیماری ہے جو گری ہوئی قوموں کو اٹھا کر عزّت کے مرتبے پر پہنچانے کا ذریعہ ہے جس قوم میں قربانیاں کرنے والے خیر خواہ پیدا ہو جائیں وہ تقدیر کے چکروں سے نکل کر اقبال مندی کی نئی کروٹ لیتی ہے۔ اس طرح محبّت زمانے کی گردش کا علاج بن جاتی ہے۔

دل میں محبّت کی جلن پیدا ہو جائے تو وہ سر سے پاؤں تک نور بن جاتا ہے۔ یہ پتنگا جلنے لگے تو محفل کو روشن کرنے کے لیے شمع بن جاتا ہے۔ یعنی دل میں محبّت کا سوز پیدا ہوتے ہی انسان اپنے ہم جنسوں کے لیے روشنی کا سامان بن جاتا ہے۔

ایک ہی حُسن ہے جس کا جلوہ ہر شے میں الگ الگ نظر آتا ہے۔ وہی شیریں ہے، وہی بے ستون پہاڑ ہے اور وہی فرہاد ہے یعنی حُسن نے اگرچہ مختلف لباس اختیار کر لیے ہیں لیکن اس کے ہونے میں شبہ نہیں۔ پھر کیوں نہ ہر شے سے محبّت کی جائے؟ اور کیا وجہ ہے کہ حسن کے شیدائی لباس کے فرق میں الجھے رہیں اور حقیقت کو نہ دیکھیں؟

قوموں کو مذہب اور شرع کے اختلاف نے برباد کر ڈالا۔ یہی اختلاف ان جھگڑوں اور کشمکشوں کا باعث بنا اور ایک دوسری سے لڑ لڑ کر تباہ ہوتی رہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اے میرے وطنی بھائیو! تمھارے دل میں اپنے وطن کی بھی کچھ فکر ہے؟ اگر وطن کی فکر ہو تو آپس کی لڑائیاں اور جھگڑے چھوڑ دو اور اکٹھے ہو کر اس کی نجات پر کمربستہ ہو جاؤ۔

میری درد بھری داستان بہت لمبی ہے۔ وہ ختم نہیں ہو سکتی لہٰذا میں نے خاموشی ہی مناسب سمجھی، ورنہ میرے منہ میں زبان بھی ہے اور زبان میں کہنے کی طاقت بھی ہے۔

میرے دلی مدعا کا رشتہ اتنا لمبا تھا کہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا، لہٰذا میں نے اسے چھوڑ دیا۔ میری کہانی کی کوئی انتہا نہ تھی، اس لیے میں نے اسے خاموشی کے ذریعے سے بیان کرنا مناسب سمجھا یعنی چُپ ہو گیا۔

اقبال کی دعوت ابتدائی دور میں یہ تھی کہ ہندوستان کے تمام طبقے اپنے جھگڑے چھوڑ کر ملک کی خدمت کے لیے متحد ہو جائیں۔ اس دعوت کی جھلک متعدد نظموں میں پائی جاتی ہے۔ تصویرِ درد پوری کی پوری اسی رنگ روغن سے سجی ہوئی ہے۔ یہ آخری بڑی نظم ہے جس کے بعد اقبال کے نقطۂ نگاہ میں بہ ظاہر تغیّر پیدا ہوا، لیکن حقیقت میں وہ پہلے کی طرح برابر عالم گیر انسانی امن و محبّت کی دعوت دیتے رہے۔ ان کے نزدیک اسلام یہی دعوت لے کر دنیا میں آیا تھا۔ آگے چل کر انھوں نے اسی وجہ سے اپنی زندگی اسلامی دعوت کے لیے وقف کر دی۔

نالۂ فراق

آرنلڈ کی یاد میں

تمہیدی نوٹ: یہ نظم اقبال نے اپنے استاد ڈاکٹر آرنلڈ کی یاد میں لکھی تھی۔ ڈاکٹر آرنلڈ پہلے علی گڑھ کالج میں فلسفے کے پروفیسر مقرر ہوئے تھے۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں آگئے۔ اقبال ۱۸۹۵ء میں سیالکوٹ سے ایف اے پاس کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے تھے۔ غالباً بی اے اور ایم اے میں ڈاکٹر موصوف ہی سے فلسفہ پڑھا۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد بھی شفیق استاد سے ان کے گہرے تعلقات قائم رہے۔ ۱۹۰۴ء کے آغاز میں ڈاکٹر آرنلڈ ولایت چلے گئے اور انڈیا آفس کے کتب خانے میں لائبریرین مقرر ہو گئے۔ پھر وہ لندن یونیورسٹی کے سکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔ پریچنگ آف اسلام ان کی نہایت مشہور کتاب ہے۔ جس میں انھوں نے تاریخی شہادتوں کی بنا پر ثابت کیا کہ اسلام دنیا میں تلوار کے زور سے نہیں بلکہ اپنی خوبیوں کی بدولت پھیلا ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر موصوف نے بیس سال کی محنت کے بعد لکھی۔ اس کا اردو ترجمہ بھی شایع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر موصوف نے امام رازی کی تفسیر سے وہ تمام اقتباسات ایک کتاب کی صورت میں مرتب کیے۔ جو معتزلہ کی تفسیروں سے امام ممدوح نے جابجا درج کیے تھے۔ اقبال کو ان سے جو عقیدت تھی وہ نظم کے لفظ لفظ سے ٹپک رہی ہے۔

یہ نظم مئی ۱۹۰۴ء کے مخزن میں شایع ہوئی تھی اور اس کے آٹھ بند تھے۔ نظر ثانی میں تین بند حذف کر دیے گئے۔ اس نظم کے ساتھ اقبال نے خود اپنے قلم سے جو نوٹ شایع کرایا تھا، وہ ذیل میں درج ہے:

استاذی قبلہ مسٹر آرنلڈ کے ولایت تشریف لے جانے کے بعد ان کی جدائی نے اقبال کے دل پر کچھ اس قسم کا اثر کیا کہ کئی دنوں تک سکینت قلبی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ ایک روز زور تخیّل نے ان کے مکان کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا اور یہ چند اشعار بے اختیار زبان پہ آگئے، جن کی اشاعت پر احباب مجبور کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کی رخصت کے موقع پر بہت سے الوداعی جلسے کیے گئے اور ان میں بہت سی نظمیں پڑھی گئیں اور یہ نظم اس وقت لکھی بھی جا چکی تھی، تاہم اس خیال سے کہ اس میں میرے ذاتی تاثرات کا ایک دردآمیز اظہار تھا، کسی عام جلسے میں اس کا پڑھنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ آپ کی تشریف بری کے بعد دلی تاثرات کی شدت اور بھی بڑھ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نظم میں بہت سی تبدیلی ہو گئی۔

پہلا بند اے مکان! پر تجھ میں رہنے والا آخر مغرب کے ملک (ولایت) میں جا بسا۔ افسوس کہ مشرق کی سرزمین (پنجاب) اسے پسند نہ آئی۔ آج میرے دل کو اس سچائی کا یقین آگیا کہ جدائی کے دن کی روشنی رات کے اندھیرے سے کم نہیں ہوتی۔ مراد یہ ہے کہ شاعر عام طور روز فراق کو ظلمتِ شب سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ ڈاکٹر آرنلڈ کی جدائی نے مجھے بھی اس سچائی کا قائل کر دیا۔ جب سے میری نگاہ نے محبوب کی آغوش وداع سے حیرانی کے داغ چنے ہیں، وہ میری آنکھ میں بجھی ہوئی شمع کی طرح سو گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب حضرت استاد ولایت تشریف لے گئے اور مجھ پر بے اندازہ حیرانی طاری ہوئی، میری نظر آنکھ میں اسی طرح سو گئی، جیسے بجھی ہوئی شمع سو جاتی ہے۔ یعنی نظر نے کچھ اور گوارا نہ کیا۔ حیرانی کا خاصہ ہی یہ ہے کہ نگاہ میں دیکھنے کی قوت باقی نہ رہے۔

دوسرا بند **یادِ ایّامِ سلف:** گزرے ہوئے دنوں کی یاد۔

میں گوشہ عزلت یعنی تنہائی کا مارا ہوا ہوں۔ آبادی میں میرے دل پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ دیوانگی کے جوش میں شہر سے نکل جاتا ہوں۔ گزرے ہوئے دنوں کی یاد سے اپنے دل کو تڑپاتا ہوں۔ پھر اے مکان! تسلی حاصل کرنے کی غرض سے تیری طرف دوڑتا آتا ہوں۔ تیرے در و دیوار اگرچہ میری آنکھ کے جانے پہچانے ہوئے ہیں، لیکن میرے رنگ ڈھنگ سے بیگانگی ظاہر ہو رہی ہے۔ یعنی جب تک تجھ میں آرنلڈ صاحب موجود تھے، میں تیرا آشنا سا تھا، اب میں تجھ سے اجنبی معلوم ہوتا ہوں۔

تیسرا بند **خورشید آشنا:** سورج سے فیض پانے والا۔ **عالم نما:** جس میں سارا جہان نظر آئے۔

میرے دل کا ذرّہ سورج کے فیض سے چمکنے والا تھا۔ یہ ٹوٹا ہوا آئینہ ایسی صورت اختیار کرنے والا تھا کہ اس میں دنیا نظر آئے۔ میری آرزوؤں کا پودا ہرا بھرا ہونے والا تھا۔ افسوس، کسی کو کیا معلوم کہ میں کیا سے کیا بن جانے والا تھا رحمت کے بادل نے میرے باغ سے دامن سمیٹا اور چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ آرزو کی کلیوں پر برسا اور چھٹ گیا۔

چوتھا بند **ذروہ:** لفظی معنی کنگرہ۔ یہاں چوٹی یا بلندی مراد ہے۔ **بادِ نشاط افزا:** خوشی بڑھانے والی ہوا۔ **رہ پیمائی:** راستہ طے کرنا۔ چلنا۔

اے علم کے طور کی چوٹی کے کلیم! تو کہاں ہے؟ یہ خطاب ڈاکٹر آرنلڈ سے ہے۔ تیری سانس کی لہر وہ ہوا تھی، جس سے علم کی خوشی بڑھتی تھی، یعنی تیرے لکچروں سے ہمارے دل میں علم کی لذّت ترقی کرتی تھی۔ تیرے چلے جانے کے بعد علم کے صحرا میں چلنے کا پہلا سا شوق کہاں رہا؟ ہمارے سر میں علم حاصل کرنے کا جو سودا تھا، وہ تیرے ہی دم سے تھا۔ اب لیلا کا آوازہ کہاں ہے؟ اب اس کے حسن کا چرچا کدھر ہے کہ وہ پھر دیوانگی کی آرائش کرے یعنی پھر دیوانگی پیدا کرے۔ پھر مجنوں کی خاک کو صحرا کے دل کا غبار بنائے یعنی پھر ہم مجنوں بن کر علم کے صحرا میں اسی طرح چکّر لگائیں جس طرح گرد و غبار چکّر

لگاتے ہیں۔

پانچواں بند مجھے یقین ہے کہ تیری جدائی میں مجھ پر جو وحشت طاری ہو گئی ہے، اسی کا ہاتھ میری قسمت کی گتھی سلجھا دے گا۔ اور میں پنجاب کی زنجیر توڑ کر تیرے پاس پہنچوں گا۔ میری حیران آنکھ تیری تصویر پر لگی ہوئی ہے، لیکن جو دل تیری تقریر کا شیدائی ہو، اسے تصویر دیکھ کر کیا تسلی ہو سکتی ہے؟ تصویر کے منہ میں بولنے کی طاقت نہیں جسے خاموشی کہتے ہیں، وہی تصویر کی بات ہے۔

چاند

تمہیدی نوٹ

یہ نظم جولائی ۱۹۰۱ء کے مخزن میں شایع ہوئی تھی اور اس کے سترہ شعر تھے، نظرِ ثانی میں تیرہ باقی رہے۔

طالبِ خو: طلب کا عادی۔ **مُبیں**: روشن۔

اے چاند! اگرچہ تیرا وطن میرے ویرانے سے ہزاروں کوس دور ہے، مگر میرے دل کا سمندر تیری ہی کشش کے باعث لہریں لے رہا ہے، یعنی تجھے دیکھ کر میرے دل میں جذبات کا طوفان اٹھتا ہے۔ اس شعر میں طبعیات کا یہ اصول پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ چاند کی وجہ سے سمندر میں لہریں پیدا ہوتی ہیں۔

تو کس محفل کی طرف جا رہا ہے اور کس محفل سے آ رہا ہے؟ تیرا منہ شاید اس لیے پیلا پڑ گیا کہ لمبے سفر کی زحمت اٹھائی ہے۔

پیدایش کے لحاظ سے تو سراسر نور ہے اور میں اندھیرا ہوں یعنی تو نوری ہے، میں خاکی ہوں۔ اس سیاہ بختی اور بدنصیبی کے باوجود میری قسمت بھی تیری قسمت سے ملتی جلتی ہے۔

میں دیدار کے شوق کی جلن میں جل رہا ہوں اور تو سورج کے احسان کا داغ اٹھانے کی وجہ سے سراپا جلن بنا ہوا ہے یعنی تو بھی جل رہا ہے اور میں بھی جل رہا ہوں۔ میری جلن کا باعث یہ ہے کہ مجھے حُسنِ مطلق کے دیدار کا شوق ہے۔ تیری جلن کا سبب یہ ہے کہ تو سورج سے روشنی لے کر نورانی بنا اور اس احسان کے داغ نے تجھے سراپا سوز بنا دیا۔

تیری رفتار ایک حلقے پر قائم ہے۔ تو برابر ایک خط پر چلا جا رہا ہے اور بار بار اسی کا چکر کاٹتا ہے۔ میں بھی پرکار کی گردش کی طرح برابر ایک ہی دائرے میں گھوم رہا ہوں۔

تو زندگی کے راستے میں سرگردان ہے تو میں حیران ہوں۔ تو کائنات کی محفل میں چمکتا ہے تو میں جل رہا ہوں۔
میں بھی منزلِ مقصود کے راستے میں ہوں، تو بھی منزلِ مقصود کے راستے میں ہے۔ تیری محفل پر جو خاموشی چھائی ہوئی ہے وہ میرے دل پر بھی چھائی ہوئی ہے۔
تو کسی کی تلاش میں لگا ہوا ہے، میرا طریقہ بھی یہی ہے یعنی میں بھی تلاش میں ہوں۔ تیرا نُور چاندنی ہے۔ میرا نور عشق ہے۔
جہاں میں رہتا ہوں، وہاں میری بھی ایک انجمن ہے، یعنی میرے اردگرد انسانوں کی کمی نہیں، لیکن جس طرح تو اپنی محفل میں اکیلا ہے۔ اُسی طرح میں اکیلا ہوں۔
تیرے حق میں سورج کی روشنی موت کا پیغام بن جاتی ہے، مجھے حُسنِ ازل کا جلوہ مٹا دیتا ہے۔
یہاں تک اقبال نے اپنے آپ کو چاند کے مشابہ قرار دیا، لیکن اب دونوں کے درمیان بنیادی فرق واضح فرماتے ہیں۔ کہتے ہیں:
اے روشن چاند! ان یکسانیوں کے باوجود میں اور ہوں، تُو اور ہے۔ جس پہلو میں درد اٹھتا ہے، وہ تجھے نصیب نہیں۔ وہ پہلو اور ہوتا ہے۔
میں اگرچہ سر سے پاؤں تک اندھیرا ہوں اور تُو سراسر نُور ہے، لیکن تو آگاہی کے ذوق سے سینکڑوں منزل دُور ہے یعنی انسان میں آگاہی کا جو شعور ہے، وہ چاند کو نصیب نہیں، بلکہ کائنات کی ہر شے اس سے بے نصیب ہے۔
آگاہی کی تشریح فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری زندگی کا جو مقصد ہے، وہ مجھے معلوم ہے، لیکن اس چمک سے تیری پیشانی محروم ہے یعنی تجھے اپنی ہستی کا مقصد معلوم نہیں۔
اس نظم میں بھی آدمِ خاکی کو کائنات کی تمام چیزوں سے جن میں نورانی چیزیں بھی شامل ہیں، افضل ثابت کیا ہے اور وہ بنیادی سبب بتایا ہے جس نے انسان کو سب سے اونچے مرتبے پر پہنچایا یعنی اپنی ہستی کے مقصد سے آگاہی۔ انسان اس مقصد سے بے خبر ہو وہ انسانیت کے درجے سے گر جائے گا۔

بلال رضی اللہ عنہ

تمہیدی نوٹ: یہ نظم ستمبر ۱۹۰۴ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی اور اس کے سولہ شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں تین حذف کر دیے۔
سب سے پہلے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے حالات اختصاراً بیان کر دینے مناسب معلوم ہوتے ہیں:

جن کی ذاتِ گرامی سے اس نظم نے شرف پایا ——— بلال نام، ابوعبداللہ کنیت، والد کا نام رباح، والدہ کا نام حمامہ، حبشی الاصل غلام تھے۔ مکّہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان خوش نصیب ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے اسلام کی دعوت پر لبیک کہنے میں سبقت کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پہلے سات مسلمانوں میں سے ایک بلال رضی اللہ عنہ تھے۔ چونکہ غلام تھے، اس لیے سب سے بڑھ کر ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ ظالم قریش انھیں تپتی ہوئی ریت، جلتے ہوئے سنگریزوں اور دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹاتے تھے۔ ان کے گلوئے مبارک میں رسیاں ڈال کر لڑکے بازاروں میں کھینچتے پھرتے۔ ابوجہل انھیں منہ کے بل سنگریزوں پر لٹا کر چکّی کا پاٹ اوپر رکھ دیتا۔ جب دھوپ تیز ہو جاتی اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر بے قراری کی حالت طاری ہوتی تو کہتا: "بلالؓ! اب بھی خدائے محمدؐ سے باز آ۔" اس شیدائے حق کی زبانِ مبارک پر اس وقت بھی اَحَد اَحَد کا ترانہ جاری ہوتا۔

امیّہ بن خلف کبھی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو گائے کی کھال میں لپیٹتا، کبھی لوہے کی زرہ پہنا کر تیز دھوپ میں بٹھا دیتا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک روز اُن پر ظلم ہوتے دیکھے تو دردناک نظارہ برداشت نہ کر سکے، بھاری رقم معاوضے میں دے کر انھیں خرید ا اور آزاد کر دیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سُنا تو فرمایا: "ابوبکرؓ! مجھے بھی اس میں شریک کر لو۔" عرض کیا: "یا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم میں آزاد کر چکا ہوں۔"

ہجرت کے بعد عبداللہ بن عبدالرحمٰن خثعمی سے بھائی چارا ہوا جو ابورویحہ کی کنیت سے مشہور تھے اور اتنی گہری محبت پیدا ہو گئی کہ جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں جہاد کی غرض سے شام جانے کا ارادہ کیا تو اپنا وظیفہ وصول کرنے کا مختار بھی ابورویحہ ہی کو بنایا۔

حضرت بلالؓ کی آواز نہایت بلند و دلکش تھی۔ نماز کے بلاوے کے سلسلے میں اذان کا طریقہ جاری ہوا تو سب سے پہلے حضرت بلالؓ ہی اذان دینے پر مامور ہوئے۔ وہ اذان دیتے تو سب لوگ کاروبار چھوڑ کر بیتابانہ ان کے اردگرد جمع ہو جاتے، یہاں تک کہ بچے بھی کھیل کود چھوڑ دیتے۔ فتح مکّہ کے بعد حضرت بلالؓ ہی نے خانۂ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر سب سے پہلی اذان دی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اذان نہ دینے کا عہد کر لیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ میں ٹھہرے رہنے پر اصرار کیا اور کہا:

"بلالؓ! میں تمھیں خدا اور اپنے حق کا واسطہ دیتا ہوں کہ بڑھاپے میں مجھے جدائی کا داغ نہ دو۔" اس لیے ٹھہرے رہے لیکن حضرت عمرؓ کی خلافت میں جہاد کی غرض سے شام چلے گئے۔ جب حضرت عمرؓ نے شام کا دورہ کیا تو ایک روز حضرت بلالؓ سے اذان کی فرمائش کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خواہش پوری کرنے کے لیے اذان

دی جہاں تک آواز پہنچی، لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کی یاد تازہ ہو گئی اور سب تڑپ اٹھے۔ حضرت ابو عبیدہؓ، حضرت معاذ بن جبل بے اختیار رو رہے تھے۔ خود حضرت عمرؓ کی ہچکی بندھ گئی۔

ایک مرتبہ شام سے مدینہ تشریف لائے تو حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی خواہش پر صبح کے وقت اذان دی۔ اس موقع پر لوگوں کی بے قراری کا پھر وہی منظر رونما ہوا جو حضرت فاروقؓ کے سفر شام میں دیکھا گیا تھا۔ ۲۰ھ میں دمشق میں وفات پائی۔ باب الصغیر کے قریب دفن ہوئے۔ ان کی قبر پر ایک چھوٹا سا قبہ بنا ہوا ہے جو زیارت گاہِ عام ہے۔

اقبال نے نظم میں حضرت بلالؓ کے عشقِ رسولؐ ہی کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا ہے اور عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی دراصل اس نظم کا موضوع ہے۔

پہلا بند | **آستان**: چوکھٹ۔ بارگاہ۔ یہاں مراد ہے بارگاہِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم سے۔

اے بلالؓ! تیری قسمت کا ستارہ چمکا تو تجھے حبش سے اٹھا کر حجاز لے آیا۔ مطلب یہ نہیں کہ خود حضرت بلالؓ حبش سے حجاز آئے۔ جیسا کہ تمہیدی نوٹ میں بتایا جا چکا ہے۔ وہ مکہ ہی میں پیدا ہوئے لیکن حبشی الاصل ہونے کے سبب سے اقبال نے یہ لکھا کہ حبش سے ان کی خوش قسمتی انھیں حجاز لائی اور اس خوش قسمتی پر کسے رشک نہ ہوگا۔

حبش سے حجاز آنا دیس چھوڑ کر پردیس آنا تھا، چونکہ حضرت بلالؓ غلام تھے، اس لیے بہ درجۂ مجبوری انھیں یا کہنا چاہیے کہ ان کے والدین کو وطن چھوڑنا پڑا اور وہ بے وطنی کے غموں میں مبتلا ہوئے۔ لیکن یہی غموں سے بھرا ہوا گھر حضرت بلالؓ کی آبادی کا سامان بن گیا یعنی وہ مکہ میں نہ ہوتے تو دینِ حق کی صدا ان کے کانوں میں کیونکر پہنچتی اور وہ بلند مقام کس طرح حاصل ہوتا جو شہنشاہوں کے لیے بھی باعثِ رشک ہے؟ بلالؓ کی زندگی کا آغاز غلامی سے ہوا تھا۔ اقبال کہتے ہیں کہ پرائے وطن میں غلامی سے اٹھ کر یہ درجہ حاصل کرنا ایسا ہے کہ انسان حضرت بلالؓ کی غلامی پر ہزاروں آزادیاں قربان کر دے۔ اے بلالؓ! تجھ سے رسولِ پاکؐ کی چوکھٹ ایک دم کے لیے بھی نہ چھوٹی۔ حضورؐ کے عشق کے طفیل تجھے مخالفوں کے ظلم و ستم میں بھی لطف آتا رہا۔ عشق میں جو ظلم ہوتے ہیں انھیں ظلم نہ کہنا چاہیے کہ اگر ظلم نہ ہو تو محبت میں مزہ ہی کیا ہے؟

دوسرا بند | **سلیمانؓ**: مراد ہے حضرت سلمانؓ فارسی سے جو حضرت بلالؓ کی طرح عاشقِ رسولؐ تھے۔ اور اسلام کی خاطر تمام رشتے قطع کر دیے تھے، اسی لیے مشہور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمانؓ کو اپنے اہل بیت میں سے قرار دیا تھا۔ مشہور شاعر سلمان ساوجی کہتا ہے:

چون محمد گفت: "السلمان منا اہل بیت"

اداشناس: ادا پہچاننے والی۔ **اویس**: حضرت اویسؓ قرنی جن کے متعلق مشہور ہے کہ رسول اللہ

کے نادیدہ عاشق تھے۔ عمر بھر زیارت نصیب نہ ہوئی۔ اس لیے کہ والدہ بہت ضعیف تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ ماں کی خدمت کرتے رہو۔ **جانِ ناشکیبا :** بے صبر جان۔

اے بلال رضؓ! تیری نظر بھی حضرت سلمان رضؓ فارسی کی طرح ادا پہچاننے والی تھی، یعنی اس نے حقیقتِ حال کا صحیح اندازہ کر لیا تھا اور حضرت سلمان رضؓ کی طرح وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شیدائی بن چکی تھی۔ پھر حالت یہ تھی کہ تو دیدار کی شراب جتنی پیتا تھا، اس سے اتنی ہی تیری پیاس بڑھتی تھی، یعنی حضورؐ کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ دیکھنے کا شوق کبھی پورا نہ ہوا۔ تجھے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کا سودا تھا۔ جس طرح حضرت موسےٰؑ کو کوہِ طور پر ذاتِ باری کی تجلی دیکھنے کا سودا تھا، لیکن حضرت اویس رضؓ قرنی کی یہ حالت تھی کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کی طاقت نصیب نہ تھی۔ وہ چاہتے تھے، دل میں اتنا حوصلہ پیدا ہو جائے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ سکوں۔

اے بلال رضؓ! مدینہ تیری آنکھوں کے لیے نُور کا سامان تھا۔ حضرت موسےٰؑ نورِ حق کے شوق میں طُور پر پہنچے، لیکن اے بلال رضؓ! تیرے لیے مدینہ کا صحرا ہی طُور بن گیا۔ تیری نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتی رہی، پھر بھی دیکھنے کی حسرت نہ نکلی۔ خوش نصیب ہے وہ دل جو مسلسل تڑپتا رہا اور ایک لمحے کے لیے بھی اس نے آرام نہ پایا۔

اے بلال رضؓ! تیری بے صبر جان پر ایسی بجلی گری کہ تیرا سیاہ چہرہ حضرت موسےٰؑ کے ہاتھ پر خندہ زن ہوا۔

ظلمت سے اشارہ حضرت بلال رضؓ کے رنگ کی طرف ہے، وہ حبشی تھے۔ اسی نسبت سے اقبال نے انھیں سیاہ فام تصوّر کیا، مستند روایتوں سے ظاہر ہے کہ حضرت بلال رضؓ کا رنگ سانولا تھا۔ دستِ موسیٰؑ کا اشارہ یدِ بیضا کی طرف ہے۔ جو حضرت موسیٰؑ کا ایک معجزہ تھا۔ قرآن میں آیا ہے: وَنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ۔ یعنی جب حضرت موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ بغل میں سے نکالا تو وہ دیکھنے والوں کو بالکل سفید نظر آیا۔ شعر کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی جان پر عشقِ رسولؐ کی جو بجلی گری اس کی برکت سے حضرت بلال رضؓ کی سیاہ فامی یدِ بیضا پر خندہ زن ہوئی۔

قضا و قدر نے شعلے سے حرارت اور تڑپ لی اور تیرے دل میں بھر دی۔ جلوے کی کیسی بجلی تھی جو تیرے حاصل کے خس و خاشاک پر گرا دی گئی۔ مطلب یہ کہ عشقِ رسولؐ سے پہلے جو کچھ تیرے پاس تھا، اس کی حیثیت خس و خاشاک سے زیادہ نہ تھی۔ عشقِ رسولؐ کی بجلی نے تجھے جلا کر یہ بلند رتبہ دے دیا۔

تیسرا بند | **یثرب :** جس وادی میں مدینۂ منوّرہ آباد ہوا۔ اس میں ہجرت سے پہلے جگہ جگہ بستیاں تھیں۔ جن میں سب سے بڑی بستی کا نام یثرب تھا، اس لیے تمام بستیوں کے مجموعے کو بھی یثرب ہی کہتے تھے۔ یہ بستی اب بھی موجود ہے اور مدینۂ منوّرہ سے تین میل شمال مغرب میں ہے۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس مقام پر ٹھہرے، اس کا نام مدینۃ النّبی یعنی نبی کا شہر ہوا۔ یہی نام عام زبانوں پر مدینہ

رہ گیا۔ بعد ازاں یثرب کا نام غیر معروف ہو گیا اور مدینہ نے شہرت عام پائی۔

اے بلالؓ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرے دیکھنے کا انداز گویا یکسر نیاز تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار ہی تیری نماز تھی۔ اذان ازل کے دن سے تیرے عشق کا ترانہ بن گئی یعنی روزِ ازل سے مقدر تھا کہ تو اسلام کا پہلا مؤذّن بنے گا۔ اذان دینا ہی تیرے عشق کا ترانہ تھا اور نماز دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کا ایک بہانہ تھی۔ کتنا اچھا وقت تھا جب مدینہ شریف میں وہ پاک ذات رہتی تھی اور کتنا اچھا زمانہ تھا جب اس ذاتِ پاک کا دیدار عام تھا۔

اقبال نے آخری شعر ایک مکتوب میں درج کرتے ہوئے لکھا ہے:

"میں لاہور کے ہجوم میں رہتا ہوں مگر زندگی تنہائی کی بسر کرتا ہوں۔ مشاغل ضروری سے فارغ ہوا تو قرآن یا عالمِ تخیّل میں قرونِ اولیٰ کی سیر۔ مگر خیال کیجیے جس زمانہ کا تخیّل اس قدر حسین و جمیل و روح افزا ہے وہ زمانہ خود کیسا ہو گا۔

خوشا وہ عہد کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ روز کہ دیدار عام تھا اس کا"[1]

سرگزشتِ آدم

تمہیدی نوٹ

یہ نظم ستمبر ۱۹۰۴ء کے "مخزن" میں تازہ غزلوں کے زیرِ عنوان بطورِ غزل شائع ہوئی تھی۔ ابتدائی دو شعروں کے بعد قطعہ کا ذیلی عنوان دے کر باقی شعر چھاپے گئے تھے۔ کل اٹھائیس شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں ابتدائی دو شعر بالکل حذف ہو گئے۔ باقی غزل سے بھی آٹھ شعر قلم زد کر دیے گئے اور اسے سرگزشتِ آدم کے عنوان سے "بانگِ درا" میں شامل کیا۔ اس میں انسان کے مشغلوں کی کیفیت نہایت عمدہ انداز میں پیش کی گئی ہے۔

پیمانِ اولین: لفظی معنی سب سے پہلا عہد۔ اشارہ ہے روزِ ازل کے اس عہد کی طرف جو قرآن میں یوں مذکور ہے: **اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ** — کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ **قَالُوْا بَلٰی:** سب نے کہا۔ بے شک تو ہمارا رب ہے۔ یعنی خدا کے پروردگار ہونے کا وہ عہد جو آفرینش کے ساتھ ازواح سے لیا گیا تھا۔ **جامِ آتشیں:** لفظی معنی آگ بھرا پیالہ۔ مراد ہے ایسا پیالہ جس کی شراب نہایت تیز و تند ہو۔ **خیالِ فلک نشین:** آسمان تک پہنچنے والا خیال۔

---

[1] مکاتیبِ اقبال، شایع کردہ بزمِ اقبال صـ۸

تغیر پسند: بدلنے والا۔ **غارِ حرا:** مکۂ معظمہ سے تقریباً تین میل مشرق میں ایک ٹیلا ہے جو آس پاس کے ٹیلوں سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ اس کی چوٹی پر بڑی بڑی سلوں کے مل جانے سے جیسے جیسا ایک غار بن گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوّت کی نعمت ملنے سے پیشتر اسی جگہ عبادت کیا کرتے تھے۔ اسی ٹیلے پر آپ کو پہلے پہل نبی ہونے کی بشارت ملی تھی۔ ٹیلے کا نام حرا تھا اور غار کو غارِ حرا کہتے تھے۔ آج کل ٹیلے کا نام جبل النّور یعنی نُور کا ٹیلا ہے۔

تہ نگین: زیرِ نگین۔ اپنے حکم کے ماتحت۔ **مظاہر پرست:** قدرت کے مظاہر کو پوجنے والی یعنی صرف چیزوں کی ظاہری حیثیت میں اُلجھی رہنے والی۔

آدمی کہتا ہے کہ میرے سفر کی کہانی سننے کے قابل ہے۔ میں نے ازل کے دن خدا کے رب ہونے کا جو عہد باندھا تھا اور یہ سب سے پہلا عہد تھا، اسے بالکل بھلا دیا۔ میری طبیعت جنّت کے باغ میں نہ لگی اور میں نے آگاہی کی تیز و تند شراب کا پیالہ پی لیا۔ اس سے حضرت آدمؑ اور حضرت حوّاؑ کے قصّے کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ کہ جب انسان میں فطرتی شعور پیدا ہوا تو جنّت کی زندگی سے طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔ اس لیے کہ اس میں سکون ہی سکون تھا اور اس دنیا میں جدوجہد کی زندگی کا آغاز ہوا۔

مجھے اُس وقت سے اس دنیا کی حقیقت معلوم کرنے کی دُھن لگی رہی۔ اس سلسلے میں میں نے آسمان تک پہنچنے والے خیال کی اُڑان دکھائی۔ مجھے ایسا مزاج ملا جو برابر بدلتا رہتا تھا یعنی اسے تبدیلیاں ہی پسند تھیں۔ اس آسمان کے نیچے میں نے کہیں بھی سکون نہ پایا اور بے قراری کی حالت میں ردّوبدل کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کعبے سے پتھر کی مورتوں کو باہر نکال دیا۔ کبھی ان مورتوں کو کعبے میں لے جا کر بٹھا دیا۔ کبھی میں خدا سے ہم کلامی کے شوق میں طُور پر جا پہنچا اور نورِ مطلق کو اپنی آستین میں چھپا لیا۔ آخری مصرع سے اشارہ یدِ بیضا کے معجزے کی طرف ہے۔

کبھی اپنوں نے مجھے پکڑ کر سُولی پر لٹکا دیا اور میں زمین کو چھوڑ کر آسمان پر چلا گیا۔ یہ حضرت عیسٰیؑ کی طرف اشارہ ہے۔ کبھی میں برسوں غارِ حرا میں چھپا رہا اور دنیا کو دینِ حق کا آخری پیالہ پلا دیا۔ اس شعر میں اشارہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے جو اس دنیا میں خدا کا آخری دین لائے۔

ہندوستان میں آکر میں نے خدا کا گیت سنایا۔ کبھی میں نے اپنے لیے یونان کی سرزمین پسند کر لی۔ اس شعر کے پہلے مصرع میں بہ ظاہر اشارہ سری کرشن کی طرف ہے جو ہندوؤں کے نزدیک بہت بڑے اوتار تھے۔ اور بنسری بجانا ان سے منسوب ہے۔ دوسرے مصرع میں اشارہ حکیم افلاطون، یونان کی طرف ہے۔ جسے ہمارے صوفیہ عارفوں میں شامل کرتے تھے۔ اقبال نے "اسرارِ خودی" میں افلاطون کو "راہبِ اوّل" قرار دیا اور "گوسفندانِ قدیم" میں سے بتایا:

راہب اوّل فلاطونِ حکیم
از گروہ گوسفندانِ قدیم۔

ہندوستان کی سرزمین نے جب میری آواز پر کان نہ دھرا تو میں نے جاپان اور چین کے خطّوں کو جا بسایا۔ اس شعر میں اشارہ بدھ مت کی طرف ہے جو ہندوستان سے نکال دیا گیا اور چین و جاپان میں اس نے فروغ پایا۔

کبھی میں نے یہ ثابت کیا کہ دنیا ذرّوں کے باہم مل جانے سے بنی ہے۔ یہ بات دین داروں کی تعلیم کے مقصد کے خلاف تھی۔ اس شعر میں غالباً دیمقراطیس کی طرف اشارہ ہے جو حضرت مسیحؑ سے چار صدی پیشتر گزرا ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ دنیا مادّی ذرّوں کی ترکیب سے بنی ہے اور مادّے کے سوا یہاں کچھ موجود نہیں۔ پیدائش عالم کی یہ تشریح اہلِ دنیا کی تعلیم کے سراسر خلاف تھی۔

پھر میں نے عقل اور دین کی جنگ چھیڑ کر سینکڑوں سرزمینوں کو انسان کے لہو سے لالہ زار بنا دیا۔ عقل و دین کی لڑائیاں ہر ملک اور ہر خطّے میں ہوتی رہیں، لیکن سب سے خوفناک لڑائیاں یورپ کے مختلف ملکوں میں ہوئیں۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جسے تاریخ میں قرونِ وسطیٰ یا درمیانہ زمانہ کہا جاتا ہے۔

جب ستاروں کی حقیقت میری سمجھ میں نہ آئی تو میں نے راتیں اسی خیال میں بسر کر دیں۔ دیکھتا، سوچتا اور غور کرتا رہا کہ یہ کیا چیزیں ہیں۔ میں نے زمین کی گردش کا مسئلہ دنیا کو سکھایا اور مسیحی پادریوں کی تلواریں مجھے ڈرا نہ سکیں پہلے شعر میں اشارہ اٹلی کے مشہور عالمِ ہیئیت گلیلیو کی طرف ہے اور دوسرے شعر میں کاپرنیکس کی طرف، جس نے آفتاب کے ساکن ہونے اور زمین کے گھومنے کا نظریہ پیش کیا۔ پادریوں نے اسے کافر قرار دے کر قتل کی دھمکی دی، لیکن وہ اپنی رائے پر جما رہا۔

میں نے دوربین عقل کا آئینہ لگا کر زمانے پر زمین کی کشش کا بھید ظاہر کیا۔ یہ ڈاکٹر نیوٹن اور اس کے نظریۂ کششِ ثقل کی طرف اشارہ ہے۔

میں نے سورج کی شعاعوں کو قید کیا۔ تڑپنے والی بجلی کو میں قابو میں لایا اور اس کی مدد سے زمین کو بہشت کے لیے قابلِ رشک بنا دیا۔ شعاعوں کی قید سے ایکس رے دریافت کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرح اگرچہ میں نے عقل کے زور سے سارے جہان کو اپنے حکم کے تابع بنا لیا، مگر افسوس ہستی کے بھید کی خبر مجھے نہ ملی۔ جب ظاہری چیزوں کی پرستش کرنے والی آنکھ سے پردے اُٹھے تو معلوم ہوا کہ ہستی کا وہ بھید میرے دل کے گھر میں موجود ہے۔ اس سے اشارہ خدا کے کائنات کی طرف ہے یعنی اس کی تلاش میں دنیا تہ و بالا کر ڈالی، آخر معلوم ہوا کہ وہ دل میں ہے، یعنی اسے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دل میں عشق کی حرارت پیدا کی جائے۔

ترانۂ ہندی

تمہیدی نوٹ: یہ نظم اکتوبر ۱۹۰۴ء کے "مخزن" میں چھپی تھی اور اس کا عنوان تھا ہمارا دیس۔ بانگ درا مرتب کرتے وقت عنوان بدل دیا گیا۔ نظم پر شیخ عبدالقادر مرحوم مدیر "مخزن" نے جو اس زمانے میں ولایت گئے ہوئے تھے، یہ نوٹ لکھا تھا:

جذبات دل کے ایک سینے سے دوسرے پر منعکس ہونے کا بھی عجیب قانون ہے۔ ہمارے دوست نے مندرجہ ذیل اشعار میں ہو بہو وہ خیالات ظاہر کیے ہیں جو وطن سے دور ہونے کے سبب راقم کے دل میں ہیں۔ میں اگر نظم لکھتا تو شاید لندن سے وہ خیالات ظاہر کرتا جو اقبال نے لاہور میں بیٹھے ہوئے کیے ہیں

پربت: پہاڑ۔ مراد ہے ہمالیہ سے۔ **رشکِ جناں:** بہشت سے بڑھ کر خوبصورت اور دلکش۔ **رودِ گنگا:** گنگا کا دریا جو ہندوؤں کے نزدیک نہایت مقدس ہے۔ **دورِ زماں:** زمانے کی گردش۔

ہمارا ہندوستان ساری دنیا سے اچھا ہے۔ یہ ہمارا باغ ہے اور ہم اس کی بلبلیں، یعنی جس طرح بلبلوں کو باغ سے بہت زیادہ محبت ہوتی ہے، اسی طرح ہمیں اپنے وطن ہندوستان سے بے حد پیار ہے۔

اگر ہم پردیس میں بھی ہوں تو ہمارا دل وطن ہی کو یاد کرتا رہتا ہے۔ جہاں ہمارا دل ہو، وہیں ہمیں بھی سمجھ لو۔ یعنی کسی بھی وقت اور کسی بھی حالت میں ہمیں اپنا وطن نہیں بھولتا۔

وہ دنیا بھر میں سب سے اونچا پہاڑ یعنی ہمالیہ جو بلندی میں آسمان تک جا پہنچا ہے، ہمارا پہریدار اور ہماری حفاظت کرنے والا ہے یعنی کوہ ہمالیہ ہمارے دشمن کے حملے کو روکنے کے لیے نہایت مضبوط اور فتح نہ ہو سکنے والی دیوار کا کام دے رہا ہے

ہمالیہ کے آس پاس ہزاروں ندیاں بہہ رہی ہیں جن کے پانی دینے اور سیراب کرنے کے باعث ہمارا باغ ایسا خوبصورت، بارونق اور دلکش ہو گیا ہے کہ بہشت بھی اسے رشک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ یعنی کوہ ہمالیہ ہمارے ملک کے لیے فخر و ناز کا موجب ہے۔

اے گنگا کے دریا! کیا تجھے وہ زمانہ یاد ہے جب ہمارا قافلہ تیرے کنارے پر اترا تھا؟ اس شعر میں مسلمانوں کی ان فتوحات کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے شروع شروع میں کی تھیں۔

مذہب ایک دوسرے سے دشمنی رکھنے کی تعلیم نہیں دیتا۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندوستان ہمارا دیس ہے یعنی ہم تمام وطنی بھائی ہیں۔ ہمیں اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر عمل کر کے باہم محبت اور پیار سے رہنا چاہیے۔

یونان، مصر اور روما کی پرانی سلطنتیں سب کی سب دنیا سے مٹ کر بے نشان ہو گئیں لیکن ہمارا نام و نشان اور

وجود ابھی تک قائم ہے۔

زمانے کی گردش سینکڑوں برسوں سے ہماری دشمن رہی ہے لیکن وہ آج تک ہمارے وجود کو مٹا نہ سکی۔ اس میں کوئی نہ کوئی بھید ضرور ہے۔ یعنی ہم اپنے مذہب کی نیک اور زندگی بخش تعلیم پر عمل کر رہے ہیں۔ اس لیے زمانے کا انقلاب ہم پر کچھ اثر نہ کر سکا۔ اور ہم بدستور زندہ و سلامت موجود ہیں۔

اے اقبال! دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں جو ہمارے دل کے بھید جانتا ہو۔ کسی کو ہمارے چھپے ہوئے دکھ درد اور رنج و غم کا حال کب معلوم ہو سکتا ہے؟ یعنی ہمارا سچا ہمدرد کوئی نہیں۔ کسی کے دل میں ہمدردی کی یہ لہر نہیں اٹھتی کہ ہم بھی ترقی کر کے آزاد حکومت کی نعمت سے فائدہ اٹھا سکیں۔

جگنو

تمہیدی نوٹ: یہ نظم دسمبر ۱۹۰۵ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی۔ نظرِ ثانی میں دوسرے بند کا مندرجہ ذیل شعر حذف کر دیا:

اک مُشتِ گِل میں رکھا احساس کا شرارہ
انساں کو آگہی کیا، ظلمت کو چاندنی دی۔

پہلا بند | **سفیر:** ایلچی۔ **تکمہ:** گھنڈی۔ بٹن۔ **حُسنِ قدیم:** پرانا حسن۔ مراد ہے خدا کی تجلّی سے

باغ کے صحن میں جگنو چمک رہا ہے یا پھولوں کی محفل میں شمع جل رہی ہے؟ کیا آسمان سے کوئی ستارہ اڑ کر باغ میں آ گیا ہے یا چاند کی کرن میں جان پڑ گئی ہے؟ یا رات کی سلطنت میں دن کا ایلچی آیا ہے۔ جو اپنے دیس میں گم نام تھا۔ اور یہاں پردیس میں آ کر چمکنے لگا ہے؟ کیا چاند کی قبا کا کوئی بٹن گر پڑا ہے یا ذرّہ سورج کا لباس پہن کر جگمگا رہا ہے؟

کیا یہ خدا کے جلوے کی ایک چھپی ہوئی جھلک تھی جسے اللہ کی قدرت اوپر کے جہان یعنی آسمانوں کی تنہائی سے دنیا کی محفل میں لے آئی؟

یہ جگنو گویا ایک چھوٹا سا چاند ہے، جس میں اندھیرا بھی ہے اور اجالا بھی۔ کبھی اسے گہن لگ جاتا ہے اور کبھی یہ گہن سے نکل آتا ہے۔ یعنی جب یہ پروں سے دُم کو چھپا لیتا ہے تو اندھیرا ہو جاتا ہے اور جب اٹھاتا ہے تو دُم کے

چمکنے سے روشنی ہو جاتی ہے۔ پتنگا ہونے کے لحاظ سے تو پروانہ اور جگنو دونوں برابر ہیں، لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ پروانے کو روشنی کی طلب و تلاش ہے اور وہ عشق میں اس پر جان دیتا ہے، مگر جگنو آپ ہی سر سے پاؤں تک روشنی ہے۔

اس بند کے آغاز میں جگنو کے لیے مختلف تشبیہیں جمع کی گئیں مثلاً:

۱۔ پھولوں کی انجمن کی شمع۔ ۲۔ آسمان کا ستارہ زمین پر اتر آیا۔ ۳۔ چاند کی کرن میں جان پڑ گئی اور وہ اڑنے لگیں۔ ۴۔ دن کا سفیر رات کی سلطنت میں بھیجا گیا۔ ۵۔ چاند کی قبا کا بٹن۔ ۶۔ ذرّے نے سورج کا لباس پہن لیا۔ ۷۔ خدا کے جلوے کی جھلک۔ ۸۔ چھوٹا سا چاند۔

دوسرا بند خدا نے دنیا میں ہر شے کو کوئی نہ کوئی دل کشی، حسن اور جوہر عطا کیا ہے جیسے پروانے کو شمع کے عشق میں تڑپ بخشی ہے، جگنو کو روشنی دی ہے۔ بے زبان پرندوں کو بے حد سُریلی اور موہنی آواز عنایت کی، پھول کو زبان دے کر چپ رہنا سکھایا (پھول کی پنکھڑی کو زبان سے تشبیہ دی گئی ہے) شفق کے سے کی خوبی اسی میں ہے کہ وہ جلد غائب ہو جاتی ہے۔ اسی لیے اس پری کو بہت تھوڑی عمر دی ہے۔ صبح کو خوبصورت دُلھن کی طرح رنگین کر دیا اور اسے سُرخ لباس پہنا کر شبنم کی آرسی دے دی۔ درخت کو سایہ دیا، ہوا کو اڑان دی۔ پانی کو چلنا اور بہنا سکھایا تو لہروں کو بے قراری بخشی، لیکن یہ فرق اور اختلاف ہمیں نے قائم کیے ہیں۔ حُسن ہر جگہ ایک ہے، جلوے مختلف ہیں۔ جگنو کا دن وہی ہے جسے ہم رات کہتے ہیں۔

تیسرا بند کسک: ٹیس۔ مخفی: چھپا ہوا۔ ہنگاموں کا محل: شور و غوغا کا مقام۔

اس دنیا میں جو بھی چیز ہے اس میں ازل کا نور جھلک رہا ہے یعنی سب چیزیں نورِ مطلق سے پیدا ہوئی ہیں۔ اگرچہ ان کی شکلیں وضع قطع اور اوصاف الگ الگ ہو گئے۔ اس نورِ مطلق نے انسان میں بولنے کا لباس پہنا اور کلی میں پہنچا تو اس نے چٹکنے کی شکل اختیار کر لی یعنی جس طرح بولنا انسان کا امتیازی وصف ہے، اسی طرح چٹکنا کلی کی خاصیت ہے۔ یہ آسمان پر جو چاند ہے، یہی شاعر کے پہلو میں ٹیس کی صورت اختیار کر لیتا ہے، یعنی وہ نورِ ازل جو چاند میں چاندنی بنا۔ وہ شاعر کے دل میں درد بن گیا۔ چاند کا حُسن چاندنی ہے۔ شاعر کے دل کا حُسن انسانوں کا درد۔ ہم لوگوں نے بات چیت کا جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے اسی نے سب کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ ورنہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلبل کی فریاد خوشبو ہے اور پھول کی خوشبو چہک ہے۔

مطلب یہ کہ جب ہر شے کی حقیقت ایک ہے تو پھر بلبل کے نغمے کو خوشبو اور پھول کی خوشبو کو چہک قرار دینے میں کیوں تامل ہو؟ وحدت کا بھید کثرت میں چھپ گیا ہے۔ یعنی ایک نورِ مطلق نے ہزاروں شکلیں اختیار کر لیں اور حقیقت اس طرح پوشیدہ ہو گئی ہے کہ ہر آنکھ کو نظر نہیں آتی اور نہ ہر دل کو محسوس ہوتی ہے۔ اگر حقیقت پر نظر رکھی جائے تو جو نور جگنو میں چمک بنا ہوا ہے، اسی نے پھول میں خوشبو کی شکل اختیار کر لی ہے۔ جب

حقیقت پر نظر رکھی جائے تو جو نور جگنو میں چمک بنا ہوا ہے اسی نے پھول میں خوشبو کی شکل اختیار کر لی ہے۔
جب حقیقت ایک ہے اور ہر چیز میں ازل کی خاموشی چھپی ہوئی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اختلاف کو شور و غوغا کا مقام کیوں بنا لیا گیا؟

ہر شے میں ازل کی خاموشی پوشیدہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب کائنات وجود میں نہ آئی تھی تو خاموشی ہی خاموشی ۔ ہنگامہ کوئی نہ تھا۔ ہنگامے اسی وقت پیدا ہوئے جب مختلف چیزیں بنیں اور ان کا اختلاف باہم ٹکراؤ کا سبب بن گیا۔

صبح کا ستارہ

تمہیدی نوٹ: یہ نظم دسمبر ۱۹۰۴ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی، اس کے بائیس شعر تھے۔ نظر ثانی میں دو حذف ہو گئے۔ اس نظم میں اقبال نے صبح کے ستارے کی زبان سے زندگی کی ناپائداری بیان کی ہے۔ صبح کا ستارہ طلوع سے تھوڑی دیر پہلے نکلتا ہے اور طلوع کے ساتھ ہی ڈوب جاتا ہے۔

پہلا بند

صبوحی: وہ شراب جو صبح کے وقت پی جاتی ہے۔ **قعر:** گہرائی۔ تہ۔

صبح کا ستارہ کہتا ہے کہ مجھے اگرچہ چاند اور سورج کے پڑوس میں بٹھا دیا گیا ہے اور میرے ذمے یہ کام لگایا گیا ہے کہ صبح کے نمودار ہونے کا پیغام دنیا کو پہنچاؤں، لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ چاند اور سورج کے پڑوس کا لطف ترک کر دوں اور خدمت سے ہاتھ اٹھا لوں۔ تاروں کی یہ بستی میرے حق میں تو کچھ اچھی نہیں۔ اس بلندی سے تو مجھے زمین والوں کی پستی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ میں آسمان پر ہوں، لیکن اصل میں تو میرا وطن آسمان نہیں بلکہ عدم ہے۔ صبح کا سوچاک دالا دامن میرا کفن بن جاتا ہے۔ پو پھٹنے کو شاعر عام طور پر صبح کا دامن چاک ہو جانے سے تعبیر کرتے ہیں۔ چونکہ صبح کے وقت افق پر سفیدی چھا جاتی ہے، اس لیے اسے کفن سے تشبیہ دی۔
میری قسمت میں ہر روز جینا اور مرنا لکھا ہے۔ موت کا ساقی مجھے اپنے ہاتھ سے صبح کی شراب پلاتا ہے یعنی صبح ہوتے ہی میں ختم ہو جاتا ہوں۔ یہ خدمت، یہ عزت اور بلندی ہرگز اچھی نہیں۔ گھڑی بھر کے چمکنے سے تو اندھیرا

ہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں کبھی ستارہ نہ بنتا بلکہ سمندر کی تہ میں چمکتا ہوا موتی بن جاتا۔

دوسرا بند خاتم: انگوٹھی۔ گوہرہائے گراں مایہ: قیمتی موتی۔

اگر سمندر کی تہ میں بھی موجوں کی کھینچ تان سے دل میں گھبراہٹ پیدا ہوتی، تو وہاں سے نکل آتا اور کسی حسین کے گلے کی زینت بن جاتا۔ چمکنے کا مزہ اسی حالت میں ہے کہ حُسن کا زیور بن جاؤں اور قیصر کی ملکہ کے تاج کی زینت بڑھاؤں۔ دیکھو، پتھر کے ایک ٹکڑے کا نصیب جاگ اٹھا اور وہ حضرت سلیمانؑ کے ہاتھ کی انگوٹھی میں نگینہ بن گیا۔ ستارے سے موتی بننے کی آرزو پیدا ہوئی پھر سوچا کہ ایسی چیزوں کو زمانہ آخر توڑ ہی دیتا ہے اور وہ قائم نہیں رہتیں۔

بیش قیمت موتیوں کا انجام بھی ٹوٹنے کے سوا کچھ نہیں۔ اصل زندگی وہی ہے جو موت سے آشنا نہ ہو اور ہمیشہ قائم رہے۔ وہ جینا کس کام کا، جس میں ہر وقت موت کا کھٹکا لگا رہے؟ اگر دنیا کی زینت کا انجام یہی ہے تو کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ شبنم بن کر کسی پھول پر گر جاؤں؟

تیسرا بند وغا: لڑائی۔ عارضِ گلگوں: پھولوں جیسا رخسار۔

بہتر یہ ہو کہ جس حسین نے پیشانی پر افشاں چُنی ہو۔ میں اس افشاں کے ستاروں میں شامل ہو جاؤں یا ظلم کے کسی مارے ہوئے کی آہوں کی چنگاریوں میں شریک رہوں یا آنسو بن کر پلکوں کے سرے پر اٹک جاؤں بلکہ اُس بیوی کی آنکھوں سے ٹپک جانا زیادہ اچھا ہے، جس کا شوہر وطن کی محبّت سے مجبور ہو کر زرہ میں ڈوبا ہوا لڑائی کے میدان کی طرف روانہ ہو۔ وہ بیوی امید اور نا امیدی کی تصویر بنی کھڑی ہو۔ چُپ ہو اور ایسی چُپ جس سے تقریر بھی شرما جائے۔ شوہر کی رضامندی اس میں صبر کی طاقت پیدا کر دے۔ حیا کی وجہ سے بول نہ سکے، لیکن اس کی نگاہیں بول رہی ہوں۔ شوہر کی روانگی کے وقت اس کے پھول جیسے رخسار پیلے پڑ جائیں۔ جدائی کے غم سے حُسن کی کشش اور بڑھ جائے۔ بیوی لاکھ ضبط کرے، لیکن میں ٹپک ہی جاؤں۔ آنسوؤں بھری آنکھ کے کٹورے سے چھلک ہی پڑوں۔ ٹپکتے ہی خاک میں ملوں اور مجھے ہمیشہ کی زندگی نصیب ہو، اس لیے کہ دنیا مجھ سے عشق کی جلن کا سبق لیتی رہے گی۔

صبح کے ستارے نے زندگی کی ناپائداری کو دیکھتے ہوئے پہلے آسمان سے اتر کر سمندر کی تہ میں موتی بننا چاہا۔ پھر سوچا کہ موتی بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ جینا وہی اچھا ہے، جس میں موت کا کوئی کھٹکا نہ ہو۔ اس پر خیال آیا کہ شبنم بن جانا چاہیے۔ پھر مظلوم کی آہوں کا شرارہ بن جانا چاہا وغیرہ۔ سب سے آخر میں اس بیوی کا آنسو بننا پسند کیا، جس کا شوہر وطن کے لیے جنگ میں جائے۔ اس کی آنکھوں سے گر کر مٹّی میں مل جانا منظور کر لیا اور اسی کو دائمی زندگی سمجھا، اس لیے کہ زمانہ اس سے سچّی محبّت کا سبق لے گا۔ سبق یہ ہے کہ شوہر سے اگرچہ وہ سب سے بڑھ کر محبّت کرتی ہے لیکن وطن کی حفاظت میں جنگ سے نہیں روکتی۔ جدائی اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہے، لیکن وطن کی محبّت میں اسے صبر کی

ساتھ قبول کرلیتی ہے۔ جو آنسو ضبط کے باوجود اس کی آنکھ سے ٹپک پڑتا ہے، وہ زمانے کے لیے شوہر کی محبت اور وطن کی محبت کا زندہ پیغام ہے۔

ہندوستانی بچوں کا قومی گیت

تمہیدی نوٹ

یہ نظم فروری ۱۹۱۰ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی اور اس کا عنوان تھا: "ایک ہندوستانی لڑکے کا گیت"۔

پہلا بند | چشتی: حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ جن کا مزار اجمیر (راجپوتانہ) میں ہے۔ نانک: سکھ مذہب کے بانی گرونانک۔

جس سرزمین میں چشتیؒ نے خدا کا پیغام سنایا، جس باغ میں نانک نے خدا کے ایک ہونے کا گیت گایا، جسے تاتار کے باشندوں نے فتح کرنے کے بعد اپنا دیس بنالیا، جہاں عرب کے مجاہدوں نے حکومت کا جھنڈا گاڑا۔ وہی میرا وطن ہے، وہی میرا دیس ہے۔

دوسرا بند | جہاں کے باشندوں نے حکمت اور فلسفے میں کمال حاصل کرکے یونانیوں کو بھی حیران کر دیا تھا۔ جس ملک کے بسنے والے علم و ہنر میں ساری دنیا کے استاد تھے۔ جس خطے کی مٹی کو خدا نے سونے کا جوہر بخشا تھا، جس زرخیز علاقے نے ترکوں کا دامن ہیروں سے بھر کر انھیں مالا مال کر دیا تھا۔ وہی میرا وطن ہے، وہی میرا دیس ہے۔

تیسرا بند | ٹوٹے تھے جو ستارے...... اشارہ ہے پارسی قوم کی طرف۔ میر عرب کو آئی...... مشہور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے ہندوستان کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آرہی ہے، لیکن یہ ارشاد ثابت نہیں۔

ایران سے جو پارسی قوم کے بڑے بڑے آدمی آئے تھے اور جس سرزمین نے انھیں آب و تاب دے کر کہکشاں کے ستاروں کی طرح چمکا دیا تھا، جس جگہ سے دنیا نے خدا کے ایک ہونے کا نغمہ سنا، جس مقام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھنڈی ہوا آئی۔ وہی میرا وطن ہے، وہی میرا دیس ہے۔

چوتھا بند | نوحؑ نبی کا آ کر...... اشارہ ہے ہمالیہ کی چوٹی کی طرف جو ناؤ بندھن کہلاتی ہے، لیکن تاریخ سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی کوہ جودی پر ٹھہری تھی، جو کوہستانِ قفقاز کی ایک چوٹی ہے۔

جس سرزمین کے باشندے مرتبے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ کے برابر ہیں۔ جہاں کے پہاڑ کوہِ طور کا درجہ رکھتے

ہیں جس ملک میں اس طوفان کے اندر جو خدا نے حضرت نوحؑ کی بددعا سے ان کی گمراہ اُمّت کے لیے نازل کیا تھا کشتیٔ نوحؑ آ کر ٹھہری تھی یہی خطّے کی زمین اونچائی میں آسمان کی چھت کا زینہ ہے۔ جہاں کی زندگی گویا بہشت کی زندگی ہے۔ وہی میرا وطن ہے۔ وہی میرا دیس ہے۔

اس نظم میں بعض تلمیحات محلِ نظر ہیں لیکن ظاہر ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے بچّوں کی زبان سے کہا گیا ہے اور ان کی معلومات مقامی افسانوں ہی تک محدود ہوتی ہے۔

نیا شوالہ!

تمہیدی نوٹ: یہ نظم مارچ ۱۹۰۵ء کے "مخزن" میں چھپی تھی اور اس کے اٹھارہ شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں آدھے شعر حذف کر دیے۔

پہلا بند صنم کدہ: بُت خانہ۔ مندر۔

اے برہمن! اگر تو برا نہ مانے تو میں یہ بات سچ سچ کہ دیتا ہوں کہ تیرے مندر کے بُت پرانے ہو گئے ہیں۔ تو نے اپنوں سے دشمنی کرنا بتوں سے سیکھا ہے۔ یعنی تیرے مذہبی رہنما مذہب کے احکام غلط رنگ میں پیش کر کے اپنے وطنی بھائیوں سے لڑتے ہیں۔ واعظ نے بھی لڑنے جھگڑنے کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ یعنی مسلمانوں کے بھی مذہبی رہنما مذہب کے صحیح معنی نہ سمجھ کر لوگوں کو ایک دوسرے سے لڑا رہے ہیں۔ آخر میں نے تنگ آ کر مسجد اور مندر دونوں چھوڑ دیے۔ واعظ کا وعظ اور تیرے مذہبی قصّے سننا ترک کر دیا۔ تو سمجھتا ہے کہ پتھر کے بُتوں میں خدا چھپا بیٹھا ہے۔ لیکن میری نظروں میں وطن کی خاک کا ذرّہ ذرّہ دیوتا ہے۔ یعنی اے برہمن! بتوں کی پوجا چھوڑ کر وطن کی پوجا کر۔

دوسرا بند غیریت: غیر ہونا۔ بےگانہ ہونا۔ بیگانگی۔ نقشِ دوئی: دو ہونے کا نشان۔ جدائی اور بیگانگی کا نقش۔ تیرتھ: ہندوؤں کا مقدس مقام۔ کلس: گنبد کے اوپر کی کلغی۔ شکتی: طاقت۔ قوّت۔ شانتی: تسلّی، اطمینان، سکھ، آرام۔ باسی: بسنے والا۔ رہنے والا۔ مکتی: نجات، چھٹکارا۔ پریت: محبّت۔

آ۔ ایک دفعہ پھر بیگانگی کے پردے اٹھا کر ایک بن جائیں۔ پھر بچھڑے ہوؤں کو باہم گلے ملا دیں اور دوری و جدائی کا نقش مٹا کر متفق و متحد ہو جائیں۔ مدت سے دل کی بستی ویران اور بے آباد پڑی ہوئی ہے۔ آ۔ اس دیس میں ایک

نیا عبادت خانہ تعمیر کر دیں۔ ہمارا تیرتھ دنیا بھر کے تیرتھوں سے اونچا ہو۔ ہم اس کے گنبد کی کلس آسمان کے کنارے سے ملا دیں ہم ہر روز صبح اُٹھ کر ایسے میٹھے میٹھے بھجن گائیں کہ پجاری محبت کی شراب پی کر مست ہو جائیں۔ پجاریوں کے گیت دل کو طاقت بھی بخشتے ہیں اور تسلی بھی۔ زمین کے رہنے والے صرف محبت کی بدولت نجات پا سکتے ہیں۔

داغ

تمہیدی نوٹ: یہ نظم اپریل ۱۹۰۵ء کے **مخزن** میں شایع ہوئی تھی اور اس کے ستائیس شعر تھے نظر ثانی میں چار قلم زد کر دیے گئے۔ اقبال نے مختلف اوقات میں چھ بڑے مرثیے لکھے ان میں سے ہر ایک کا انداز الگ الگ ہے۔ ان میں پہلا مرثیہ داغ کا تھا۔ دوسرا تسلی کا، تیسرا گورستان شاہی، چوتھا فلسفۂ غم جو میاں فضل حسین مرحوم کو ان کے والد ماجد کے انتقال پر بھیجا گیا تھا، پانچواں والدۂ مرحومہ کی یاد میں۔ چھٹا راس مسعود مرحوم کا جو زندگی کے آخری اوقات میں لکھا گیا۔ ان کے انداز کی جداگانہ حیثیت مرثیوں کی شرح میں بیان ہوگی۔

پہلا بند: پیوندِ زمین: زمین میں ملی ہوئی۔ خاک میں دفن۔ مہدیِ مجروح: میر مہدی مجروح دہلوی، مرزا غالب کے نہایت عزیز شاگرد تھے۔ ۱۹۰۲ء میں وفات پائی۔ امیر: منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی۔ داغ کے ہم عصر اور مدمقابل تھے۔ ۱۹۰۰ء میں فوت ہوئے۔ زیبِ دوش: کندھوں کی سجاوٹ۔ کندھوں پر اٹھائی ہوئی۔

غالب کی عظمت مدت ہوئی، زمین میں دفن ہو چکی تھی یعنی غالب کو وفات پائے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا۔ میر مہدی مجروح بھی قبرستان میں مقیم ہو گیا۔ یعنی وہ بھی فوت ہو چکا۔ موت نے امیر مینائی کی صراحی بھی پردیس میں توڑ ڈالی۔ اگرچہ محفل کی آنکھوں میں امیر کی شراب کا نشہ اب تک باقی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ امیر مینائی کا اصلی وطن لکھنؤ تھا، لیکن وہ حیدر آباد دکن میں فوت ہوئے، جو ان کے لیے پردیس تھا اور ان کی شاعری سے لوگ اب تک متاثر ہیں، جیسے ان کی زندگی میں متاثر تھے۔ اردو زبان کے ان تین بڑے اور مشہور شاعروں کے ذکر کو اقبال نے داغ کی عظمت کی تمہید بنایا اور یہ طریقہ داغ کی عظمت نمایاں کرنے کے لیے بہت ہی پُرتاثیر تھا۔ اس سے اقبال یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ داغ اسی بزمِ انجم کا ایک روشن ستارہ تھا جو غالب، مجروح اور امیر مینائی جیسے

عظیم الشان شاعروں کی بدولت جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔

اے ہم نوا! آج سارا باغ سوگوار ہے۔ روشن شمع بجھ گئی اور شاعری کی محفل پر ماتم کا سماں چھا گیا۔ داغ نے جو دلی کی بلبل تھا، اس چمن سے اس باغ میں اپنا گھونسلا بنا لیا، جہاں باغِ ہستی کی تمام بلبلیں اس کی ہم نوا ہیں۔ یعنی داغ اس جہان سے رخصت ہو کر عالمِ بقا میں پہنچ گیا جہاں پہلے سے دنیا کے بڑے بڑے شاعر پہنچ چکے ہیں۔ آہ داغ فوت ہو گیا اس کی میت لوگوں کے کندھوں کی زینت بنی ہوئی ہے۔ شاہ جہاں آباد کے آخری شاعر نے بھی ہمیشہ کے لیے چپ سادھ لی۔

دوسرا بند | نشیمن : گھونسلا

طرزِ بیان کی شوخی اور رنگین، داغ کے ساتھ ختم ہو گئے۔ اب انھیں کہاں پا سکتے ہیں؟ وہ اگرچہ بوڑھے ہو چکے تھے، لیکن بڑھاپے کے کافور میں بھی جوانی کی آگ چھپی ہوئی تھی۔ پیری کو کافور سے اس لیے تشبیہ دی کہ پیری میں بال سفید ہو جاتے ہیں اور کافور بھی سفید ہوتا ہے۔ کافور کی خاصیت ٹھنڈی ہے۔ وہ حرارت کو زائل کر دیتا ہے لیکن داغ کی کیفیت یہ تھی کہ بڑھاپے کے باوجود ایسے شعر کہتا تھا جن میں جوانی کی گرمی، طرزِ بیان کی شوخی اور رنگین ہوتا تھا داغ لوگوں کے دل کی بات کہتا تھا یعنی جو کچھ لوگوں کے دل میں ہوتا تھا اسی کو داغ زبان پر لے آتا تھا۔ معنی کی لیلیٰ کے لیے لوگوں کے دل تو محمل کی حیثیت رکھتے تھے، لیکن داغ کی زبان پر وہ پردے سے باہر نکل آتی تھی۔ دوسرے مصرع میں پہلے مصرع کا مطلب شاعرانہ طریق پر بیان کیا گیا ہے۔ یعنی آرزو دل میں ہو تو سمجھنا چاہیے کہ چھپی ہوئی ہے۔ یہ چھپنا اس کے لیے محمل میں بیٹھنا ہو گیا۔ وہ دل سے نکل کر زبان پر آ جائے تو سمجھو پردہ اٹھ گیا اور معنی بے نقاب ہو گئے۔

داغ فوت ہو گیا۔ اب پھولوں کی خاموشی کا بھید بادِ صبا سے کون پوچھے گا اور باغ میں بلبل کے نالوں کی حقیقت کون سمجھے گا؟ صرف داغ صبا، پھول اور نالۂ بلبل کا رازداں تھا۔ اب یہ راز چھپے کے چھپے رہ جائیں گے۔ شعر کہتے وقت اس کی فکر بھی بلند اڑتی تھی، لیکن حقیقت اس کی آنکھوں سے کبھی اوجھل نہ ہوتی۔ پرندہ گھونسلے سے اڑ کر بھی نظریں اپنے گھونسلے پر جمائے رکھتا ہے۔ مطلب یہ کہ داغ نے ایسے شعر کبھی نہ کہے جو حقیقت کے خلاف ہوں۔ اس شعر کے دوسرے مصرع میں پہلے مصرع کا مطلب شاعرانہ طریق پر بیان کیا گیا ہے۔ یعنی داغ شاعری میں ایسا مبالغہ جائز رکھتے تھے جو اصل مطلب سے دور لے جاتے۔

ان اشعار میں داغ کی شاعری کا ایسا نقش کھینچا گیا ہے جو مبالغے سے بالکل پاک ہے۔ شاعر جب کسی کی تعریف کرتے ہیں تو ہمیشہ حقیقت سے بہت آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اقبال کی خوبی یہ ہے کہ وہ حقیقت سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوتے۔ پھر داغ کی خصوصیتوں کو اس خلوص سے بیان کر گئے ہیں کہ اس سے بہتر بیان غالباً ممکن نہیں۔

تیسرا بند | نکتہ آرا : باریک باتیں پیدا کرنے والی۔ فلک پیمائیاں :

آسمان تک اڑانیں۔ بلند پروازیاں۔ ساحر: جادو نگار۔ صاحب اعجاز: معجزہ دکھانے والا۔
آذر: حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام ہے۔ جو بُت بنانے میں بڑے کاریگر تھے۔ یہاں مراد ہے بُت تراش۔
یہاں بہت سے شاعر پیدا ہوں گے۔ ایسے بھی ہوں گے جو نکتے پیدا کرنے والی فکر کی بلند پروازیوں سے نازک اور دقیق مضمون پیدا کریں گے۔ ایسے بھی ہوں گے جو زمانے کی تلخیوں کے نقشے کھینچ کر ہمیں رُلوائیں گے اور خیالات کی نئی دنیا ہمارے سامنے پیش کریں گے۔ اس باغ میں سعدی اور حافظ جیسے شاعر بھی پیدا ہوں گے۔
سینکڑوں جادوگر ہوں گے یعنی صرف لفظی خوبیوں سے دلوں کو لبھائیں گے۔ ایسے شاعر بھی پیدا ہوں گے، جن کا کلام معجزہ سمجھا جائے گا۔ شعر کے بُت خانے سے ہزاروں بُت تراش اٹھیں گے۔ نئے ساقی نئے پیالوں میں شراب پلائیں گے یعنی شعر کی دنیا میں نئے نئے اندازِ بیان اور اسلوبِ فکر اختیار کیے جائیں گے۔ دل کی کتاب کی بہت سی شرحیں لکھی جائیں گی۔ جوانی کے خواب کی تعبیروں میں کوئی کمی نہ رہے گی، یعنی عشق کے مضامین بھی کثرت سے لکھے جائیں گے۔ لیکن عشق کی تصویر ہو بہو کون کھینچے گا؟ تیر انداز رخصت ہو گیا، اب دل پر کون تیر چلائے گا۔ مطلب یہ کہ داغ کے شعروں میں اگرچہ نازک اور دقیق مضمون نہ تھے۔ نہ اس نے قومی مضامین لکھے، نہ تخیل کا زور دکھایا، لیکن عشق کی صحیح تصویر پیش کر دی اور جو کچھ کہا وہ تیر کی طرح دل میں ترازو ہو گیا۔ یہ شان اب کون پیدا کرے گا؟

چوتھا بند میں شعر کی زمین میں آنسوؤں کے دانے بو رہا ہوں یعنی رو رہا ہوں اے دلی کی خاک! تو بھی رو، میں بھی داغ کو روتا ہوں۔ اے شاہ جہاں آباد! اے دہلی! تو شاعری کی عقل کا سرمایہ ہے۔ تیرا باغ آج پھر خزاں نے پامال کر ڈالا۔ وہ خوش رنگ اور دل کش پھول خوشبو بن کر اڑ گیا۔ افسوس، اُردو کا مرکز داغ سے خالی ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وطن یعنی دہلی کی خاک میں شاید ایسی کشش نہ تھی کہ داغ کو اپنے ہاں کھینچ لاتی اور وہ اُس کی زمین میں دفن ہوتا۔ وہ چودھویں کا چاند دکن کی خاک میں چھپ گیا۔ جتنے شراب پلانے والے تھے، وہ اٹھ گئے۔ شراب خانہ خالی رہ گیا۔ صرف ایک حالی دہلی کی محفل کی یادگار باقی رہ گیا۔

پانچواں بند بیدادِ اجل: موت کا ظلم۔

موت کا ظلم آرزو کو خون رُلواتا ہے۔ یعنی موت آرزو کو لہو بنا کر بہا دیتی ہے۔ اجل کا شکاری اندھیرے میں تیر چلاتا ہے مطلب یہ کہ اس کے تیر اندھا دھند چل رہے ہیں۔ جسے کوئی تیر اچانک لگ جاتا ہے، وہ دنیا سے اٹھ جاتا ہے لیکن شکایت کے لیے زبان نہیں کھل سکتی، یعنی موت کے خلاف کسی کو شکایت کا یارا نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ خزاں بھی باغ کے قائم رہنے

رلہ "بانگِ درا" میں غلطی سے "آزر" پہ ذال لکھا گیا ہے۔ صحیح ز سے ہے۔ ذال سے آذر کے معنی آگ وغیرہ ہیں۔

کا ایک سبب ہے یعنی خزاں آتی ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ بہار بھی آئے گی۔ اگر خزاں نہ ہو تو کسی کو بہار کا احساس بھی نہ ہو سکے یہاں ساری دنیا کے لیے ایک قانون جاری ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے، سب اسی کا نتیجہ ہے۔ پھول کی خوشبو باغ سے اڑ کر باہر جاتی ہے اور پھول توڑنے والا دنیا سے رخصت ہوتا ہے یعنی فنا سب کے لیے لازم ہے ہمیشگی کسی کے لیے بھی نہیں۔

اس سے پیشتر عظیم الشان شخصیتوں کے بڑے بڑے مرثیے لکھے گئے، لیکن یہ اردو شاعری میں پہلا مرثیہ ہے جس میں مرنے والے کا ماتم بھی بڑے پرتاثیر انداز میں کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس کی خصوصیتیں بھی ٹھیک ٹھیک بیان ہوئیں اور انداز بالکل نیا ہے۔

ابر

تلمیحات

یہ نظم ۱۹۰۴ء میں بمقام ایبٹ آباد لکھی گئی تھی، جہاں اقبال سیر و تفریح کے لیے تشریف لے گئے تھے اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس جگہ بیٹھ کر لکھی گئی تھی جہاں آج کل میونسپل کمیٹی کا باغ ہے اور سربن پہاڑ اس کے سامنے نظر آتا ہے۔

سربن: ایبٹ آباد کے مشرق میں پہاڑ کی چوٹی کا نام۔ **نشاطِ مدام:** ہمیشہ کی خوشی۔

وہ دیکھو آج پھر مشرق سے کالی کالی گھٹا اٹھی۔ پھر سربن کے پہاڑ نے سیاہ لباس پہن لیا، یعنی ابر سیاہ اس کے چاروں طرف چھا گیا۔

بادل کے دامن کے نیچے سورج کا چہرہ چھپ گیا۔ ٹھنڈی ہوا بھی ابر کے گھوڑے پر سوار ہو کر آ گئی۔ یعنی فضا میں کالی گھٹا گھر کر آئی اور سرد ہوا کے خوش گوار جھونکے روح کو تازگی بخشنے لگے۔

بادل چپ چاپ جھوم رہے ہیں، گرج کی آواز بالکل نہیں آتی۔ یہ گھٹا کیا ہے، ایک ایسا عجیب و غریب شراب خانہ ہے جس میں کسی قسم کا شور یا ہنگامہ نہیں، گویا ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔

یہ گھٹا باغ میں ہمیشہ قائم رہنے والی خوشی کا پیغام لے کر آئی ہے اور پھولوں کے پیراہن میں موتی ٹانک دے گی یعنی ابر برسے گا تو اس کی بوندیں پھولوں پر گریں گی اور ایسا نظر آئے گا کہ ان کے لباس میں موتی ٹانک دیئے گئے ہیں۔

جو پھول سورج کی گرمی سے سوئے جا رہے تھے، یعنی مرجھا رہے تھے، وہ پھر تر و تازہ ہو گئے اور جو زمین کی گود میں سو چکے تھے وہ بھی جاگ اٹھے یعنی وہ نئے سرے سے اُگ آئے اور ان میں بھی تازگی آ گئی۔

بادل ہوا کے زور سے ابھرا، بڑھا اور اُڑنے لگا۔ دیکھو وہ اور گھٹا اٹھی، لو برس بھی پڑی۔

پہاڑ کے درختوں نے عجیب خیمہ بنا رکھا ہے یعنی ان درختوں کی ٹہنیوں نے آپس میں مل کر خیمے کی شکل اختیار کر لی ہے۔

وادی میں سیر کرنے والوں کو اسی خیمے میں ٹھہرنا چاہیے۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ ابر برسنے لگا ہے۔ بوندا باندی سے محفوظ ہونے کے لیے وہ جگہ بہت موزوں ہے۔ جہاں درختوں کا جھنڈ ہے۔ اس لیے کہ جھنڈ نے خیمہ تان رکھا ہے۔

اس نظم میں بادل کے آنے اور برسنے کا سماں بڑے دل کش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ایک پرندہ اور جگنو

تمہیدی نوٹ

اس نظم کا مضمون کسی تشریح کا محتاج نہیں اور اس کا اصل مقصد آخر میں واضح کر دیا گیا ہے۔

نغمہ پیرا: گانے والا۔ **نوا ریز:** راگ برسانے والا، چہچہانے والا۔ **منقار ہوس:** لالچ کی چونچ۔ کھا جانے کی حرص۔ **بہشتِ گوش:** کانوں کے لیے جنت۔ نہایت دلکش آواز۔ **فردوس نظر:** نگاہ کے لیے بہشت یعنی حد درجہ خوبصورت۔ **ظہورِ اوج و پستی:** اونچ نیچ کا ظاہر ہونا۔

شام کے وقت ایک گانے والا پرندہ کسی ٹہنی پر بیٹھا راگ الاپ رہا تھا۔

اتنے میں اسے زمین پر ایک چمکتی ہوئی چیز نظر آئی۔ پرندہ اس چیز کو جگنو سمجھ کر شاخ سے اڑا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔

جگنو نے کہا: اے گانے والے پرندے! مجھ غریب پر جس کا کوئی سہارا نہیں، لالچ کے دانت تیز نہ کر یعنی مجھے کھا جانے کی خواہش نہ کر۔

جس خدا نے تجھے چہکنے اور چہچہانے کی نعمت بخشی ہے، اسی نے مجھے چمک عطا کی ہے۔

میں روشنی کے کپڑوں میں چھپا ہوا ہوں اور نور کا لباس پہن رکھا ہے۔ میں کیڑوں پتنگوں کی دنیا میں طور پہاڑ کا درجہ رکھتا ہوں یعنی تمام کیڑوں میں ایک میں ہی ایسا ہوں جس میں خدا کی تجلی نظر آتی ہے۔

اگر تیرا گانا ایسا دلکش ہے کہ جو کوئی سن لے، وہ یہی سمجھے کہ میں بہشت میں پہنچ گیا ہوں تو میری چمک ایسی ہے کہ

والی ہے کہ دیکھنے والے کی آنکھوں کے آگے جنّت کی تصویر کھینچ دیتی ہے۔
قدرت نے تجھے دل کے موہ لینے والی آواز دی ہے اور میرے پروں کو روشنی عطا فرمائی ہے۔
تیری چونچ کو گانا سکھایا گیا ہے اور مجھے باغ کا چراغ بنایا گیا ہے، یعنی ہم دونوں دنیا کے باغ کی رونق ہیں۔
مجھے چمک بخشی گئی ہے اور تجھے آواز، مجھے جلن دی گئی ہے اور تجھے آرام۔
جلن آرام کی مخالف نہیں ہوتی۔ دیکھ! دنیا میں جہاں خوشی ہو وہاں غم بھی ساتھ ہوتا ہے یعنی ہم دونوں میں بیر نہ ہونا چاہیے۔

شاعر کہتا ہے کہ دنیا کی محفل میں سوز اور ساز دونوں ہی کے دم سے رونق اور چہل پہل ہے۔ انھیں کی بدولت جہان میں کمال اور زوال کا سماں نظر آتا ہے، یعنی کائنات میں جہاں پھول ہے، وہاں کانٹا بھی ہے۔ جہاں عیش و نشاط ہے، وہاں آفت و مصیبت بھی ہے۔ دنیا کے کاروبار کا انتظام اسی قانون پر چل رہا ہے۔
دنیا کی محفل ہم نوائی، اتحاد اور اتفاق کے بل پر قائم ہے۔ اسی پھول برسانے والی نسیم سے باغ عالم میں بہار آتی ہے۔

اقبال نے اس نظم میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ دنیا میں سوز اور ساز دونوں کے دم قدم سے رونق ہے۔
جب تک انسان کو ٹھوکر کے ساتھ دکھ نہ پہنچے، وہ زندگی کا راز بخوبی سمجھ نہیں سکتا۔ خوشی اور غم کے پہلو بہ پہلو وارد ہونے ہی سے انسان ترقی کی منزلیں طے کر کے کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے۔

بچّہ اور شمع

تمہیدی نوٹ

یہ نظم ستمبر ۱۹۰۵ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی اور نظر بظاہر اس میں کوئی ردّ و بدل نہ ہوا۔ اس کی اشاعت سے پیشتر اقبال ولایت جا چکے تھے۔ اس نظم کا بھی مرکزی نکتہ وہی ہے جو چاند کا ہے یعنی روشنی اور نور کی طلب۔ نیز اس حقیقت کا اظہار کہ انسان خود سراپا نور ہے اور اس نے اپنے نور کو آگاہی کے پردے میں چھپا لیا۔

پہلا بند پروانہ خو: پروانے جیسی خصلت والا۔
اے پروانے کی سی خصلت والے بچّے! تو کیوں حیران ہو کر شمع کو گھڑیوں دیکھتا رہتا ہے؟ شمع کو دیکھتے ہی میری

گود میں بیٹھے بیٹھے ہلنا جلنا شروع کر دیا۔ کیا تیرا مقصد یہ ہے کہ روشنی سے بغل گیر ہو جائے؟ شمع کا نظارہ دیکھ کر تیرا انعکاس دل حیران ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ روشنی پہلے تو نے کہیں دیکھی ہے۔ اب دوبارہ اسے دیکھتے ہی پہچان لیا ہے لہٰذا اس کی طرف لپک رہا ہے۔

دوسرا بند | عُریاں: برہنہ۔ بے پردہ۔ ظاہر۔ خاکِ تیرہ: سیاہ مٹی۔

شمع تو ایک شعلہ ہے لیکن تو سر سے پاؤں تک نُور ہی نُور ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ دنیا کی محفل میں شمع بے پردہ ہے اور تو پردے میں چھپا ہوا ہے۔ شمع ظاہر ہے اور تو پوشیدہ۔ کیا معلوم، قدرت کے ہاتھ نے شمع کو کس وجہ سے عریاں اور بے پردہ کر دیا اور تیرے نور کو سیاہ مٹی کے فانوس میں چھپا دیا؟ تیرا نور آگاہی یعنی احساس وجود کے پردے میں چھپ گیا۔ آگاہی کا پردہ دیکھنے والی آنکھ کے لیے غبار ہے، یعنی دیکھنے والی آنکھ کو اسی طرح کچھ نظر نہیں آتا جس طرح گرد و غبار سے اٹ جانے کے باعث بینائی کی طاقت جواب دے دیتی ہے۔ ہم جسے زندگی کہتے ہیں وہ اپنی حقیقت سے غافل ہو جاتا اور اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ یہ زندگی ایک خواب ہے، غفلت ہے، سرمستی اور بے ہوشی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر انسان اپنی حقیقت پہچان لے، ذاتی شعور کا پردہ آنکھوں سے اٹھا دے تو اسے نظر آ جائے کہ وہ سر سے پاؤں تک نُور ہی نور ہے، لیکن زندگی نے انسان کو حقیقت سے غافل کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سو گیا یا اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی ہو۔

تیسرا بند | بے پایاں: بے کنارہ۔ اتھاہ ضَو گستری: روشنی پھیلانا آشیاں سازی: گھونسلا بنانا۔ ماہیٔ بے آب: پانی سے باہر آئی ہوئی مچھلی یعنی نہایت بے قرار و بیتاب۔

قدرت کی محفل حُسن کا ایک بے کنارہ اور اتھاہ سمندر ہے۔ آنکھ اگر حقیقت پر نظر رکھے تو ہر قطرے میں حُسن کا طوفان نظر آئے گا۔ پہاڑوں کی ہیبت پیدا کرنے والی خاموشی میں حُسن ہے۔ سُورج کے روشنی پھیلانے میں حُسن ہے۔ رات جب اندھیرے کا سیاہ لباس پہن لیتی ہے تو اس میں بھی حُسن ہوتا ہے۔ صبح کے وقت آسمان آئینے کی طرح صاف شفاف ہو جاتا ہے تو اس میں حُسن نظر آتا ہے۔ شام کی سیاہی اور شفق کے پھول بکھرنے میں بھی یہی جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ گزرے ہوئے زمانے کی عظمت کے مٹتے ہوئے نشانوں میں بھی حُسن ہے۔ جو بچہ بات چیت سے ناواقف ہو، وہ جب بولنے کی کوشش کرتا ہے، تو اس میں بھی ایک خاص حُسن ہے۔ باغ میں رہنے والے پرندے اکٹھے مل کر گاتے ہیں یا چھوٹے چھوٹے پرندے گھونسلے بناتے ہیں تو ان میں بھی حُسن ہے۔ پہاڑ کے چشمے میں اور دریا کی آزادی میں، تیز شہر میں، بیابان میں، ویرانے میں، غرض ہر جگہ حُسن ہی حُسن ہے۔ دریا کی آزادی اس لیے کہا کہ اسے کوئی روکنا چاہے تو رُوک نہیں سکتا اور جب جوش میں آتا ہے تو کناروں سے بھی اچھل کر باہر نکل جاتا ہے۔ اس کا عام منظر ہی ایسا ہے جس میں آزادی سب سے نمایاں ہوتی ہے لیکن

انسانی رُوح کو کسی ایسی شے کی تلاش ہے جو گم ہو چکی ہو، وہ اس دنیا کے بیابان میں قافلے کے گھنٹے کی طرح فریادی کیوں ہے؟ رُوحِ حسن کے اس عام جلوے میں بھی بے قرار ہے اور اس کی زندگی بے قراری میں ایسی مچھلی کی سی ہے جو پانی سے باہر ہو۔

کنارِ راوی

تمہیدی نوٹ: یہ نظم نومبر ۱۹۰۵ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی۔ اس کے چودہ شعر تھے۔ نظرثانی میں دو قلم زد ہو گئے۔

پہلا بند **محوِ سرود**: گانے میں مگن۔ **زیر و بم**: نیچا اور اونچا سُر۔ **سوادِ حرم**: کعبہ اور اس کے آس پاس کی زمین۔

شام کی خاموشی چھا چکی ہے۔ راوی دریا گانے میں مگن ہے۔ اے دوست! مجھ سے نہ پوچھ کہ اس وقت میرے دل کی حالت کیا ہے؟ راوی کے گانے سے جو اُونچے سُر پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ مجھے پیغام دیتے ہیں کہ سجدے میں گر جا۔ ساری دنیا میرے لیے کعبے کے آس پاس کی زمین بن گئی ہے، جہاں اس کثرت سے نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ گویا ہر طرف لوگ سجدے میں گرے پڑے ہوتے ہیں۔ میں چلتے ہوئے پانی کے کنارے کھڑا ہوں، لیکن دل کی یہ حالت ہے کہ کچھ خبر نہیں، کہاں کھڑا ہوں۔

دوسرا بند **دستِ رعشہ دار**: کانپتا ہوا ہاتھ۔ **تیز گام**: تیز چلنے والا۔ **عظمت فزائے تنہائی**: لفظی معنی تنہائی کی عظمت بڑھانے والے۔ مراد یہ ہے کہ راوی کے کنارے کوئی شخص تنہا کھڑا مقبرۂ جہانگیر کے میناروں پر نظر ڈالے تو اسے عظمت کا ایسا احساس ہو گا۔ گویا پورے نظارے کا مرتبہ بلند ہو گیا۔ **شہسوارِ چغتائی**: چغتائی خاندان کا شہسوار۔ یعنی شہنشاہ جہانگیر۔ **خواب گاہ**: لفظی معنی سونے کی جگہ۔ یہاں اشارہ ہے مقبرے کی طرف۔ **زمانِ سلف**: گزرا ہوا زمانہ۔

مُرخ شراب سے شام کا دامن سُرخ ہو گیا ہے مطلب یہ ہے کہ شفق کی سُرخی آسمان کے کناروں پر پھیل گئی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شام کا دامن سُرخ ہو گیا۔ بوڑھا آسمان کانپتے ہوئے ہاتھ میں شراب کا پیالہ لیے کھڑا ہے۔ یہاں جام سے اشارہ سُورج کی طرف ہے۔ وہ ڈوبتا جا رہا ہے اور اس پر کپکپی سی طاری نظر آتی ہے۔ شاعر اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ آسمان بوڑھا ہو چکا۔ اس کے ہاتھوں میں رعشہ آگیا اور وہ سُورج کا پیالہ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے۔ کانپتے ہوئے ہاتھ کی وجہ سے پیالہ بھی کانپ رہا ہے۔ چونکہ اس کی شراب سُرخ تھی، رعشے کے باعث وہ چھلک کر باہر آگئی اور شام کا دامن رنگین کر گئی۔ یہ شفق پھیلنے کی شاعرانہ توجیہ ہے۔

تیز چلنے والے دن کا قافلہ عدم کو روانہ ہو گیا، یعنی دن ختم ہو گیا۔ جسے ہم شفق کہتے ہیں، یہ شفق نہیں۔ سورج کے پھول معلوم ہوتے ہیں۔ میت پر یا اس کی قبر پر پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ شفق نے سورج کی میت کے لیے پھول تیار کر لیے۔ سورج ڈوبنے کے منظر سے شاعر کی نظر ہٹ کر شہنشاہ جہانگیر کے مقبرے کے اونچے میناروں پر جا پڑتی اور وہ کہتا ہے، دیکھو، چغتائی شہنشاہ کے مقبرے کے مینار دور نظر آ رہے ہیں۔ ان کی عظمت اور بڑائی نے تنہائی کے اس نظارے کی عظمت بڑھا دی ہے۔ ساتھ ہی شاعر کو اس مقام کی پرانی تاریخ یاد آ گئی۔ وہ سوچتا ہے کہ یہاں کیسے کیسے انقلاب برپا ہوئے۔ کسی زمانے میں تیموری یہاں حکمران تھے اور ان کی شان و شوکت کو چار چاند لگا رکھے تھے۔ وہ مٹ گئے تو ان کی حکومت غیروں نے سنبھال لی۔ زمانہ بدل گیا۔ حالات منقلب ہو گئے۔ اس طرح یہ مقام زمانے کی گردش کے ظلم و ستم کی کہانی بن گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقام نہیں بلکہ گزرے ہوئے زمانے کے واقعات کی ایک کتاب ہے۔ اسے مقام کیوں کہیں؟ یہ تو ایک خاموش راگ ہے، جسے آس پاس کے درخت چپ چاپ سُن رہے ہیں۔ انھیں درخت کیوں کہیں؟ یہ تو ایک ایسی انجمن ہے جو ہر شور و غل سے پاک ہے۔

ان چند اشعار میں اقبال نے منظر کشی کا انتہائی کمال دکھایا ہے۔ پھر موقع اور محل کے اعتبار سے حقیقی احساس رکھنے والے قلب میں جو جذبات پیدا ہو سکتے تھے، وہ اس طرح ابھر آئے، گویا قدرت نے پورا منظر انھیں جذبات کے لیے مہیا کیا تھا۔ آخری شعر میں اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ زمانے کی گردش کے ظلم و ستم بیان کرنے کا نہ موقع ہے، نہ اس سے کچھ فائدہ ہے۔ لہٰذا گیت کو خاموش بتایا گیا اور سننے والے درختوں کو انجمن بےخروش۔

تیسرا بند **سفینہ**: کشتی۔ ناؤ۔ **گرم ستیز**: لڑنے میں مصروف۔ زور آزمائی میں مشغول۔ **سبک رو**ی: تیز چلنا اور اس طرح کہ آہٹ تک نہ سنائی دے۔

مقبرے کے میناروں سے ہٹ کر شاعر کی نظر پھر دریا پر جم گئی۔ وہ دیکھتا ہے کہ دریا کے سینے پر ایک کشتی تیزی سے چلی جا رہی ہے۔ اس کے ملاح نے دریا کی لہروں سے زور آزمائی شروع کر دی ہے۔ کشتی نگاہ کی طرح تیز اور سبک رو ہے اور دیکھتے دیکھتے نظر کی حد کے حلقے سے دُور نکل گئی یعنی وہاں چلی گئی جہاں نظر نہیں آ سکتی۔ انسان کی زندگی کا جہاز بھی اسی طرح چلتا ہے کبھی ہمیشگی کے سمندر میں ظاہر ہو جاتا ہے کبھی چھپ جاتا ہے لیکن یہ ٹوٹتا نہیں۔ نظر سے پوشیدہ ہو جاتا ہے، مگر فنا نہیں ہوتا، ڈوبتا نہیں۔

آخری شعر میں اقبال نے روح کو ہمیشہ قائم رہنے والی قرار دیا ہے۔ زندگی اور موت میں ان کے نزدیک صرف اتنا فرق ہے کہ جب تک انسان زندہ ہے نظر آتا ہے۔ مر جاتا ہے، تو نظروں سے پوشیدہ ہو جاتا ہے، لیکن روح کی زندگی بدستور قائم رہتی ہے۔ "فلسفۂ غم" میں بھی یہی مضمون بیان کیا ہے۔ مثلاً:

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں   یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

التجائے مسافر!

بہ درگاہِ حضرت محبوبِ الٰہی، دھلی۔

تمہیدی نوٹ

یہ نظم اقبال نے ولایت جاتے ہوئے دہلی میں نظام الدولیا حضرت شیخ نظام الدین محبوبؒ الٰہی کے مزار پڑھی تھی اور یہ اکتوبر ۱۹۰۵ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی۔ ابتدا میں اس کے چھتیس شعر تھے۔ نظر ثانی میں صرف اکیس رکھے گئے۔ میر غلام بھیک نیرنگ مرحوم نے اس پر ایک تمہیدی نوٹ لکھا تھا جس کا مفاد ذیل میں درج ہے:

۲ ستمبر ۱۹۰۵ء بنبئی میل سے اقبال دہلی پہنچے۔ خواجہ حسن نظامی اور منشی نذر محمد بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس حلقۂ دہلی استقبال کے لیے سٹیشن پر موجود تھے۔ نیرنگ اور راکرآم اپنے دوست کو رخصت کرنے کے لیے دہلی تک ساتھ گئے۔ ریل سے اتر کر تھوڑی دیر منشی نذر محمد کے مکان پر ٹھہرے، پھر حضرت محبوبؒ الٰہی کے مزار کی زیارت کے لیے گئے۔ راستے میں ہمایوں کے مقبرے کی سیر کی۔ مزار پر پہنچے تو اقبال نے تنہائی میں سرہانے بیٹھ کر یہ نظم پڑھی۔ بعد ازاں احباب کی درخواست پر مزار کی طرف منہ کر کے انھیں سنائی۔ لہجہ نہایت درد انگیز اور دل نشین تھا۔ سب احباب متاثر ہوئے۔ محویت کا وہ عالم تھا جس کی تصویر حاضرین کے تصور ہی کھینچ سکتے ہیں۔ درگاہ سے واپس ہو کر خواجہ حسن نظامی کے مکان پر قیام کیا اور حضرت محبوب الٰہی کے لنگر کی مہمان داری سے بہرہ اندوز ہوئے۔ وہاں ولایت نام قوّال موجود تھا۔ وہ اگرچہ نوعمر تھا مگر خوش گلو اور باطبیعت تھا۔ وہ گاتا رہا۔

واپسی کے وقت خاتم الشعرا مرزا غالب کے مزار پر حاضر ہوئے۔ دھوپ تیز تھی۔ ۲ بجے کا وقت تھا، ہوا میں گھس، مگر قبر کی زیارت کا اثر تھا کہ کسی کو گرمی کا خیال تک نہ آیا۔ پارٹی مزار کے ارد گرد بیٹھ گئی۔ قوّال ساتھ تھا۔ بولا: حضور ایک غزل یاد آئی۔ اجازت ہو تو سناؤں۔ چنانچہ اس نے مرزا غالب کی یہ غزل سنائی:

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

اقبال نے رخصت ہوتے وقت لوحِ مزار کو بوسہ دیا۔

پہلا بند اے حضرت محبوبِ الٰہی! تیرے نام کا وہ درجہ ہے کہ فرشتے اس کا ورد کرتے ہیں۔ تیری درگاہ بہت اونچی ہے۔ تیرا فیض عام ہے۔ تیرا نظام بھی سورج کے نظام (نظامِ شمسی) کی مانند ہے۔ اس کائنات کے ستارے نظامِ شمسی کی بدولت قائم ہیں۔ عشق کے ستاروں کو اے حضرت محبوبِ الٰہی! تیری کشش نے قائم رکھا ہے۔ عشق کے ستاروں سے مراد وہ بزرگ ہیں جنھوں نے عشقِ الٰہی میں اونچا مرتبہ حاصل کیا۔ تیری قبر کی زیارت سے دل زندہ ہوتے ہیں۔ تیرا رتبہ مسیحؑ اور خضرؑ سے بھی اونچا ہے۔

اس شعر سے مراد یہ ہے کہ ادبی مسلمات کے مطابق حضرت مسیحؑ مردہ جسموں کو زندہ کرتے تھے۔ حضرت خضرؑ خود زندہ رہے۔ لیکن حضرت محبوبِ الٰہی کے مزار کی زیارت سے دلوں کو زندگی نصیب ہوتی ہے۔

ذاتِ باری تعالیٰ سے تیری محبّت میں محبوبی کا رنگ نمایاں تھا یعنی محبّت باری تعالیٰ میں تو نے وہ اونچا درجہ حاصل کیا کہ خود محبوبِ الٰہی بن گیا۔ تیری شان اور تیری عزّت بڑی ہے۔ میرا دل اگر سیاہ ہے تو سمجھنا چاہیے کہ میں تیرے لالہ زار کا داغ ہوں۔ اگر میں خستہ پیشانی ہوں تو تیری بہار کا پھول ہوں۔

دوسرا بند **نکہت**[1]: خوشبو۔ **نردبان**: سیڑھی۔ زینہ۔

میں وطن کے باغ کو پھول کی خوش بو کی طرح چھوڑ کر نکلا ہوں۔ میں اپنے صبر کا امتحان کرنا چاہتا ہوں۔ علم کی شراب کی لذّت مجھے کھینچتی ہوئی وطن کے نگارخانے سے باہر لے چلی ہے۔ میری نظر رحمت کے بادل پر ہے۔ میں بیابان کا درخت ہوں اور خدا نے مجھے باغبان کا محتاج نہیں کیا۔

مطلب یہ کہ بیابان کے درخت کی دیکھ بھال کوئی نہیں کرتا۔ ابرِ رحمت برستا ہے تو اسی سے وہ پرورش پاتا ہے۔ یہی حالت میری ہے۔

اے حضرت محبوبِ الٰہی! میرے لیے دعا کر کہ مجھے وہ زینہ عطا ہو، جس سے کام لیتے ہوئے میں آسمان پر پہنچ کر سورج کی طرح زمانے بھر کے لیے روشنی کا سامان بن جاؤں۔ میرا مقام ساتھیوں سے اس قدر اونچا ہو جائے یعنی میں اپنے ساتھیوں سے اس قدر آگے نکل جاؤں کہ قافلہ مجھے منزلِ مقصود سمجھنے لگے۔ میرے قلم کی زبان سے کسی کے دل کو دکھ نہ پہنچے اور اس آسمان کے نیچے مجھے کسی سے گلے کی نوبت نہ آئے۔ خدا کی بارگاہ سے مجھے فریاد کا ایسا طریقہ نصیب ہو جس کا اثر لوگوں کے دلوں کو شانے کی طرح چاک کر ڈالے۔ جو گھونسلا میں نے باغ میں گھاس پھوس چن چن کر بنایا تھا،

---

[1] "بانگِ درا" میں غلطی سے "نگہت" چھپ گیا۔

وہ مجھے پھر نظر آئے۔ اس سے بہ ظاہر اشارہ گھر کی طرف ہے۔ میں پھر واپس آکر اپنے ماں باپ کے قدموں پہ پیشانی رکھ دوں جن سے میں نے محبت کا بھید سیکھا۔

حضرت علی مرتضیٰ کے خاندان کی وہ شمع بارگاہ جس کا آستانہ میرے لیے کعبے کی طرح عزت اور حرمت والا رہے گا، جس کے فیضِ صحبت سے میری آرزو کی کلی کھلی جس کے احسان نے مجھے نکتے سمجھنے کے قابل بنایا۔ اے حضرت محبوبِ الٰہی! دعا کر کہ آسمان و زمین کا مالک مجھے پھر اس کی زیارت سے شادمانی بخشے۔ ان تین شعروں میں اشارہ اقبال کے شفیق استاد شمس العلماء مولانا سید میر حسن مرحوم کی طرف ہے۔

وہ میرا یوسفِ ثانی، وہ عشق کی محفل کا چراغ جس کی برادرانہ محبت میری جان کے لیے قرار کا باعث ہے جس کی محبت نے دوئی کے امتیاز کو مٹا کر مجھے عیش کی فضا میں پالا اور جوان کیا۔ وہ زمانے کے باغ میں پھول کی مانند ہنستا رہے، اس لیے کہ وہ جانِ جان مجھے جان سے بڑھ کر عزیز ہے۔

ان تین شعروں میں اشارہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد مرحوم کی طرف ہے۔

دل کی کلی کھل کر پھول بن جائے اور مسافر کی یہ التجا قبول فرمائی جائے۔

غزلیات

۱

اِس دنیا کے باغ کو غیروں اور اجنبیوں کی طرح نہ دیکھ۔ یہ تو دیکھنے کی چیز ہے۔ اسے لگاتار دیکھتا چلا جا۔

مطلب یہ کہ کائنات کی ہر چیز پر گہری نظر ڈال اور اچھی طرح غور کر کہ خدا نے یہ تمام اشیا کیوں پیدا کیں، انسان کی پیدائش کا کیا مقصد ہے اور ہمیں کیونکر زندگی بسر کرنی چاہیے؟

دیکھ تو دنیا میں چنگاری کی طرح پیدا ہوا ہے۔ یہ قائم نہ رہنے والی زندگی تجھے دھوکا نہ دے جائے، یعنی تیری عمر بہت تھوڑی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تو اس عارضی اور فانی زندگی کے فریب میں آجائے اور مقصدِ حیات آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔ چند روزہ زندگی کو غنیمت جان اور اس کا حقیقی مدعا حاصل کر کے اسے کامیاب بنا لے۔ شعر میں شرار، ہستی نا پائدار اور دم نہ دے جانے کی مناسبت ظاہر ہے۔

بے شک یہ درست ہے کہ میں تیری تجلی دیکھنے کے لائق نہیں۔ کہاں میں ایک ادنیٰ انسان اور کہاں تو جس نے یہ ساری کائنات پیدا کی۔ بھلا مجھ ایسے حقیر گدا کو تیری برتر اور اعلیٰ ذات سے جو شہنشاہوں کی شہنشاہ ہے، کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ پھر بھی تو یہ دیکھ کہ میں تجھ سے ملنے کے لیے کس قدر بے قرار ہوں اور تیرے انتظار میں کیونکر تڑپ رہا ہوں۔

اگر دیدار کے شوق اور لذت نے تیری آنکھیں کھول دی ہیں تو تجھے ہر راستے میں پائے محبوب کے تلوے کا نشان نظر آئے گا۔

مطلب یہ کہ اگر تو سراپا شوق بن کر دل کی آنکھوں سے دیکھے گا تو تجھے دنیا کی ہر چیز میں خدا کا جلوہ دکھائی دے گا۔

۲

اگر آپ آنا نہ چاہتے تھے تو نہ آتے، ہمیں اس پر کوئی اصرار یا ضد نہ تھی، لیکن آنے کا وعدہ کر لیتے تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ آپ کا اس میں کچھ نہ بگڑتا مگر ہمیں ضرور تسلی ہو جاتی۔

تمھارے پیغام لانے والے نے سارا بھید کھول دیا۔ جناب اس میں میرا قصور کوئی نہ تھا، یعنی تمھیں بدنام کر دینے کا جُرم تمھارے قاصد پر عائد ہوتا ہے، جس نے تمھارا پیغام اس رنگ میں دیا کہ تمھارے متعلق ہر شے دنیا پر ظاہر ہو گئی۔

اس شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اے خدا! تیرے تمام راز تیرے رسولوں نے سارے جہان پر ظاہر کر دیئے۔ اس میں ہماری کوئی خطا نہیں۔

تیری آنکھ مست ہونے کے باوجود کیسی ہوشیار تھی کہ اس نے بھری محفل میں اپنے چاہنے والے کو تاڑ لیا۔ یعنی اے ساقی! اگرچہ تو اپنے حسن و جمال کی شراب سے مست و سرشار ہے اور تیری آنکھوں سے مستی ٹپکی پڑتی ہے، لیکن اس حالت میں بھی تیری ہوشیاری اور مستعدی کی شان یہ ہے کہ تو اپنے عاشق کو نہیں بھولا اور اہلِ بزم میں سے اسے فوراً پہچان کر اس پر لطف و کرم کی نظریں ڈالتا رہتا ہے۔

اے قاصد! یہ تو مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ یہاں آنے میں سوچ بچار سے کام لے رہے تھے اور آنا نہ چاہتے تھے، لیکن یہ بھی تو بتا کہ ان کے انکار کرنے کا طریقہ کیا تھا، وہ کن لفظوں میں تامل و تذبذب سے کام لے رہے تھے، تاکہ میں ان کی گفتگو کے انداز سے ان کے دل کا بھید پا سکوں۔

اے محبوب کا جلوہ دیکھنے کی تڑپ! تجھ میں کس قدر کشش تھی کہ حضرت موسیٰؑ آپ ہی آپ کوہِ طور کی طرف کھنچتے ہوئے چلے گئے۔ مطلب یہ کہ اگر سچے عاشق کا ذوقِ دیدار کمال پر پہنچ جائے تو وہ ذوق خود بخود اسے کشاں کشاں معشوق کی جانب لے جا کر نعمتِ دید سے مالا مال کر سکتا ہے۔

اے اقبال! کسی کی محفل میں تیرا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ تیری باتیں نہ تھیں، وہ تو کوئی جادو تھا، یعنی تیری گفتگو میں ایسا جادو کا اثر ہے کہ محبوب کی بزم میں ہر ایک کے لب پر تیرا ہی تذکرہ ہے اور یہ تیری محبت کا کرشمہ ہے۔

۳

لے خدا! واعظ کی دین داری بھی عجیب و غریب ہے کہ اسے ساری دنیا سے دشمنی ہے یعنی وہ ہر شخص کی برائی کرتا ہے اور کوئی بھی اس کے نزدیک دین کی ترازو میں پورا نہیں اترتا۔ اقبال کا مقصد یہ ہے کہ دین پھیلانے کے لیے محبت اور

رواداری ضروری ہے۔ لیکن واعظ نے بالکل الٹا طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ لوگ دین سے دور بھاگنے لگیں۔ یہ کہاں کی دین داری ٹھہری ؟

کوئی شخص اب تک یہ بھید نہ پا سکا کہ انسان کس جگہ سے آتا اور کس مقام کو چلا جاتا ہے ؟ یعنی وجود و عدم ، زندگی و موت ، ازل و ابد ایسے گہرے راز اور پیچیدہ معمّے ہیں کہ آج تک انھیں کوئی حکیم کوئی فلاسفر غرض انسان حل نہیں کر سکا۔

جس جگہ سے تارے کو روشنی نصیب ہوئی ہے اسی مقام سے رات کو اندھیرا بخشا گیا ہے۔
مطلب یہ کہ خدا ہی کی ذات نے تارے کو نور اور رات کو ظلمت عطا کی ہے۔ ساری کائنات کو پیدا کرنے اور ہر چیز کو جدا جدا خوبیاں بخشنے والا ذات باری تعالےٰ کے سوا کوئی نہیں۔

جو شخص ہماری محبت کے تمام بھیدوں سے واقف ہے ، ہم اس کی زبان سے اپنا دکھ درد سنا کرتے ہیں۔
اس شعر کے دو مطلب ہو سکتے ہیں : اوّل یہ کہ دکھ درد کی باتوں میں ہمیں ایسی لذت ملتی ہے کہ اپنے رنج والم کی کہانی اپنے ہم راز سے سُن کر خوش ہوتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ ہم اپنے ضبط و صبر کی بنا پر اپنا دکھ درد بالکل بھول جاتے ہیں۔ ہمارا ہم راز یہ کہانی سناتا ہے تو ہمیں یاد آتا ہے کہ ہم پر کیا کچھ گزری۔

واعظ کی چالیں بڑی باریک ہیں۔ وہ اذان کی آواز سنتا ہے تو کانپ اٹھتا ہے۔ یعنی اذان سُن کر کانپنا بھی واعظ کی ایک چال ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دیکھنے والوں پر اس کی پرہیزگاری اور خدا ترسی کا خاص اثر پڑے۔

۴

ہفتاد و دو ملّت : بہتّر فرقے۔ ہم صفیر : ہم آواز - ہم نوا - ہم زبان -

مجھے اپنے گھونسلے کے لیے کہیں سے وہ تنکے لانے چاہییں ، جنھیں جلانے کے لیے بجلیاں بے قرار ہوں۔ گھونسلا اس لیے بنایا جاتا ہے کہ پرندہ اس میں آرام سے رہے۔ گھونسلے پر بجلی گرنے اور اس کے جلنے کو بہت سمجھا جاتا ہے کہ پرندہ اس میں آرام سے رہے۔ گھونسلے پر بجلی گرنے اور اس کے جلنے کو بہت بڑی مصیبت سمجھا جاتا ہے لیکن راہِ حق میں عزیمت کی یہ کتنی اچھی مثال ہے کہ ایسے تنکوں سے گھونسلا بنانے کی خواہش ہے ، جنھیں جلانے کے لیے بجلیاں بار بار بے قرار ہو کر گریں۔
اس شعر میں اقبال نے مقام عزیمت کا اظہار نہایت اچھے انداز میں کیا ہے اور یہ کمال عشق کا مقام ہے۔
میری ناکامی کس درجہ قابلِ ماتم ہے کہ میں نے جس شاخ کو گھونسلا بنانے کے لیے موزوں سمجھا آسمان نے اسے توڑ کر

نیچے پھینک دیا۔ یعنی زمانے کو مجھ سے اتنی دشمنی ہے کہ زین بسیرا کے لیے کوئی موزوں جگہ تجویز کرنے کا بھی موقع نہیں دیتا۔
یہ بھی ارباب عزیمت ہی کا نقشہ ہے، جنھیں زندگی میں اطمینان بہت کم نصیب ہوتا ہے۔

مجھے دل میں کوئی ایسی آرزو پیدا کرنی چاہیے کہ آسمان میرے مٹانے کے لیے بے تاب ہو جائے۔

مطلب یہ کہ جتنی آرزو ہوگی، آسمان اسے ناکام بنانے کے لیے اتنا ہی سرگرم ہوگا۔ پرانا مضمون ہے کہ اولوالعزم، ہمّت ورا اور اصلاح کے بلند جذبات رکھنے والے لوگوں سے زمانے کو دشمنی ہوتی ہے۔ اقبال اسی بلند مقام کا آرزومند ہے اور پرانے مضمون کو بالکل نئے اور دلکش انداز میں اس نے پیش کیا ہے۔

تو پہلے دانہ دانہ چُن کر غلّے کا ڈھیر تو جمع کر لے۔ کوئی نہ کوئی بجلی اسے جلانے کے لیے آ ہی جائے گی۔ یعنی جب تک تیرے پاس جلنے کے لیے کوئی چیز نہ ہوگی، بجلی آئے گی تو کیا جلائے گی؟ پہلے وہ سامان تو جمع کرنا چاہیے جسے جلانے کے لیے بجلی کی آرزو ہے۔ شیخ ناصر علی سرہندی نے اس مضمون کو یوں پیش کیا ہے:

به طاعت کوش گر عشقِ بلا انگیزی خواہی
متاعے جمع کن شاید کہ غارت گر شود پیدا

اے ہم نوا! مجھے صرف یہ خیال تھا کہ کہیں شکاری نامراد واپس نہ جائے۔ اس لیے میں جال میں پھنس گیا۔ ورنہ کب ایک دانے کے لیے شاخ سے اڑ کر جال میں چلا آتا؟ یعنی میں صرف صیّاد کی دل جوئی کی خاطر دام میں گرفتار ہو گیا ورنہ دانے کا بھوکا نہ تھا۔ مجھ سے یہ دیکھا جا سکتا تھا کہ صیّاد کو ناکامی کا غم ہو۔ لہٰذا محض اسے خوش اور کامیاب کرنے کی غرض سے شکاری کے الجھائے ہوئے دام پر جا بیٹھا اور پھنس گیا۔ ایک دانے سے مراد دانے کی گنتی نہیں بلکہ اس کی تحقیر ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی ذاتی غرض سے متاثر نہیں۔ دشمن کی خدمت میں صرف اس خیال سے اپنی جان تک دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں کہ اس کا دل نہ ٹوٹے۔ وسعتِ حوصلہ کا یہ نہایت بلند مقام ہے۔

اس باغ میں دل کے پرندے کو آزادی کا راگ نہ الاپنا چاہیے۔ افسوس ہے کہ یہ گلشن ایسے گیت گانے کے لیے موزوں نہیں۔

مطلب یہ کہ ہندوستان میں جو ایک غلام ملک ہے، کوئی شخص آزادی کے جذبات و خیالات کا اظہار نہ کرے کیونکہ یہ ایسا مقام ہے جہاں حریت و آزادی کے نعرے بلند کرنے والوں کو فوراً طوق و زنجیر پہنا دیے جاتے ہیں۔ اس شعر میں زور پہلے مصرع پر نہیں بلکہ دوسرے مصرع پر ہے۔ یعنی لوگوں کو آزادی کے نعرے لگانے سے روکنا مقصود نہیں بلکہ ہندوستان کی انتہائی بے چارگی کا نقشہ کھینچنا منظور ہے۔ جو لوگ ظا ہر ی الفاظ میں الجھ جاتے ہیں، وہ

اقبال کے ان یگانہ شاعرانہ کمالات کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔

اسیرِ حلقۂ دامِ ہوا صبر آزما

۵

: حرص کے جال کے پھندے میں پھنسا ہوا۔

صبر کا امتحان لینے والا۔

میں کیا بتاؤں کہ اپنے باغ سے کس طرح جدا ہوا اور ہوس، وطمع کے جال میں کیونکر پھنس گیا، یعنی میں اس مشکل سوال کا جواب کیا دوں کہ انسان آسمان کی بہشت سے علیحدہ ہو کر زمین کے دوزخ میں کس طرح آ گیا اور یہاں دنیا میں آ کر اس کی دل فریبیوں میں کیونکر گرفتار ہو گیا؟

بڑی حیرانی کی بات ہے کہ مجھے جو سارے زمانے سے بُرا ہے، اشرف المخلوقات ہونے کا خلعت عطا ہوا، یعنی انسان میں کمزوریاں بھی ہیں۔ وہ برائیوں میں بھی مبتلا ہو سکتا ہے، لیکن وہ صحیح راستے پر چلے تو اس کائنات کی کوئی مخلوق اس کی برابری کا دم نہیں مار سکتی۔ اس میں بھی زور پہلے مصرع پر نہیں، دوسرے پر ہے یعنی جس انسان کو اشرف المخلوقات بنایا، کتنی حیرانی ہے کہ وہ بُرا بن گیا، حالانکہ اسے مخلوقات کے لیے بہترین نمونہ بننا چاہیے تھا۔

طُور اور حضرت موسیٰ کا معاملہ صرف اتنا ہے کہ دیکھنے دکھانے کا تقاضا ہو رہا تھا یعنی حضرت موسیٰ نے اَرِنی کہا: (اے خدا! تُو مجھے اپنا جلوہ دکھا) اے دل! کیا خبر کہ اس قضیّے کا فیصلہ کس بنا پر ہوا؟

عام خیال یہ ہے کہ دل میں کوئی مدّعا نہ ہونا چاہیے اور جو شخص بے مدعا ہوگا، وہ آرام سے زندگی بسر کرے گا۔ اقبال کہتے ہیں کہ اپنے دل سے آرزوؤں کو نکالنا بھی تو ایک مدّعا ہے۔ یہ بھی تو ایک خواہش ہے پھر کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ دل کا پرندہ خواہشوں کے جال سے آزاد ہو گیا، یعنی اس زندگی میں انسان کے لیے تمنا سے پاک ہونے کی کوئی صورت نہیں۔

اے خدا! دیکھنے والے تو تجھے اس زندگی میں بھی دیکھ لیتے ہیں۔ پھر ہم کیوں کہیں کہ قیامت کے دن دیدار کا جو وعدہ ہے وہ بہت صبر آزما ہے اور اس کا انتظار بہت کٹھن ہے؟

نورِ مطلق تو پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو ظاہر کیوں کیا؟ ہو نہ ہو، اس بے پردگی کا سبب یہ ہے کہ حُسن جب کمال پر پہنچا ہوا ہو تو وہ چھپا رہ ہی نہیں سکتا۔

اے جدائی کے دُکھ! علاج کرنے والا دیوانہ ہے جو میرے مرض کو لاعلاج بتاتا ہے۔ اگر اس کے نسخے ختم

ہو چکے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ علاج کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ اور کچھ نہ ہو تو میرے پاس موت کا نسخہ تو باقی ہے یعنی میں مر تو سکتا ہوں اور اس طرح جدائی کے دُکھ کا علاج کر سکتا ہوں۔

اے سبق حاصل کرنے والی آنکھ! تُو نے کبھی اس حقیقت پر بھی غور کیا ہے کہ پھول نے مٹی سے پیدا ہو کر دل کش سُرخ لباس کیونکر حاصل کر لیا؟

مُراد یہ ہے کہ اگر نظر تہ تک پہنچنے والی ہو تو صرف یہی ایک بات قدرت کی کرشمہ سازیوں کا یقین دلا سکتی ہے۔ صرف اسی سے کارسازِ مطلق پر ایمان لایا جا سکتا ہے کہ پھول اگرچہ مٹی جیسی بے حقیقت چیز سے پیدا ہو کر اتنا خوب صورت ہوتا ہے۔ تاہم اپنی خوب صورتی سے ہر نظر کو لُبھا لیتا ہے۔

اس دنیا میں مجھ سے جو اعمال سرزد ہوئے وہ تو خدا ہی کے تھے۔ یہ بھی ظاہر تھا کہ وہ کس وجہ سے سرزد ہوئے۔ پھر ان کی پُوچھ گچھ سے اس کے سوا کیا غرض تھی کہ مجھے رسوا کیا جائے؟ یعنی جب اس دنیا میں سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا ہے تو پھر میرے اعمال کا حساب کیوں لیا گیا؟ کیا صرف اس لیے کہ میری رُسوائی ہو؟

میں کیا بتاؤں کہ میرا اور میرے محبوب کا سامنا کیونکر ہوا؟ بس اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ سامنا ہوتے ہی میں مٹ گیا اور میرے مٹنے کا یہ تماشا دیکھنے کے قابل تھا یعنی عاشق کی ہستی محبوب کے سامنے باقی نہیں رہ سکتی۔

۶

سوزن: سُوئی۔ خاماں برباد: اُجڑے گھر والا۔

عاشقوں کی وضع قطع سب سے انوکھی ہے اور وہ زمانے بھر سے نرالے ہیں۔ اے خدا! یہ لوگ کس بستی کے رہنے والے ہیں؟ شاعر عاشقوں کے طور طریقے دیکھ کر محسوس کرتا ہے کہ یہ عام انسانی آبادیوں کے باشندے تو معلوم نہیں ہوتے۔ کسی اور ہی بستی میں ان کا رہنا سہنا ہو گا۔

میں درد کا علاج کرتے ہوئے بھی درد کی لذت پا رہا ہوں۔ میرے چھالوں میں جو کانٹے چبھ گئے تھے۔ انھیں میں نے سُوئی کی نوک سے نکالا یعنی کانٹوں کی چُبھن سے نجات حاصل کرنے کے سلسلے میں سُوئی کی چُبھن سے کام لیا۔ غالب نے اس سے ملتے جُلتے مضمون کا ایک شعر کہا ہے:

زخم سلوانے میں مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذّت زخمِ سوزن میں نہیں

اے خدا! میری امیدوں کے باغ کو پھولا پھلا رکھ۔ میں نے امیدوں کے بُوٹے جگر کا خون دے دے کر پالے ہیں ہر شخص کی امیدیں اسے حد درجہ عزیز ہوتی ہیں۔ گویا کہا جاسکتا ہے کہ اس نے امیدوں کی پرورش کے لیے جگر کا خون استعمال کیا ہے اور اس کے دل سے یہی دعا اٹھتی رہتی ہے کہ یہ امیدیں ہمیشہ تر و تازہ رہیں۔

رات کے وقت ستاروں کی خاموشی دیکھ کر مجھے رونا آجاتا ہے۔ میرا عشق بھی نرالا ہے اور میری فریاد کے طریقے بھی نرالے ہیں۔ یعنی عام عاشق محبوب کو پیار کرتے ہیں اور اس سے جدائی پر گرمِ فغاں ہوتے ہیں، لیکن میرے لیے ستاروں کی خاموشی بھی رونے کا پیغام ہے۔ اور یہ خاموشی میرے دل میں خالق اور مالک کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔

مجھے گھر بار برباد رکھنے میں جو مزہ آتا ہے وہ بیان نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے سینکڑوں گھونسلے بنائے، پھر انھیں جلا ڈالا۔ گویا دوسروں کو گھر بار بنانا پسند ہے، مجھے برباد ہی کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔

اے چنگاری! تو کیوں تیزی سے بجھ رہی ہے؟ ذرا ٹھہر جا۔ ہم بھی تو مٹنے والے ہیں اور اس لحاظ سے تیرے سفر کے ساتھی ہیں۔ سفر کے ساتھیوں سے یوں آنکھیں پھیر لینا اچھا نہیں۔

اس شعر میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ انسان بھی اسی طرح لمحے بھر میں مٹ جاتا ہے جیسے چنگاری چمکتے ہی غائب ہو جاتی ہے۔

حضرت واعظ دیکھنے میں تو بڑے سیدھے سادے اور بھولے بھالے ہیں، لیکن ان کی ساری پاک بازی اس لیے ہے کہ موت کے بعد بہشت میں جائیں گے تو حوریں ملیں گی۔

اے اقبال! میرے شعر مجھے کیوں پیارے نہ ہوں؟ یہ شعر نہیں میرے ٹوٹے ہوئے دل کے درد بھرے نالے ہیں۔

۷

عذر آفریں: بہانہ پیدا کرنے والا۔ **جنبشِ مژگاں:** پلکوں کا ہلنا۔

اے نورِ مطلق! تجھے ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ اگر کوئی دیکھنا چاہے تو اسے دل کی آنکھ کھولنی چاہیے اگر دل کی آنکھ کھل جائے تو انسان کو کائنات کی ہر شے میں اسی کا جلوہ نظر آئے۔

منصورؒ نے انا الحق کہا اور اس طرح عشق کا دعوےٰ کیا، لیکن یہی دعویٰ اس کے لیے سولی کی سزا کا باعث بنا۔ گویا اس کے لبوں کا کھلنا موت کا پیغام بن گیا۔ جب حالت یہ ہے تو اب کوئی کس بنا پر کسی کے عشق کا دعوےٰ کرے؟ یعنی جب دعویٰ کرتے ہی موت کی سزا ملتی ہے تو چپ رہنے کے سوا چارہ کیا ہے؟

اگر تجھے دیدارِ الٰہی کا شوق ہو تو آنکھیں بند کر لے۔ اس دیدار کا طریقہ یہی ہے کہ دیکھا نہ جائے۔ اس شعر کے دوسرے مصرع میں "دیکھنا ہی" سے مراد ہے۔ "دیدارِ الٰہی"۔ "نہ دیکھا کرے کوئی" سے مراد ہے کہ ظاہری آنکھیں بند کر لی جائیں۔
میں عشق کی آخری منزل پر پہنچا ہوا ہوں، تو حسن میں کمال کا سب سے اونچا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ لوگ مجھے دیکھیں یا تجھے؟
شعر میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ جب عشق اور حُسن انتہا پر پہنچ جائیں تو ایک ہو جاتے ہیں اور ان میں دوئی باقی نہیں رہتی۔
اے ہم نشین! میں محبوب کو محبّت بھری نظر ہی سے دیکھ سکتا ہوں اور ایسی نظر کو لاکھ چھپانے کی کوشش کی جائے، یہ چھپ نہیں سکتی۔ اس بنا پر مجھے مجرم سمجھا جاتا ہے لیکن تو مجھے بتا کہ میں انھیں اور کس نظر سے دیکھوں؟
خدا جانے، حضرت موسیٰؑ کوہِ طُور پر پہنچے تو کس برتے پر نورِ مطلق کے دیدار کا تقاضا کرنے لگے اور اس تقاضے پر اَڑ گئے حالانکہ ان میں دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ جب حالت یہ تھی تو دیدار کا تقاضا کیوں کیا تھا؟
محبوب کے دیدار کے وقت تو پلکوں کا ہلنا بھی گوارا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے دیکھنا ہو تو نرگس کی آنکھ پیدا کی جائے، جس کے پلکیں نہیں ہوتیں۔
اگر محبوب دو چار دن میری آرزو میں گزار دے تو اسے معلوم ہو جائے کہ شوق کی تمنّا میں کیا مزے ہیں یعنی عشق کے لطف کا اندازہ ذاتی تجربے کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

۸

تمہیدی نوٹ

معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ اور ان کے بعض دوستوں نے ایک مصرع طرح تجویز کر کے غزلیں لکھی تھیں۔ چنانچہ ذیل کی زمین میں اقبالؔ، نیرنگؔ اور اعجازؔ کی غزلیں اکتوبر ۱۹۰۱ء کے "مخزن" میں بیک وقت شایع ہوئی تھیں۔ اقبالؔ کی غزل کے بیس شعر تھے، نظرِ ثانی میں صرف نو باقی رہے۔

آرزو تھی بے دلی: دل دینے کا شوق۔ عاشقی کی تمنّا۔ **چمن افروز:** باغ کو رونق دینے والا۔ **رحیل:** کوچ۔ **کشودِ کار:** مطلب حاصل ہونا۔ مشکل حل ہونا۔
میں کیا بتاؤں کہ مجھے عاشقی کی تمنّا کس قدر ہے۔ بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ میرے بازار کی رونق نقصان کے سودے تک

قائم ہے۔ یعنی میں برابر نقصان اٹھا رہا ہوں۔ نقصان ہی سے میرے تجارت کی گرم بازاری ہے۔ نقصان اٹھانا، تکلیفیں سہنا، دُکھ برداشت کرنا عاشقی کی عام خصوصیتیں ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میری زندگی ہی نقصان کے سودے کرتے رہنے پر موقوف ہے۔ اسی سے اندازہ کر لینا چاہیے کہ مجھے عاشقی میں کیا مقام حاصل ہے۔

میں وہ شراب نوش ہوں کہ شراب میرے رگ و پے میں دوڑ جائے اور اس کی آب و تاب سے چہرے پر سُرخی آ جائے تو میں خود گلزار بن جاؤں۔ مجھے پھولوں کی سیر کا شوق کیوں ہو؟ یہ شوق صرف اس وقت تک ہے، جب تک میں اپنے نامہربان ساقی سے جُدا ہوں یعنی جب تک وہ آ کر مجھے شراب نہیں دیتا۔

شراب کی آب و تاب سے چہرے کا رشکِ گلزار بن جانا بہت اچھا مضمون ہے۔

شکاری اسی وقت تک باغ کی رونق بڑھا رہا ہے، جب تک میں دل لبھانے والے نغمے گا رہا ہوں۔ بجلی کا گرنے کے لیے تڑپنا اور بے قرار ہونا بھی میرے گھونسلے تک ہے۔ یعنی میں نہ رہوں گا تو صیاد بھی باغ کی رونق نہ بڑھائے گا۔ اور میرا گھونسلا نہ رہے گا تو بجلی کی بے قراری بھی ختم ہو جائے گی۔

اگرچہ میں خاک کی مُٹھی ہوں لیکن پریشانی کے فیض نے مجھے صحرا بنا دیا ہے۔ میں اپنی وسعت کیا بتاؤں۔ یہ سمجھ لو کہ میری وسعت زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی ہے۔

اس شعر میں پریشانی سے مراد عشق ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ انسان خاک کی ایک مٹھی ہے تاہم عشق کے فیض سے وہ زمین و آسمان کی فراخی پر چھا سکتا ہے۔

میں جرس ہوں اور میری رگ رگ میں فریادیں سوئی پڑی ہیں، لیکن میری خاموشی اسی وقت تک ہے جب تک قافلہ کوچ نہ کرے۔ اس کے کوچ کرتے ہی میں سراپا فریاد بن جاؤں گا۔

اگر تو اپنا مطلب حاصل کرنا چاہتا ہے اور تیری خواہش یہ ہے کہ مشکلات دور ہو جائیں تو اس کا ذریعہ دل کا سکون ہے۔ دیکھو پانی جب تک چلتا رہتا ہے، بھنور کے دل کی گتھی نہیں سلجھتی۔ اگر پانی کی روانی ختم ہو جائے تو بھنور بھی باقی نہ رہے۔ بھنور کے چکر کو اس کے دل کی گرہ سے تشبیہ دی۔

مطلب یہ کہ پانی ٹھہر جائے تو بھنور نہ رہے۔ اسی طرح تو اپنا کام آسان کرنا چاہتا ہے تو سکون اختیار کر لے۔

اے بلبل! محبّت کے باغ میں چُپ رہنا اور فریاد نہ کرنا موت کے برابر ہے۔ یہاں کی زندگی اسی وقت تک قائم ہے، جب تک نالہ و فغاں کا قاعدہ جاری ہے۔

جوانی ہو تو دیدار بھی مزہ دیتا ہے اور تمنا میں بھی لطف آتا ہے یوں سمجھنا چاہیے کہ جوانی مہمان ہے اور گھر کی رونق اسی مہمان کے دم سے ہے۔ جوانی کو مہمان اس لیے کہا کہ وہ چند روزہ اور عارضی ہوتی ہے۔

زمانے بھر میں بدنام ہو چکا ہوں مگر میری سادگی اور سادہ لوحی دیکھو کہ اب تک سمجھ رہا ہوں، میری محبت کا بھید میرے ہم راز کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

۹

تمہیدی نوٹ

یہ غزل جنوری ۱۹۰۱ء کے "مخزن" میں چھپی تھی اور اس کے اکیس شعر تھے۔ نظرثانی میں تین قلم زد کر دیے۔

ظلمت خانہ : اندھیرا گھر۔ **جبہ سائی :** لفظی معنی پیشانی گھسنا۔ اصطلاحاً سجدہ کرنا۔ **خرقہ پوش :** گدڑی پہننے والے یعنی درویش۔ **خوشہ چین :** خوشے چننے والا یعنی فیض حاصل کرنے والا۔ **ادائے ماعرفنا :** اشارہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی طرف کہ : ماعرفناک حق معرفتک۔ یعنی اے خدا ہم نے تجھے اس طرح نہ پہچانا، جس طرح پہچاننے کا حق تھا۔

ہم نے جنھیں آسمانوں اور زمینوں میں ڈھونڈا تھا، وہ دل کے اندھیرے گھر میں موجود نکلے۔ اس میں اشارہ محبوب حقیقی کی طرف ہے یعنی خدا کو آسمانوں اور زمینوں میں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے باطن پر توجہ کی ضرورت ہے۔ دل کو پاک کرنا چاہیے جو اس کا اصل مقام ہے۔

جب ہماری اپنی حقیقت ہماری آنکھوں پر کھل گئی تو محبوبِ حقیقی ہمارے دل ہی کے مکان میں رونق افروز نکلا۔ مطلب یہ کہ جب انسان خود اپنی حقیقت کے بھید سے واقف ہو جائے، اپنے نفس کو بخوبی پہچان جائے تو وہ اپنے رب کو پہچان جاتا ہے اور شاہدِ معنی اس کے دل میں جلوہ گر ہو جاتا ہے۔

اگر کعبے کی چوکھٹ کا پتھر سجدہ کرنے کی لذت سے ذرا بھی واقف ہوتا تو عاشقوں کی پیشانیوں میں جا ملتا۔ یعنی سجدہ کرنے والوں میں شامل ہو جاتا۔

مطلب یہ کہ اگر سنگِ کعبہ آستانِ محبوب پر سجدہ کرنے کی لذت سے آگاہ ہوتا تو وہ بھی عاشقوں میں جا کر ملتا۔

اے قیس! تو نے کبھی اپنی حقیقت پر بھی نظر ڈالی ہے کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی کجاوے کی رونق ہے؟ مراد یہ کہ اے انسان! اگر تجھ پر خود اپنی ذات کی حقیقت کا بھید کھل جائے تو تیرے اندر بھی محبوبی کی شان پیدا ہو جائے۔

وصلِ محبوب کے مہینے تو گھڑیوں کی طرح جلد جلد گزر جاتے ہیں لیکن جدائی کی گھڑیاں لمبی ہو کر مہینے بن جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ خوشی کے دن گزرتے معلوم بھی نہیں ہوتے اور آناً فاناً ہوا ہو جاتے ہیں مگر غم کی گھڑیاں کاٹے نہیں کٹتیں۔

اسے کشتی بان! تو مجھے ڈوبنے سے کیا روکے گا؟ جن لوگوں کو ڈوبنا ہوتا ہے، وہ تو کشتیوں میں بیٹھے بیٹھے بھی ڈوب جاتے ہیں، یعنی جو شخص محبوبِ حقیقی کے عشق میں فنا ہونے کی ٹھان لیتا ہے، وہ امیری کی مسند پر بیٹھ کر بھی اس کی یاد میں گم ہو جاتا ہے۔ اصل شے ظاہری صورت نہیں بلکہ دل کی لگن ہے۔ نہایت بلیغ اور بلند پایہ شعر ہے۔

جس محبوب نے اپنے حُسن کو حضرت موسیٰؑ سے چھپائے رکھا تھا، اسی نازنین کا جلوہ حسینوں میں ظاہر ہو رہا ہے۔ مُراد یہ کہ دنیا کی ہر چیز میں اسی کا جلوہ ہے لیکن اس جلوے کی صورتیں الگ الگ ہیں۔ کہیں معشوقوں کے چہروں میں جھلک دکھا رہا ہے اور کہیں پھولوں کے آب و رنگ میں۔

اے خدا! دل والے لوگوں کے سینوں میں کیا چیز چھپی ہوتی ہے کہ ان کے سانس کی لہر سے بجھی ہوئی شمع روشن ہو سکتی ہے؟ مطلب یہ کہ جو لوگ روحانی اعتبار سے مُردہ ہو چکے ہوں۔ ان کے دلوں میں عاشقانِ خدا باطنی توجّہ سے ایمان کا بجھا ہوا چراغ روشن کر سکتے ہیں۔

اگر تو دردِ دل کی نعمت حاصل کرنا چاہتا ہے تو فقیروں کی خدمت کر، کیونکہ یہ موتی بادشاہوں کے خزانوں میں نہیں مل سکتا یعنی عشقِ حقیقی کی تڑپ عاشقانِ خدا ہی کے فیض سے میسّر آ سکتی ہے۔ اللہ والے ہی اللہ سے ملا سکتے ہیں۔ امیروں، وزیروں اور بادشاہوں کی خوشامد کرنے سے یہ انمول نعمت دست یاب نہیں ہو سکتی

ان گدڑی پہننے والوں کا حال کیا پوچھتا ہے؟ اگر تو ان سے عقیدت رکھتا ہے تو انھیں دل کی آنکھ سے دیکھ۔ تجھے صاف نظر آئے گا کہ وہ حضرت موسیٰؑ کی طرح اپنی آستینوں میں یدِبیضا کا معجزہ لیے بیٹھے ہیں۔

مراد یہ کہ نبیوں کے معجزوں کی طرح ولیوں میں بھی کرامتیں ہوتی ہیں جن کے بل پر وہ مردہ دل کو زندہ دل بنا کر اسے عشقِ الٰہی کی شراب سے مدہوش کر سکتے ہیں۔

جس رونق اور حُسن کا نظارہ کرنے کے لیے ظاہر بینوں اور مادہ پرستوں کی نگاہیں ترس رہی ہیں، اس کا جلوہ اس دنیا میں انھیں تنہائی میں بیٹھنے والے خدا شناسوں کے فیض سے نظر آ سکتا ہے۔

مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص دردِ دل اور عشقِ الٰہی پیدا کر کے محبوبِ حقیقی کی تجلّی کا آرزومند ہے تو ان بزرگوں کا فیضِ صحبت حاصل کرے۔

اپنے دل کا کھلیان کسی ایسی چنگاری سے پھونک دے کہ قیامت کے دن چمکنے والا سورج بھی تجھ سے حرارت طلب کرے یعنی اے مسلمان! عشقِ رسولؐ کی چنگاری سے اپنے دل کو اس قدر گرم، پُرسوز اور روشن کر لے کہ اس کے آگے آفتابِ قیامت کی بھی کوئی حقیقت نہ رہے۔

عشق پیدا کرنے کے لیے کوئی ٹوٹنے والا دل تلاش کر۔ یہ وہ شراب ہے جو نازک شیشوں میں رکھی جاتی ہے۔

مراد یہ کہ اگر تو محبتِ رسولؐ کی دولت حاصل کرنے کا خواہش مند ہے تو پہلے اپنے دل میں سوز و گداز پیدا کر لے۔

اے دل! بھلا تو بتا تو سہی کہ دنیا کے حسینوں میں کوئی حسین ایسا بھی ہے، جس کے حُسن کا عاشق خود ہی سر سے پاؤں تک حُسن بن جائے؟ مطلب یہ کہ ایسا حسین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی نہیں کیونکہ حضورؐ ہی کے عشق میں فنا ہونے والوں کو یہ بلند مقام حاصل ہوتا ہے کہ وہ سراپا حُسن بن جاتے ہیں۔

جب آپ کی زبان مبارک سے ارشاد ہوا کہ ما عرفناك حق معرفتك۔ یعنی ہم نے تجھے اس طرح نہ پہچانا جس طرح پہچاننے کا حق تھا تو اللہ تعالیٰ آپ کی اس ادا پر پھڑک اٹھا اور آپ کا مقام سب حسینوں سے بلند تر کر دیا۔ یعنی جناب باری تعالیٰ نے آپ کو تمام نبیوں کا سر دار بنا کر معراج کی رات بے حجاب اپنی عین ذات کی تجلی دکھائی۔

فلسفی اور حکیم مدت سے آپ کی عظمت، شان اور مقام پر بحث و تحمیص کر رہے ہیں اس لیے اے محبوب خدا کبھی ان منکروں کو اپنے جمالِ جہاں تاب کی ایک جھلک دکھا دیجیے۔ مراد یہ کہ کم نظر لوگ آپ کے بلند ترین مرتبے کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ انھیں اپنی بے مثال بزرگی اور بلند پایگی سے آگاہ فرما کر صراطِ مستقیم پر چلا دیجیے۔

اے دل! چُپ ہو جا۔ بھری محفل میں شور و غل کرنا مناسب نہیں۔ عشق کے سلیقوں اور قاعدوں میں ادب پہلا قاعدہ ہے۔

مطلب یہ کہ حضورؐ کے دربار میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ بات کرنے سے کہیں بے ادبی کا کوئی پہلو پیدا نہ ہو جائے۔

اے اقبال! جو لوگ مجھ پر نکتہ چینی اور اعتراض کرتے ہیں۔ کیا میں انھیں بُرا سمجھوں؟ نہیں، مجھ سے تو ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ میں تو خود ہی اپنے آپ پر نکتہ چینی کرتا رہتا ہوں۔ یعنی عاشق لوگ کسی کو بُرا نہیں کہا کرتے۔ عشق کے طریق میں بدگوئی سب سے بڑا جرم ہے۔ پھر میں اپنے مخالفوں کو کیونکر بُرا کہہ سکتا ہوں؟

۱۰

تمہیدی نوٹ

یہ غزل جنوری ۱۹۰۶ء کے "مخزن" میں چھپی تھی۔ جس کے پندرہ شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں صرف چھ باقی رکھے۔

میں تجھ سے انتہائی طور پر محبت کرنا چاہتا ہوں۔ میری سادگی اور معصومیت دیکھ کہ مجھے کس چیز کی آرزو ہے۔

مراد یہ کہ اے محبوب! میں تیرے عشق میں وہ بلند ترین مقام حاصل کرنا چاہتا ہوں جو آج تک کسی کو نہ ملا ہو۔

میں تجھ سے اس قدر محبت کرنے کا آرزو مند ہوں کہ اس سے آگے عشق کا کوئی درجہ نہ ہو۔ ذرا غور تو کر، میں بھی کیسا

اٹھی ہوں کہ تجھ سے مانگا بھی تو کیا مانگا۔

اس شعر میں تجاہلِ عارفانہ (جان بوجھ کر انجان بننا) خوب لطف دے رہا ہے۔

خواہ تم مجھ پر ظلم کرو یا چہرے سے نقاب الٹ دینے کا وعدہ۔ بہر حال میں تم سے یہ چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی بات کرو، جس سے میرے صبر کی آزمائش ہو سکے۔

مطلب یہ کہ ظلم و ستم سے بھی اور بے پردہ جلوہ دکھانے کے وعدے سے بھی دونوں حالتوں میں عاشق کے صبر کا امتحان ہوتا ہے۔ بس میں اپنا صبر آزمانا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے اسی میں لذت ملتی ہے۔

یہ بہشت زاہدوں کو مُبارک رہے۔ میں تو آپ کا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔ یعنی مجھے زاہدوں کی طرح بہشت کی ضرورت نہیں۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ آپ کے جلوے سے آنکھیں سینکتا رہوں۔ اس کے آگے بہشت وغیرہ کی کوئی بھی حقیقت نہیں۔

یوں تو میں ننھا سا دل ہوں لیکن شوخ اور گستاخ ایسا ہوں کہ تیری زبان سے وہی لن ترانی (تو مجھے نہ دیکھ سکے گا) سننا چاہتا ہوں جو تو نے کوہِ طور پر حضرت موسیٰؑ کو سنائی تھی۔ مراد یہ کہ مجھے تیری زبان سے انکارِ جلوہ کے الفاظ سننے میں بڑا مزہ آتا ہے۔

اے محفل والو! میں تو اب تھوڑی دیر کا مہمان ہوں، گویا صبح کے چراغ کی طرح بجھنے ہی والا ہوں۔

مطلب یہ کہ میری زندگی ختم ہو رہی ہے اور اب میں اس دنیا سے رخصت ہی ہونے والا ہوں۔

اے محبوب! میں نے بھری محفل میں یہ چھپا ہوا بھید کھول دیا کہ تو مجھے لطف و کرم کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ میں نے بڑی بے ادبی اور گستاخی کی ہے، مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے۔ یعنی عشق کی شان یہ ہے کہ عاشق ہمیشہ چُپ رہے۔ محبوب خواہ اس پر نظرِ عنایت کرے خواہ ظلم و ستم۔ اسے کسی بھی حال میں زبان نہ کھولنی چاہیے۔

۱۱

تمہیدی نوٹ

یہ غزل جون ۱۹۰۵ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی اور اس کے پندرہ شعر تھے جن میں سے پانچ قلم زد کر دیے۔

احتراز: پرہیز کرنا۔ بچ کر رہنا۔ پرے پرے رہنا۔

وہ بے نیاز اپنے کرم کا ہاتھ کھولے یعنی اللہ تعالیٰ مہربانی کرنے پر مائل ہو تو پھر نیاز مند یعنی بندہ اپنی عاجزی پر کیوں فخر نہ کرے:

اے واعظ! تو نے تو خدا کو عرش پر بٹھا رکھا ہے یعنی تو یہ سمجھتا ہے کہ خدا دنیا سے الگ تھلگ بیٹھا ہے اور اسے یہاں کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن وہ خدا کیا ہوا جو اپنے بندوں سے پرہیز کرے؟

مطلب یہ کہ اوّل خدا عرش سے وابستہ نہیں۔ وہ ہر جگہ اور ہر مقام پر موجود ہے۔ دوم ہمارا مہربان خدا اپنے بندوں کے ہر دُکھ درد کو دیکھتا ہے اور اپنی رحمت سے ان کی مشکلیں دور کرتا ہے۔ واعظ اپنے وعظ میں خدا کی جو تصویر پیش کرتا ہے۔ وہ اس سے بالکل الگ تھلگ ہوتی ہے۔

اے ساقی! میں تو اُس رند کو رند ہی نہیں سمجھتا جو ہوشیاری اور مستی میں فرق کرے یعنی حقیقی رند تو وہ ہے جس کا ہر لمحہ ساقی کی مہربانی سے مستی اور سرور کی حالت میں گزرے۔

میرزا غالب نے بھی ساقی کی مہربانیوں اور دریا بخشیوں کا ذکر نہایت عمدہ انداز میں کیا ہے۔ کہتے ہیں:

مستِ عطائے خود کند ساقیِ ما نہ مستِ مے

دادہ ز یاد می برد بسکہ زیاد می دہد

یعنی ساقی اتنی شراب بخشتا ہے کہ پیشتر کی بخشش کو بھلا دیتا ہے۔ ہم شراب کے متوالے نہیں ہم تو ساقی کی عطا کے متوالے ہیں۔

اقبال کے شعر کا ایک عام مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ جس رند کو ہوشیاری اور مستی میں فرق محسوس ہو، وہ رند ہی نہیں رند وہ ہے جس کی مستی دائمی ہو اور اسی کو وہ اپنی زندگی کی مستقل حالت بنا لے۔

ہمیشہ اپنے کان دل پر لگائے رکھ، کیونکہ یہ ایسا ساز ہے کہ اگر ٹوٹ جائے تو پھر اُس سے راز کے نغمے نکلنے لگتے ہیں
اس شعر میں دل کے ٹوٹنے یعنی عاشق ہونے کو راز کے نغموں کا ساز قرار دیا ہے۔

کوئی پوچھے، واعظ بڑے زور و شور سے بیان کرتا ہے کہ بے عمل لوگ خدا کی رحمت سے محروم رہیں گے۔ اقبال کہتا ہے۔ بھلا ان حضرت سے کوئی پوچھے کہ اگر وہ پاک اور بے نیاز ذات بے عملوں کو بھی اپنی رحمت کے پردے میں چھپا لے تو واعظ صاحب کا کون سا نقصان ہو جائے گا؟

اس شعر میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اچھے عمل بے شک ہونے چاہییں، لیکن خدائے بے نیاز چاہے تو اپنی رحمت سے گنہگاروں کو بھی بخش دے۔ قرآن میں آیا ہے: إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ۔ نیز إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا۔

اے خدا! شعر میں سوز و گداز کہاں سے آتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ پتھر کو بھی پگھلا کر پانی بنا دے سکتی ہے۔ مطلب یہ کہ سوز و گداز اگرچہ دل کی تڑپ سے پیدا ہوتا ہے، لیکن یہ خدا داد نعمت ہے۔ وہ بے نیاز جسے چاہے عطا کر دے۔

بلبل کے نالہ وفریاد کی وجہ یہ ہے کہ وہ لالے اور گلاب کے پھول میں فرق کرتی ہے۔ یعنی اسے ہر پھول سے محبت نہیں۔ صرف گلاب کے پھول سے محبت ہے اور جب گلاب کا پھول نہیں ملتا تو اس کی جدائی میں فریاد پر آمادہ ہو جاتی ہے حالانکہ اور دوسرے بہت پھول موجود ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس دنیا میں جو آنکھ فرق و امتیاز میں مبتلا ہو گی، اسے چین نہ ملے گا۔

اقبال نے اس شعر میں اپنے خاص انداز سے فرقہ واری و گروہ بندی کی مذمت کی ہے اور یہ سبق دیا ہے کہ نظر حقیقت پر رہنی چاہیے۔ اس سے ہٹے گی اور ظاہری صورتوں میں اُلجھے گی تو پھوٹ اور تفرقے کی مصیبتیں پیدا ہوں گی۔

سب لوگ خدا کے بندے ہیں، خواہ وہ گنہگار ہوں یا پاک باز۔ واعظ کو اپنی پرہیزگاری پر غرور ہے۔ اس لیے وہ گنہگاروں کے خلاف زبان درازی سے کام لیتا ہے۔ یعنی یہ زبان درازی، پرہیزگاری پر غرور کا نتیجہ ہے۔

اے اقبال! میری آرزو ہے کہ ہندوستان کی جانب سے ایسی ہوا چلے جو مجھے اڑا کر لے جائے اور حجاز کے راستے کا غبار بنا دے۔ اس میں حرمین شریفین کی طلب و آرزو کا اظہار خاص دلکش انداز میں کیا گیا ہے۔

۱۲

یہ غزل دسمبر ۱۹۰۸ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی اور اس کے چودہ شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں آٹھ قلم زد کر دیے۔

گوہر بدست: ہاتھ میں موتی لیے۔ **خزف چین:** سنگ ریزے، ٹھیکریاں چننے والا۔

پہلے شعر میں اُس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے حوالے کی گئی۔ انھوں نے نہ اٹھائی۔ انسان نے اٹھالی۔ وہ ظالم اور جاہل تھا۔ یہ آیت پہلے نقل ہو چکی ہے۔ اقبال کہتے ہیں: میں اپنے دل پر ہر قسم کی سختیاں برداشت کرتا ہوں، اسے غیر کی طرف مائل نہیں ہونے دیتا اور اس سے غافل رکھتا ہوں۔ آپ نے کیا اچھی بات کہہ دی کہ میں ظالم ہوں اور جاہل ہوں۔

اس شعر کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرا دل پر سختیاں کرنا مجھے ظالم ثابت کرتا ہے اور غیر سے غافل رہنا میرے جاہل ہونے کی دلیل ہے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اگرچہ میں غیر کی جانب سے آنکھیں بند رکھنے کے لیے دل پر سختیاں کرتا ہوں، لیکن آپ اس کے باوجود مجھے ظالم اور جاہل قرار دیتے ہیں۔ آپ کی یہ بات عجیب ہے۔

میرا وجود اسی وقت تک ہے جب تک خدائے پاک کی ذات یعنی نورِ مطلق جلوہ نہ دکھائے۔ اُس کے جلوہ دکھاتے

ہی میں اس طرح مٹ جاتا ہوں جس طرح حق کے ظاہر ہونے سے باطل مٹ جاتا ہے۔ تصوّف کا یہ عام مضمون ہے۔
جن خوش نصیبوں نے علم کے دریا میں غوطے لگائے، وہ موتی نکال کر لے آئے۔ مجھے اپنی محرومی پر افسوس ہے کہ کنارے پر کھڑا سنگریزے اور کنکر چن رہا ہوں۔
میری ذلّت ہی میری شرافت کی دلیل ہے۔ ذلّت سے مراد ہے حضرت آدمؑ کا بہشت سے نکالا جانا اور شرافت سے مراد ہے انسان کا اشرف المخلوقات بننا۔ میں وہ غافل ہوں کہ میری غفلت پر فرشتے بھی آنسو بہاتے ہیں۔ جس کی بے سمجھی پر فرشتے آنسو بہائیں، اس کی شرافت اور بزرگی میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے؟
اے زندگی کی محفل! تو اپنی سجاوٹ پر فخر نہ کر۔ تیرے لیے فخر زیبا نہیں، اس لیے کہ تو تو محفل کی ایک تصویر ہے محفل تو میں ہوں یعنی زندگی کے کارخانے کی ساری رونق صرف انسان کے دم سے ہے۔
اے اقبال! میں اپنے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں یعنی خود ہی مسافر ہوں اور خود ہی منزلِ مقصود۔

۱۳

تمہیدی نوٹ

یہ غزل مئی ۱۹۰۵ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ جب اقبال ولایت جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ اس کے چودہ شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں مندرجۂ ذیل دو شعر حذف کر دیے:

ہاں اے شرابِ عشق! یہ دن ہیں نمود کے ۔۔۔ ایسی اچھل کہ خلوتِ مینا بھی چھوڑ دے
مینارِ دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ ۔۔۔ یہ انتظارِ مہدیؑ و عیسیٰؑ بھی چھوڑ دے

تقلید: پیروی یعنی دوسروں کے پیچھے چلنا۔ نا شِ بے جا: بے جا فخر۔ سوالِ مکرّر: بار بار سوال کرنا۔ جواز: جائز ہونا۔
مجنوں نے شہر چھوڑا تھا یعنی آبادی سے تعلق توڑ کر بیابان میں جا بیٹھا تھا۔ تو اگر سچا عاشق ہے تو بیابان کو بھی چھوڑ دے۔ تجھے ذاتِ مطلق کو دیکھنے کی آرزو ہے تو لیلیٰ سے بھی بے نیاز ہو جا۔ مراد یہ ہے کہ جب تک انسان ماسوا کی ہر شے کو نہ چھوڑ دے، خدا کے دیدار کی آرزو پوری نہیں ہو سکتی۔
اے واعظ! اگر کمال کو پہنچ جائے تو مراد ملتی ہے۔ اگر تو نے دنیا چھوڑ دی ہے تو آخرت کو بھی چھوڑ دے یعنی،

اعمال کی جزا سے بھی بے پرواہو جا حقیقی ترک اسی کا نام ہے اور اسی طرح تو مراد کو پہنچے گا۔ غالب نے بھی لکھا ہے:

طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

دوسرے لوگوں کے پیچھے چلنے اور ان کے پامال کیے ہوئے راستوں پر قدم زن رہنے سے تو خودکشی بہتر ہے۔ انسان کے لیے زیبا طریقہ یہ ہے کہ خضر یعنی رہنما کا خیال چھوڑ دے اور اپنا راستہ اپنی تلاش سے پیدا کرے۔

اس شعر میں خود اعتمادی (اپنے آپ پر بھروسا کرنا) کا سبق دیا گیا ہے اور انسان میں جب تک خود اعتمادی نہ ہو، وہ کوئی قابلِ ذکر کام انجام نہیں دے سکتا۔

قلم کی طرح تیری زبان پر دوسروں کی باتیں رہتی ہیں یعنی جس طرح قلم کی اپنی بات کوئی نہیں ہوتی، وہ دوسرں کی بات لکھتا ہے، اسی طرح تو بھی دوسروں کا قول دہراتا رہتا ہے اور ان پر فخر کرتا ہے، لیکن بیگانہ چیز پر فخر بالکل بے محل ہے اور یہ فخر چھوڑ دینا چاہیے۔ اپنے ہی دل سے ہر بات پیدا کرنی چاہیے۔

دل میں عشق کا درد نہ ہو تو شعر میں کیا مزہ پیدا ہو گا؟ جب تو زخموں سے چُور نہیں تو تڑپتا کیوں ہے؟

مطلب یہ کہ دل میں عشق کا درد ہو تو اس سے مجبور ہو کر انسان تڑپے گا اور جو کچھ کہے گا، اس میں اثر ہو گا۔

لیکن دل درد سے خالی ہو تو تڑپنا محض دکھاوے کا ہو گا اور اس قسم کا تڑپنا وہ اثر پیدا نہیں کر سکتا جو حقیقی تڑپ میں ہوتا ہے۔ اس شعر میں دردِ عشق کو بسمل کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے اور کلام کو تڑپنے سے۔

شبنم کی طرح پھولوں پر آنسو بہا اور چمن سے نکل جا۔ اس باغ میں رہنے کی ہوس چھوڑ دے۔ یہاں باغ سے بظاہر اشارہ اس دنیا کی طرف ہے۔ یعنی یہ دنیا ناپائدار ہے۔ اس سے کیوں دل لگاتا ہے؟ اسی طرح زندگی بسر کر، جس طرح شبنم چمن میں بسر کرتی ہے۔ آتی ہے، پھولوں کی ناپائداری پر روتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔

عاشقی کا دستور یہ ہے کہ سب سے الگ ہو کر انسان محبوب کے ساتھ لو لگا کر بیٹھ جائے۔ یہ بُت خانہ، یہ کعبہ، یہ کلیسا سب کے سب چھوڑ دینے کے قابل ہیں۔ اس لیے کہ یہ محبوب نہیں، بلکہ محبوب تک پہنچنے کی راہیں ہیں۔ ان میں لوگ رسموں اور طریقوں پر جان دیتے ہیں، محبوب کی طرف متوجہ نہیں رہتے۔

غالب نے لکھا ہے:

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست
ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

اے بے خبر! تو خدا کی عبادت کرتا ہے تو اس خیال سے کہ آخرت میں تجھے اس کا صلہ ملے گا۔ یہ عبادت تو نہ

ہوئی، تجارت ہو گئی کہ جو کچھ کیا، بدلے کی نیت سے کیا۔ صحیح عبادت یہ ہے کہ انسان سوداگری نہ کرے اور صلے کی آرزو بھی دل سے نکال دے۔

عقل کا نگہبان دل کے ساتھ رہے تو اچھا ہے۔ یعنی کاروبار کی باگ ڈور جذبات کے حوالے نہ ہونی چاہیے بلکہ عقل کو جذبات کا نگہبان بنائے رکھنا چاہیے، لیکن بعض اوقات ایسے موقعے بھی آ جاتے ہیں کہ وہاں عقل کی نگہبانی کا کوئی کام نہیں ہوتا اور دل ہی کو تنہا مختارِ کل بنائے رکھنا مناسب ہوتا ہے۔ اقبال کا یہ شعر زبان زدِ عام ہے۔ زندگی میں ایسے موقعے بھی آتے ہیں کہ انسان کے لیے باریک بینی کرنا اور دین میکھ نکالنا نقصان کا باعث ہوتا ہے اور نتیجے سے بے پروا ہو کر معاملات کو ہمت و جرأت کے حوالے کرنا پڑتا ہے۔ دل کو کبھی کبھی عقل کی نگہبانی سے آزاد کر دینے کا یہی مطلب ہے۔

شہرت کیا ہے؟ یہ کہ لوگ کہتے ہیں، فلاں بہت اچھا ہے۔ فلاں نے بڑے اونچے درجے کا کام کیا۔ یہ غیروں کی باتیں ہیں۔ ایسی باتوں کو بھروسے کے قابل ماننا ہرگز مناسب نہیں اور کون اسے پسند کرے گا کہ دوسروں کی سانس پر جیے نہ کہ اپنی سانس پر؟ لہٰذا شہرت کی زندگی کو بھی بھروسے کے قابل نہ سمجھنا چاہیے۔ جو لوگ آج کسی کو اچھا کہتے ہیں تو کل اسے بُرا بھی کہہ سکتے ہیں۔ حقیقی زندگی وہی ہے۔ جو اپنے عمل اور اپنی اچھائیوں کی بنا پر عظیم الشّان بنے۔ خالی شہرت سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

اے کلیمؑ! بار بار سوال کرنے میں بے ادبی پائی جاتی ہے، جسے محبوب کی رضا سے کوئی مناسبت نہیں۔ راضی بہ رضا رہنے کی شرط یہ ہے کہ محبوب جو کچھ چاہتا ہے، اسی پر سرِ خم کر دیا جائے۔ اپنی طرف سے تقاضا نہ کیا جائے۔

واعظ اگر شراب کے جائز ہونے کا فتویٰ دے دے تو اقبال کو واعظ سے اتنی ضد ہے کہ شراب پینا بھی چھوڑ دے گا، یعنی واعظ اگر اقبال کے ڈھب کی بات بھی کہے تو وہ منظور نہ ہو گی۔

حصّہ دوم
۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک

محبّت

تمہیدی نوٹ

یہ نظم جنوری ۱۹۰۶ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی، جب اقبال کیمبرج پہنچے تھے۔ اس نظم میں اقبال نے محبت کے متعلق تین بنیادی چیزیں بیان کی ہیں:

۱۔ محبت اکسیر کا ایسا نسخہ ہے، جسے فرشتے آدمی سے پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے۔

۲۔ محبت ہی کی وجہ سے اس دنیا میں زندگی پیدا ہوئی اور کائنات وجود میں آئی۔

۳۔ محبت کائنات کی مختلف چیزوں کے خواص لے لے کر بنی اور کائنات کی تمام چیزوں کا حسن محبت ہی سے پیدا ہوا۔

لذتِ رم: بھاگ دوڑ کا مزہ۔ **آئینِ مسلّم:** مانا ہوا دستور۔ پختہ قاعدہ۔ **امکان:** فلسفیوں نے خدا کو واجب اور کائنات کو "ممکن" قرار دیا ہے۔ امکان کا لفظ انھیں چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے جو ممکن ہوں۔ مراد ہے موجود ہونا۔ وجود پہنانے۔ **عالم:** جہان کی فراخی یعنی جہان۔ **خاتم:** انگوٹھی۔ **عالمِ بالا:** اوپر کی دنیا جو ہماری مادی دنیا سے الگ ہے۔ عالمِ ملکوت جہاں قدسی اور فرشتے رہتے ہیں۔ وہاں انسانوں کا گزر نہیں۔ **اسمِ اعظم:** لفظی معنی سب سے بڑا نام یعنی خدائے پاک کا ذاتی نام۔ سمجھا جاتا ہے کہ اس نام کی تاثیر سے ہر شے کو تسخیر کیا جا سکتا ہے۔ **سعیٔ پیہم:** لگاتار کوشش۔ **ربوبیت:** رب ہونا۔ پروردگاری۔ **افتادگی:** لفظی معنے نیچے گرنا۔ مراد ہے خاکساری اور مسکینی سے۔ **چشمۂ حیواں:** لفظی معنی زندگی کا چشمہ۔ مراد ہے آبِ حیات سے جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس کا پانی پینے سے ہمیشہ کی زندگی ملتی ہے جیسے کہ عام عقیدے کے مطابق حضرت خضرؑ کو ملی۔ **مرکّب:** مختلف چیزوں کو ملا جلا کر بنایا ہوا نسخہ۔ **مہوس:** کیمیاگر۔ **خرامِ ناز:** ناز سے چلنا بانکی چال۔ مجبوبانہ رفتار۔

ابتدائی شعروں میں دنیا کے آغاز کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں کہ رات کی دُلھن کی زلفیں ابھی پیچ وخم سے واقف نہ ہوئی تھیں اور آسمان کے ستارے تگ ودو کے مزے سے بے خبر تھے۔ چاند اپنی نئی پوشاک میں بیگانہ سا معلوم ہوتا تھا۔ ابھی وہ گردش کے قانون سے آگاہ نہ ہوا تھا۔ دنیا وجود کے اندھیرے گھر سے تازہ تازہ پیدا ہوئی تھی اور اس جہان کی فراخی میں زندہ رہنے کا ذوق ابھی چھپا ہوا تھا، ظاہر نہ ہوا تھا۔ کائنات کے نظام کا کمال ابھی شروع ہو رہا تھا اور انگور کی آنکھ سے ٹپکنے کی آرزو ٹپک رہی تھی۔

ان شعروں کا مطلب یہ ہے کہ دنیا پیدا ہو چکی تھی، مگر اس کا کاروبار جاری نہ ہوا تھا۔ نہ راتیں بنی تھیں، نہ ستاروں اور چاند کی گردش کا سامان ہوا تھا۔ نہ زندگی کی چہل پہل شروع ہوئی تھی۔ البتہ اس کے لیے سروسامان تیار ہو چکا تھا یا سمجھنا چاہیے کہ فرمان نیار ہو چکا تھا اور اس پر ابھی مہر نہ لگی تھی۔

مثلاً ہے کہ عالمِ بالا میں ایک کیمیاگر رہتا تھا۔ اس کے پاؤں کی خاک میں جو پاکیزگی تھی وہ جمشید کے پیالے سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ خدا تعالےٰ کے عرش کے پائے پر اکسیر کا ایک نسخہ لکھا ہوا تھا۔ فرشتے اسے روحِ آدمؑ کی آنکھ سے چھپائے رکھنے کی کوشش کرتے تھے یعنی چاہتے تھے کہ اکسیر کا یہ نسخہ انسان کو معلوم نہ ہو، لیکن عالمِ بالا کا کیمیاگر اس نسخہ کی تاک میں لگا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ نسخہ اپنی تاثیر میں اسمِ اعظم سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ آخر وہ خدائے پاک کی تسبیح کرنے کے بہانے عرش کی جانب بڑھا۔ لگاتار کوشش کے بعد اس کے دل کی مراد بر آئی۔ اور وہ نسخہ معلوم ہو گیا۔

پھر نسخے کے اجزا کی تلاش میں وہ اس جہان کے کونے کونے میں پھرا۔ وہ خدا کی بارگاہ کا رازدان تھا۔ بھلا اس کی نظروں سے کون سی چیز چھپی رہ سکتی تھی؟ اس نسخے کے لیے اس نے جو اجزا جمع کیے ان کی کیفیت یہ ہے:

تارے سے اس نے چمک مانگی۔ چاند سے جگر کا داغ لے لیا۔ رات کی بکھری ہوئی زلف سے تھوڑی سی سیاہی اڑا لی۔ بجلی سے تڑپ، حور سے پاکیزگی اور حضرت مریمؑ کے فرزندِ ارجمند حضرت عیسیٰؑ کے سانس سے حرارت حاصل کر لی۔ اس کے بعد جناب باری تعالےٰ سے تھوڑی سی بے نیازی کی شان مانگ لی۔ فرشتے سے عاجزی اور شبنم کی قسمت سے مسکینی لے لی۔ ان تمام اجزا کو آبِ حیات میں گھول لیا۔ اس طرح جو مرکب نسخہ تیار ہوا، اسے عرشِ اعظم سے محبّت کا نام دیا گیا کیمیاگر نے یہ پانی اس ہستی پر چھڑکا جو ابھی ابھی پیدا ہوئی تھی۔ اس کی کاری گری نے دنیا کے کاروبار کی گرہ کھول دی یعنی زندگی کے کاروبار کی مشکلات دور ہو گئیں۔ ایک حرکت پیدا ہوئی، ذرّے جو جیا بجا نیند کے مزے لے رہے تھے، جاگ اٹھے اور سب اپنے اپنے ساتھیوں سے گلے ملنے لگے۔ ساتھ ہی سورجوں اور تاروں کو بانکپن سے چلنے کا سلیقہ نصیب ہوا، کلیاں چٹکنے لگیں، لالوں کے سینوں پر داغ نقش ہو گئے۔

حقیقتِ حُسن

تمہیدی نوٹ

یہ نظم اقبال نے کیمبرج سے بھیجی تھی۔ اور مارچ ۱۹۰۶ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی خود اس پر نثر میں یہ عبارت رقم فرمائی تھی:

اصل خیال جرمن نثر میں دیکھا گیا۔ میں نے ناظرینِ "مخزن" کے لیے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اُردو میں منتقل کردیا۔ ("مخزن" بابت مارچ ۱۹۰۶ء صد ۵۳) اس کا ابتدائی عنوان "حُسن اور زوال" تھا۔ "بانگِ درا" مرتب کرتے وقت عنوان تبدیل کرکے "حقیقتِ حُسن" بنا دیا۔

اس نظم کے کمال کا خاص قابلِ توجہ پہلو یہ ہے کہ حُسن کے زوال کا ذکر کرتے ہوئے وہی چیزیں لیں جن کی ناپائداری کسی تشریح کی محتاج نہ تھی اور ناپائداری کے ساتھ وہ حسین بھی تھیں۔

ایک روز حُسن نے خدا کی بارگاہ میں یہ عرض پیش کی کہ تو نے مجھے غیر فانی کیوں نہ بنا دیا؟ بارگاہِ باری تعالیٰ سے جواب ملا کہ یہ دنیا تو ایک ایسا گھر ہے جس میں رنگ رنگ کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی چیز اصل نہیں، حرف نقل ہے یہ دنیا تو فنا کی لمبی رات کی ایک کہانی ہے یعنی یہ تو فنا ہونے والی ہے اس کا تو ظہور ہی تغیر کے رنگ سے ہوا ہے، یعنی اس کی ہر چیز لحظہ بہ لحظہ بدلتی رہتی ہے۔ اس میں تو حسین وہی کہلائے گا جس کی اصل زوال ہو یعنی وہ فنا ہو جاتے۔

یہ بات چیت ہو رہی تھی تو چاند کہیں قریب ہی تھا اس نے بھی سُن لی۔ چاند نے اسے آسمان کی ہر چیز کو سُنا دیا صبح کے ستارے نے بھی سُن لی۔ اس نے صبح کو سُنا دی۔ صبح نے شبنم کے کان تک پہنچا دی۔ یوں آسمان کی بات زمین کے محرم تک پہنچ گئی۔ شبنم کو زمین کا محرم اس لیے کہا کہ وہ اوپر سے زمین پہ گرتی ہے۔

یہ بات شبنم تک پہنچی تو اس نے پھول کو سنا دی۔ یہ سنتے ہی پھول کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کلی کا ننھا سا دل غم سے خون ہو گیا۔ موسمِ بہار باغ سے روتا ہوا چلا گیا۔ جوانی سیر و تفریح کے لیے آئی تھی ماتم کرتی ہوئی لوٹ گئی۔

جرمن نثر میں اقبال نے جو خیال دیکھا تھا وہ پہلے تین شعروں میں آ گیا۔ باقی چار شعر اس کے شاعرانہ کمال کا نتیجہ ہیں یعنی چاند، صبح کے ستارے، صبح، شبنم، پھول، موسمِ بہار، شباب کی ناپائیداری اور بے ثباتی شاعرانہ انداز میں پیش کرکے حُسن کے فانی ہونے کا نہایت پُر تاثیر نقشہ کھینچ دیا۔

پیام

تمہیدی نوٹ

یہ نظم فروری ۱۹۰۷ء کے "مخزن" میں "پیغام راز" کے عنوان سے شایع ہوئی تھی اور اس کے بارہ شعر تھے۔ نظر ثانی میں پانچ قلم زد کر دیے۔ مدیر "مخزن" نے اس پر مندرجہ ذیل نوٹ لکھا:

شیخ محمد اقبال جب سے کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرنٹی کالج میں پہنچے ہیں، اپنے نئے مشاغل علمی میں بے حد مصروف ہو گئے ہیں۔ نظم کے لکھنے کا وقت نذر جستجو ہو رہا ہے اور کتب خانوں (میں کتابوں) کی ورق گردانی باقی سب شوقوں پر غالب ہے۔ ان دنوں میں انھیں لکھنے کی تحریک کرتے ہوئے بھی تامل ہوتا ہے خدا بھلا کرے شیخ نذر محمد صاحب بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس حلقہ دہلی کا کہ ان کے ایک خط نے ذیل کے اشعار لکھوا لیے۔ یہ گویا ان کے خط کا جواب ہے۔ معلوم نہیں انھوں نے خط میں کیا کیا لکھا تھا جس کے جواب میں یہ رنگین شعر نکلے ہیں، اس وقت ہم رازدار نہیں محض پیغامبر ہیں۔ ع

یہی اشعار زبانوں پہ ہیں رہنے والے

(مخزن بابت فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۵۳)

نوٹ سے ظاہر ہے کہ یہ اشعار شیخ نذر محمد کو بھیجے گئے تھے اور انھوں نے مخزن میں شایع کرائے۔ شیخ نذر محمد نے ان میں سے بعض اشعار کی تخمیس بھی کر دی تھی جو آگے چل کر مخزن میں شایع ہوئی۔

بلند بال: اونچا اڑنے والا۔ **پیر مغاں**: لفظی معنی آتش پرستوں کا مذہبی پیشوا۔ اصطلاح میں اس کے معنی ہیں شراب خانے کا مالک۔ ساقی۔ **مے خانہ ساز**: گھر کی بنی ہوئی شراب۔ دیسی شراب۔

اے مخاطب! اگر عشق نے تیرے دل میں سوز و گداز کی لذت پیدا کر دی ہے تو تجھے چاہیے کہ محفل کو شمع محفل کی طرح سوز و گداز کے حاصل سے فائدہ پہنچائے۔

مطلب یہ کہ تیرے دل میں قوم، ملک یا انسانیت کی خدمت کا احساس پیدا ہو چکا ہے تو یہ احساس اپنے ساتھیوں اور ہم وطنوں میں بھی پیدا کر دے۔

مشکلات کی گتھی کو سلجھانے والا عشق خدا کی رحمت سے نصیب ہوتا ہے۔ اس کے لیے کسی خاص طبقے اور گروہ کی قید نہیں۔ خدائے بے نیاز جسے چاہے عطا کر دے۔ اس میں بیت خانے اور کعبے پر کچھ موقوف نہیں۔

مطلب یہ کہ سچے عشق کے لیے ظاہری عبادتیں ذریعہ تو بن سکتی ہیں لیکن ضروری نہیں کہ سب کچھ انھیں پر موقوف رکھا جائے۔ یہ خدا کی دین ہے جسے چاہے اس سے سرفراز کردے۔

شمع جیسا نورانی لباس اسے نصیب نہیں ہو سکتا جسے اس دنیا میں جان کو پگھلانے والی گریہ وزاری خدا کی بارگاہ سے عطا نہ ہو۔ مطلب یہ کہ جو لوگ دوسروں کے غم میں روتے اور اپنی جان پر دُکھ سہتے ہیں وہی درگاہِ ایزدی سے نورانی خلعت پاتے ہیں۔ شمع کی نورانی قبا یعنی اس کی روشنی سوز و گدازہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جو لوگ دنیا کے لیے روشنی اور رہنمائی کا ذریعہ بننا چاہیں لازم ہے کہ جاں گداز گریہ وزاری میں مشغول رہیں۔

خدا کا نور تارے میں بھی ہے، چاند میں بھی ہے اور صبح کی جلوہ گاہ میں بھی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ دیکھنے والی آنکھ فرق و امتیاز کا ٹھیکہ لگائے، حقیقت پر نظر نہ رکھے اور ظاہری فرقوں میں الجھی رہتی ہے؟

عشق نیازمندی کے دستور سے بہت اونچا اڑتا ہے۔ اگر حُسن اپنے ناز و غمزہ میں مست ہے اور تو عاشق ہے تو تجھے بھی حسن کو ناز و غمزہ ہی کی شکل میں جواب دینا چاہیے۔

مطلب یہ کہ اگر حُسن غرور پر مائل ہو تو عشق کو بھی اپنے اندر خودداری پیدا کرنی چاہیے۔

اے شراب خانے کے مالک! فرنگستانی شراب عیش و سرور پیدا کرتی ہے۔ اس میں غم کی وہ لذت کہاں جس کا میں طلب گار ہوں؟ مجھے تو گھر کی بنی ہوئی شراب عطا کر۔

اقبال نے ولایت پہنچ کر فرنگستانی تہذیب کا قریب سے مطالعہ کرتے ہی جو خاص اثرات قبول کیے۔ اس شعر میں ان کی پہلی جھلک نظر آتی ہے۔ پھر یہ اثرات اتنے گہرے اور وسیع ہو گئے کہ فرنگستانی تہذیب سے دُور رہنے کی دعوت اقبال کے کلام کا ایک خاص جزو بن گئی۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ فرنگستانی علوم دل و دماغ پر سرور کی کیفیت ضرور طاری کر دیتے ہیں لیکن خدمتِ خلق اور خدمتِ قوم کا وہ سچا جذبہ پیدا نہیں کر سکتے جس کی ہمیں تلاش ہے۔ ایمان کی اس رُوح کو محفوظ نہیں رکھ سکتے جس پر ہماری زندگی کا انحصار ہے۔ ہمیں تو اپنے علوم اور اپنی تہذیب سے کام لینا چاہیے۔

کیا تجھے معلوم نہیں کہ پرانی محفل بدل گئی اور زمانے کے طور طریقوں میں تغیر آگیا؟ اب ہمارے لوگوں کو مجازی شراب کی نہیں، حقیقی شراب کی ضرورت ہے۔ فرنگستانی مجازی شراب ہے جو حقیقت کے کیف سے خالی ہے۔ یہ نہ پلانی چاہیے۔

سوامی رام تیرتھ

تمہیدی نوٹ

یہ نظم جنوری ۱۹۰۱ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی۔ سوامی رام تیرتھ کا نام تیرتھ رام تھا۔ وہ ۲۲ اکتوبر ۱۸۷۳ء کو ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں مرالی والا میں پیدا ہوئے۔ ذات کے گوسائیں برہمن تھے۔ والد کا نام ہیرانند تھا۔ گھرانہ بہت غریب تھا۔ سوامی جی چند ہی دن کے تھے، ان کی والدہ فوت ہو گئیں۔ پانچ برس کی عمر میں تعلیم شروع ہوئی۔ پرائمری کا امتحان گاؤں میں پاس کر کے گوجرانوالہ کے ایک ہائی سکول سے میٹرک کی سند لی۔ پھر مشن کالج میں (لاہور) داخل ہو گئے۔ یہ زمانہ انھوں نے بڑی مشکلات میں گزارا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ خاصی دیر تک وہ صرف ایک آنہ یومیہ اپنے کھانے پر خرچ کرتے تھے۔ تین پیسے دوپہر کے وقت اور ایک پیسہ شام کے وقت۔

حافظہ غیر معمولی تھا اور طبیعت ابتدا ہی سے درویشانہ تھی۔ انسانی ہمدردی ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بی اے کے امتحان میں ریاضی ان کا خاص مضمون تھا۔ اس میں کمال حاصل کر لیا۔ امتحان میں تیرہ سوال آئے جن میں سے صرف نو حل کرنے تھے۔ سوامی جی نے تیرہ کے تیرہ حل کر دیے اور لکھ دیا کہ ممتحن حسبِ منشا جو نو سوال چاہیں دیکھ لیں۔ صوبے بھر میں اوّل رہے۔

گورنمنٹ کالج سے ایم اے پاس کیا۔ پرنسپل ان کا نام ای اے سی کے لیے بھیجنا چاہتا تھا۔ جب انھیں معلوم ہوا تو بے اختیار اشک بار ہو گئے اور پرنسپل سے کہا کہ میں نے علم کسی عہدے کے لیے حاصل نہیں کیا۔ میں خدا کے بندوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ دیر سیالکوٹ مشن ہائی سکول میں ٹیچر رہے۔ پھر مشن کالج لاہور میں ریاضی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ غالباً اسی زمانے میں اقبال سے تعلقات پیدا ہوئے۔ وہ خدا پرستی اور حبِّ وطن کی تعلیم دیتے تھے۔ ۱۸۹۹ء میں ملازمت سے استعفا دے کر اپنی زندگی اہلِ ملک کے لیے وقف کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ بعض لوگوں نے سمجھا کہ تیرتھ رام پاگل ہو گیا ہے۔ کہا جاتا ہے یہ سنتے ہی اقبال نے کہا کہ اگر تیرتھ رام پاگل ہے تو اس دنیا میں عقل مندی کا کہیں وجود نہیں۔

غرض تیرتھ رام نے ملازمت، بیوی بچّوں اور اقربا کو چھوڑ سنیاس قبول کر لیا اور رام تیرتھ نام رکھا۔ ۱۹۰۲ء میں وہ جاپان ہوتے ہوئے امریکہ گئے۔ دو سال وہاں رہے۔ مصر ہوتے ہوئے واپس آ گئے۔

ہردوار کے پاس پہاڑوں میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ایک مرتبہ گھٹنے پر چوٹ لگی اور گنگا میں نہانے سے معذور ہو گئے ۔۱۷ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ہمت کر کے نہانے کے لیے دریا میں اترے۔ یکایک پاؤں پھسلا اور پانی میں بہ نکلے۔ تیرنے کی کوشش کی، کامیاب نہ ہو سکے۔ تیسرے روز ان کی لاش ملی۔

اقبال اس زمانے میں ولایت پہنچے ہوئے تھے۔ وہیں سوامی جی کی وفات کی خبر ملی تو اپنے دیرینہ دوست کی یاد میں یہ نظم لکھی۔

موتی جو مل نہ سکے۔ **رازِ رنگ و بو:** لفظی معنی رنگ و بو کا بھید۔ مراد ہے اس کائنات کے ظاہری امتیازات کا بھید۔ **نفیِ ہستی:** ہستی کو مٹا دینا۔ **لا:** کلمۂ نفی۔ مراد ہے لا اِلٰہ سے یعنی کوئی معبود نہیں۔ **اِلّا اللہ:** سوا اللہ کے۔ یہ اشارہ اسلامی کلمے کے ابتدائی جزو کی طرف ہے۔ جس کا مطلب ہے خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اقبال کی مراد یہ ہے کہ جب تک اپنی ہستی کو فنا نہ کر دیا جائے۔ خدا نہیں ملتا یا اس کے وجود کی تصدیق نہیں ہو سکتی۔

تسنیم: بہشت کی ایک نہر۔

اے بے قرار قطرے! تو دریا سے بغل گیر ہو گیا ہے یعنی دریا میں مل گیا ہے۔ تو اپنی زندگی میں موتی تھا۔ اب ایسا موتی بن گیا ہے جو کہیں نہیں مل سکتا۔

اس شعر میں سوامی جی کے غرقاب ہو جانے کا ذکر کیا گیا ہے وہ اپنی زندگی میں اتنے ارفع تھے کہ انھیں انسانیت کا موتی کہنا مناسب تھا۔ ڈوب گئے تو اس اعتبار سے بھی گوہرِ نایاب بن گئے کہ وہ ہاتھ نہ آ سکتے تھے۔ چونکہ نہایت بیش قیمت موتی کو بھی گوہرِ نایاب کہتے ہیں اور ڈوب کر اصل سے مل جانے کے باعث سوامی جی کی ہستی زیادہ بلند ہو گئی تھی، لہٰذا اس لحاظ سے بھی انھیں گوہرِ نایاب قرار دینا بہت موزوں معلوم ہوتا ہے۔

آہ! تو نے کس خوبی سے اس کائنات کے ظاہری امتیازات کا بھید کھول دیا اور حقیقت تک پہنچ گیا۔ میں ابھی تک رنگ و بو کے امتیازات میں پھنسا ہوا ہوں۔

زندگی کا شور ختم ہو کر قیامت کی شورش بن گیا۔ یہ چنگاری بجھ گئی تو اس سے آئندہ کا آتش کدہ پیدا ہو گیا۔ مراد یہ ہے کہ سوامی جی زندگی میں جس پائے کی ہستی مانے جاتے تھے، مرنے کے بعد ان کا پایا پہلے سے بہت بلند ہو گیا۔

اپنی ہستی کو مٹا دینا حقیقت جاننے والے دل کی ایک کرامت ہے یعنی وہی لوگ اپنی ہستی کو مٹا دینے کی ہمت رکھتے ہیں جو حقیقت کے بھید سے واقف ہوں۔ سچ ہے اِلّا اللہ کا موتی لا ہی کے دریا میں چھپا ہوا ہے۔

مراد یہ ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو فنا کر دینے کے لیے تیار ہوں وہی خدائے واحد کے وجود کی تصدیق کر سکتے ہیں اور اس سے مل سکتے ہیں۔

فنا سے مقصود صرف یہ ہے کہ وجود کی موجودہ شکل کو ختم کر دیا جائے۔ یہ فنا صرف مادے تک محدود ہوتی ہے روح سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ تصوّف اور ویدانت دونوں کا فلسفہ یہ ہے کہ مادّی جسم فنا ہو جائے تو روح اپنی اصل سے جا ملتی ہے۔

جو آنکھ حقیقت کو نہ دیکھ سکے اس پر انجام کا بھید نہیں کھل سکتا۔ پارے کی ہستی کیا ہے؟ صرف تڑپ اور بیقراری یہ تڑپ اور بیقراری ختم ہو جائے تو پارا خالص چاندی رہ جائے گا۔

اس مثال میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر وجود کی خاص خصلتیں ہوتی ہیں۔ وہ خصلتیں مٹ جائیں تو وجود اصل سے ملتا ہے لیکن یہ کیفیت اسی آنکھ کو معلوم ہو سکتی ہے جو حقیقت کو دیکھ سکے اور فنا کے انجام کا بھید پا سکے۔

جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے بنائے ہوئے بت توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے، اسی طرح عشق کا ابراہیم یعنی عشق ہستی کے بت کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ سچّے عاشق کے لیے اپنی ہستی کو مٹا دینا ویسا ہی آسان ہے جیسا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے بت توڑ دینا آسان تھا۔ یہ سمجھنا چاہیے کہ تسلیم عشق کی مستی ہوش کی دوا ہے۔ یعنی ہوش[۱] (اپنی ہستی کا احساس) ایک بیماری ہے اس بیماری کا علاج یہ ہے کہ عشق کی تسلیم سے شراب کا پیالہ پیا جائے اور اپنے اوپر مستی اور سرور کی کیفیت طاری کی جائے عشق ہی ہستی کا بت توڑتا ہے۔ عشق ہی ہستی کے احساس کی بیماری دور کرتا ہے۔

طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام

تمہیدی نوٹ

یہ نظم جون ۱۹۰۷ء کے مخزن میں شایع ہوئی تھی۔ اس کے بارہ شعر تھے۔ نظر ثانی میں صرف سات باقی رکھے اور ان میں بھی جزوی ترمیمات کر دیں۔ اس پر مدیر "مخزن" نے مندرجہ ذیل نوٹ لکھا:

کلام اقبال علی گڑھ کالج میں ہمیشہ سے مقبول ہے اور شوق و توجہ سے پڑھا جاتا ہے مگر پیام اقبال جو ہم آج شایع کرتے ہیں نہایت ہی غور سے پڑھے جانے کے لائق ہے۔ طلبۂ علی گڑھ کی خصوصیت سے

---

[۱] "بانگ درا" میں "ہوش کا دارو" چھپا ہے۔ یہ بظاہر کاتب کی غلطی ہے۔ اس لیے کہ "دارو" بالاتفاق مونث ہے۔

کرنے کی یہ وجہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کی آئندہ امیدیں بہت کچھ ان کے ساتھ وابستہ ہیں، ورنہ سب پڑھے لکھے نوجوان اس دردمندانہ مشورے کے مخاطب ہو سکتے ہیں جو حضرت اقبال نے ان چند اشعار کے جامع الفاظ اور بلیغ اشارات میں انھیں دیا ہے۔ (مخزن بابت جون ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

طائرِ زیرِ دام: جال میں پھنسا ہوا پرندہ یعنی غلام۔ محکوم **طائرِ بامِ**: چھت کا پرندہ یعنی آزاد۔ **غم کدۂ نمود**: غم کا گھر جو دکھاوا ہی دکھاوا ہو۔ مراد دنیا۔ **بادۂ نیم رس**: وہ شراب جس میں ابھی نشے کی کیفیت پوری طرح پیدا نہ ہوئی ہو۔

دوسروں کا پیغام اور ہے لیکن میرا پیغام ان سے بالکل الگ اور جداگانہ ہے جس کے دل میں عشق کا درد ہو اس کی بات کا طریقہ ہی نرالا ہوتا ہے۔

مطلب یہ کہ میں عشقِ ملّت میں ڈوبا ہوا ہوں۔ میرے سامنے ذاتی غرض کوئی نہیں۔ یہ چاہتا ہوں کہ میری قوم کو سربلندی نصیب ہو لہٰذا میرا پیغام ان لوگوں سے الگ ہے جن کی کیفیت مجھ ایسی نہیں اور میرے کلام کا طریقہ ہی دوسرا ہے۔

تم ان پرندوں کے نالے سن چکے ہو جو جال میں پھنسے ہوئے تھے جو پرندہ چھت کی منڈیر پر بیٹھا ہے، اس کا بھی نالہ سنو۔ اس نالے کا رنگ دوسرا ہے۔

مطلب یہ کہ تم نے اب تک غلاموں کی آہ فریاد سنی اب آزادوں کی آہ و فریاد بھی سنو۔ غلاموں سے مراد بظاہر وہ لیڈر ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں حکومت سے وابستہ تھے۔

پہاڑ سے یہ صدا بلند ہو رہی تھی کہ زندگی کا بھید ایک مقام پر ٹھہرا رہنے میں ہے لیکن چیونٹی (کمزور) یہ کہتی تھی کہ چلنے کا مزہ اور ہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ بڑے بڑے اور ذی اثر لیڈروں نے جن کی حیثیت پہاڑ کی تھی تمھیں سکون کا پیغام دیا، لیکن میں اگرچہ ان کے مقابلے میں کمزور چیونٹی کی حیثیت رکھتا ہوں، مگر تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حرکت اور جدوجہد میں اور ہی مزہ ہے۔

انجمنِ حجاز کی رونق کعبے کی کشش کے دم سے ہے یعنی ملّتِ اسلامیہ اسی وقت ایک اقبال مند اور سربلند رہ سکتی ہے کہ اس کے دل میں حرمِ پاک کے عشق کا جذبہ موجود ہو۔ وہ اپنے دینی اصول کو ایک لمحے کے لیے بھی نہ بھولے۔ باقی قوموں کے مقام اور نظام سے ہماری قوم کا مقام اور نظام بالکل الگ ہے۔

اگر جستجو کی آرزو نہ ہو تو ہمیشہ کا عیش بھی موت کے برابر ہے۔ پیالہ محفل میں چکر لگاتا ہے تو صرف اس لیے کہ لوگوں کو عیش و سرور حاصل ہو لیکن آدمی کی حرکت اور جدوجہد کا مقصد یہ ہے کہ اسے نئی چیزیں ملیں۔ اس کی تحقیق کا قدم آگے بڑھے۔ اس کے مقاصد قریب تر آئیں۔ گردش میں اگرچہ پیالہ اور آدمی ایک ہیں، لیکن دونوں کا مدعا ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔

صبح کا چراغ بجھتے بجھتے یہ پیغام دے گیا کہ سوز اور جلن ہی سے زندگی بنتی ہے جستجو کی حرارت ہی سے کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ یہ دنیا دکھاوے کا ایک غم خانہ ہے۔ یہاں ہمیشہ نامور رہنے کی شرط سوز، جستجو اور طلب کے سوا کچھ نہیں۔
ابھی شراب میں نشے کی کیفیت ادھوری ہے، درجہ کمال کو نہیں پہنچی اور شوق کو ابھی پختگی کا انتہائی مقام حاصل نہیں ہوا بہتر یہی ہے کہ ابھی شراب کے مٹکے کے منہ پر گرجے کی اینٹ رکھی رہنے دو۔ شراب بنانے والے مٹکے میں ضروری مسالا ڈالتے ہیں تو اس کے منہ پر اینٹ رکھ کر لیپ دیتے ہیں تاکہ آہستہ آہستہ شراب میں جوش آئے اور نشہ پیدا ہو۔ اقبال کہتے ہیں کہ ہمارے مٹکے کی شراب ابھی پختگی کے آخری درجے پر نہیں پہنچی اور ہمارا شوق بھی ابھی خام ہے، لہٰذا اس پر مسیحیّت کی جو اینٹ رکھی ہوئی ہے، اسے نہ ہٹاؤ اور شراب کے نشے کو کمال پر پہنچ لینے دو۔
خُم سے مراد کالج اور خشتِ کلیسا سے مراد انگریز پرنسپل ہے۔ یہ غالباً اس زمانے کی نظم ہے جب علی گڑھ میں کالج کا پرنسپل انگریز تھا اور اس کے خلاف ہڑتال ہوئی تھی۔ اقبال طلبہ کو یہ پیغام دیتے تھے کہ ابھی ہمیں اس قسم کے ہنگامے شروع نہ کرنے چاہئیں کیونکہ جو صلاحیتیں ایسے ہنگاموں کے لیے لازم ہیں۔ وہ ابھی ہم میں پختہ نہیں ہوئیں۔ اس زمانے میں ملک کے اندر سیاسی ہنگامے بھی شروع ہو گئے تھے۔ اس شعر سے یہ مراد بھی لی جا سکتی ہے کہ اقبال نے اپنے ہم قوم نوجوانوں کو ان ہنگاموں سے الگ رہنے کی تلقین کی اور فرمایا کہ انگریزی راج کے خلاف اٹھنے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ ذرا انتظار کرو اور اپنی قوم میں پوری بیداری پیدا ہو لینے دو تاکہ جو قدم اٹھایا جائے، سوچ سمجھ کر اور نفع و نقصان کا اندازہ کرتے ہوئے اٹھایا جائے۔

اخترِ صبح

تمہیدی نوٹ

صبح کے ستارے پر اقبال کی ایک نظم پہلے پڑھ چکے ہو۔ اس نظم میں اسی عنوان پر دوسرے رنگ میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

بساط: حیثیت

صبح کا ستارہ روتے روتے کہہ رہا تھا کہ مجھے قدرت کی طرف سے نگاہ تو عطا ہوئی لیکن دیکھنے اور اس سے کام لینے کی فرصت نہ ملی۔ سورج کے نکلنے سے ہر چیز زندہ ہو گئی۔ ایک میں ہی ہوں جسے صبح کے دامن کے نیچے پناہ نہ مل سکی۔ بھلا صبح کے ستارے کی حیثیت کیا ہے؟ یوں سمجھ لو کہ بلبلے کا سانس یعنی زندگی ہے یا چنگاری کی چمک۔

مراد یہ ہے کہ صبح کا ستارہ بھی اسی طرح ناپائدار ہے جس طرح بُلبلا کہ ایک آن میں پھوٹ کر غائب ہو جاتا ہے یا چنگاری کہ چمکی اور بجھ گئی۔

میں نے ستارے کی یہ بات سنی تو اس سے کہا کہ اے صبح کی پیشانی کے زیور! یعنی صبح کو زینت دینے والے! تجھے فنا کا غم کھائے جا رہا ہے۔ اگر واقعہ یہی ہے تو پھر آسمان کے گنبد سے اتر آ۔ شبنم کے ساتھ اس بلندی سے میرے شعر کے باغ میں ٹپک آ جس کی فضا روح کو تازگی بخشنے والی ہے۔ میں اس باغ کا مالی ہوں جس کی بہار محبت ہے۔ یہ باغ ابد کی طرح ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔

مطلب یہ کہ اگر تو فنا کے غم میں مبتلا ہے اور ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے تو میرے شعر کے باغ میں آ جا، جس کی رونق اور تر و تازگی محبّت کے دم سے ہے۔ یہ باغ کبھی ویران نہ ہوگا اور اس میں تجھے فنا کے غم سے نجات مل جائے گی۔

حسن و عشق

کشتیِ سیمیں: چاندی کی یا روپہلی کشتی۔

پہلا بند

جس طرح چاندی کی روپہلی کشتی صبح کے وقت سورج کی روشنی کے طوفان میں ڈوب جاتی ہے جس طرح چاندنی رات میں کنول کا پھول جو چاندنی کا رنگ کا ہوتا ہے۔ نور کا آنچل لے کر گم ہو جاتا ہے، یعنی ہم رنگ ہونے کے باعث چاندنی میں صاف نظر نہیں آتا، جس طرح طور کے جلوے میں حضرت موسٰے علیہ السلام کا یدِ بیضا گم ہو گیا تھا یا جس طرح باغ سے نکلنے والی خوشبو کی لہروں میں کلی کی مہک ظاہر ہوتی ہے۔ وہی حالت تیری محبت کے طوفان میں میرے دل کی ہو رہی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ سورج کے سامنے چاند، چاندنی رات میں کنول کا پھول، طُور کی تجلّی میں حضرت موسٰے علیہ السلام کا ہاتھ، خوشبو کی لہروں میں کلی کی مہک جس طرح گم ہو جاتے ہیں، میرا دل بھی تیری محبت میں اسی طرح گم ہے۔

دوسرا بند

تُو اگر انجمن ہے تو میں اس انجمن کا ہنگامہ ہوں۔ تُو حسن کی بجلی ہے، میں عشق کا حاصل ہوں تو صبح ہے تو میرے آنسو تیری شبنم ہیں۔ میں اگر پردیس کی شام ہوں تو میری شفق تو ہے، میرے دل میں وہی پریشانی ہے جو تیری زلفوں میں ہے۔

اور تیری تصویر میں میری حیرانی نمایاں ہے۔ تیرا حسن درجۂ کمال پر پہنچا ہوا ہے تو میرا عشق درجۂ کمال پر پہنچا ہوا ہے۔ اس بند میں
اس بند میں حسن و عشق کا لازم و ملزوم ہونا ثابت کیا ہے یعنی یہ دونوں اکٹھے رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ حسن اگر انجمن ہے تو عشق اس انجمن کی رونق ہے اور رونق کے بغیر انجمن کا ہونا نہ ہونا برابر ہوتا ہے۔ حسن اگر بجلی ہے تو عشق وہ حاصل مہیا کر دیتا ہے جسے بجلی جلاتی ہے۔ حسن اگر صبح ہے تو اس کے ساتھ شبنم ہونی چاہیئے۔ عشق کے آنسو شبنم کی کمی پوری کر دیتے ہیں۔ شام کے لیے شفق کا ہونا ضروری ہے۔ اگر عشق پردیس کی شام بن جائے تو حسن اس شام کی پیشانی پر شفق بن جاتا ہے۔ عشق کا دل پریشان ہوتا ہے۔ زلفیں اسی وقت تک حسین معلوم ہوتی ہیں، جب تک پریشان رہیں گویا عشق کے دل اور حسن کی زلفوں میں پریشانی مشترک ہے۔ تصویر اپنی ظاہری حالت میں حیران ہوتی ہے اور حیرانی عشق کی ایک خاصیت ہے گویا حسن کی تصویر اور عشق میں حیرانی مشترک ہے۔

تیسرا بند

آسودۂ منزل: جسے منزل پر پہنچ کر آرام مل جائے۔

اے حسن! تو میری شاعری کے باغ کے لیے بادِ بہار ہے۔ میرے خیالات بے قرار تھے تو ان کے لیے آرام کا سامان بن گیا۔ جب سے تیرا عشق میرے سینے میں آ بسا ہے میرے آئینے میں نئے جوہر پیدا ہو گئے ہیں۔ عشق کی فطرت کو حسن کمال پر پہنچانے کے لیے حرکت میں لاتا ہے۔ یعنی عشق کو حسن کی وجہ سے کمال حاصل کرنے کی رغبت ہوتی ہے۔ حسن ہی کی وجہ سے عشق کی امیدوں کے پودے ہرے بھرے ہوتے ہیں۔ اور اس کا قافلہ منزل پر پہنچ کر آرام میں مصروف ہو جاتا ہے یعنی حسن ہی عشق کو منزل پر پہنچاتا اور تگ و دو سے نجات دلاتا ہے۔

..... کی گود میں بلّی دیکھ کر

دزدیدہ نگاہی: آنکھ چرا کر دیکھنا۔ ذکاوت: ذہن کی تیزی۔ تجسّس: تلاش، جستجو۔ تمنائی: خواہش مند۔
اس نظم میں خطاب صرف بلّی سے ہے۔ اے بلّی! تجھے آنکھ چرا کر دیکھنا کس نے سکھا دیا؟ آغازِ محبت کا یہ انداز تجھے کس نے بتا دیا؟ واضح رہے کہ محبت کے آغاز میں عاشق اپنے محبوب کو آنکھ چرا کر ہی دیکھتا ہے۔ لہٰذا اسے محبت کے شروع ہونے کا طریقہ قرار دیا۔
تیری ہر ادا سے کیسی محبت ظاہر ہوتی ہے؟ تیری نیلی نیلی آنکھوں سے ذہن کی تیزی ٹپکی پڑتی ہے۔ تو کبھی محبوب

کو دیکھتی ہے، کبھی شرماجاتی ہے۔ کبھی اٹھتی ہے اور کبھی لیٹ کر سو جاتی ہے۔ اس شعر میں اقبال نے گود میں بیٹھی ہوئی بلی کی ایک ایک حرکت کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔

اے بلی! تیری آنکھ آئینے کی طرح کس قدر حیران ہے! کیا تیری پہچان کو آگاہی کے نور سے روشنی مل گئی ہے؟ تو کبھی محبوب کو پنجے مارتی ہے۔ یہ عجیب ناز ہے۔ کیا یہ چڑ ہے یا غصہ ہے یا پیار کرنے کا ایک خاص انداز ہے؟ تو اگر شوخی کرے گی تو تجھے گود ہی سے اتار دیا جائے گا۔ اگر ان کے سینے پر لگا ہوا پھول تیری حرکتوں کے باعث گر جائے گا تو مار کھائے گی۔ تجھے کس کی تلاش ہے؟ تو کس کی آرزومند ہے؟ کیا تو بھی اسی شے کی دیوانی ہے جسے حسن کہتے ہیں؟ حسن کا احساس کچھ انسان کے لیے مخصوص نہیں۔ یہ احساس دل کی صورت اختیار کر کے کائنات کی ہر شے کے باطن میں رہتا ہے۔

زمانے کے مینا میں عشق خالص شراب کی طرح بھرا ہوا ہے۔ یہ سورج کی جان ہے۔ یہ چاند کی رگوں کا خون ہے یعنی چاند کی چاندنی اسی سے ہے۔ ہر ذرّے کے دل میں اس کی ٹیس چھپی ہوئی ہے۔ یہ وہ نور ہے جس کی جھلک ہر چیز میں نظر آتی ہے۔ یہ کہیں خوشی کا سامان بن کر آتا ہے اور کہیں غم، کہیں یہ موتی ہے، کہیں یہ آنسو اور کہیں شبنم۔ مراد یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز عشق کی بنا پر قائم ہے اور کائنات کی ہستی ہی عشق و محبت پر موقوف ہے۔

کلی

پہلا بند **جلوہ آشام**: لفظی معنی جلوہ پینے والا۔ مراد ہے جلوے سے فائدہ اٹھانے والا

سینہ شگافی: سینہ چیر دینا

جب صبح اپنا گلابی رخسار دکھاتی ہے یعنی جب صبح شفق کے ساتھ نمودار ہوتی ہے تو کلی اپنا سنہرا سینہ کھول دیتی ہے یعنی کھلنے لگتی ہے اور اس کے اندر زرد رنگ کا جو مادہ ہوتا ہے وہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ اسے پھول کا زیرہ کہتے ہیں۔ یہ صبح کے شراب خانے میں جلوے سے فائدہ اٹھانے لگتی ہے۔ شراب خانے میں شراب پی جاتی ہے۔ صبح کے شراب خانے میں جلوے یعنی نور کی شراب کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور کلی فوراً ہی شراب پینے لگتی ہے۔ اس کی زندگی سورج کے پیمانے پر موقوف ہے۔

مراد یہ ہے کہ صبح ہوتی ہے تو کلی کھلتی ہے اور سورج کی سنہری کرنوں سے اس میں رونق اور تازگی آتی ہے۔ یہ سورج سورج کے سامنے دل چیر کر رکھ دیتی ہے یعنی کھل جاتی ہے اور سینہ چیرنے کے خوب مزے لیتی ہے۔

دوسرا بند | طرب اندوزِ حیات: زندگی کا لطف اٹھانے والا۔

اے میرے سورج! کبھی تو بھی اپنے چہرے سے پردہ اٹھا۔ بے قرار نظر تیرے دیکھنے کے لیے تڑپ رہی ہے۔ تو بے نقاب ہو اور تیرا جلوہ میرے سینے میں آ بیٹھے۔ تیرا عکس میرے آئینے میں آ بسے۔ تجھے دیکھتے رہنا میرے دل کی زندگی کا سامان بن جائے۔ تیری روشنی میرے دل کے لیے پنگوڑے کا کام دے۔ میرا ذرہ ذرہ پھر زندگی کا لطف اٹھائے۔ میری فکر کے جوہروں سے پھر زندگی کا سوز ظاہر ہو۔ میں دور سے اپنے سورج کو دیکھوں اور کلی کی طرح نور سے بغل گیر رہوں۔ اپنی بیقرار جان کی حقیقت سب کے سامنے کھول کر رکھ دوں۔ جو خیالات میرے دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے ہیں، انھیں بھی بے نقاب کر دوں۔

اس نظم میں اقبال اپنے محبوب کی جلوہ ریزیوں سے اسی طرح فیض یاب ہونا چاہتے ہیں جس طرح کلی سورج کی نورباریوں سے فیض یاب ہوتی ہے۔

چاند اور تارے

ستم کشِ سفر: سفر کی سختیاں سہنے والا، شجر و حجر

پہلا بند | صبح کے وقت سے ڈرتے ڈرتے تاروں نے چاند سے کہا کہ ہم چمک چمک کر تھک بھی گئے لیکن آسمان پر وہی کیفیت رہی جو پہلے تھی۔ ہمارا کام صبح شام چلنا ہے۔ چلنا، چلنا اور ہمیشہ چلنا۔ اس جہان کی ہر چیز بے قرار ہے۔ جسے سکون کہتے ہیں وہ یہاں نہیں ملتا۔ سب سفر کی سختیاں جھیل رہے ہیں۔ تارے ہوں یا انسان، درخت یا پتھر، کوئی بھی ان سختیوں سے بچا ہوا نہیں۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ یہ سفر کبھی ختم بھی ہوگا اور کبھی منزل بھی نظر آئے گی۔ جہاں پہنچ کر آرام سے ٹھہر جائیں۔

دوسرا بند | اشہب: گھوڑا۔ تازیانہ: کوڑا۔

چاند نے جواب دیا۔ اے پاس بیٹھنے والے دوستو! اے رات کی کھیتی سے خوشے چننے والو! اس جہان کی زندگی حرکت پر موقوف ہے اور حرکت یہاں کا پرانا دستور ہے۔ زمانے کا گھوڑا تلاش اور جستجو کے کوڑے کھا کھا کر دوڑتا ہے یعنی تلاش ہر شے کو ہر وقت حرکت میں رکھتی ہے۔ اس راستے میں ٹھہرنا بالکل بے جا ہے۔ ٹھہرنے میں موت

چھپی ہوئی ہے۔ یعنی جو ٹھہرا ختم ہو گیا۔ چلنے والے دور آگے نکل گئے۔ جو ذرا بھی ٹھہرے انھیں روند ڈالا گیا۔ اس چلنے کا انجام حسن ہے۔ اس کا آغاز عشق سے ہوتا ہے اور آخری منزل حسن کے سوا کچھ نہیں۔ عشق سے مراد ہے تلاش و جستجو اور جدو جہد کا سچّا ذوق حسن سے مراد ہے درجۂ کمال حاصل کر لینا۔ اس نظم میں حرکت اور جدوجہد کی تعلیم دی گئی ہے۔ اسی تعلیم کے لیے اقبال نے اپنی زندگی وقف کی۔ یہاں اس دعوت کی ابتدائی جھلک ملتی ہے، جس کے جلووں سے اقبال کا سارا کلام لبریز ہے۔

وصال

پہلا بند **ارتکاب**: کوئی جرم وغیرہ کرنا۔ **آئینہ دارِ شبِ دیجور**: جس کے آئینے میں اندھیری رات کا عکس ہو یعنی سیاہ۔

اے بلبل! جس پھول کی تلاش مجھے تڑپاتی تھی، خوش قسمتی سے وہ پھول مجھے مل گیا۔ اس شعر میں پھول سے مراد محبوب ہے۔

میں خود بھی تڑپتا تھا اور چمن والوں کو تڑپاتا تھا۔ جب تیرے دل کش نغمے سنتا تھا تو مجھے شرم آتی تھی۔ اس شعر میں چمن والوں سے اشارہ بظاہر راز دان دوستوں کی طرف ہے۔

میرے پہلو میں بے قرار دل نہ تھا بلکہ پارا رکھا ہوا تھا۔ جو محبّت کا جرم کر گزرنے کے لیے بے چین تھا۔

پھولوں کی محفل میں میری نامرادی کا قصہ مشہور تھا اور میری صبح کالی رات کی طرح سیاہ تھی۔ اس شعر میں صبح کو کالی رات کی طرح سیاہ اس لیے کہا کہ نامرادی اور بدنصیبی کی حالت موجود تھی لیکن خوبی یہ ہے کہ صبح کے لیے آئینہ داری کی ترکیب لائے۔ اگرچہ آئینہ داری اندھیری رات ہی تک محدود رہی۔

میرے خون سے لبریز سینے میں سانس نشتر کا کام دیتا تھا اور میری خاموشی میں قیامت کا شور چھپا ہوا تھا۔ یہ ناکامی اور نامرادی کا نقشہ تھا۔

دوسرا بند **ضو**: روشنی۔

اب احساس کی دنیا میں پہلے کی سی پریشانی نہیں اور باغ والوں پر میرا غزل پڑھنا گراں نہیں گزرتا۔ عشق کی گرمی سے یہ حال ہوا کہ میرے چھالے شعلے بن گئے اور میرے نالے بجلیوں کے ساتھ کھیلنے لگے۔ میری خاکِ سیاہ

پر محبت کا بلّا لگایا گیا تو وہ آئینے کی طرح صاف شفاف ہو گئی اور اس آئینے میں میرے پرانے محبوب کا عکس جلوہ گر ہو گیا۔ میں محبت کی قید میں آیا تو مجھے آزادی مل گئی۔ میرا دل لٹ گیا تو میرا گھر آباد ہو گیا۔ اس سورج کی روشنی سے میرے ستارے میں چمک دمک ہے جس کے راستے کا غبار چاندنی کو بھی شرماتا ہے۔ اے میرے محبوب! تو نے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور فنا کے آداب سکھا دیئے۔ وہ کتنا مبارک دن تھا جب تو نے میرے وجود کے گھاس پھوس کو جلا کر راکھ کر دیا۔

سلیمیٰ

جس کا جلوہ نجومی کی آنکھ نے سورج، چاند اور تاروں کی محفل میں دیکھا، جسے صوفی نے دل کے اندھیرے گھر میں پایا، جسے شاعر نے کائنات کی چیزوں کے بانکپن میں دیکھا، جس کی چمک شبنم کے موتیوں میں جلوہ گر ہے، جس کی مہک پھولوں کے لباس میں بسی ہوئی ہے، جس نے بیابان میں پہنچ کر سنسانی کا جامہ پہنا۔ جس کی بدولت باغ کے کاشانے میں رونق اور چہل پہل ہے۔ اس کا جمال ہر چیز میں نمایاں ہے۔ لیکن اے سلیمیٰ! تیری آنکھوں میں اُس کا کمال ہے۔

نظم کا مضمون بظاہر یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے میں ذات باری کا جمال موجود ہے، لیکن اس کا کمال دیکھنے والا صرف انسان ہے جو اشرف المخلوقات ہے۔

عاشقِ ہرجائی

۱

پہلا بند

مجموعۂ اضداد: ایسے اوصاف کا مجموعہ جو ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ **زمین فرسا:** لفظی معنی زمین کو گھسانے والا یعنی زمین پر چلنے پھرنے والا۔ **تفنن:** گوناگونی۔ رنگارنگی **جبیں فرسا:** پیشانی گھسنے والا۔ **تلوّن کیش:** وہ شخص جس کا شیوہ رنگ بدلنا ہو۔ جو ایک انداز پر قائم نہ رہ سکے اور بدلتا رہے۔

اے اقبال! تیری حالت عجیب ہے۔ تو ایسے اوصاف کا مجموعہ ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک طرف یہ حال ہے کہ محفل میں صرف تیری وجہ سے رونق اور چہل پہل ہے۔ دوسری طرف یہ حالت ہے کہ تو سب سے الگ ہے۔ تیرا ہمدم اور ہم نفس کوئی نہیں۔ اے دلکش نغمے گانے والے! تیرے ہنگاموں کی بدولت ایک طرف باغ میں زیب و زینت ہے اور دوسری طرف بیابان نے سجاوٹ کا سامان حاصل کر رکھا ہے۔ بلندی کے سبب سے تو تاروں کا ہم نشین بنا ہوا ہے۔ اے زمین پر چلنے والے! تیرا قدم آسمان کو بھی ناپ رہا ہے۔ عین شراب پینے کی حالت میں تیری پیشانی سجدے میں بھی گر جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تیرے طریقے میں مینا کے مذاق کا بھی رنگ ہے۔ یعنی مینا میں شراب بھری ہوتی ہے۔ جب اسے الٹا کر شراب ساغر میں ڈالتے ہیں تو مینا کا منہ زمین کی طرف ہو جاتا ہے۔ اسے شاعر اپنا سجدہ قرار دیتا ہے۔ اقبال نے شراب نوشی کی حالت میں سجدہ کرنے کے لیے تشبیہ کی جو خوبی پیدا ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔

تو پھول کی خوشبو کی طرح رنگ کے لباس سے پاک ہے۔ اگرچہ حکمت کی باتیں پیدا کرتا ہے، لیکن ساتھ ہی دیوانہ بھی ہے۔ تو منزلِ مقصود کی طرف رواں ہوتا ہے تو لہر کی طرح ایک جگہ کھڑا ہوا بھی ہے یعنی چلتا ہے تو لہر کی طرح اور ٹھہرا ہوا ہے تو کنارے کی طرح۔

عورت کا حسن تیری فطرت پر بجلی بن کر گرتا ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ تیرا عشق بے پروا بھی ہے۔ یعنی اگرچہ حسین عورت کو دیکھ کر تو بہت بے قرار ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہ ہر وقت تجھے اسی کی دُھن لگی رہے۔ تیری زندگی رنگا رنگی پر موقوف ہے۔ یعنی کبھی اس سے تعلق ہے، کبھی اس سے۔ تو ایک آستانے پر پیشانی رگڑنے کا قائل نہیں۔ حسینوں نے تجھے بے وفا کا خطاب دے رکھا ہے۔ اے ہر لحظہ رنگ بدلنے والے! تو مشہور بھی ہے اور بدنام بھی۔ تو اس دنیا میں پارے کی خصلت لے کر آیا ہے۔ تیری اس بے قراری کے قربان جائیے۔ تو عجیب بے قرار انسان ہے۔

۲

دوسرا بند

آشفتگی: پریشانی۔ رستخیز: قیامت۔ شرارِ جستہ: تڑپ کر اچھلنے والی چنگاری۔ ذرہ انجامی: وہ کیفیت جس کی انتہا ذرہ ہو۔ افلاسِ تخیل: لفظی معنی خیال کی ناداری۔ مراد ہے خیال کی بلندی سے محروم ہونا۔ شبنم آسا: شبنم کی مانند۔ تنگ جلوہ: خفیف جھلک دکھانے والا۔ وہ جس کا جلوہ بہت تھوڑا ہے۔

میں نے اپنے کُرتے کے نیچے خاک کی ایک ایسی مٹھی چھپا رکھی ہے۔ جسے عشق کی پریشانی نے بیابان بنا دیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے۔ میرے سینے میں کوئی ترشا ہوا ہیرا موجود ہے۔ اس کے ہزار پہلو ہیں۔ اور ہر پہلو کا رنگ دوسرا ہے۔ شاعر کا دل احساسات کی قیامت ہوتا ہے یعنی اس میں محسوس کرنے کی قوتیں اسی طرح اٹھا تھ کر ہنگامے بپا کر رہی ہیں، جیسے قیامت کے دن زمین سے مردے اٹھیں گے۔ تجھے کیا خبر کہ میرے سینے کے اندر کیا ہے؟ میرے ہر احساس میں نئے جلوے کی خواہش بھری ہوئی ہے۔ میں بے تاب ہوں اور میرے دل کو کسی پہلو آرام نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میری نظر ہر لحظہ نئے حسین کی تلاش میں رہتی ہے، لیکن حسن سے میں نے وفا کا پکا عہد باندھ رکھا ہے اس شعر میں حسن سے بظاہر حسنِ مطلق مراد ہے۔ گویا اقبال کہتا ہے کہ حسینوں سے بے وفائی کا جو الزام مجھ پر لگایا جاتا ہے یہ غلط ہے۔ بے شک میں نئے نئے حسینوں کی تلاش میں رہتا ہوں لیکن کیوں؟ اس لیے کہ حسنِ مطلق تک پہنچ جاؤں اس سے میری وفاداری بالکل پختہ ہے۔ حسینوں سے بے نیازی دراصل یہ ظاہر کرتی ہے کہ میری فطرت نیازمندی سے بھری ہوئی ہے اور یہ نیازمندی حسن مطلق کے لیے ہے۔ میں صبا کی طرح ہر لحظہ اس کی تلاش میں لگا ہوا ہوں۔ یہ جو حسین میرے سامنے آتے ہیں۔ ان کی حیثیت کیا ہے؟ یہ کہ آگ سے چنگاری تڑپ کر اچھلی اور بجھ گئی ایسی چنگاریوں کا دیدار میرے دل کے لیے تسکین کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اسے تو بجلی کی طلب ہے۔ وہ تو اس حسن کا مشتاق ہے جس کا ایک ہی جلوہ مجھے بجلی کی طرح جلا کر راکھ کر دے۔ میں اس کامل تجلی کا خواہاں ہوں جو عشق کی فطرت کے ہر تقاضے کو ختم کر دے۔ کل کی تلاش مجھے اجزاء میں لیے پھرتی ہے۔ حسن کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ یہ بے کنارہ ہے۔ لہٰذا میری تلاش کے درد کی بھی کوئی دوا نہیں۔ جس طرح حسن اتھاہ ہے۔ میری طلب کا درد بھی ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔ میری زندگی ہی وہ محبت ہے جس کا انجام درد کے سوا کچھ نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میرا عشق وفا کے طریقے کا کوئی پابند نہیں۔ سچی بات پوچھتے ہو تو مجھے کہنا چاہیے کہ وفا بلند خیالی سے محروم ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ میں بلند خیالی سے محروم نہیں۔ میرے دل میں ہر آن ایک نئی قیامت بپا ہوتی رہتی ہے۔ ساقی نے ہمیں جو کچھ دیا ہے، اس کی حیثیت شبنم کے قطروں کی سی ہے۔ میرے دل کا ظرف سمندروں کا طلب گار ہے۔ میں دائمی پیاسا ہوں اور میری پیاس بجھنے والی نہیں۔ میرے پاؤں کے نیچے انگارے بچھے ہوئے ہیں۔ مجھے پیدا کر کے پیدا کرنے والے نے اپنا نکتہ چین پیدا کر لیا۔ میں اگرچہ تصویر ہوں لیکن تصویر بنانے والے سے مجھے سخت گلا ہے۔ جب اس کائنات کی محفل میں حسن کا جلوہ اتنا تھوڑا اور اس قدر قلیل تھا تو سمجھ میں نہ آیا کہ مجھے وہ فکر کیوں دی گئی جس کی اڑان کی کوئی حد و نہایت نہیں؟ ہم تلاش کے بیابان میں لگاتار تگ و دو جاری رکھنے والے ہیں۔ ہم سمندر کی لہریں جو اپنی شکست کند سے پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ جو شے ٹوٹ جائے وہ آگے نہیں چل سکتی۔ موج کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ چلتی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ بگڑتی بنتی جاتی ہے۔ گویا

اپنی شکست کو کندھے پر اٹھائے چلی جاتی ہے رکتی کہیں نہیں۔
اس نظم میں بھی جدوجہد اور تگ ودو ہی کا سبق دیا گیا ہے یعنی یہ کائنات انسان کے ذوقِ طلب کے لیے کافی نہیں۔ اس کی ہمت و استعداد بے انتہا ہے۔ وہ شکست سے کبھی آشنا نہیں ہوتا بلکہ موج کی طرح اس کی شکست بھی نئی زندگی کا سامان بنتی رہتی ہے۔

کوششِ ناتمام

تابِ دوام: ہمیشہ کی چمک۔ **خجستہ گام:** مبارک قدم والا۔

صبح کی سورج کی جدائی میں پیچ و تاب کھاتی ہے۔ شفق کی آنکھ شام کے تارے کی جدائی میں خون روتی ہے۔ دن کے مجنوں کو شام کی لیلےٰ کی آرزو رہتی ہے یعنی دن شام کا آرزومند ہے۔ صبح کا ستارہ اس لیے بیقرار ہے کہ اسے ہمیشہ کی چمک مل جائے۔ قطب تارا ستاروں کے قافلے سے کہہ رہا تھا کہ دوستو! میں تو چلنے کا مزہ لینے کے لیے ترس گیا۔

مراد یہ ہے کہ قطب تارا اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور دوسرے ستاروں کی طرح گردش نہیں کرتا وہ چلنے کا مزہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے چشمے ندیوں کے شوق میں پہاڑوں سے نکل کر اترتے ہیں۔ ندیاں سمندر کے عشق میں دوڑی چلی جاتی ہیں۔ سمندر کی لہروں کو پورے چاند کا عشق بے قرار رکھتا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ حسن مطلق جو لالے اور گلاب کے پردے میں چھپا ہوا ہے، اس لیے بیقرار ہے کہ اس کا جلوہ عام ہو جائے۔ زندگی کا بھید مبارک قدم والے خضر سے پوچھ، وہ بتائیں گے کہ ہر چیز اسی وقت تک زندہ ہے جب تک اس کی کوشش ختم نہ ہو۔ جونہی کوشش ختم ہو گی زندگی کی بساط بھی لپیٹی جائے گی۔
اس نظم میں بھی جدوجہد، حرکت اور کوشش کا سبق دیا گیا ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ کائنات کی ہر شے صرف تگ ودو اور ایک دوسری کے عشق کی بنا پر زندہ ہے۔

نوائے غم

پہلا بند

رباب: سارنگی کی قسم کا ایک ساز۔ بربط: ایک مشہور ساز۔ محشرستانِ نوا: نغموں کی قیامت گاہ۔ یعنی ایسا ساز جس کے نغمے قیامت کا ہنگامہ برپا کردیں۔ امین: امانت دار مضراب: ساز بجانے کا آلہ۔

میری زندگی اس خاموش رباب کی طرح ہے جس کی آغوش ہر رنگ کے نغموں سے بھری ہوئی ہو، یعنی وہ ساز جس میں ہر قسم کے نغمے تو موجود ہوں لیکن اسے بجایا نہ گیا ہو۔

میرا رباب اگرچہ خاموش ہے لیکن اس کی خاموشی پر اس دنیا کے نظام کا ساز بھی قربان ہو ہو جاتا ہے۔ میرے رباب کے ہر تار میں سینکڑوں نغمے دفن ہیں۔ وہ اگرچہ چُپ ہے مگر اس کی چُپ نغموں کی ایک قیامت گاہ کی امانت دار ہے اور اس کی اس چپ نے ہنگامے کا احسان کبھی نہیں اٹھایا۔

تینوں شعروں کا مطلب یہ ہے کہ میری زندگی ایک خاموش رباب کی سی ہے۔ اس رباب میں ہر قسم کے ترانے موجود ہیں۔ لیکن ابھی تک اسے بجایا نہیں گیا اور نغمے اس کے تاروں میں اسی طرح دفن ہیں جس طرح مُردے قبروں میں۔

افسوس، محبّت کی اُمید کبھی پوری نہ ہوئی اور میرے اس ساز نے مضراب کی چوٹ کبھی نہ کھائی۔

دوسرا بند

لیکن کبھی کبھی طُور کے باغ سے نسیم صبح کی لہر آجاتی ہے یا آسمان کی طرف سے حُور کے سانس کی نوا آ نکلتی ہے۔ ان ہواؤں سے میری زندگی کے تار میں ہلکی سی حرکت پیدا ہو جاتی ہے، اور میری رُوح جو زندگی کے جال میں گرفتار ہے۔ جان سے آزاد ہو جاتی ہے۔ نا امیدی کے نغمے کی مدھم سی آواز اٹھتی ہے۔ ساتھ ہی آنسو بھر آتے ہیں۔ گویا یہ آواز آنسوؤں کے لیے قافلے کی گھنٹی کی آواز کا اثر رکھتی ہے کہ اسے سنتے ہی قافلہ چلنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ جس طرح شبنم کی بلندی اس کے اڑ جانے کے ذوق سے قائم ہے۔ میری فطرت کی بلندی نوائے غم سے ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان کی بلندی کا راز سوز و گداز میں ہے۔ اسے چاہیے کہ اپنے ہم جنسوں کے غم میں گھل گھل کر درد بھرے ترانے گاتا رہے۔

عشرتِ امروز

شرابِ طہور: پاک شراب جو بہشت میں ملے گی۔ سلسبیل: بہشت کی ایک نہر

مجھ سے یہ نہ کہہ کہ موت عیش و سرور کا پیغام ہے اور میرے سامنے شرابِ طہور کی کیفیت کا نقشہ نہ کھینچ، بہ ظاہر یہ خطاب واعظ سے ہے۔ کہتے ہیں کہ موت کے بعد بہشت کے عیش کا پیغام مجھے نہ سُنا۔

تو حُور کی جدائی میں غم سے بغل گیر نہ ہو، یعنی حُور کی جُدائی کا غم نہ کھا اور پری کو الفاظ کے شیشے میں نہ اتار۔ مجھے خوبصورت ساقی کا شیدائی نہ بنا۔ حُور کی باتیں نہ سُنا۔ سلسبیل کا ذکر نہ کر۔ بہشت بلاشبہ امن کی جگہ ہوگی۔ مجھے اس سے اختلاف کی ضرورت نہیں، لیکن اسے واعظ! جوانی کے لیے تیرا پیغام موزوں نظر نہیں آتا۔

تو بتا کہ جوانی کتنی مدت تک عیش کی امیدوار رہے؟ وہ عیش ہی نہیں جس کا انتظار کرنا پڑے۔ وہ حسن کس کام کا جو دیکھنے والی آنکھ کا محتاج ہو اور اپنے ظاہر ہونے کے لیے کل کا احسان اٹھائے۔ یہاں کل سے مراد ہے موت کے بعد کا وقت۔

زندگی کا احساس بڑی ہی عجیب چیز ہے۔ جوانی کا عقیدہ یہ ہے کہ جو عیش و عشرت آج حاصل ہے، اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

اس نظم میں بہ ظاہر عشرتِ امروز پر زور دیا ہے لیکن در اصل یہ حقیقت پیش کی ہے کہ دورِ حاضر کے نوجوانوں کے لیے ہمارے واعظوں کے وعظ کا طریقہ ہرگز موزوں نہیں۔ انھیں ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے جو جوانوں میں دین کا صحیح ذوق اور ایمان کا سچّا جذبہ پیدا کر سکے۔ محض جنّت، حُور، سلسبیل وغیرہ کا پیغام جو موت کے بعد نصیب ہونے والی عشرت کا پیغام ہے، ان جوانوں پر اچھا اثر نہیں ڈال سکتا، جو اس دنیا میں اپنے ارد گرد ہر قسم کی عشرت کے سامان جمع پاتے ہیں۔

انسان

پہلا بند

رازِ جو: بھید تلاش کرنے والا۔

قدرت کا یہ عجیب ظلم ہے کہ انسان کے دل میں بھید ڈھونڈنے کا جذبہ پیدا کیا اور بھید اس کی نگاہوں سے

چھپا دیا۔ آگاہی کا ذوق بے قرار ہے۔ زندگی کے بھید کا پتہ نہیں چلتا۔ شروع اور آخر حیرانی ہے۔ گویا آئینے کا گھر بنا ہوا ہے۔ اس میں حیرانی کے سوا کیا مل سکتا ہے۔

شروع اور آخر حیرانی کا قول افلاطون سے منسوب ہے یعنی علم کی ابتدا بھی حیرانی سے ہوتی ہے اور اس کی انتہا بھی حیرانی پر ہوتی ہے۔

دوسرا بند

تقدیر: اندازہ۔ مراد ہے وہ اندازہ جو ہر شے کے لیے خدا نے روز ازل سے مقرر کر دیا۔

دریا کی لہریں چلنے میں مگن ہیں۔ دریا سمندر کی طرف چلا جا رہا ہے۔ بادل کو ہوا اڑا رہی ہے۔ اور اپنے کندھوں پر اٹھائے لیے آ رہی ہے۔ آسمان کے تاروں کے لیے خدا نے جو اندازہ مقرر کر دیا وہ اس کی شراب میں مست ہیں یعنی اس اندازے کے مطابق چلے جا رہے ہیں۔ گویا آسمان کے قید خانے نے انھیں زنجیریں پہنا رکھی ہیں۔

مطلب یہ کہ تاروں کے لیے گردش کی جو راہیں مقرر ہو چکی ہیں، ان پر اس طرح چلے جا رہے ہیں گویا ان کے پاؤں میں زنجیریں پڑی ہوئی ہیں۔ بال برابر بھی ادھر اُدھر نہیں ہو سکتے۔

سورج صبح کو اٹھنے والا عبادت گزار اور دنیا کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا پیغام لانے والا مغرب کی پہاڑیوں میں چھپتا ہے تو شفق کی شراب کا پیالہ پیتا ہے۔ سورج غروب ہوتا ہے تو مغرب کی جانب افق پر سرخی سی پھر جاتی ہے۔ اسے چھپنے والے سورج کی شراب قرار دیا۔

غرض ہر شے زندگی کے مزے لے رہی ہے اور ہر ایک اپنی نمائش میں سرمست ہے۔ ان میں سے کوئی بھی انسان کا غم بٹانے والا نہیں۔ افسوس انسان کی زندگی کتنی تلخ ہے۔

مطلب یہ کہ کائنات کی ہر شے اپنی ہستی نمایاں کر رہی ہے اور جو اندازہ اس کے لیے مقرر ہو گیا، اس پر چل رہی ہے۔ انسان زندگی کا بھید دریافت کرنے میں لگا ہوا ہے۔ اس کام میں کوئی بھی شے اس کا ہاتھ نہیں بٹا سکتی۔

جلوۂ حسن

سر بہ گریباں ہونا: ۔ گریبان میں سر ڈالنا یعنی غور و فکر کرنا۔ ادراک: دریافت۔ سمجھ

وہ جلوۂ حسن جس سے آرزو بے قرار ہوتی ہے اور جسے جوانی اپنے خیالوں کی گود میں پالتی ہے جس سے یہ فنا ہونے والی دنیا دائمی بن جاتی ہے، جس کی بدولت جوانی ایک دل لبھانے والی کہانی کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جو ہمیں غور و فکر کرنا سکھاتا ہے، جس کے سبب سے ہم موجود دنیا کے نظارے سے بھاگتے ہیں، جس سے عقل کی خامی دور ہو جاتی ہے جس کے باعث عقل احساس کی غلام بن جاتی ہے۔ آہ وہ حسن کہیں موجود بھی ہے کہ نہیں؟ اسے خدا! زمانے کی انگشتری میں وہ نگینہ جڑا ہوا ہے کہ نہیں؟

ایک شام

دریائے نیکر (ھائیڈل برگ) کے کنارے پر

تمہیدی نوٹ

دریائے نیکر دریائے رہائن کا ایک معاون ہے۔ جرمنی کا مشہور شہر ہائیڈل برگ اس کے بائیں کنارے واقع ہے۔ یہ نظم اس زمانے میں لکھی گئی تھی جب اقبال فلسفے کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے جرمنی گئے ہوئے تھے اور میونخ یونیورسٹی سے اگست ۱۹۰۷ء میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی کی لائبریری سے فائدہ اٹھانے کے لیے وہاں تشریف لے گئے تھے۔

نوا فروشی: نغمے گانے والے یعنی پرندے۔ مراقبہ: گیان۔ دھیان۔

چاند کی روشنی خاموش ہے۔ ہر درخت کی شاخیں بھی خاموش ہیں۔ وادی کے پرندوں نے چپ سادھ لی ہے۔ پہاڑوں کے سبز پوش درخت خاموش کھڑے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت بے ہوش ہو کر رات کی گود میں سو گئی ہے۔ چپ نے ایسا جادو کر دیا ہے کہ نیکر کا چلنا بھی ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ تاروں کا قافلہ خاموش ہے اور گھنٹے کی آواز کے بغیر چلا جا رہا ہے۔ پہاڑ، بیابان اور دریا سب چپ ہو گئے ہیں۔ گویا قدرت گیان دھیان میں مگن ہو گئی ہے۔

اسے دل! تو بھی چُپ ہو جا اور غم کو گود میں لے کر سو جا۔

تنہائی

حسن زین: غمگین۔ نسترن زار: سیوتی کے پھولوں کا باغ۔

اے دل! تو رات کی تنہائی میں غمگین کیوں ہے؟ تجھے اس بات کا رنج کیوں ہے کہ تیرا ساتھی اور دوست کوئی نہیں ہے؟ کیا یہ تارے تیرے ساتھی نہیں ہیں؟ کیا یہ تیرا غم نہیں بٹا سکتے اور تیری رازداری کا حق ادا نہیں کر سکتے؟ ذرا کائنات کی مختلف چیزوں پر نظر ڈال۔ یہ خاموش آسمان کی بلندی، یہ سوئی ہوئی زمین، یہ چپ چاپ دنیا، یہ چاند، بیابان، آبادیاں، پہاڑ، انھیں دیکھ۔ معلوم ہوگا کہ پوری کائنات سیوتی کا باغ بنی ہوئی ہے۔ پھر اپنی حالت پر غور کر۔ تیرے پاس آنسوؤں کے تارے ہیں جو نہایت خوش رنگ اور پیارے پیارے موتی ہیں۔ اے دل! تجھے اور کس چیز کی آرزو ہے؟ کیا یہ کافی نہیں کہ پوری قدرت تیری ہمدم اور ہم راز ہے؟ پھر تو غم کیوں کھا رہا ہے؟

پیامِ عشق

تمہیدی نوٹ

یہ نظم غالباً ۱۹۰۶ء میں لکھی گئی اور "مخزن" میں چھپی تھی۔ اقبال کی فکر و نظر میں بنیادی تبدیلی اسی وقت سے شروع ہو گئی تھی جب وہ ولایت پہنچے تھے۔ آہستہ آہستہ اس تبدیلی کا رنگ گہرا ہونے لگا۔ پیامِ عشق اس حالت کا ابتدائی نقشہ پیش کر رہی ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں اور اقبال کی مشہور عالم نظموں میں مضمون اور انداز بیان کے اعتبار سے یکسانی بہت نمایاں ہے۔

غزنوی: مراد ہے سلطان محمود غزنوی۔ ایاز: سلطان محمود کا ایک امیر تھا لیکن غلام مشہور ہو گیا۔ اسے ملک ایاز کہتے تھے۔ لاہور کا گورنر رہا۔ شعر و ادب کی اصطلاح میں اسے سلطان محمود کا محبوب مانا جاتا ہے۔

قناعت شعار : وہ شخص جس کا طریقہ قناعت ہو یعنی قناعت پسند۔ **وفور** : بہتات۔ **دامن دراز** : لمبے دامن والا۔ **صحرانوردی** : بیابانوں میں گھومنا۔ **آتش زن** : آگ لگانے والا **فرقہ ساز** : فرقہ بنانے والے

عشق کہتا ہے کہ اے عاشق! اے پہلو میں درد کے طلب گار! اگر تو مراد کو پہنچنا چاہتا ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ میرے ناز کے روبرو سر سے پاؤں تک نیاز بن جا۔ میں تیرے دل کو اسی طرح فتح کروں گا جس طرح غزنوی نے سومنات فتح کیا تھا تو ایاز کی طرح غلامی اور وفاداری کا نمونہ پیش کر۔

مطلب یہ کہ عاشق کے لیے مراد حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ اپنے آپ کو عشق کے حوالے کر دے۔ اپنا عشق کے ہاتھ میں دل دے کر خود اس کے حکموں پر چلنے لگے۔

اس آسمان کے نیچے کمال حاصل کرنے کے لیے سکندر کی شان پیدا کرنا لازم نہیں۔ کمال قدرت نے اس کے لیے خاص نہ کر دیا تھا۔ سکندر کی کاریگری کا سب سے بڑا کارنامہ کیا تھا؟ یہ کہ اس نے ایک ایسا آئینہ بنا دیا تھا جس میں دنیا کے حالات نظر آتے تھے۔ تجھ میں بھی وہ تمام سامان موجود ہیں جو سکندر کو حاصل تھے۔ پھر تو آئینہ کیوں نہیں بناتا؟

ایک کہانی مشہور ہے کہ سکندر نے مصر فتح کر کے جب ساحل پر سکندریہ کی بنیاد رکھی تو یہاں ایک بہت اونچا مینار بنا دیا تھا جس پر آگ روشن رہتی تھی اور جہازوں کو اندھیرے میں دور سے سکندریہ کا پتہ چل جاتا تھا یہ مینار سکندر نے بنایا یا کسی دوسرے شخص نے، بڑی مدت تک قائم رہا اور پرانی دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا تھا۔ شاعروں نے خدا جانے کس بنا پر اس مینار کی روشنی کو سکندر کا طلسمی آئینہ قرار دے لیا کہ فارسی اور اردو کے ادب میں یہ ایک عام اصطلاح بن گئی۔ اقبال کہتے ہیں کہ ایسا طلسمی آئینہ بنا لینا سکندر سے مخصوص نہیں، ہر ہمت ور انسان خداداد سامانوں سے کام لے کر سکندر جیسا کمال دکھا سکتا ہے۔

زندگی میں جدوجہد اور کشمکش کا مقصد کیا ہے؟ یہ کہ تو کمال کے درجے پر پہنچے اور تیرا ہلال بدر منیر بن جائے۔ اے مسلمان! تو اس کشمکش سے گھبراتا اور پریشان کیوں ہوتا ہے؟ تو دنیا کا سب سے بڑا فرض ہے لہٰذا تجھے نماز کی طرح ادا ہونا چاہیے۔ یعنی تجھے قدرت نے جس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے وہ پورا ہونا چاہیے۔ خواہ ارد گرد مشکلات کے کیسے ہی طوفان بپا ہوں۔

اے پھول چننے والے! تو قناعت پسندی نہ کر۔ یعنی جو کچھ مل جائے اسی کو لے کر اطمینان سے نہ بیٹھ تیری شان اسی طرح قائم رہ سکتی ہے کہ اپنی طلب بڑھاتا جا۔ اگر باغ میں پھولوں کی بہتات ہے تو تجھے چاہیے کہ اپنا دامن اور پھیلا لے تاکہ کوئی پھول تیرے دامن سے باہر نہ رہ جائے۔

اپنا دامن اور پھیلا لے تاکہ کوئی پھول تیرے دامن سے باہر نہ رہ جائے۔

اس شعر میں مسلمان کو عالی ہمتی اور بلند نظری کا سبق دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کا کام صرف چند آرزوئیں پوری کر لینے پر موقوف نہیں۔ اسے یہ نہ چاہیئے کہ جو کچھ دوسروں سے ملتا ہے، اس پر تسلی کر کے بیٹھ جائے۔ اس دنیا میں فرائض اور مقاصد کی کمی نہیں۔ مسلمان کو جواں مردی سے آخری وقت تک جدوجہد جاری رکھنی چاہیئے۔

ایک زمانہ تھا کہ عاشق بے تاب ہو کر جنگلوں اور بیابانوں میں گھوما کرتے تھے۔ وہ زمانہ باقی نہیں رہا۔ اب حالات کا تقاضا یہ ہے کہ جلتی ہوئی شمع کی طرح محفل میں پگھلا جائے۔

بیابانوں میں گھومنے سے اشارہ مجنوں کی طرف ہے۔ اقبال یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مجنوں کی طرح لیلیٰ کے عشق میں دیوانہ بن کر بیابانوں میں گھومتے پھرنا کیا کام دے سکتا ہے؟ اب تو جس شخص کے دل میں قوم کے عشق کا سچا جذبہ ہے، اسے اپنے ہم قوموں میں بیٹھ کر جاں بازی کا نمونہ پیش کرنا چاہیے اپنی قوم کو جلنے اور پگھلنے کا سبق دینا چاہیے اور اسے آگے بڑھانا چاہیئے۔

افراد کا مجازی وجود ہوتا ہے یعنی وہ اصلی اور حقیقی چیز نہیں۔ حقیقی چیز قومی زندگی ہے۔ افراد صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ باہم مل جل کر اور ایک دوسرے میں گم ہو کر قوم کی شکل اختیار کر لیں۔ قوم باقی ہے تو افراد بھی باقی رہیں گے اگر قوم باقی نہ رہی تو افراد بھی مٹ جائیں گے۔ پس ہر سچے مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ مجاز کے طلسم میں آگ لگا دے اور قوم پر فدا ہو جائے۔

اے اقبال! ہندوستان کے جو لوگ فرقے اور گروہ بنا رہے ہیں، انھوں نے آزر کی طرح بت تراشی کا طریقہ اختیار کر لیا ہے تو ان بتوں سے اپنا دامن بچا کر حجاز کے راستے کا غبار بن جانا۔

مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں فرقہ سازی اور گروہ بندی کی جو وبا پھیلی ہوئی ہے، یہ کھلی ہوئی بت تراشی ہے۔ مسلمان کا فرض یہ ہے کہ ان تمام بتوں یعنی فرقہ سازیوں سے کنارہ کر لے اور اپنے آپ کو اسلام میں گم کر دے۔

فراق

پہلا بند

طفلک گفتار آزما: وہ بچّہ جو بولنے کی مشق کر رہا ہو، یعنی باتیں کرنا سیکھ رہا ہو۔

میں تنہائی کے گوشے کی تلاش میں پھر رہا ہوں اور پہاڑ کے دامن میں آچھپا ہوں۔ اس کے سوا مجھے تنہائی کہیں نصیب نہ ہوئی۔

یہاں بہنے والے چشموں کے اُس گیت میں جس کی لَے تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد کان تک پہنچتی ہے۔ بڑی دل کشی محسوس ہوتی ہے۔ اس گیت کی صورت ایسی ہے جیسے چھوٹا بچہ جو بولنے کی مشق کر رہا ہو، کسی وقت دعائیں لگ جائے۔ چشموں کے گیت کو شکستہ اس لیے کہا کہ چلنے کی آواز کسی وقت سنائی دیتی ہے، کسی وقت سنائی نہیں دیتی۔ یہ اقبال کی تصویر کشی کا کمال ہے۔ پھر اسے بولنا سیکھنے والے بچّے کی دعا سے تشبیہ دینا معجزے کا حکم رکھتا ہے۔

شام کا ستارہ شفق کے لعل جڑے تخت پر بیٹھ گیا ہے۔ یعنی شفق میں ستارہ نمودار ہو گیا ہے۔ شام کے نظارے کی خوبی دیکھنے والی آنکھ کے لیے بہشت کا نمونہ ہے۔ شام کی جدائی کی خاموشی میرے لیے بہانہ بن گئی اور کسی کی یاد نے مجھے ترانہ سکھا دیا یعنی میں گانے لگا۔

دوسرا بند

سرود: راگ گیت

میری بے صبر جان کی کیفیت یہ ہے۔ میری مثال اُس چھوٹے بچے جیسی ہے جو اکیلا ہو، اندھیری رات میں گانے لگے اور اپنی آواز کو غیر کی آواز سمجھے۔

ان دو شعروں میں اقبال نے حقیقت شناسی کا انتہائی کمال دکھایا ہے۔ بچّہ اکیلا ہو تو گانے لگتا ہے۔ یہ گانا تنہائی میں اس کے ڈر کا علاج ہوتا ہے، گویا وہ اپنی آواز کو غیر کی آواز سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دیتا ہے کہ میرے پاس کوئی نہ کوئی موجود ہے۔

اسی طرح میں اپنے دل کو صبر کا پیغام دیتا ہوں، گویا اپنے خیال کے مطابق جدائی کی بات کو فریب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

عبدالقادر کے نام

تمہیدی نوٹ

اس نظم میں خطاب شیخ عبدالقادر مرحوم مدیر مخزن سے ہے۔ یہ دسمبر ۱۹۰۸ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ جب اقبال کو ولایت سے واپس آئے ہوئے کم و بیش چار مہینے ہو چکے تھے۔ معلوم نہیں یہ نظم یہاں پہنچ کر لکھی یا ولایت ہی میں لکھ چکے تھے۔ بہر حال قوم کی عملی خدمت کے لیے کمربستہ ہونے کا یہ پہلا اعلان ہے۔ پھر اقبال کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی خدمت کے لیے وقف ہو گیا۔ اگرچہ وہ معاش کے لیے کچھ کام بھی کرتے رہے، لیکن ان کا دل برابر خدمت ہی میں لگا رہا۔

شیخ عبدالقادر نے اس پر ایک تمہیدی نوٹ لکھا تھا جو ذیل میں درج ہے:

اس نظم کو ہدیۂ ناظرین کرتے ہوئے مجھے اس بات سے شرم آتی ہے کہ ایسی نظم اور ایسے خیالات کا مخاطب مجھے بنایا گیا ہے اور ایسے بلند ارادوں میں مجھے شریک کیا گیا ہے۔ سوائے اس کے کہ دل اپنے دل نواز کی محبت کا شکریہ ادا کرے اور میں یہ دعا مانگوں کہ خدا حضرت اقبال کے ارادوں میں برکت دے اور اگر میرے نصیب میں کوئی خدمت ملک کی لکھی ہے تو مجھے اس کی توفیق عطا فرمائے، کوئی جواب اس خط کا مجھ سے بن پڑتا نہیں۔ خصوصاً جب اقبال کے اشعار آب دار کے مقابل اپنی نثر کی خشکی اور بے مایگی پر نظر کرتا ہوں۔ (مخزن بابت دسمبر ۱۹۰۸ء)

اس میں سے مندرجہ ذیل پانچ شعر اقبال نے نظر ثانی کے وقت حذف کر دیے تھے۔

پھونک ڈالا تھا کبھی دفترِ باطل جس نے ۔۔۔ حدّتِ دم سے اسی شعلے کو پیدا کر دیں
تنِ آتش زدۂ شوق کو مانندِ سرشک ۔۔۔ قطعِ منزل کے لیے آبلہ پا کر دیں
درد ہے سارے زمانے کا ہمارے دل میں ۔۔۔ جنس کم یاب ہے آ نرخ کو بالا کر دیں
زاہدِ شہر کہ ہے سوختہ طبعی میں مثال ۔۔۔ خشک ہے اس کو غریقِ نمِ صہبا کر دیں
سنگ رس شاخِ چمن ہم نے نشیمن کے لیے ۔۔۔ اپنے بے دردوں کو آمادۂ ایذا کر دیں

خاور: مشرق۔ شعلہ نوائی: ایسے نغمے گانا جن سے شعلے نکلیں۔ مراد ہے تڑپانے والے نغمے۔

تپش آمادہ: تڑپنے کے لیے تیار اور بے قرار۔ آئینِ نمو: پھلنے پھولنے کا قانون۔ سُعدیٰ و سُلیمیٰ: عرب لڑکیوں کے نام۔ یہاں مراد ہے اسلام۔

اے رفیق! اُٹھ کہ مشرق پر اندھیرا چھا گیا۔ یہ وقت ہے کہ اپنے شعلوں بھرے نغموں سے محفل میں اُجالا کر دیں، یعنی ہماری قوم مایوسی اور بے عملی کے اندھیرے میں ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ اُمید کی کوئی روشنی نظر نہیں آتی۔ ایسی حالت میں اسے راستہ دکھانے اور اس میں عمل کا جذبہ پیدا کرنے کی صورت یہی ہے کہ ہم اپنی آواز بلند کریں۔ اٹھائیں اور آگے بڑھائیں۔

ہرن کے دانے کی طرح ہمارے بس میں فریاد کے سوا کچھ نہیں آ کہ اسی فریاد سے اپنی محفل میں ہنگامہ بپا کریں تاکہ بے حسی ختم ہو اور قوم عمل کی راہ پر لگ جائے۔

اہلِ محفل کو دکھا دیں کہ سچے عشق کی جلا کا اثر کیسا ہوتا ہے۔ آج کے پتھر کو آئندہ کل کا آئینہ بنا دیں۔
مطلب یہ کہ قوم کا سچا عشق دل میں موجود ہو تو پتھر بھی آئینہ بن سکتا ہے، یعنی قوم کی بے حسی جو پتھر کی مانند ہے، ختم ہو سکتی ہے۔ آج یہ حالت ہے، گویا اس کے سامنے آئینے کی جگہ پتھر رکھا ہوا ہے۔
جس میں ماضی، حال، مستقبل کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ سچے عشق کی جلا سے یہی پتھر آئینے کی طرح صاف و شفاف ہو جائے گا۔

آ کہ اسے یعنی قوم کو گم شدہ یوسف کا جلوہ دکھائیں اور دلوں میں وہی تڑپ پیدا کر دیں جو زلیخا کے خون میں تھی۔

مراد یہ کہ ہماری قوم اپنی اُس شان کو بھول چکی ہے جو کل اسے حاصل تھی۔ وہ شان اسے دکھا کر عمل کی زبردست حرکت پیدا کی جا سکتی ہے۔

اس باغ کو پھولنے پھلنے کا ایسا طریقہ سکھائیں کہ بے حقیقت شبنم کی بوند دریا بن جائے۔ یعنی ہماری قوم بہت گری ہوئی ہے۔ اس میں ایسا جذبہ پیدا کر دیں کہ قطرہ دریا کی حیثیت اختیار کر لے۔

اپنی جان کا ساز و سامان چین کے بُت خانے سے اٹھا لیں اور اپنی قوم کے ہر فرد کو سُعدیٰ اور سُلیمیٰ کے حُسن کا شیدائی بنا دیں یعنی ہمارے تمام شیوے اور طریقے غیر اسلامی ہیں، ان میں بُت خانے کے اثرات نمایاں ہیں ضروری ہے کہ اپنی قوم کو اسلام کا شیدائی بنائیں۔

دیکھ! یثرب میں لیلیٰ کا ناقہ بے کار ہو گیا ہے۔ اب وہ مجنوں کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتا۔ ضروری ہے کہ مجنوں کو نئی آرزو اور نئی امنگ سے آشنا کریں۔

مطلب یہ کہ قوم میں اسلامی زندگی کی شان پیدا کرنے کے پرانے طور طریقے اب کام نہیں دے سکتے اس غرض سے نئے طور طریقوں کی ضرورت ہے۔

ہمیں ایسی شراب درکار ہے جو پرانی ہو، لیکن اس میں اتنی تیزی اور تندی ہو کہ صراحی، پیالے اور مینا کا جگر پگھلا کر رکھ دے۔

مراد یہ ہے کہ شراب تو ہمارے پاس پرانی ہی ہے یعنی خالص اسلامی، لیکن اس میں تیزی ایسی پیدا کریں کہ سب کے دل پگھل جائیں۔

ہمیں مغرب یعنی انگلستان کی سردی میں قوم کے عشق کا جو داغ تڑپاتا رہتا تھا، اب سینہ چیر کر اسے اپنی قوم کو دکھا دیں۔

ہمیں دنیا کی محفل میں شمع کی طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے کہ خود جلتی ہے اور دوسروں کے لیے روشنی بہم پہنچاتی ہے۔ ہمیں خود بھی جلتے رہنا چاہیئے تاکہ ہماری قوم روشنی حاصل کرے۔ اس میں نیک و بد کی پہچان پیدا ہو۔ وہ اپنی اچھائی برائی کے متعلق اندھیرے میں نہ رہے اور ہماری جلن اسے اسلام کی نعمت سے مالا مال کر دے۔ شمع کے دل پر جو کچھ گزرتا ہے، وہ اسے زبان پر لے آتی ہے۔ جلنا کوئی خیال نہیں جسے شمع چھپا کر رکھ سکے۔

مطلب یہ کہ جس طرح شمع کا جلنا دنیا پر ظاہر ہے، اسی طرح قوم کے عشق میں ہمارا جلنا بھی سب پر ظاہر ہو جائے۔

صقلیہ

جزیرہ سسلی

تمہیدی نوٹ

یہ نظم اگست ۱۹۰۸ء کے "مخزن" میں چھپی تھی اور اس کا عنوان "جزیرہ سسلی" تھا۔ عام طور پر یہ نظم مرثیۂ سسلی کے نام سے مشہور ہے۔ مسز سروجنی نائیڈو نے بھی اپنی ایک (انگریزی) نظم میں اسے مرثیۂ سسلی ہی قرار دیا ہے:

IN IQBAL'S DIRGE OF SICILY (یعنی اقبال کے مرثیۂ سسلی کے انداز میں)

اقبال ولایت سے آتے ہوئے بمبئی سے دہلی پہنچے تو احباب نے انھیں روک لیا۔ ۲۶ جولائی ۱۹۰۸ء کو شیخ نظام الاولیاء کی درگاہ میں مجلسِ احباب منعقد ہوئی، جہاں یہ نظم پڑھی گئی۔ اس میں خواجہ حسن نظامی، شیخ عبدالقادر، شیخ محمد اکرام، میر غلام بھیک نیرنگ اور مولانا راشد الخیری شریک تھے۔

"مخزن" نے اس پر ایک نوٹ لکھا جس کا ایک حصّہ ذیل میں درج ہے:

جزیرہ سسلی روئے زمین کے ان حصّوں میں سے ہے جہاں اہلِ عرب نے اپنی فتوحات کا جھنڈا بلند کیا اور اپنی تہذیب کی روشنی پھیلائی۔ وہ انقلاب دوراں کے ہاتھوں اب اس حالت میں ہیں کہ تاریخ داں لوگوں کے سوا کسی کو ان میں اسلام کی عظمت کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ ہمارے دوست (اقبال) فرماتے ہیں کہ وہ رات کے وقت جہاز میں اس جزیرے کے پاس سے گزرے اور اس کی روشنیوں کو دیکھ کر بعض خیالات اور جذبات نے یکایک ان کی طبیعت پر ہجوم کیا۔ یہ نالۂ موزوں انھیں خیالات اور جذبات کا نتیجہ ہے۔

("مخزن" بابت اگست ۱۹۰۸ء صفحہ ۶۳)

نظرِ ثانی میں اس کے بعض شعر بدل دیے گئے۔

پہلا بند

خونابہ بار: خون برسانے والی۔ لہو رونے والی۔ عصرِ کہن: پرانا زمانہ۔ تیغِ ناصبور: بے صبر تلوار۔

اے لہو رونے والی آنکھ! تو دل کھول کر رو لے۔ وہ عربوں کی اسلامی تہذیب کا مزار نظر آتا ہے۔ جیسا کہ تمہیدی نوٹ میں بتایا گیا۔ اقبال کی یہ نظم ان خیالات کے جذبات کا نتیجہ تھی جو جزیرہ سسلی کی شمعیں دیکھ کر اس وجہ سے ان کے دل میں پیدا ہوئے کہ کبھی سسلی پر اسلام کا پرچم لہرا رہا تھا اور یہاں سے اسلامی علوم و فنون یورپ پہنچ رہے تھے۔ اب مدّت ہوئی وہ دور ختم ہو گیا۔ عرب اپنی عظمت لٹا کر پھر صحرا میں جا بیٹھے، لہٰذا سسلی ان کی تہذیب کا مزار بن کر رہ گیا۔

یہاں ایک زمانے میں ان بیابانیوں کا ہنگامہ بپا تھا، جن کی کشتیاں سمندر کے سینے پر کھیلتی پھرتی تھیں، یعنی سمندر ان کے لیے کھیل کا میدان بنا ہوا تھا۔ وہ بیابانی جن کی وجہ سے شہنشاہوں کے درباروں میں ہلچل مچ جاتی تھی اور ہر شخص پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ جن کی تلواروں میں بجلیوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے یعنی وہ تلواریں میان سے باہر نکالتے تھے تو ان سے ہر طرف بجلیاں گرتی تھیں۔ وہ بیابانی جن کا ہر دَور نئے کار آتا نئی دنیا کا پیغام تھا اور جن کی بے صبر بیتاب تلوار پرانے زمانے کو کھا گئی اور جلا کر بھسم کر گئی، یعنی وہ عرب جنھوں نے پرانے زمانے کو ختم کیا اور نئی دنیا کی بنیاد رکھی۔ وہ بیابانی جن کے قُم کا نعرہ سُن کر مری ہوئی دنیا زندہ ہو گئی اور انسان کو وہم و وسواس کی زنجیر سے آزادی

مل گئی، یعنی ان کا پیغام سُن کر اس جہان میں نئی زندگی پیدا ہوئی اور انسان وہم و وسوسہ کو چھوڑ کر خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے کام لینے لگے۔ وہ تکبیر جس کے غلغلوں کی آواز سے کان اب تک لطف اٹھا رہے ہیں، کیا ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی ہے؟ یعنی کبھی سسلی اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں تکبیر کی صدا گونج رہی تھی، اب سسلی کی سطح سے ایسی کوئی آواز نہیں آتی، حالانکہ کان اسی پر لگے ہوئے ہیں۔ کیا وہ آواز پھر سنائی نہ دے گی؟

دوسرا بند

بحر پیما: سمندر ناپنے والا یعنی سمندر کا سفر کرنیوالا۔

اے سسلی! تیری وجہ سے سمندر کی شان قائم ہے۔ تجھے پانی کے اس وسیع بیابان میں راستہ دکھانے والے کی حیثیت حاصل ہے۔ میری دعا ہے کہ تو سمندر کے رخسار پر تل کی طرح زیب و زینت کا سامان بنا رہے اور سمندر کا سفر کرنے والے کو تیری شمعیں تسلّی دیتی رہیں۔ سسلی کو سمندر کے رخسار کا تل اس لیے کہا کہ بحیرۂ روم کے وسیع پانیوں میں جزیرے کو واقعی وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو رخسار پر تل کو۔

میری دُعا ہے کہ تیرا نظارہ مسافر کی آنکھ کے لیے پُرلطف رہے اور سمندر کی موجیں تیرے ساحل کی چٹانوں پر رقص کرتی رہیں۔

میں یہ دُعائیں اس لیے دیتا ہوں کہ تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا سرچشمہ اور مرکز تھا، جس کا دنیا کو روشن کرنیوالا حسن آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دیتا تھا۔

تیسرا بند

نالہ کش: نوحہ کرنے والا۔ **شیراز کا بلبل:** شیخ سعدیؔ شیرازی جنھوں نے بغداد کی تباہی کا مرثیہ کہا تھا اور اس کا پہلا شعر یہ ہے:

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملکِ مستعصم امیرالمومنین

داغ: اردو کے مشہور شاعر نواب میرزا خاں داغؔ جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی بربادیٔ دہلی کا مرثیہ لکھا تھا۔ دہلی کی بربادی کے مرثیے بہت سے شاعروں نے لکھے تھے جو "فغانِ دہلی" کے نام سے چھپ گئے تھے۔ اقبال نے داغ کا ذکر غالباً اس لیے کیا کہ سب سے اچھا مرثیہ انھیں کا مانا گیا تھا۔

غرناطہ : اندلس کا مشہور شہر جسے انگریزی میں گریناڈا کہتے ہیں۔ اس کا قصر الحمرا دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے اندلس کو فتح کیا تو قرطبہ (کارڈووا) کو دارالحکومت بنایا۔ جب مرکزی سلطنت باقی نہ رہی تو طوائف الملوکی پھیل گئی۔ آخری دور کی سلطنتوں میں سے بنو احمر کی سلطنت غرناطہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جسے شاہ فرڈی نینڈ اور ملکہ ازابلا نے ۱۴۹۲ء میں فتح کیا اور اندلس سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دیا۔

ابن بدرون : اندلس کا مشہور ادیب و شاعر جس نے غرناطہ کی تباہی کا مرثیہ لکھا۔

شیخ سعدیؒ نے بغداد کی تباہی کا نوحہ لکھا۔ داغ نے دہلی کی تباہی پر خون کے آنسو بہائے۔ جب آسمان کی گردش نے غرناطہ کی سلطنت برباد کی تو ابن بدرون کے پُر غم دل نے فریاد کی یعنی غرناطہ کا مرثیہ لکھا۔ اسے سسلی! تیرا ماتم اُس اقبال کے حوالے ہوا، جس کی قسمت میں غم کے سوا کچھ نہیں۔ سمجھنا چاہیے کہ تیرے ماتم کے لیے قضا و قدر نے وہ دل چُن لیا جو تیری حالت سے واقف اور تیرا رازدار تھا۔

چوتھا بند

آثار، کھنڈر۔ پرانی عمارتوں کے بچے کھچے نشان۔

تیرا ساحل اگرچہ خاموش ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مجھے بتا کہ تیرے کھنڈروں میں کس کی کہانی چھپی ہوئی ہے؟ مراد یہ ہے کہ تیرا ساحل کچھ کہنا چاہتا ہے۔ تو کھنڈروں ہی کی داستان کہے گا۔ تُو بتا! یہ کھنڈر کس کے ہیں تُو اپنا دُکھ درد مجھے سُنا۔ میں بھی سر سے پاؤں تک درد ہی درد ہوں۔ جس قافلے کی تو منزل تھا یعنی جو قافلہ تجھ میں ٹھہرا رہا، میں اُس قافلے کی گرد ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ تو کسی زمانے میں عربوں کا وطن تھا۔ ان کا قافلہ رخصت ہو چکا۔ ہر قافلہ کے پیچھے گرد اڑتی ہے، میں وہی گرد ہوں یعنی قافلے کے پیچھے پیچھے آنے والا ہوں۔

پرانی تصویر میں پھر رنگ بھر کر مجھے ایک مرتبہ دکھا دے اور پرانے زمانے کی کہانی سنا کر مجھے تڑپا دے یعنی وہی درد پھر تازہ کر دے، جب عرب تجھ پر حکمران تھے۔ میں ہندوستان جا رہا ہوں اور تیرا تحفہ اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ خود یہاں رو رہا ہوں، ہندوستان پہنچ کر دوسروں کو رُلاؤں گا۔

اقبال کا پہلا مرثیہ داغ کی وفات پر تھا۔ اس کا انداز سب سے الگ اور بالکل اچھوتا تھا۔ یہ دوسرا مرثیہ ہے اس کا رنگ بھی بالکل الگ ہے۔ مثلاً سب سے پہلے اس دور کی یاد تازہ کی گئی، جب مسلمان

دنیا کے ہر خطّے پر حکمران تھے۔ اور ان کی وہی خصوصیتیں بیان کی گئیں جن کی وجہ سے دنیا کی رہنمائی انھیں ملی تھی۔ پھر سسلی کا عام منظر پیش کرتے ہوئے اسلامی تہذیب کے دور کی یاد تازہ کی۔ مرثیہ نگاری کے سلسلے میں اسلامی عظمت کی بربادی کے چند دل دوز واقعات کی طرف اشارہ کیا اور آخر میں اس آرزو کا اظہار کیا کہ اے سسلی! تو اپنا درد مجھے سنا اور پرانے زمانے کی تصویر ایک مرتبہ دکھا تاکہ تیرا یہ تحفہ میں ہندوستان جا کر سب کو دکھاؤں اور رلواؤں۔ اردو شاعری میں اس قسم کے مرثیوں کی کوئی مثال نہیں ملتی بلکہ دوسری زبانوں میں بھی مثال ناپید ہے۔

غزلیات

۱

رَم: بھاگنا۔ زائرانِ کعبہ: کعبے کی زیارت کرنے والے۔ زمزم: کعبے کے قریب ایک مقدس کنواں جہاں کا پانی حاجی لوگ تبرّک کے طور پر ساتھ لاتے ہیں۔

انسانی زندگی کی حقیقت ایک دم کے سوا کچھ نہیں۔ رَم کیا ہے؟ صرف ہوا کی ایک لہر جو اِدھر اُدھر بھاگتی، دوڑتی اور اُڑتی رہتی ہے۔ مطلب یہ کہ زندگی ناپائدار ہے۔ عارضی ہے، بلبلے جیسی ہے کہ پانی کی سطح پر بنا، اُسی وقت ہوا کا جھونکا آیا اور وہ مٹ گیا۔

پھول کہتا تھا کہ زندگی ایک مسکراہٹ اور ہنسی ہے۔ لیکن شمع بولی کہ غم و رنج سے رونے ہی کا نام زندگی ہے یعنی زندگی میں کبھی خوشی ہوتی ہے، کبھی غم، ان دونوں کے مجموعے کو زندگی کہتے ہیں۔

جب تک کوئی شخص زندگی کے بھید سے واقف نہ ہو، زندگی اس کے لیے ایک راز ہی بنی رہتی ہے۔ جب اس پر یہ بھید کھل جاتا ہے تو اسے خبر ہو جاتی ہے کہ دنیا میں اس کے سوا اور کسی چیز کی کوئی حقیقت نہیں۔ مراد یہ کہ بے خبری کے عالم میں زندگی انسان کے لیے ایک راز ہے۔ لیکن آگاہی کی صورت میں اس کے دل پر یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں فانی ہیں۔ صرف انسان کی رُوح باقی اور ہمیشہ کے لیے قائم رہنے والی ہے۔

اسے اقبال! کعبے کی زیارت کرنے والے حاجیوں سے کوئی پوچھے، بھلا کعبے سے آبِ زمزم کے سوا اور کوئی چیز تحفے کے طور پر ساتھ لانے کے قابل نہیں؟ اس شعر میں ان حاجیوں پر طنز کی گئی، جو بیت اللہ شریف سے صرف زمزم کا پانی تبرکاً اور تحفۃً ساتھ لے آتے ہیں۔ حالانکہ انھیں چاہیے خوفِ خدا و صفائے قلب کا تحفہ وہاں سے لائیں، باقی زندگی احکام اسلام کے مطابق اور ذکر الٰہی میں بسر کریں۔

۲

خجستہ پے: مبارک قدم والی۔ سودائے بخیہ کاری: بخیہ کرنے یا سینے کا خبط۔ سرِ پیرہن: لباس

کا خیال۔

اے خدا! مُبارک قدم والی عقل کو تھوڑا سا جنون سکھا دے۔ اسے تو لباس کے سینے کا خبط ہے لیکن مجھے سر سے لباس ہی کا ہوش نہیں۔ یعنی عقل مجھے دنیا کے کاروبار کی طرف مائل کر رہی ہے اور میں دنیا سے دور بھاگتا ہوں۔ میرے دل کو عشق رسولؐ کی ذراسی جھلک سے روشن کر دے تاکہ میں خاطر خواہ زندگی کا مقصد حاصل کر سکوں۔

جب ازل میں خدا نے یہ دنیا پیدا کر کے اپنے بندوں میں نعمتیں تقسیم کیں تو مجھے عشق کی جلن عطا ہوئی۔ یہ دیکھ کر فرشتے بول اٹھے کہ اے بندے! تو قبر کے چراغ کی طرح عمر بھر جلتا رہتا ہے۔ تیری محفل کوئی نہیں۔

مطلب یہ کہ عاشق کی زندگی شمع مزار کی زندگی سے ملتی جلتی ہے، کیونکہ وہ اس کی طرح عمر بھر جلتا رہتا ہے اور تنہائی میں لذتِ حیات گزار دیتا ہے۔ اسے کوئی خلوص سے ملنے والا اور سچا ہمدرد بن کر دکھ بانٹنے والا نہیں ملتا

اے دل! دنیا محبت سے ناواقف ہے۔ یہاں کوئی دوست نہیں مل سکتا۔ تو مجھ سے وہ شے طلب کرتا ہے جو اس پرانے اور بوڑھے آسمان کے نیچے زمین میں موجود نہیں۔

مراد یہ کہ دنیا میں مخلص اور بے غرض دوست ملنا غیر ممکن ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کا قلعہ ساری دنیا سے انوکھا تعمیر کیا ہے۔ اس کی بنیاد ویس کا اتفاق نہیں۔ یعنی اسلام جہان کے سب مذہبوں سے نرالا ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ قوم کی بنیاد وطنیت پر نہیں بلکہ توحید و رسالت کے عقیدے پر ہے۔ مسلم کا وطن سارا عالم ہے کیونکہ خدا اور رسولؐ کے نام لیوا مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کو دوسری قوموں کے اس اصول کے سے کوئی واسطہ نہیں کہ قوم وطن سے بنتی ہے۔

عموماً لوگوں کا خیال ہے کہ انسان عدم سے وجود میں آیا ہے اور اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے بعد پھر ملکِ عدم میں چل بسے گا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آنا محض اعتباری ہے۔ دنیا اور آخرت میں فرق و امتیاز کرنا ایک دھوکا ہے۔ ہر شے میں صرف ہماری جھلک نمایاں ہے۔ ہم مستقل طور پر کہیں بھی نہیں رہتے۔

اے اقبال! کوئی شخص جا کر "عرفان" کے ایڈیٹر کو میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ آج دنیا میں جو قومیں کوئی ٹھوس کام کر رہی ہیں اور اس کی بدولت ترقی کے آسمان پر جلوہ افروز ہیں، وہ شعر و شاعری میں وقت نہیں کھوتیں بلکہ ہر وقت تگ و دو اور جد و جہد سے کام لے کر عظمت و کمال کے میدان میں ایک دوسری سے گوئے سبقت لیجانے کی کوشش کرتی ہیں۔

۳

یہ غزل اپریل ۱۹۰۵ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی اور ولایت سے بھیجی گئی تھی۔ اس میں سے دو شعر نظرِ ثانی کے وقت حذف کر دیے تھے۔ جو درج ہیں:

اٹھا دیا ذوقِ تپش پتنگے سے شمع سے شوق اشکباری | کہیں سے سیکھی نماز میں نے لیا کہیں سے سبق وضو کا
جو چاک میرے جگر کے دیکھے کلی نے بادِ صبا سے پوچھا | یہ آدمی ہے کہ گل ہے منّت پذیر ہے سوزنِ رفو کا

سپاس: شکریہ۔ محزوں: غمگین۔

جب میرے دل سے گفتگو کی قیامت برپا ہو گی تو سارے زمانے کو خبر ہو جائے گی۔ حیرانی و پریشانی سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی اور وہ کانپ کانپ اٹھے گا۔ اب جو چپ ہوں تو میری اس چپ کو خاموشی نہ سمجھو۔ یہ تو گویا میرے حرفِ مطلب کی قبر ہے۔ جب میرا مدعائے دل الفاظ کا لباس پہن کر زبان پر آ جائے گا تو زمانے بھر میں انقلاب کی بجلیاں کوند جائیں گی اور جس طرح قیامت کے دن صورِ اسرافیلؑ کی آواز پر قبروں سے مُردے اٹھ کھڑے ہوں گے اسی طرح میرے آزادی بخش پیغام سے ایک محشر بپا ہو جائے گا۔ میری مردہ قوم زندہ ہو جائے گی اور اسے آزاد حکومت مل جانے پر ایک عالم دنگ رہ جائے گا۔

جب دریا کی لہر کہنے لگی کہ میری شان سفر سے قائم ہے تو موتی بول اٹھا کہ میرے لیے سیپی میں چھپا رہنا عزت کا سامان ہے۔ مطلب یہ کہ دنیا میں لوگوں کے رہنے سہنے کے طریقے مختلف ہیں، ایک کا نظامِ زندگی دوسرے کے لیے موزوں نہیں۔

جن لوگوں کی طبیعت ہی میں اصلاح قبول کرنے کا جوہر نہ ہو وہ تعلیم و تربیت کے اثر سے سیدھی راہ پر نہیں آ سکتے، جیسے ندی کے کنارے اُگے ہوئے سبزہ کا عکس پانی میں رہنے کے باوجود ہرا بھرا نہیں ہو سکتا۔ مراد یہ ہے کہ انسانی فطرت کسی بھی طریق یا تدبیر سے بدل نہیں سکتی۔

میں نے کوئی ایسا شخص نہ دیکھا جس کے دل میں آرزو نہ سوئی ہوئی ہو۔ اے خدا! یہ تیری بنائی ہوئی دنیا کیا ہے؟ آرزو کا نگار خانہ ہے، یعنی اس میں ہر طرف آرزو ہی کے رنگین نقش و نگار نظر آتے ہیں۔

جب ہم مر گئے تو یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ زندگی سراسر آرزوؤں اور تمناؤں کا گورکھ دھندا تھی۔ ہم جسے جسمِ خاکی سمجھتے تھے، وہ جسم نہ تھا بلکہ آرزو کے کوچے کا غبار تھا۔ مراد یہ ہے کہ ہماری زندگی سر سے پاؤں تک آرزوؤں ہی کا مرقع تھی۔

اگر کوئی شے چھپی ہوئی نہ تھی تو میں سر سے پاؤں تک تلاش کیوں بنا ہوا ہوں؟ میری نگاہوں کو دیکھنے کی آرزو ہے اور میرے دل کو جستجو کا جنون ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کا سراپا تلاش ہونا ہی اس امر کی دلیل ہے

کہ کچھ نہ کچھ چھپا ہوا ہے۔ اگر چھپا ہوا نہ ہو تو تلاش کیوں کی جائے؟ اس چھپی ہوئی چیز کو زندگی کا بھید بھی سمجھا جا سکتا ہے اور حسن مطلق بھی۔

کلی باغ میں پھول چننے والے سے کہہ رہی تھی کہ خدا جانے، انسان آتا ہے درد کیوں ہے؟ میرے مٹکے کا ٹوٹنا تیری نگاہوں میں مسکراہٹ ہے۔ کلی جب تک کھل نہ جائے اور بند رہے، اس کی صورت مٹکے سے مشابہ ہوتی ہے۔ کھلنا اس کے لیے مرجھانے یعنی مرجانے کا پیغام ہے۔ پھول چننے والا وہی پھول چنتا ہے جو کھلے ہوئے ہوں۔ گویا وہ کلی کا مٹکا ٹوٹ جانے کو اس کی مسکراہٹ یعنی اس کا کھلنا قرار دیتا ہے۔

باغ ہستی کے ہر ذرے سے محبت کا جلوہ نمایاں ہے تو اگر پھول کی حقیقت پر غور کرے تو معلوم ہوگا کہ رنگ اور بو نے آپس میں مل رہنے کا عہد باندھ رکھا ہے۔ پھول کی حقیقت رنگ اور بو کے سوا کیا ہے؟ جب تک دونوں ملے رہیں، پھول بنا رہے گا۔ دونوں الگ الگ ہو جائیں تو پھول کی ہستی ختم ہو جائے گی۔ اس میل جول اور وابستگی سے شاعر نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس دنیا کا ہر ذرہ محبت ہی کی چمک دکھا رہا ہے۔

میرے تمام مضمون پرانے ہیں اور میرا کلام اوّل سے آخر تک غلطیوں سے بھرا ہوا ہے۔ اگر کسی کو مجھ میں کوئی خوبی نظر آتی ہے تو سمجھنا چاہیے کہ یہ میرے نکتہ چین کی خامی ہے۔ خامی اس لیے کہا کہ نکتہ چین نے غلطی کو خوبی سمجھ لیا۔ اس شعر میں اقبال نے انتہائی کسر نفسی سے کام لیا ہے۔

اے خدا! تو نے مجھے ذرا سا دل دیا اور اس کی حالت یہ ہے کہ آرزو کا فریب کھائے ہوئے ہے۔ ادب کا تقاضا یہی ہے کہ میں شکر ادا کروں حقیقت حال کے اعتبار سے دیکھا جائے تو تیری یہ مہربانی ظلم سے بڑھ کر ہے۔

اس کائنات میں وحدت کا کمال اس درجہ عیاں ہے کہ اگر تو نشتر کی نوک سے پھول کی رگ کو چھیڑے تو مجھے یقین ہے کہ اس رگ سے انسان کے لہو کا قطرہ ٹپکے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کی اصل ایک ہے اگرچہ شکلیں مختلف ہیں۔ حقیقت پر نظر ہو تو پھول کی رگ میں بھی وہی شے زندگی کا سامان ہے جو انسان کے جسم میں لہو بن کر دوڑتی پھرتی ہے۔ اس شعر میں وحدت الوجود کا مضمون نہایت دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

پہلے زمانے کے لوگوں کی پیروی کرتے ہوئے مجاز کے رنگ میں باتیں کہنے کا وقت ختم ہو گیا۔ تقلید کا زمانہ اٹھ گیا۔ مجاز کو چاہیے کہ اپنا سروسامان اٹھا کر چلا جائے۔ جب حقیقت ظاہر ہو گئی تو پھر بات کہنے کی تاب کسے ہو سکتی ہے۔ اور لب کون کھول سکتا ہے؟

اے اقبال! میں اگر گھر سے دور ہوں تو میرے عزیزوں کو غمگین نہ ہونا چاہیے۔ میری مثال موتی کی ہے جو اپنے وطن یعنی صدف سے جدا ہو کر عزت و آبرو کی معراج پر پہنچتا ہے۔ مطلب یہ کہ موتی جب تک صدف میں رہتا ہے،

صدف سمندر کی تہ میں چھپی رہتی ہے۔ جب اسے سمندر سے نکالتے ہیں تو وہ حسینوں کے گلے کا زیور یا بادشاہوں کے تاج کی زینت بنتا ہے اور اس کی آبرو کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ یہی مثال میری ہے کہ میں اپنے وطن سے جدا ہو کر درجۂ کمال حاصل کر دوں گا۔

۴

تمہیدی نوٹ

یہ غزل دسمبر ۱۹۰۵ء کے "مخزن" میں چھپی تھی۔ منشی درگا سہائے سرور نے اگست ۱۹۰۵ء کے مخزن میں ایک نظم فضائے برشگال اور پروفیسر اقبال کے عنوان سے شایع کرائی تھی جس میں اقبال کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

تمانہ سنج ہوا و بلبلِ ریاضِ سخن　　کہاں ہے تو کہ چمن میں فضا کے دن آئے

ترے بغیر ہیں مرغانِ نغمہ زن خاموش

ترے بغیر ہے یاروں کی انجمن خاموش

اقبال نے اس کے جواب میں یہ غزل بھیجی، ساتھ ہی لکھا:

گو مصروفیت کا ابھی وہی عالم ہے، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ حضرت سرور جنھوں نے میری خاموشی کو توڑنا چاہا کہیں ناراض نہ ہو جائیں، اس لیے ان کی نظم کے شکریے میں سرِ دست یہ غزل بھیجتا ہوں۔ امید ہے عنقریب کچھ اور بھی بھیجوں گا۔ نظرِ ثانی میں اس غزل کے چار شعر قلم زد کر دیے تھے۔

استعارہ: جب کسی لفظ کو مجاز کے رنگ میں استعمال کیا جائے تو حقیقت اور مجاز میں کسی نہ کسی علاقے یا رابطے کا پایا جانا ضروری ہے۔ اگر وہ علاقہ تشبیہ کا ہو تو اسے استعارہ کہیں گے۔ مثلاً چاند سے محبوب مراد لینا یہاں مراد ہے چھپا کر بات کہنا یعنی اپنا مطلب ایسے رنگ میں پیش کرنا کہ سننے والا بخوبی سمجھ نہ سکے۔

اس غزل کے اکثر اشعار وحدت الوجود کے رنگ میں ہیں۔ فرماتے ہیں:

اے خدا! تیری چمک بجلی، آگ اور چنگاری میں نمایاں ہے اور تیری جھلک چاند، سورج اور تارے میں ظاہر ہے۔ آسمانوں کی بلندی میں بھی تو ہے، زمینوں میں پستی بھی تیری ہے۔ سمندر میں روانی اور ساحل میں افتادگی بھی تجھی سے ہے۔ مراد یہ ہے کہ تمام چیزوں میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے اور ہر شے سے اس کی حکمت نمودار ہے۔

اگر میں اپنے دل کی بات کہنے کا شائق ہوں تو شریعت کا قانون کیوں میرا گریبان پکڑے اور کیوں مجھے گرفت میں لائے؟ میں تو اپنا مطلب استعارے میں چھپا جاتا ہوں۔ یعنی بات ایسے طریقے پر کہتا ہوں کہ سننے والا اس پر اعتراض نہ کر سکے۔

جو حقیقت انسان کے وجود میں علم اور شعور کا لباس پہنتی ہے اور اسے بیدار و ہوش مند بناتی ہے، وہی حقیقت درخت، پھول، حیوان، پتھر اور ستارے میں گہری نیند سو رہی ہے۔ یعنی اگرچہ وہ زندہ ہیں ان کی اور انسان کی اصل ایک ہے، لیکن ان میں شعور زندہ نہیں اور انسان میں شعور زندہ ہے۔

مجھے محبت کے آنسو کی تپش نے جلا دیا۔ پانی کی اس چھوٹی سی چنگاری میں بلا کی آگ بھری ہوئی تھی۔ محبت کے آنسو کی تپش کے پیشِ نظر اسے پانی کی چنگاری قرار دینا حسنِ تشبیہ کا ایک نادر کارنامہ ہے۔

مجھے آخرت کا ثواب حاصل کرنے کی کوئی خواہش نہیں۔ میں وہ سوداگر ہوں جس کے نزدیک نفع گھاٹے ہی میں ہے۔ مطلب یہ کہ ذاتِ باری تعالیٰ سے میرا عشق بے غرض ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ اس کا نفع آخرت میں حاصل کروں۔

پارے کا تڑپتے رہنا ہی اس کی زندگی ہے۔ اے خدا! معلوم نہیں کس دل کی تڑپ اس میں چھپ کر بیٹھ گئی ہے؟ شاعر کے نزدیک تڑپ صرف دل سے مخصوص ہے۔ اس نے پارے کو تڑپتے ہوئے دیکھا تو سمجھا کہ اسے بھی کسی دل سے یہ نعمت مل گئی ہے۔

اے اقبال! میں لن ترانی کی صدا سن کر چپ ہو گیا۔ میں جدائی کا مارا ہوا ہوں۔ مجھ میں بار بار تجلی کے تقاضے کی تاب نہیں۔ مطلب یہ کہ ذاتِ باری تعالیٰ سے جدائی نے میرا یہ حال کر رکھا ہے کہ حضرت موسےٰؑ کی طلب کے جواب میں لن ترانی کی صدا سن کر چپ بیٹھ گیا ہوں اور تقاضا نہیں کر سکتا۔

۵

ماہِ سیما: چاند جیسی پیشانی ذالا یعنی حسین۔

اے دنیا کی محفل! یوں تو تیرے ہنگامے نہایت دل کش اور پُر لطف تھے لیکن ان تماشوں میں کچھ اداسی، غم اور ناامیدی بھی تھی۔ مراد یہ کہ اس جہان میں خوشی اور غم دونوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کوئی بھی انسان ایسا نہیں کہ اسے ہمیشہ عیش و راحت نصیب رہے۔ سکون، آرام اور نشاط کی مستی کے بعد رنج و پریشانی کے دکھ

بھرے خار کے صدمے بھی ضرور اٹھانے پڑتے ہیں۔

وہ خاک جو ایک عرصے تک عقل و دانش اور فلسفے کے بیابانوں میں بھٹکتی رہی، اُسے محبّت کے کوچے میں آرام مل گیا۔ یعنی حکمت اور فلسفے سے دل کو سکون و اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ نعمت صرف عشقِ الٰہی سے میسر آسکتی ہے۔

اے شراب! تجھے پردے کی رسم کتنی پسند آئی کہ پہلے تو انگور کے پردے میں چھپی ہوئی تھی۔ جب اس سے نکل کر باہر آئی تو صراحیوں میں پوشیدہ ہو گئی۔ مطلب یہ کہ محبت ایک ایسا راز ہے جو ہمیشہ پردے میں رہنا پسند کرتا ہے۔ پہلے ذاتِ الٰہی میں نہاں تھا۔ پھر سچّے عاشقوں کے دل میں آکر چھُپ گیا۔ حقیقت میں عشق وہی ہے جو کبھی عیاں نہ ہو اور رازِ سربستہ کی طرح دلِ عاشق میں مخفی رہے۔

دنیا کے تمام دانا اسی کوشش میں لگے رہے کہ علم کے بل پر حُسن کے اثر کو مغلوب کرلیں، لیکن یہ ہو نہ سکتا تھا۔ تھے تو واقعی دانا تاہم اس مقام پہ پہنچ کر چُوک گئے۔ علم حُسن کی تاثیر پر غالب نہ آسکتا تھا۔ اقبال یہ ظاہر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حُسن کے اثر اور کشش کا مقابلہ علم نہیں کر سکتا۔ اس شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ علم کے زور سے حُسنِ مطلق کے کمالات کو پالینا ممکن نہیں۔ دانا لوگ صرف علم کے ذریعے سے یہ کوشش کرتے رہے اور ان کی کوشش ناکام رہی۔

اے اقبال! ہندوستان کے حسینوں میں جو بات تھی، میں اُسے یورپ میں فضول ڈھونڈتا رہا۔ بہ ظاہر یہ مراد ہے کہ ہندوستانی حسینوں میں شرم و حیا، عفّت و پاکیزگی اور وفاداری کے جو جوہر ہوتے ہیں، وہ یورپ کے حسینوں میں نہیں مل سکتے۔

۶

مازنی: اٹلی کا مشہور محبِّ وطن قومی رہنما جوزف میزینی ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۷۲ء میں وفات پائی۔ عمر بھر قوم و ملک کی خدمت میں تکلیفیں اٹھاتا رہا۔ ترکِ وطن کی نوبت بھی آئی۔ ۱۸۷۰ء میں حکومتِ اٹلی نے اسے قید کر دیا۔ قید ہی میں اس کی موت واقع ہوئی۔ یہ غزل بہ ظاہر اس زمانے میں لکھی گئی، جب اقبال ولایت سے واپس آرہے تھے۔ مازنی والا شعر غالباً اٹلی کے میدانوں کو دیکھنے کا نتیجہ ہے۔ جہاز آبنائے سینا سے گزرتا ہے تو دائیں طرف سسلی اور بائیں طرف اٹلی کی سرزمینیں دُور دُور تک نظر آتی ہیں۔

ہم شراب کے جلوے کی طرح پیالے کا طواف کرتے ہیں صبح و شام یہی ہماری نماز ہے۔ مراد یہ ہے کہ

ہمارا کام عشق و محبت کی شراب پیتے رہنے کے سوا کچھ نہیں۔ یہی ہمارے نزدیک روز و شب کی عبادت ہے۔
اے کلیم! (اے حضرت موسیٰؑ) خدا سے کلام کرنا آپ ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ درخت اور پتھر بھی اسی ذات پاک سے ہم کلام رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے زبانِ حال سے خدا کی تسبیح میں لگی ہوئی ہے۔ یہ شرف صرف انسانوں ہی پر موقوف نہیں۔

اے شمع! اب ہمیں اپنے لیے کوئی نئی دنیا تلاش کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس دنیا میں تو ناتمام جلن کا ظلم سہنا پڑتا ہے
اس شعر میں شمع سے مراد موم بتی ہے۔ جسے عموماً پوری جلے بغیر بجھا دیا جاتا ہے۔ یہاں سے اقبال نے تپش ناتمام یعنی ادھوری جلن کی ترکیب نکالی اور اسے ظلم قرار دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں پورا جلنے کی بھی مہلت نہ ہو۔ وہاں جینے کا کیا مزہ ہے؟ تپشِ ناتمام سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ اس زندگی میں تمنائیں اور آرزوئیں پوری نہیں ہوتیں پھر ایسی دنیا میں کیا رہنا؟

اے گانے والے ساتھیو! اس باغ میں خاموش ہی رہنا بہتر ہے، اس لیے کہ یہاں اچھے نغمے سنانے والوں کو جال میں گرفتار کر لیتے ہیں یعنی پکڑ لیتے ہیں۔ یہ بظاہر ہندوستان کے ۱۹۰۸ء کے سیاسی حالات کا ایک عام نقشہ ہے کہ اونچے درجے کے لیڈروں میں سے بعض کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔

جو لوگ شراب اس غرض سے پیتے ہیں کہ سرور حاصل ہو، وہ حلال چیز کو حرام کر لیتے ہیں گویا شاعر کے نزدیک شراب صرف بے خودی کے لیے پینی چاہیئے، اس صورت میں یہ حلال ہے۔ اگر عیش و نشاط مقصود ہو تو پھر یہ حرام ہے۔ غالب نے بھی اس مضمون کا ایک شعر کہا ہے:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

اس شعر میں اقبال نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ اکثر چیزیں بجائے خود حرام یا حلال نہیں ہوتیں بلکہ اپنے صحیح یا غلط استعمال کی بنا پر حلال یا حرام بنتی ہیں۔ شراب سے شرابِ الٰہی مراد لی جائے تو شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص محض معرفت حاصل کرنا چاہے یا رات دن رضائے باری تعالیٰ کو پورا کرنے میں لگا رہے تو یہ شرابِ عشق کا صحیح استعمال ہوگا، لیکن اگر کوئی شخص اپنی بزرگی اور پیری کا سلسلہ جاری کرے تاکہ دنیا میں ناموری حاصل ہو تو شرابِ عشق حرام بن جائے گی۔

اے حضرت واعظ! آپ کی ہم سے کیوں کر نبھے گی؟ ہم محبت کے قاعدے کو عام کرنا چاہتے ہیں اور آپ اسے اپنے مذہب کے آدمیوں تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہم ساری دنیا کو محبت کا پیغام پہنچاتے ہیں سب

حُسنِ سلوک کے خواہاں ہیں۔ سب کو خدا کی چوکھٹ پر جُھکا دینا چاہتے ہیں لیکن واعظ صرف ان آدمیوں سے تعلق رکھنا چاہتا ہے جو اسے پسند ہوں یا اس کے معیار پُورے اتریں۔ پھر ہمارا اور واعظ کا نباہ کیونکر ہو سکتا ہے ؟

اے خدا! ان گدڑی پہننے والے پیروں میں کیا جادو ہوتا ہے کہ ایک ہی نظر سے جوانوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ اس شعر میں خدا کے نیک اور پاک بندوں کی نظر کا اثر واضح کیا گیا ہے۔

میں ان لوگوں کی محفلِ عیش و عشرت دیکھ کر کانپ اُٹھتا ہوں جو اپنا گھر پھونک کر دنیا میں نام پیدا کرتے ہیں یعنی جو لوگ اپنی خاندانی دولت، عزت اور شرافت کو تباہ کر کے عشرت کی محفلیں قائم کرتے ہیں اور اس طرح نامور بننا چاہتے ہیں، ان سے دُور ہی رہنا بہتر ہے۔

اے مازنی کے دیس یعنی اٹلی کے میدانو! تم ہرے بھرے رہو۔ تم اس جواں مرد قومی رہنما کے وطن ہو، جس کی زندگی ملک کی آزادی، اتحاد اور عشقِ جمہوریت میں بسر ہوئی، اس لیے تم عزت کے قابل ہو اور ہم تمھارے پاس سے گزرتے ہوئے جہاز ہی پر سے تمھیں سلام کرتے ہیں۔

اے اقبال! جب کبھی بے نمازوں کو نماز پڑھنے کا خیال آتا ہے تو مجھے بُت خانے سے بلا کر اپنا امام بنا لیتے ہیں۔

۷

تمہیدی نوٹ

یہ غزل جیسا کہ اقبال نے خود لکھا ہے۔ مارچ ۱۹۰۷ء میں کہی تھی، جب وہ ولایت میں تھے اور غالباً اسی مہینے کے "مخزن" میں چھپ گئی تھی۔ ان کی فکر و نظر میں جو انقلاب ولایت پہنچتے ہی شروع ہوا تھا۔ وہ کوئی ڈیڑھ برس میں آخری منزل پر پہنچا۔ یہ غزل جسے طوالت اور مضامین کی فی الجملہ ترتیب و یکسانی کے اعتبار سے نظم کہنا چاہیے۔ ذہنی انقلاب کی تکمیل کا پہلا مکمل اظہار ہے۔ اس کے اکثر اشعار سے صاف ٹپک رہا ہے کہ اقبال اب صرف شاعر نہ تھے، بلکہ ایک صاحبِ پیغام شاعر تھے۔ اگر ان کی تعلیمات کا ابتدائی نقشہ دیکھنا ہو جو بعد از اں دنیا بھر کے لیے خاص جذب و کشش کا مرجع بنیں تو وہ بھی غزل بالنظر ہے۔

زرِ کم عیار : کسوٹی پر پورا نہ اترنے والا سونا۔ کھوٹا سونا۔ پا بہ گل : جن کے پاؤں کیچڑ میں پھنسے ہوئے ہوں۔

چہرے سے پردہ اُٹھ جانے کا وقت آ گیا۔ اب سب لوگ محبوب کے دیدار سے فیض یاب ہو سکیں گے۔ جس بھید کو خاموشی نے پردے میں چھپا رکھا تھا، اب وہ دنیا کے سامنے ظاہر ہو جائے گا۔ مراد یہ ہے کہ ہم اب تک قومی مقاصد کے متعلق چھپ چھپا کر کام کرتے تھے۔ اب ان مقاصد کو سب کے سامنے کھول کر بیان کرنے کا وقت آ گیا اور جو کچھ ہمیں کرنا ہے، اس کے لیے عام تبلیغ شروع کر دینی چاہیے۔

اے ساقی! وہ زمانہ گزر گیا جب پینے والے چھپ چھپ کر پیتے تھے۔ اب ساری دنیا مے خانہ بن جائے گی اور ہر شخص شراب پینے لگے گا۔ اس شعر میں بھی پہلے شعر کا مضمون نئے انداز میں دہرایا گیا ہے۔

جو لوگ دیوانگی کے جوش میں بیابانوں کے اندر مارے مارے پھر رہے تھے، وہ دوبارہ بستیوں میں آ بسیں گے ان کے پاؤں پہلے کی طرح ننگے ہی رہیں گے، مگر ان کے لیے کانٹوں کا جنگل نیا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ قوم سے عشق و محبت کے جنون میں ایسے مقامات تلاش کیے جا رہے تھے، جہاں کسی کو اس عشق کا علم نہ ہو سکے اب وقت آ گیا ہے کہ اس عشق کے نعرے آبادیوں میں لگائے جائیں۔ دیوانگی کی حالت وہی رہے گی جو پہلے تھی لیکن راستے کی مشکلات نئی ہوں گی۔

جو کان انتظار میں لگے ہوئے تھے، انھیں حجاز کی خاموشی سے یہ پیغام مل گیا کہ بیابانیوں سے جو عہد باندھا گیا تھا اسے نئے سرے سے پختہ کیا جائے گا۔ یعنی اسلام کی عظمت و برتری کا ڈنکا پھر بجایا جائے گا اور مسلمان پھر اپنی عظمت کے لیے جدوجہد شروع کر دیں گے۔

جس شیر نے جنگل سے نکل کر رومیوں کی سلطنت کا تختہ اُلٹ دیا تھا، میں نے فرشتوں سے سنا ہے کہ وہی شیر پھر بیدار ہونے والا ہے۔ یہاں "شیر" سے مراد "ملّتِ اسلامیہ" ہے، جو ابتدائی دور میں عرب کے صحرا سے نکلی تو اس نے رومی سلطنت کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔

ساقی نے شراب فروشوں کی محفل میں میرا ذکر کیا تو مے خانے کا بزرگ بولا کہ یہ شخص بڑا منہ پھٹ ہے۔ سچّی بات بے باکی سے کہہ دیتا ہے، لہٰذا ذلیل ہو جائے گا۔ مطلب یہ کہ قومی خدمت گاروں یعنی لیڈروں کی مجلس میں میرا ذکر ہوا تو تجربہ کار لوگ بول اُٹھے کہ اقبال سچ بولنے میں ننگی تلوار ہے۔ اس لیے اس کی سچّی باتیں اپنے پرائے کسی کو بھی اچھی نہ لگیں گی۔

اے سرزمینِ مغرب کے رہنے والو! اے فرنگستانیو! خدا کی بستی دکان داری اور تجارت کے بل پر قائم نہیں۔ تم نے ساری دنیا میں تجارت کے سلسلے قائم کر لیے اور اس ذریعے سے ہر ملک پر قابض ہو گئے۔ تم نے ہر ملک سے دولت لوٹ لوٹ کر اپنے گھر بھر لیے لیکن خدا کے بندوں کی خدمت کا کوئی خیال نہ رکھا۔ تمھیں اس

تجارت اور صنعت و حرفت پر بڑا ناز ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ جس سکے کو تم کھرا سمجھ رہے ہو، وہ کھوٹا ثابت ہو جائے، اس لیے کہ خدا کی مخلوق کا نظام صرف تجارت اور بیوپار پر نہیں چل سکتا۔ یہ تہذیب جس پر تم فخر کر رہے ہو، تمھاری اپنی ہی تلوار سے اپنا خاتمہ کر لے گی۔ یاد رکھو کہ جو گھونسلا کمزور شاخ پر بنے گا، وہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔

ان دونوں شعروں میں خطاب فرنگستانیوں سے ہے۔ انھیں بتایا گیا ہے کہ کامیابی کا راز دکان داری کرنا اور دولت سمیٹنا نہیں، بلکہ خدا کے بندوں کی سچی خدمت ہے۔ یہ حقیقت ساری دنیا پر روشن ہو گئی کہ یورپ کی تہذیب نے اپنے ہی خنجر سے خودکشی کر لی۔ اس کے وسیع تجارتی سلسلے مختلف یورپی قوموں میں کھینچ تان اور کشمکش کا باعث بنے۔ ہر یورپی ملک ایک دوسرے کو پیچھے ہٹانے اور تجارتی منڈیوں پر قابض ہو جانے کے لیے سر توڑ کوششیں کرنے لگا۔ انھوں نے خوفناک جنگی آلات ایجاد کیے۔ باہم لڑائیاں چھیڑیں۔ وہی جنگی آلات یورپ اور اس کی تہذیب کو تباہی کے غار میں گرانے کے موجب بن گئے۔ اقبال نے ۱۹۰۷ء میں جو پیش گوئی کی تھی، وہ پہلی اور دوسری جنگ میں حرف بحرف پوری ہوئی۔

کمزور چیونٹیوں کا قافلہ پھول کی پتی کو کشتی بنا لے گا۔ لہروں کی ہزار کھینچ تان ہو، مگر یہ کشتی نہ ڈوبے گی اور قافلہ دریا پار اتر جائے گا۔ "مورِ ناتواں" سے اشارہ مسلمان قوم کی طرف ہے، جس کے پاس نہ بڑے بڑے جہاز تھے، نہ جنگی سامان۔ اقبال کہتے ہیں کہ وہ قوم اپنے مذہب کی سچی تعلیمات کے سہارے کامیاب ہو گی، اگرچہ اس کا سامان کتنا ہی معمولی ہو۔

لالے کا پھول باغ میں اپنے جگر کا داغ ایک ایک کلی کو دکھاتا پھرتا ہے۔ غالباً اسے یہ خیال ہے کہ اس دکھاوے سے وہ دل جلوں میں شمار ہونے لگے گا۔ بظاہر اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے دل میں قوم کی سچی محبت نہیں، انھیں محبت کی نمائش کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

خدا ایک تھا، کائنات کی اصل ایک تھی، لیکن اے نگاہ! تو نے اسے ہزاروں شکلوں میں بانٹ دیا۔ تیرا یہی حال ہے تو بتا کہ تجھ پر کیا اعتبار کیا جائے؟

میں نے ایک دن قمری سے کہا کہ یہاں جنھیں آزاد سمجھا جاتا ہے، وہ تو کیچڑ میں دھنسے ہوئے ہیں، انھیں آزاد کون مان سکتا ہے؟ یہ بات کلیوں نے سن لی تو کہنے لگیں، یہ شخص ہمارے باغ کا رازدار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حکومت نے آزادی کے نام پر جو کچھ ہمیں دے رکھا ہے، وہ تو آزادی نہیں بلکہ سراسر پابندی ہے۔

جو لوگ عشق الٰہی کے دعویدار ہیں اور جنگلوں میں مارے مارے پھرتے ہیں، میں انھیں سچے عاشق نہیں مان سکتا

اور ان کی نیاز مندی قبول نہیں کر سکتا۔ میں تو اس کا نیاز مند بنوں گا، جسے خدا کے بندوں سے پیار اور ہمدردی ہو گی۔ مراد یہ ہے کہ وہ عشقِ الٰہی کس کام کا جس میں انسان بستیوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں جا بیٹھے؟ عشقِ الٰہی تو یہ ہے کہ قوم کی ہمدردی اور خدا کے بندوں کی خیر خواہی میں ایک ایک لمحہ بسر کیا جائے۔

فنا کی مجلس کا قاعدہ یہی ہے کہ تمام تکلیفیں صبر و شکر سے برداشت کی جائیں اور آنکھ جھپکنے کو بھی گناہ سمجھا جائے اگر تو تکلیفوں اور مصیبتوں سے گھبرائے گا۔ اور بے چین ہو گا تو ہماری عزت کیا رہے گی؟ یعنی قوم کی خدمت میں تکلیفیں اٹھاتے اٹھاتے مر مٹنا اور اف نہ کرنا ہی عزت و آبرو کا اصلی سامان ہے۔

میں رات کے اندھیرے میں اپنے بچھڑے ہوئے قافلے کو لے کر نکلوں گا، میری آہ سے چنگاریاں جھڑیں گی میرے سانس سے شعلے برسیں گے۔

اگر تیری زندگی کا مقصود نمود و نمایش کے سوا کچھ نہیں تو پھر سمجھ لینا چاہیے کہ تو بھی چنگاری کی طرح ایک آن میں مٹ جائے گا۔ یعنی اگر تیری زندگی کا مقصد صرف زندہ رہنا ہے تو جان لے کہ تیری ہستی بے حقیقت ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ اپنی زندگی دین و دنیا کے بلند مقاصد کے حصول کی نذر کرے۔ یہی اصلی اور پائدار زندگی ہے۔

اقبال کا ٹھکانا کچھ نہ پوچھو۔ اس کا حال وہی ہے جو پہلے تھا۔ وہ کسی راستے پر بیٹھا ہوا محبوب کے انتظار کی سختیاں جھیل رہا ہو گا۔

حصّہ سوم
۱۹۰۸ء سے.....

بلادِ اسلامیہ

تمہیدی نوٹ

یہ نظم اپریل ۱۹۰۸ء کے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی۔ نظرِ ثانی میں اس کے متعدد اشعار قلم زد کر دیے گئے۔ اکتیس اشعار میں سے صرف بائیس باقی رکھے۔ اس میں اقبال نے دنیائے اسلام کے پانچ شہروں کا ذکر کیا ہے۔ دہلی، بغداد، قرطبہ، قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) اور مدینۂ منورہ۔ مدینۂ منورہ کی مقدس حیثیت کسی شرح کی محتاج نہیں۔ باقی چار دوں شہر اسلام کی نہایت عظیم الشان سلطنتوں کے مرکز اور تخت گاہ رہے اور آج بھی اسلامی جاہ و جلال کے جیسے آثار ان میں ملتے ہیں، شاید ہی کسی دوسری جگہ مل سکیں۔

پہلا بند

خیر الاُمم: اُمّتوں میں سب سے بہتر یعنی بہترین اُمّت۔

دلّی کی سرزمین غمگین اور دُکھی دل کی سجدہ گاہ ہے۔ اس لیے کہ اس کے ایک ایک ذرّے میں ہمارے بزرگوں کا لہو سویا ہوا ہے یعنی اسے فتح کرنے اور دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ہمارے بزرگوں نے اتنا خون بہایا ہے کہ کہا جا سکتا ہے، ہر ذرّہ اس خون سے رنگین ہے۔ اب وہ خون جذب ہو چکا ہے، لہٰذا کہا کہ ذرّے ذرّے میں وہ خون سویا ہے۔

اس اجڑے ہوئے باغ کی زمین کیوں کر ہماری نظروں میں پاک اور مقدس نہ ہو؟ اسلام کی عظمت و برتری کی تو یہ خانقاہ ہے۔ "خانقاہ" یہاں بہ ظاہر "مزار" اور "مدفن" کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔

اس شہر کی مٹی میں دنیا کی بہترین امّت (اُمّتِ اسلامیہ) کے تاج دار سو رہے ہیں یعنی دفن ہیں، جن کی حکومت پر دنیا کے انتظام کا انحصار تھا۔

دہلی میں مسلمانوں کے بڑے بڑے بادشاہ دفن ہیں۔ مثلاً شمس الدین التمش، علاؤ الدین خلجی، محمّد تغلق، فیروز تغلق، سکندر لودھی اور ہمایوں وغیرہ۔

اس شہر کے دیرینہ رونق اور شان و شوکت کی یاد اب تک دل کو تڑپا رہی ہے۔ جو کچھ ہم نے حاصل کیا تھا، وہ تو باقی نہ رہا اور جل کر راکھ ہو چکا، مگر اس کی یاد اب تک باقی ہے۔

دوسرا بند

کرامت: بزرگی۔ اِرم: شدّاد کی بنائی ہوئی بہشت۔ اُردو میں اس سے عموماً بہشت مراد ہوتی ہے "ہم دوشِ اِرم" کے معنی ہیں بہشت کی ہم پلہ۔ چمن ساماں: لفظی معنی ہیں باغ کا ساز و سامان رکھنے والا۔ یعنی باغ کے برابر۔

اگرچہ دلّی مسلمانوں کی خاص زیارت گاہ ہے لیکن اس شرف کا حق دار بغداد بھی ہے۔ بغداد وہ باغ تھا جس کے لیے صحرا کا لالہ فخر و ناز کا سامان بنا رہا۔ اسی کو حجازی یا عربی اسلامی تہذیب کہتے ہیں۔ اس شہر کی مٹی کیوں بہشت کی ہم پلہ نہ ہو، وہاں حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں کے قدم پڑتے رہے ہیں اور جس مقام پر چار پانچ سو سال تک خلفاء حکمران رہے ہوں، اس کی عظمت و بزرگی میں کیسے کلام ہو سکتا ہے؟ یہ وہ باغ تھا جس کی ایک ایک کلی چمن کی برابری کا دم بھر رہی تھی۔ جن تاج داروں کا نام سُن کر روما پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا، وہ اسی خاک میں دفن ہیں۔

جانشینانِ پیمبر: یہاں اشارہ عباسی خلیفوں کی طرف ہے جو محض خلیفہ نہ تھے، بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کا شرف بھی انھیں حاصل تھا۔ اس بند کے آخری مصرع میں روما سے مراد غالباً مشرقی رومی سلطنت کا مرکز ہے۔ عباسیوں کے زمانے میں مشرقی رومی سلطنت کی حکمران ایک ملکہ بن گئی تھی جو باقاعدہ خراج ادا کرتی تھی۔ پھر اس ملکہ کی جگہ نیسفورس نامی حکمران بنا۔ عرب اسے نقفور کہتے تھے۔ اس نے خلیفہ ہارون الرشید کو لکھا کہ تم ملکہ کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر خراج وصول کرتے رہے۔ عافیت چاہتے ہو تو پوری وصول کی ہوئی رقم ادا کرو۔ یہ خط پڑھ کر ہارون آگ بگولا ہو گیا۔ جواب میں لکھا:

"امیرالمومنین ہارون الرشید کی طرف سے سگِ رومی کے نام ۔ میں نے تجھ کافر بچّے کا خط پڑھا اس کا جواب تو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔"

یہ خط بھیجتے ہی فوجوں کو کوچ کا حکم دے دیا اور اس زور سے حملہ کیا کہ نسی فور نے گڑگڑا کر صلح کی درخواست کی اور خراج کی ایک ایک کوڑی ادا کر دی ۔ اس حملے میں چالیس ہزار رومی مارے گئے ۔ ایسے واقعات کئی مرتبہ پیش آئے ۔ یقیناً رومی قیصر عباسی خلیفوں کا نام سُن کر کانپ اٹھتے تھے ۔

تلمیسِ ابند

قرطبہ : جسے انگریزی میں کارڈووا کہتے ہیں ۔ اندلس (ہسپانیہ) کا مشہور شہر ہے ۔ مسلمانوں نے اندلس پہنچتے ہی اسے دارالحکومت بنا لیا تھا ۔ جب اندلس میں عبدالرحمٰن اموی نے مستقل سلطنت قائم کی تو قرطبہ کا عہدِ ترقی شروع ہوا ۔ اپنے دورِ عروج میں اس کی آبادی دریائے کبیر کے دونوں جانب چوبیس میل کی لمبائی میں پھیل گئی تھی اور ایک یورپی مؤرخ کے بیان کے مطابق دسویں صدی عیسوی میں صفائی عمارتوں کے حسن و خوبی ، درس گاہوں کی بہتات اور دوسرے محاسن کے لحاظ سے یہ یورپ کا بہترین شہر تھا ۔ دسویں صدی عیسوی کے لندن ، پیرس اور روما تینوں مل کر بھی قرطبہ کی ہمسری کا دعوےٰ نہ کر سکتے تھے ۔ اس کے پرانے آثار میں سے اب صرف مسجدِ جامع باقی ہے ۔ جسے عیسائیوں نے گرجا بنا لیا تھا ۔ علم و فضل کا یہ بہت بڑا مرکز تھا ۔ اس کی یونیورسٹیوں میں مشہور فرنگی علماء نے تعلیم پائی تھی ۔ قرطبہ ہی کے ذریعے سے مشرقی علوم کی روشنی یورپ پہنچی اور وہاں سے جہالت کا اندھیرا دور ہوا ۔

فروزاں : روشن ۔ تاک : انگور کی بیل ۔

قرطبہ کی سرزمین بھی مسلمان کی آنکھ کا نور ہے ۔ یہ سرزمین یورپ کے اندھیرے میں شمعِ طور کی طرح روشن تھی اور اسی کے ذریعے سے علم یورپ میں پھیلتا رہا ۔ یہ شمع گل ہوئی تو ساتھ ہی ملّتِ اسلامیہ کی محفل بھی درہم برہم ہو گئی اور اس کی عظمت بھی باقی نہ رہی ۔ لیکن یہ بجھتے بجھتے بھی موجودہ تہذیب کا چراغ روشن کر گئی ۔ مطلب یہ ہے کہ یورپ نے علوم و فنون کی روشنی قرطبہ ہی سے حاصل کی اور انھیں علوم و فنون سے وہ تہذیب پیدا ہوئی جسے دورِ حاضر کی تہذیب کہا جاتا ہے ۔ یعنی تہذیبِ فرنگ ۔

قرطبہ کی سرزمین امن اسلامی تہذیب کی قبر ہے جس سے یورپ جیسے باغ میں انگور کی بیل کو تازگی نصیب ہوئی ۔ یعنی جس سے یورپ نے تہذیب کا سروسامان حاصل کیا ۔

چوتھا بند

قسطنطنیہ: اس شہر کا ابتدائی نام بازنطیم تھا۔ جب قیصر کانسٹنٹائن (قسطنطین اعظم) کو نئے دارالحکومت کی تلاش ہوئی تو اس نے بازنطیم کو پسند کیا۔ اس کا نام اپنے نام پر کانسٹنٹی نوپل (لفظی معنی شہر قسطنطین مشہور قسطنطنیہ) رکھا اور رومہ کے بجائے زیادہ تر اسی جگہ رہنے لگا۔ پھر رومی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی ایک کا مرکز رومہ اور دوسری کا قسطنطنیہ قرار پایا۔ ایک کو مغربی اور دوسری کو مشرقی رومی سلطنت کہتے تھے۔ مسلمانوں نے قسطنطنیہ پر کئی مرتبہ حملے کیے۔ سلطان محمد فاتح عثمانی نے ۱۴۵۳ء میں اسے فتح کیا اور استنبول نام رکھا لیکن قسطنطنیہ کے نام کے سامنے نئے نام کو فروغ حاصل نہ ہوا۔ تقریباً پانسو سال یہ شہر عثمانی سلطنت کا دارالحکومت رہا۔ خلافت کا مرکز ہونے کے باعث مسلمانوں میں اسے خاص عظمت اور تقدیس حاصل ہو گئی تھی۔ جمہوریہ ترکیہ نے اسے چھوڑ کر انقرہ کو دارالحکومت بنایا۔

مہدیٔ اُمّت: مہدی کے معنی ہیں ہدایت کرنے والا۔ اقبالؔ نے جب یہ نظم شایع کرائی تھی تو خود اس پر نوٹ لکھا تھا کہ اس سے مراد محمد دوم فاتح قسطنطنیہ ہے۔ جناب سرورِ کائنات کی ایک پیش گوئی کے مطابق اس عظیم الشان شہنشاہ کو مہدی کہنا چاہیے۔ "مخزن" بابت اپریل ۱۹۰۹ء صفحہ ۵

سطوت: شان و شکوہ۔ دبدبہ۔ **شہ لولاک:** حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ لولاک سے اشارہ لولاک لما خلقت الافلاک کی طرف ہے، یعنی اے محمدؐ اگر آپ نہ ہوتے تو میں آسمان پیدا نہ کرتا۔ اسے حدیث سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ مستند نہیں۔ تاہم شہ لولاک۔ سیدِ لولاک۔ سرورِ لولاک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور لقب ہیں۔

ابوّب انصاریؓ: خالد نام، ابوایوب کنیت، قبیلہ خزرج سے تھے۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبا سے مدینہ پہنچے تو حضورؐ کی میزبانی کا شرف انھیں کو حاصل ہوا اور حضورؐ تقریباً چھ مہینے انھیں کے مکان میں قیام فرما رہے۔ حضورؐ فتح قسطنطنیہ کی بشارت دے گئے تھے، اس لیے جب امیر معاویہؓ کے عہد میں قسطنطنیہ پر حملے کے لیے فوج تیار ہوئی تو بعض دوسرے بڑے بڑے صحابہؓ کے ساتھ حضرت ابوایوبؓ بھی شریک ہو گئے۔ سوء اتفاق سے اسلامی لشکر میں وبا پھیل گئی۔ حضرت ابوایوبؓ بھی بیمار ہو گئے۔ یزید بن امیر معاویہؓ جو لشکر کا سپہ سالار تھا مزاج پرسی کے لیے خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ کوئی وصیت کرنی ہو تو فرمائیے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے فرمایا کہ تم دشمن کی سرزمین میں جہاں تک جا سکو میری

میت وہیں لے جا کر دفن کرنا۔ وفات کے بعد اس وصیت کی تعمیل کی گئی۔ حضرت کورات کے وقت قسطنطنیہ کی فصیل کے پاس دفن کیا گیا اور مزار کی زمین اس خیال سے برابر کر دی گئی کہ دشمن بے ادبی نہ کر سکے، لیکن یزید نے اعلان بھی کر دیا کہ اگر اس مقدس میت کا احترام نہ کیا گیا تو اسلام کی وسیع سلطنت کے اندر کسی مسیحی گرجے میں گھنٹہ نہ بجنے پائے گا۔

قسطنطنیہ کی فتح کے بعد ایک بزرگ کی نشان دہی پر سلطان محمدؒ فاتح نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مزار بنوایا جو اب تک زیارت گاہِ عام ہے۔

قسطنطنیہ کی سرزمین یعنی قیصروں کی بادشاہی کا مرکز سلطان محمدؒ فاتح کی شان و شکوہ اور دبدبے کا قائم رہنے والا نشان ہے۔ یہ سرزمین بھی خاکِ کعبہ کی طرح پاک ہے۔ یہ ان فرماں رواؤں کا آستانہ ہے جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مسند سنبھالے رہے یعنی جنھیں مسلمانوں میں خلافت کا منصب حاصل ہوا۔ اس شہر کی ہوا پھول کی خوشبو کی طرح پاکیزہ ہے۔ اور حضرت ابوایوبؓ انصاری کے مزار سے صدا آ رہی ہے۔ مسلمانو! یہ شہر اسلامی ملت کا دل ہے اور صدیوں کے کشتۂ[1] و خون کے بعد ہاتھ آیا ہے۔

پانچواں بند

حجِ اکبر: حج دو ہیں۔ ایک حجِ اصغر، دوسرا حجِ اکبر۔ حجِ اصغر کو عام اسلامی اصطلاح میں عُمرہ کہتے ہیں جو ہر وقت ادا ہو سکتا ہے۔ اور حجِ اکبر وہ ہے جو حج کے دنوں میں شریعت کی ہدایت کے مطابق ادا کیا جاتا ہے۔ **ولادت گاہ:** پیدائش کی جگہ۔ **ماویٰ:** پناہ کی جگہ۔ **نقطۂ جاذب:** کھینچنے والا نقطہ جس کی طرف ہر شے کھچی آئے۔

اب مدینہ سے خطاب ہے۔ کہتے ہیں: اے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی آرام گاہ! اے مدینۂ منورہ! تو وہ پاک سرزمین ہے کہ کعبہ تیرے دیکھنے کو حج سے بھی بڑھ کر جانتا ہے۔ تو اس کائنات کی انگشتری میں نگینے کی طرح چمک رہا ہے۔ تیری ہی زمین میں ہماری عظمت پیدا ہوئی تھی۔ یعنی اسلام کی نعمت تیری ہی سرزمین میں پوری ہوئی تھی، جس کی بدولت مسلمانوں کو اس دنیا میں برتری کی معراج ملی۔ اس بزرگ شہنشاہ (حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی یہیں آرام ملا، وہ شہنشاہؐ جس کے دامن میں دنیا کی قوموں نے پناہ لی۔ اس پاک ذاتؐ کے نام لیوا دنیا کے شہنشاہ بن گئے۔ وہ قیصر کے جانشین بنے اور انھیں جمشید کا تخت ملا۔

---

[1] بانگِ درا میں کاتب کی غلطی سے صدیوں کے کشت و خون کی جگہ صدیوں کی کشت و خون چھپ گیا۔

اگر اسلامی قومیت کے لیے کسی مقام کا پابند ہونا جائز ہوتا تو اس کی بنیاد نہ ہندوستان بن سکتا ہے، نہ ایران اور نہ شام۔ اے مدینۂ منورہ! صرف تو وہ مقام ہے جو اسلامی قومیت کی بنیاد بن سکتا ہے۔ تو مسلمان کا دیس ہے تو اس کی پناہ گاہ ہے تو ہی وہ نقطہ ہے جسے احساسات کی شعاعوں کا نقطۂ جاذب قرار دیا جا سکتا ہے یعنی جو تمام احساسات کا مرکز ہے۔

آخری دو شعروں میں اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسلامی قومیت کسی مقام کی پابند نہیں ہو سکتی۔ اسے کسی ملک میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عالم گیر اور آفاقی ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسا مقام تلاش کیا جائے جسے اس کا مرکز بنایا جا سکے تو وہ مدینہ کے سوا کوئی نہیں جو مسلمانوں کی تمام محبتوں کا مرکز ہے۔

اے مدینہ! جب تک تو دنیا میں ہے، ہم بھی باقی ہیں۔ تیری اور ہماری مثال صبح اور شبنم کی ہے۔ صبح جب طلوع ہوگی، اس کے ساتھ شبنم کے موتیوں کا ہونا لازم ہے۔

ستارہ

یہ نظم جولائی ۱۹۰۵ء کے "مخزن" میں چھپی تھی۔

پہلا بند

مآل: انجام۔ ہراس: خوف۔

رات کے وقت غور سے دیکھا جائے تو ستارے کانپتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اقبال یہ سماں دیکھ کر ستارے سے پوچھتے ہیں: کیا تجھے چاند کا خوف ہے یا صبح کے طلوع ہونے کا خطرہ ہے یا تجھے معلوم ہو چکا ہے کہ حسن کا انجام زوال ہے؟ یا تجھے نور کا سرمایہ لٹ جانے کا ڈر ہے؟ یا چنگاری کی طرح تجھے فنا ہو جانے کی دہشت پریشان کر رہی ہے؟ آسمان نے تیرا گھر زمین سے بہت دور بنایا ہے اور چاند کی طرح تجھے سنہرا لباس پہنا دیا ہے۔ اس کے باوجود تیری ننھی جان پر خوف طاری ہے اور تو ساری رات کانپتے ہوئے گزار دیتا ہے۔

دوسرا بند

محال: ناممکن۔

اے چمکنے والے مسافر! یہ دنیا بڑی ہی عجیب ہے۔ یہاں ایک کو بلندی نصیب ہوتی ہے تو دوسرے کو پستی سے سابقہ پڑتا ہے۔ سورج کی ایک پیدائش لاکھوں ستاروں کے لیے موت کا پیغام ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فنا کی نیند شرابِ زندگی کی مستی ہے یعنی جسے ہم فنا سمجھتے ہیں، وہ زندگی کا جوش اور کمال ہے۔ کلی کی رخصت میں پھول کی پیدائش کا بھید چھپا ہوا ہے۔ یعنی کلی چٹک کر اپنی ہستی ختم کر دیتی ہے تو پھول پیدا ہوتا ہے۔ سوال یہ کہ عدم کو عدم سمجھیں یا ہستی کا آئینہ دار کہیں؟ یہ اس لیے فرمایا کہ ایک چیز مٹتی ہے تو اس سے بہتر چیز سامنے آجاتی ہے۔ ستارے مٹے تو سورج روشن ہوا، کلی گم ہوئی تو پھول سامنے آگیا۔

یہ اصل میں انگلستان کے مشہور فلسفی ہربرٹ سپنسر کا کلیہ ہے کہ کوئی شے "لا شے" سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اشیا صرف اپنا قالب اور ہئیت بدلتی رہتی ہیں۔ اقبال اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ اشیاء صرف قالب نہیں بدلتیں بلکہ بہتر شے کی تخلیق کے لیے تغیر کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ آگے چل کر والدۂ مرحومہ کے مرثیے میں بھی انھوں نے فرمایا:

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو ۔۔۔ خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

قدرت کے کارخانے میں ٹھہراؤ ممکن نہیں یعنی کوئی چیز ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ زمانے میں کسی چیز کو بقا ہے تو صرف "تغیر" کو ہے یعنی ہر چیز بدلتی جاتی ہے۔ صرف تغیر باقی ہے۔

آخری مصرع کے مضمون کو مشہور انگریز شاعر شیلے نے یوں باندھا ہے:

Naught may endure but mutability یعنی تغیر کے سوا کسی چیز کے لیے بقا نہیں۔

دو ستارے

یہ نظم اگست ۱۹۰۹ء کے "مخزن" میں چھپی

پہلا بند

قِران: دو ستاروں کا ایک بُرج میں جمع ہونا

دو ستارے ایک بُرج میں جمع ہوئے تو ایک دوسرے سے کہنے لگا کہ ہمارا یہ ملاپ ہمیشہ قائم رہے تو

کیا ہی اچھا ہو۔ کاش یہ ہر وقت کی گردش انجام کو پہنچے۔ اگر آسمان ہم پر تھوڑی سی مہربانی کرے اور چکر سے نجات دے دے تو ہم دونوں مل کر چمکنے لگیں۔

دوسرا بند

مقدر: تقدیر میں لکھی ہوئی۔

لیکن ملاپ کی یہ آرزو سراسر جدائی کا پیغام بن گئی یعنی اُدھر تاروں نے ہمیشہ ملے رہنے کی تمنا کی، اِدھر بُرج میں اُن کی یک جائی ختم ہو گئی۔

سچ ہے، اگر دش تاروں کی قسمت میں لکھی ہے۔ ہر ایک کا راستہ پہلے سے مقرر ہو چکا ہے۔ آشنائی کا قائم اور باقی رہنا ایک ایسا خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں۔ جدائی ہی اس دنیا کا دستور ہے۔

گورستانِ شاہی

تمہیدی نوٹ

یہ نظم اور اس کے ساتھ ایک قصیدہ جون ۱۹۱۰ء کے "مخزن" میں شایع ہوئے تھے۔ مدیرِ "مخزن" نے انھیں شایع کرتے وقت ایک نوٹ میں لکھا تھا کہ مارچ ۱۹۱۰ء میں اقبال حیدر آباد گئے۔ اربابِ فضل و کمال کی صحبتوں نے انھیں گدگدایا اور یہ دو نظمیں اس سفر کی یادگار ہیں۔ گورستانِ شاہی ایسی لاجواب نظم ہے جو فی الحقیقت اقبال کے دیرینہ سکوت کی تلافی کرتی ہے۔ (مخزن بابت جون ۱۹۱۰ء صفحہ ۲۰)

خود اقبال نے گورستانِ شاہی پر جو نوٹ لکھا، وہ ذیل میں درج ہے:

حیدر آباد دکن کے مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت فرما جناب مسٹر نذر علی حیدری صاحب بی اے معتمد محکمۂ فنانس (بعد ازاں نواب حیدر یار جنگ بہادر) جن کی قابل قدر خدمات اور وسیع تجربے سے دولتِ آصفیہ مستفید ہو رہی ہے۔ مجھے ایک شب ان شاندار مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کے لیے لے گئے جن میں سلاطینِ قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور

بادلوں میں سے چھن کے آتی ہوئی چاندنی نے اس پُر حسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ذیل کی نظم انھیں بے شمار تاثرات کا ایک اظہار ہے۔ اسے میں اپنے سفر کی یادگار میں مسٹر حیدری اور ان کی لائق بیگم صاحب مسز حیدری کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں جنھوں نے میری مہماں نوازی اور میرے قیام حیدرآباد کو دلچسپ ترین بنانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔

یہ مقبرے حیدرآباد شہر سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر قلعہ گولکنڈہ کے پاس ہیں۔ قطب شاہیہ سلطنت کا دارالحکومت گول کنڈہ ہی تھا۔ حیدرآباد اس سلطنت کے آخری دور میں آباد ہوا۔ عالمگیر اعظم نے گول کنڈہ اور سلطنت قطب شاہیہ کو ۱۶۸۷ء میں فتح کیا۔

پہلا بند

اس میں مقبروں کی زیارت کے وقت کا عام منظر پیش کیا گیا ہے۔

مکدّر: کدورت والا یعنی میلا دھندلا۔ اشجار: شجر کی جمع۔ درخت

آسمان نے بادل کی پرانی گدڑی پہن رکھی ہے یعنی فضا میں بادل چھائے ہوئے ہیں۔ چاند کی پیشانی کا آئینہ کسی قدر دھندلا سا ہو گیا ہے۔ شاعر نے بادل کو آئینہ قرار دیا۔ چونکہ اس میں سے چاند صاف نظر نہ آتا تھا اس لیے کہا کہ یہ آئینہ قدرے میلا ہو گیا ہے۔

خاموشی کے اس نظارے میں چاندنی پھیکی سی نظر آتی ہے۔ اسے چاندنی رات نہ سمجھنا چاہیے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ صبح صادق رات کی گود میں سو رہی ہے۔

اس تشبیہ میں کمال یہ کیا ہے کہ پھیکی چاندنی کو صبح صادق قرار دیا۔ دونوں کی مشابہت کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ چونکہ رات کا وقت تھا، اس لیے کہا کہ صبح صادق رات کی گود میں ہے۔ یعنی روشنی تو ہے، پھٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، لیکن رات کی گود میں ہونے کے باعث اس پر قدرے سیاہی چھائی ہوئی ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ پَو پھٹنے کے وقت پرندوں کے چہچہے شروع ہو جاتے ہیں۔ اذان کی آوازیں فضا میں گونجنے لگتی ہے، لیکن یہ چیزیں شاعر کے پیش نظر منظر میں موجود نہ تھیں۔ اس لیے کہا کہ صبح صادق سو رہی ہے۔

درختوں کی خاموشی دیکھ کر حسرت میں کس قدر اضافہ ہوتا ہے! یہ کہنا مناسب ہوگا کہ خاموشی

کے ساز کا دھیما سا نغمہ ہے جو مدھم سروں میں گایا جا رہا ہے۔ شاعر کے نزدیک ہر حالت قدرت کے ساز کا ایک نغمہ ہے۔ وہ خاموشی کو بھی نغمہ ہی قرار دیتا ہے لیکن دھیما نغمہ۔

اس دنیا کے ہر ذرّے کا دل درد سے اس درجہ لبریز ہے کہ کہا جا سکتا ہے، وہ ہمہ تن درد ہے اور خاموشی زندگی کے لب پر ایک سرد آہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی جب دنیا کی ہر شے درد ہی درد ہے تو اس کی آہ بھی ہونی چاہیے۔ یہ کام خاموشی پورا کرتی ہے۔

دوسرا بند

جولان گاہ: تگ و دَو کا مقام۔ **حصار**: قلعہ۔ یہاں مراد ہے قلعہ گولکنڈہ جیسا کہ خود اقبال نے نظم شائع کراتے وقت اس کے حاشیے پر لکھا تھا۔ **سُکّان**: ساکن کی جمع۔ رہنے والے۔

وہ سامنے گولکنڈہ کا قلعہ ہے۔ جسے فتح کرنے کے لیے عالمگیر اعظم تگ و دَو میں لگا رہا اور قلعے کے آس پاس کا میدان اس کی جولان گاہ بنا۔ اس قلعے نے اپنے کندھے پر سینکڑوں صدیوں کا بوجھ اٹھا رکھا ہے، یعنی اسے بنے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں۔ یہ کسی زمانے میں زندگی کی چہل پہل اور رونق سے بھرا ہوا تھا۔ اب سنسان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ خاموشی اس کے پرانے ہنگاموں کا قبرستان بن گئی ہے۔ یعنی قلعے نے ہنگاموں کے جتنے منظر دیکھے، ان پر موجودہ خاموشی نے پردہ ڈال رکھا ہے۔ یہ قلعہ اب تک اپنے پرانے مکینوں کا شیدائی ہے اور پہاڑی کے سر پر ایک پہرے دار کی طرح کھڑا ہے۔

قلعے میں اب کوئی آبادی نہیں۔ جب سے حیدر آباد سلطنت کا مرکز بنا یہ ویران ہو گیا۔ اگرچہ اس کی دیواریں قائم ہیں۔ اقبال کے دل میں اس کی بے رونقی کو دیکھ کر پرانی رونق کی یاد تازہ ہو گئی۔

تیسرا بند

نجم: ستارہ۔ **خاک بازی**: مٹی سے کھیلنا۔ **از بر**: حفظ۔ زبانی یاد۔ **گل بدامن**: دامن میں پھول لیے ہوئے۔

پھٹتے ہوئے بادل کی کھڑکی سے آسمان کی چھت پر بیٹھا ہوا ستارہ، جس نے سبز لباس پہن رکھا ہے، دنیا کی حالت دیکھ رہا ہے۔ اس کائنات کا وسیع نظارہ اس کے لیے ایسا ہی بے حقیقت ہے جیسے کہ مٹی سے کھیلنا انسان کی ناکامی کی کہانی ستارے کے نوک بر زبان ہے۔ یہ مسافر ازل کے دن سے منزل مقصود کی طرف جا رہا ہے۔ چلتے چلتے

آسمان سے دنیا کے انقلابوں کا تماشا دیکھتا رہا ہے۔ اگرچہ اس جہان میں ستارے کے لیے ٹھہرنا ممکن نہیں لیکن یہ دم بھر کے لیے رک گیا ہے تاکہ فاتحہ پڑھ لے۔ زندگی کی شادابی و تازگی کا یہ رنگ ہے گویا زمین کا دامن پھولوں سے بھرا ہوا ہے۔ ساتھ ہی اس میں سینکڑوں تہذیبیں خون ہو کر دفن ہو چکی ہیں یعنی اگرچہ زندگی کی آب و تاب اس زمین کی رونق ہے لیکن یہ سینکڑوں تہذیبوں کو ہڑپ بھی کر چکی ہے۔

اس بند میں شاعر نے ستارے کو دیکھ کر اپنے حسرت بھرے مرثیے کی تمہید میں ماتم کا نیا سماں پیدا کر لیا۔

چوتھا بند

یہ حسرت بھرا مقام بادشاہوں کی آخری آرام گاہ ہے، اے زندگی کے واقعات سے سبق حاصل کرنے والی آنکھ! تو یہاں خون کے آنسوؤں کا خراج ادا کر۔ بلاشبہ یہ قبرستان ہے لیکن اس مٹی کو آسمان کا رتبہ حاصل ہے، اس لیے کہ یہ ایک ایسی قوم کا سرمایہ ہے جس کی قسمت کا ستارہ گردش میں آچکا ہے۔ مقبروں کی شان دیکھ کر اس درجہ حیرانی پیدا ہوتی ہے کہ دیکھنے والی آنکھ کی پلکیں حرکت سے پرہیز کرتی ہیں یعنی ٹکٹکی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ یہ ہمارے سامنے جو نقشہ پیش ہے، اس میں ناکامی کی ایسی کیفیت نمایاں ہے جس کا عکس تحریر کے آئینے میں نہیں اتر سکتا یعنی جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

پانچواں بند

جبیں گستر: لفظی معنی پیشانی بچھانے والا یعنی سجدہ کرنے والا۔ **فغفوری:** بادشاہی۔ فغفور چین کے بادشاہ کا لقب تھا۔ **غنیم:** دشمن۔ لٹیرا۔ **یورش:** حملہ۔

جنھیں بیتاب آرزوئیں ہر وقت بے قرار رکھتی تھیں وہ آبادی کے شور و غل سے دور ہٹ کر خاموش سو رہے ہیں جن کے دروازوں پر آسمان سجدے کرتا تھا۔ وہ سورج اب صرف قبر کے اندھیرے میں چمک رہے ہیں۔ جن شہنشاہوں کی ملک داری اور نظم و نسق کی تدبیروں سے زوال خوف کھاتا تھا، کیا ان کی عظمت اور برتری کا انجام یہی ہے؟ سچ ہے، موت کے لٹیرے کا حملہ ٹل نہیں سکتا۔ نہ چین کے شہنشاہ کا رعب اس پر کوئی اثر ڈال سکتا ہے، نہ روم کے تاجدار کی شان اسے روکنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ سچ ہے بادشاہوں کی عمر کی کھیتی کا حاصل بھی قبر ہی ہے۔ سمجھنا چاہئے کہ بڑائی اور برتری کے راستے کی آخری منزل قبر کے سوا کوئی نہیں۔ یعنی سب مرتے ہیں اور عظیم الشان انسان بھی آخر قبر ہی میں جا سوتے ہیں۔ آخری مصرع کے مضمون کو مشہور انگریز شاعر گرے

نے اپنی نظم مرثیہ میں یوں بیان کیا ہے:
The paths of glory lead but to the grave. یعنی جاہ و جلال کے راستے بھی قبر ہی کی طرف جاتے ہیں۔

چھٹا بند

عُود: بربط کی قسم کا ایک ساز۔ نالۂ شب گیر: رات کے وقت کی آہ و زاری۔ رات کا رونا۔
راگ رنگ محفل کا ہنگامہ ہو یا ساز کے نغمے یا دکھی لوگوں کی آہ و زاری ہو، جو وہ رات کے وقت کرتے ہیں۔ لڑائی کے میدان میں تلواروں کی جھنکار ہو یا خون میں گرمی پیدا کرنے والا نعرۂ تکبیر، ان سونے والوں کو اب کوئی آواز نہیں جگا سکتی، جو سینے جان نکل جانے کے باعث اُجڑ چکے ہیں، ان میں پھر جان واپس نہیں آسکتی۔

ساتواں بند

زحمت کش بیداد: ظلم کا دُکھ اٹھانے والی۔
انسان کی روح خاک کی مٹھی یعنی جسم میں ظلم کے دکھ اٹھاتی ہے۔ سانس جب بانسری کے کوچے میں پھرنے لگتا ہے تو وہ فریاد بن جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ زندگی انسان کے لیے مصیبتوں کا گھر ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بانسری میں سانس پھونکا جائے تو اس سے فریاد پیدا ہوتی ہے اور انسان کے جسم میں جب تک سانس کی آمد و رفت جاری ہوتی ہے، وہ سراپا فریاد ہی بنا رہتا ہے۔
انسان کی زندگی اس میٹھے گیت گانے والے پرندے کی سی ہے جو شاخ پر آ کر بیٹھتا ہے۔ ذرا سی دیر کے لیے چہچہاتا ہے اور اڑ جاتا ہے۔ آہ! ہم زمانے کے باغ میں کیا آئے اور کیا گئے۔ زندگی کی شاخ سے پھوٹے، کھلے اور مرجھا گئے۔ بادشاہ ہو یا فقیر، ہر ایک کی زندگی کے خواب کی تعبیر موت ہے۔ یعنی سب کے لیے مرنا لازم ہے۔ یہ وہ ظالم ہے جس کا ظلم بھی انصاف کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس لیے کہ چھوٹے بڑے، اعلیٰ ادنیٰ، امیر فقیر، کسی میں تمیز نہیں کی جاتی، سب کو ایک لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے۔

آٹھواں بند

اس بند اور اگلے دو بندوں میں زندگی کی ناپائداری اور بے ثباتی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

خسِ آتش سوار: وہ تنکا جو آگ پر سوار ہو یعنی آنکھ جھپکتے ہی جل بجھنے والا تنکا۔ **صورت گر:** تصویر بنانیوالا۔
زندگی کا سلسلہ ایک ایسا سمندر ہے، جس کا کنارہ نظر نہیں آتا۔ قبریں اس اتھاہ سمندر کی موجیں ہیں۔
قبروں کو موجوں سے اس لیے تشبیہ دی کہ دونوں میں ابھار ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر زندگی کو ایک بہت بڑا سمندر فرض کریں، جس کے کنارے دکھائی نہ دیتے ہوں تو قبریں اس کی موجیں ہیں، یعنی زندگی کا انجام موت ہے۔ اس کے باوجود دنیا والے جینے کی ہوس کرتے ہیں، حالانکہ انھیں خون رونا چاہیے۔ اس لیے کہ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ چنگاری کی ایک مسکراہٹ ہے یا جلتا ہوا تنکا یعنی بہت جلد ختم ہونے والی ہے۔ چاند دیکھنے میں کائنات بنانیوالے خدا کا ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ پارے کے رنگ کا لباس پہنے ہوئے اپنی بانکی چال میں مگن رہتا ہے لیکن صبح کے وقت اس کی بے چارگی دیکھنا چاہیے۔ جب آسمان سے تارے غائب ہو چکے ہوں اور اس کے خوفناک پھیلاؤ میں چاند تنہا رہ جائے، اس وقت معلوم ہوگا کہ جسے ہم چاند کہتے تھے وہ بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے، جس سے پانی کی آخری بوند گر جائے تو وہ ختم ہو جائے۔

نواں بند

زیاں خانہ: نقصان کا گھر یعنی دنیا۔ **گردوں وقار:** آسمان جیسے اونچے رتبے والی۔ **بے اعتنائی:** بے پروائی۔ **ذوقِ جدت:** نئی چیزیں پیدا کرنے کا شوق۔ **آبستن:** حاملہ ہونا۔

قوموں کی زندگی بھی اسی طرح ناپائدار ہے جیسے ان کی بہار کہا جاتا ہے۔ وہ اصل میں گزرے ہوئے رنگوں کی ایک تصویر ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ پہلی قوموں کی شان و شکوہ کو لوٹ کر اپنے لیے عروج کا سامان پیدا کرتی ہیں، حالانکہ گزری ہوئی قوموں کی طرح وہ بھی مٹنے والی ہوتی ہیں۔ اس دنیا میں جو نقصان کا گھر ہے۔ کوئی آسمان جیسے اونچے رتبے والی قوم بھی ہمیشہ کے لیے زمانے کے گندھے کا بوجھ نہیں بنی رہ سکتی۔ یہ دنیا قوموں کو برباد کرنے کی اس درجہ عادی ہو چکی ہے کہ اب اسے کسی کی بربادی کا نظارہ انوکھا اور قابلِ دید معلوم نہیں ہوتا اور وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ یہاں کوئی بھی چیز ایک صورت پر قائم نہیں رہتی۔ ہر وقت نئی چیزیں پیدا کرنے کے شوق سے زمانے کے مزاج نے ترکیب پائی ہے۔ زمانے کا نگینہ ہر وقت نئے نام سے زینت پاتا ہے اور یہ جہان کی ماں نئی نئی قومیں جنتی رہی ہے۔

دسواں بند

کوہِ نور: مغل بادشاہوں کا مشہور ہیرا جو کئی بعد دیگرے مختلف تاج داروں کے قبضے میں آتا رہا۔

آفاری : بہار کا بادل

دنیا کی گزرگاہ ہزاروں قافلے دیکھ چکی ہے، کوہِ نور ہیرا کتنے ہی بادشاہوں کے تاج کی زینت بن چکا ہے۔ مصر اور بابل کی قدیم عظیم الشان سلطنتیں مٹ گئیں۔ اب ان کا نشان تک باقی نہیں بلکہ زندگی کے دفتر میں ان کی کہانی بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ ایران کی عظمت کے سورج کو موت کی شام نے دبوچ لیا۔ زمانے نے یونان اور روم کی شان و شوکت لوٹ لی۔ آہ مسلمان بھی اسی طرح دنیا سے رخصت ہو گیا گویا یہ بہار کی گھٹا تھی، اٹھی، برسی اور چھٹ گئی۔

گیارھواں بند

مطرب : گانے والا۔ گلستاں زادے : باغ میں پیدا ہونے والی چیزیں یعنی درخت اور پودے۔
خاکدان : مٹی کا گھر یعنی دنیا۔ نشاط آباد : عیش و شادمانی کی بستی۔

پھول کی رگ صبح کے آنسوؤں کے سبب سے موتیوں کی لڑی بن گئی ہے۔ سورج کی کوئی کرن شبنم میں الجھی ہوئی ہے دریا کے سینے پر شعاعیں کھیل رہی ہیں۔ ندی کے کنارے سے سورج کا نظارہ کتنا پیارا معلوم ہوتا ہے۔ ندی کا پانی آئینہ بنا ہوا ہے اور صنوبر اپنا عکس اس میں دیکھ کر اپنے آپ کو آراستہ کرنے میں مگن ہے۔ پھول کی کلی کے لیے بادِ بہار آئینے کا کام دے رہی ہے۔ باغ میں کوئل کوک رہی ہے وہ پتوں کی خلوت میں بیٹھی ہے اور انسانوں کو نظر نہیں آتی، بلبل جو باغ میں میٹھے گیت گاتی ہے، جس کے دم سے باغ کی ہوا زندہ ہے۔ عشق کے ہنگاموں کی اڑتی ہوئی تصویر بن رہی ہے۔ قدرت کے قلم کی یہ تحریر کتنی بانکی ہے۔ یعنی قدرت نے اسے کتنا بانکا بنایا ہے۔ باغ میں پودے اور درخت خاموش کھڑے چلے کر رہے ہیں۔ پہاڑ کی وادی سے گڈریوں کے لڑکوں کے نعرے گونج رہے ہیں۔ گویا یہ پرانی دنیا زندگی کے شور و غل سے آباد ہے۔ موت میں بھی زندگی کی تڑپ چھپی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ پھولوں کی پتیاں خزاں کے موسم میں اس طرح گرتی ہیں جیسے سوتے ہوئے بچے کے ہاتھ سے رنگین کھلونے۔ یہ تشبیہ اتنی پاکیزہ اور اچھوتی ہے کہ اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

عیش و شادمانی کی اس دنیا میں اگرچہ خوشی کے بے اندازہ سامان جمع ہیں، لیکن ایک غم ہمیشہ تازہ رہتا ہے اور وہ قوم کا غم ہے۔

بارھواں بند

ہمارے دل گزرے ہوئے زمانے کی یاد سے کبھی خالی نہیں ہوتے۔ ہماری قوم اپنے بادشاہوں کو بھول

نہیں سکتی۔ یہ اجڑے ہوئے در و دیوار ہمارے لیے آنسو بہانے کا بہانہ ہیں۔ ہماری تر آنکھیں لگاتار رونے ہی کی برکت سے بینا ہیں۔ ہم زمانے کو رونے والی آنکھ کے موتی دیتے ہیں یعنی آنسو بہاتے ہیں۔ جو طوفان گزر چکا، ہم اس کے آخری بادل ہیں۔ اس بادل کی گود میں ابھی سینکڑوں موتی باقی ہیں اور اس کے خاموش سینے میں بجلی بھی چھپی ہوئی ہے۔ یہ بادل بیابان کی خاک کو پھولوں کی وادی بنا سکتا ہے۔ اس طرح کسان کی سوئی اُمّید نیند سے جاگ سکتی ہے۔ قوم کی جلالی شان اگرچہ گزر چکی لیکن اس کی جمالی شان ابھی باقی ہے۔

اس سے پیشتر کے بندوں میں ایک گونہ مایوسی اور حسرت کا رنگ نمایاں تھا۔ اقبال نے آخری بند میں اپنے خاص انداز کے مطابق امید کا پیغام دیا اور یہ خوش خبری سنائی کہ مسلمان کے شان و شکوہ اور بے اندازہ فتوحات کا دور اگرچہ گزر چکا، لیکن اسلام کی معنوی خوبیاں نمایاں کرنے کا دور ابھی باقی ہے۔ مایوس نہ ہونا چاہیے۔ اس نئے دور کو وہ جمالی شان کا دور کہتے ہیں۔ اس سے مراد غالباً یہ ہے کہ زمانہ اب ذہنی اور دماغی اعتبار سے اس درجے پر پہنچ گیا ہے جس میں وہ اسلام کی خوبیوں کا صحیح اندازہ کر سکے گا۔ اور دینِ حق کی برکتوں سے دنیا کا گوشہ گوشہ بقعۂ نور بن جائے گا۔

نمودِ صبح

یہ اشعار ایک قصیدے کی تشبیب تھے جو مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر اعظم دولتِ آصفیہ کے لیے لکھا تھا اور اکتالیس اشعار پر مشتمل تھا۔ اقبال نے خود اس پر ذیل کا نوٹ لکھا تھا:

گزشتہ مارچ ۱۹۱۰ء میں مجھے حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں آستانۂ وزارت پر حاضر ہونے کا اور عالی جناب ہز ایکسیلینسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر جی، سی، آئی، ای، یمین السلطنت پیشکار و وزیر اعظم دولتِ آصفیہ المتخلص بہ شاد کی خدمت بابرکت میں باریاب ہونے کا فخر بھی حاصل ہوا۔ ہز ایکسیلینسی کی نوازش کریمانہ اور وسعت اخلاق نے جو نقش میرے دل پہ چھوڑا، وہ میری لوحِ دل سے کبھی نہ مٹے گا۔ مزید الطاف یہ کہ جناب ممدوح نے میری روانگی حیدر آباد سے پہلے ایک نہایت تلطف آمیز خط لکھا اور اپنے کلام شیریں سے بھی شیریں کام فرمایا۔ ذیل کے اشعار اس عنایت بے غایت کے شکریے میں دل سے زبان پر بے اختیار

آ گئے۔ انھیں زبانِ قلم کی وساطت سے جناب مہاراجہ صاحب بہادر کی خدمت میں پہنچانے کی جرأت کرتا ہوں۔ (مخزن بابت جون ۱۹۱۰ء)

اس قصیدے کے آخری دو شعر یہ تھے:

نقش وہ اس کی عنایت نے مرے دل پر کیا | محو کر سکتا نہیں جس کو مرورِ روزگار
شکر یہ احسان کا اے اقبال لازم تھا تجھے | مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

وردِ فصلِ انجم: ستاروں کی فصل کاٹنا یعنی ستاروں کا ڈوب جانا۔ **شب زندہ دار:** رات بھر جاگنے والا۔ **اختلاط انگیز:** میل جول پیدا کرنے والی۔ **ترنم ریز:** گانے والا۔ **قانون:** ایک قسم کا ساز۔

صبح جو رات اور دن کی کنواری بیٹی ہے، افق کے دامن سے ظاہر ہو رہی ہے۔ یعنی صبح ہو رہی ہے۔

آسمان ستاروں کی فصل کاٹنے سے فرصت پا چکا گویا ستارے ڈوب گئے۔ مشرق کے کھیت میں آفتاب آئینے بونے لگا، یعنی سورج کے نکلنے سے مشرق آئینے کی طرح روشن ہو گیا۔

آسمان نے سورج کے آنے کی خبر سنی تو رات کی رخصت کا کجاوا غبار کے کندھے پر باندھ دیا، یعنی رات کو رخصت کر دیا۔

آسمان کے کسانِ ناروں کی جو چنگاریاں بوئی تھیں، ان سے سورج کا شعلہ پیدا ہوا، یعنی رات بھر تارے نکلے رہے تھے، وہ ڈوبے تو ان کی جگہ سورج نکل آیا۔

صبح کا ستارہ اس انداز سے رخصت ہو رہا ہے۔ جیسے رات بھر جاگنے والا کوئی عبادت گزار سب کے بعد عبادت خانے سے نکلے۔

سماں ایسا نظر آتا ہے جیسے کوئی میان کے اندھیرے سے چمکنے والی تلوار کھینچے۔

سورج کے نکلنے کی جگہ یعنی مشرق میں صبح کا مضمون اس طرح چھپا ہوا ہے، جیسے صراحی کی خلوت گاہ میں خوشگوار شراب۔ مراد یہ ہے کہ سورج کا نکلنا ہی صبح کی دلیل ہے اور شراب مینا میں ہو تو اگرچہ کہنے کو چھپی ہوتی ہے، لیکن صاف نظر آتی ہے۔ غالب کا ایک مصرع ہے:

چوں بادہ بہ مینا کہ نہاں است نہاں نیست

خود اقبال نے لکھا ہے:

کسوتِ مینا میں ہے مستور بھی عریاں بھی ہے

میل جول پیدا کرنے والی صبح کی ہوا کے زیرِ دامن ناقوس کا شور اذان کی آواز سے بغل گیر ہے۔ مطلب یہ کہ صبح کے وقت مندروں سے ناقوس کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں، مسجدوں سے اذان کی آواز آ رہی ہے، دو توں آوازیں

مل جل رہی ہیں۔ یہ صبح کی ملاپ بڑھانے والی ہوا کا نتیجہ ہے۔
نغمے گانے والے پرندے کویل کی کوک سن کر جاگ اٹھے۔ صبح کے ساز کا ہر تار راگ الاپ رہا ہے۔

تضمین بر شعر انیسی شاملو

تضمین: کسی کے شعر کو اپنے شعروں میں لانا اصطلاحاً تضمین کہلاتا ہے۔ انیسی: یول قلی بیگ شاملو فارسی کا مشہور شاعر تھا۔ خانخاناں کے پاس رہا۔ نظیری کا خواجہ تاش اور عزیز دوست تھا۔ اس کی وفات پر نظیری نے بڑا دردناک مرثیہ لکھا۔ "مآثر الکرام" کے بیان مطابق ۱۰۱۳ھ ۱۶۰۵ء میں بہ مقام برہان پور وفات پائی۔ "مآثر رحیمی" میں تاریخ وفات ۱۰۱۴ھ۔ "مآثر رحیمی" اس باب میں زیادہ قابل اعتماد ہے۔ محمود و ایاز کا قصہ نظم کرنا شروع کیا تھا۔ پورا نہ ہو سکا۔ پیر سنجر: اشارہ ہے حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی طرف جنھیں اقبال نے غالباً عام شہرت کی بنا پر سنجری لکھ دیا، حالانکہ ان کا وطن مالوف علاقہ سنجر ہے جسے سجستان یا سیستان بھی کہتے ہیں۔ ان کے دیار سے مراد ہے اجمیر شریف۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ خواجہ صاحب کا وطن مالوف قریہ سنجر تھا لیکن اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ نازائی: بانجھ پن۔ کنشتی: بت خانے سے تعلق رکھنے والا۔

میں صبح کی ہوا کی طرح ہمیشہ آوارہ پھرتا رہتا ہوں۔ محبت میں سفر منزل سے بھی زیادہ پُرلطف معلوم ہوتا ہے۔ پھرتے پھرتے میرا دل بے قرار خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی سرزمین اجمیر شریف جا پہنچا۔ بے صبری کے دُکھ کا علاج وہیں ہوتا ہے۔ میرے دل کی آرزو ابھی لب سے آشنا نہ ہوئی تھی۔ زبان تقریر کی طاقت کا احسان اٹھانے ہی کو تھی یعنی میں دل کی بات کہنا ہی چاہتا تھا، ابھی کہی نہ تھی کہ خواجہ کے مزار سے آواز آئی:
اے باپ دادا کا طریقہ چھوڑ دینے والے! حرم کے رہنے والوں کو تجھ سے شکایت ہے۔ تو قیس تھا پھر تیرے دل کی جلن کیوں ٹھنڈی پڑ گئی۔ لیلا میں تو اب تک محبوبی کی پرانی شان باقی ہے۔ تیری مٹی میں بنجر تھی۔ لاالٰہ کا جو بیج اس میں بویا گیا تھا، وہ نہ اُگا اور تیری فطرت کا بانجھ پن زمانے بھر میں رسوا ہو گیا۔ اے غافل! تجھے معلوم ہے تیری زندگی کیا ہے؟ تیرا ساز بُت خانے کا ہے اور اس میں گرجے کے

کے نغمے بھرے ہوئے ہیں۔ تیری پرورش کعبے کی گود میں ہوئی تھی۔ تیرا دیوانہ دل بُت خانے کا سودائی ہے۔
تو نے ہم سے وفا سیکھی، لیکن اسے غیروں کے کام میں صرف کیا۔ ہم سے موتی لیا اور اسے دوسروں پر نثار کر دیا۔
اس نظم میں مخاطب اس وقت کے ہندوستان کا مسلمان ہے کہ وہ اپنی حقیقی تعلیم بھول چکا ہے۔ اس نے غیروں کے طریقے اختیار کر لیے ہیں۔ انگریزوں کی خوشامد اس کا شیوہ ہے۔ کعبے کی آغوش میں پرورش پانے کے باوجود اس کی ساری فطرت اسلامیت کے خلاف ہے۔ اس کی زمین میں توحید کا بیج بویا گیا تھا، لیکن زمین بنجر ہونے کے باعث یہ بیج پیدا نہ ہوا۔
یہ پہلو خاص توجہ کے قابل ہے کہ یہ سب کچھ خواجہ اجمیریؒ کی رُوحِ پاک سے منسوب کر کے کہا گیا اور اس طرح اس میں وعظ و تلقین کی ایک خاص خوبی پیدا ہو گئی۔

فلسفۂ غم

یہ نظم میاں فضل حسین مرحوم کے والدِ ماجد کے انتقال پر بہ طور تعزیت بھیجی گئی تھی اور جولائی ۱۹۱۱ء کے "مخزن" میں چھپی تھی۔ اقبال نے خود اس پر یہ نوٹ لکھا تھا:

> ذیل کے اشعار اپنے قدیم دوست اور ہم جماعت میاں فضل حسین بیرسٹر ایٹ لا لاہور کی خدمت میں ان کے والدِ بزرگوار کی ناگہانی رحلت پر بہ طور تسلی نامے کے لکھے گئے تھے۔ اگرچہ میری تحریر پرائیویٹ تھی اور اس کی اشاعت کچھ ضرور نہ تھی۔ تاہم میں چاہتا ہوں کہ یہ اشعار میاں صاحب موصوف کے احبّا اور معترفین تک بھی پہنچیں، جنھوں نے اس موقع پر میاں صاحب سے اظہارِ ہمدردی کیا۔

سحاب: بادل۔ خزاں نادیدہ: جس نے خزاں نہ دیکھی ہو۔ انکشافِ راز: بھید کا کھلنا۔
یا رب: یعنی فریاد۔ انسان انتہائی دکھ کی حالت میں ہو تو اس کے لب پر بار بار یا رب یا رب آتا ہے۔ اسی سے فریاد کے معنی پیدا کر لیے گئے۔ عدم ناآشنا: جو عدم سے آشنا نہ ہو یعنی فنا نہ ہونے والی۔
محصور: گھری ہوئی۔ رزم گاہِ خیر و شر: نیکی اور بدی کا میدانِ جنگ۔ گوشہ گیر: تنہائی کے

کونے میں بیٹھنے والا یعنی الگ تھلگ جانے والا۔

اگرچہ زندگی کی شراب سراسر عیش و مسرت کا نشہ ہے لیکن اس ابر کے دامن میں آنسو بھی موجود ہے۔

پہلا بند مراد یہ ہے کہ زندگی کا لطف اگرچہ عیش و مسرت میں ہے لیکن اس میں غم سے بھی سابقہ پڑتا رہتا ہے اور غم سے محفوظ رہنا ممکن نہیں۔

زندگی کا بلبلا غم کی لہر پر رقص کرتا ہے اور رنج والم کا سورہ زندگی کی کتاب کا ایک جزو ہے۔ زندگی کو بلبلا اس لیے کہا کہ وہ بہت ناپائدار ہے۔ پھر بلبلا پانی میں اسی جگہ ہوتا ہے جہاں موجیں اٹھیں۔ لہٰذا فرمایا کہ زندگی کا بلبلا غم کی موج پر رقص کرتا ہے یعنی زندگی کے ساتھ غم لگا ہوا ہے۔ الم کے لفظی معنی ہیں رنج و غم۔ یہ قرآن مجید کے پہلے پارے کے نام الف لام میم (الم) سے مشابہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح الف، لام، میم کتاب مبین (قرآن مجید) کا جزو ہے، اسی طرح رنج و غم کی سورت زندگی کی کتاب کا حصّہ ہے۔

اگر پھول کی ایک پتّی بھی کم ہو جائے تو وہ اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھتا ہے اور پھول نہیں رہتا ہے۔ جس بلبل نے خزاں کا موسم نہ دیکھا ہو، اسے بلبل نہیں کہا جا سکتا۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح پھول پنکھڑیوں کی ترکیب سے بنتا ہے اور اگر ایک بھی پنکھڑی کم ہو جائے تو اس کی حیثیت زائل ہو جاتی ہے اسی طرح غم بھی زندگی کی کیفیتوں کا ایک حصّہ ہے اور اگر وہ حصّہ موجود نہ ہو تو زندگی زندگی نہ کہلائے گی۔ اسی بنا پر فرمایا کہ بلبل وہی ہے جس نے بہار کے ساتھ خزاں کا موسم بھی دیکھا ہو۔ وہ عیش و عشرت کے لطف لینے کے ساتھ رنج و ماتم کے دور سے بھی گزر چکی ہو ایسا نہ ہو تو اس کی زندگی نامکمل رہ جائے گی۔

دل کی کہانی آرزو کے خون سے رنگین ہے۔ اور انسانیت کا نغمہ آہ و فغاں کے بغیر کامل نہیں ہوتا یعنی

دوسرا بند جب تک آرزوئیں ناکامی کی حالت میں خون بن کر نہ نکلیں، دل کی کہانی میں تاثیر پیدا نہیں ہوتی۔ نغمے میں مختلف سُر جمع ہوتے ہیں۔ انسانیت کے نغمے کا ایک سُر آہ و فریاد بھی ہے۔ جب تک یہ سر شامل نہ ہو نغمہ نامکمل رہے گا۔

دل میں غم کا داغ بیٹھ جائے تو دیکھنے والی آنکھ کے لیے وہ سینے میں چراغ بن جاتا ہے۔ یعنی اس سے سینے میں روشنی پیدا ہوتی ہے۔ روح کے لیے آہ و فریاد کا آئینہ زیب و زینت کا سامان ہے۔ آہ و فریاد کے بغیر روح پوری طرح آراستہ نہیں ہو سکتی۔

غم کے حادثوں سے انسان کی فطرت کمال کو پہنچتی ہے۔ دل کے آئینے کے لیے رنج کی گرد ابٹنا بن جاتی ہے۔

ان تمام اشعار کا مضمون ایک ہے یعنی یہ کہ غم زندگی کا جزو ہے، اس کے بغیر انسانیت مکمّل نہیں ہوتی۔ اسی سے فطرت کمال کو پہنچتی ہے، روح آراستہ ہوتی ہے اور اس میں صفائی پیدا ہو جاتی ہے۔

غم جوانی کو خواب کے لطف سے بیدار کر دیتا ہے۔ یعنی غم کی بدولت سوئی ہوئی جوانی جاگ اٹھتی ہے اور جوانی کا ساز غم ہی کی مضراب سے نغمے پیدا کرنے لگتا ہے۔

دل کے پرندے کے لیے غم اڑان کے وقت شہپر کا کام دیتا ہے جس کے بغیر اڑنا ممکن نہیں۔ انسان کا دل قدرت کا ایک بھید ہے۔ یہ بھید غم ہی کے ذریعے سے کھلتا ہے۔

غم کو غم نہ کہنا چاہیے۔ یہ تو روح کا ایک خاموش نغمہ اور دھیما راگ ہے، جو زندگی کے ساز سے نکلنے والے نغموں کے ساتھ بغل گیر ہے۔ یعنی زندگی کے ساز سے جو نغمے پیدا ہوتے ہیں، ان کے سُر تال روح کے اسی دھیمے راگ سے پیوستہ ہیں جس کا نام دنیا نے غم رکھا ہے، یعنی غم زندگی کا لازمی جزو ہے۔

تیسرا بند جس ہستی کی شام "یا رب" کے نالوں سے آشنا نہیں ہوئی اور جس کی رات میں آنسوؤں کے تاروں کا جلوہ نظر نہیں آتا یعنی جو شام کے وقت آہ و فریاد نہیں کرتا اور رات کے وقت روتا نہیں۔

جس کے دل کا پیالہ غم کی ضرب سے آشنا نہیں، یعنی جو غم کی چوٹ پڑنے سے ٹوٹتا نہیں اور جو ہستی ہمیشہ عیش و عشرت ہی کی شراب سے مست رہی۔

جس پھول توڑنے والے کے ہاتھ میں کانٹے کی نوک نہ چبھی، جس عاشق کے دل کو جدائی کا دکھ نہ پہنچا۔ اگرچہ ایسی ہستیاں کے دن رات غم کی تکلیف سے دور ہوں لیکن زندگی کا راز ان کی آنکھوں سے پوشیدہ رہے گا۔

اے مخاطب! (اوپر بتایا جا چکا ہے کہ خطاب میاں سر فضل حسین مرحوم سے ہے۔) تجھے کائنات کے اس انتظام اور زمانے کے اس کاروبار سے پوری آگاہی حاصل ہے۔ تو جانتا ہے کہ اس زندگی میں غم سے بچے رہنے کی کوئی صورت نہیں، بلکہ غم کے بغیر زندگی مکمل نہیں ہوتی۔ والدِ بزرگوار کی وفات سے تجھے رنج و قلق کی جو منزل پیش آگئی ہے، کیا وجہ ہے کہ حقیقت سے آگاہی کے بعد وہ تیرے لیے کٹھن رہے۔ اور آسان نہ ہو جائے؟

چوتھا بند ہمیشگی کی پرانی کتاب کا آغاز عشق سے ہوتا ہے یعنی ہمیشہ رہنے والی چیز عشق ہے۔ عقل فنا ہو جانے والی ہے۔ عشق ہمیشہ زندہ رہے گا۔ عشق کے سورج سے موت کی شام شرم سار ہے۔ یعنی عشق کے لیے موت نہیں، عشق زندگی کا سوز ہے۔ یہ ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔

اگر محبوب کے رخصت ہو جانے یعنی مر جانے کا مقصد فنا ہو تا تو عاشق کے دل میں الفت کا جوش بھی باقی نہ رہتا۔ محبوب کے مرنے سے اس کا عشق نہیں مرتا۔ وہ غم بن کر روح میں سرایت کر جاتا ہے اور زائل نہیں ہوتا۔ عشق کے

باقی رہنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب فنا نہیں ہوا بلکہ باقی ہے اور اس کی زندگی پر فنا کی کیفیت طاری نہیں ہوئی۔

پانچواں بند اس بند میں ایک مثال کے ذریعے سے اپنا مدعا بیان فرماتے ہیں۔ یہ مثال وہی ہے جو نظم "ہمالہ" میں بھی دی گئی تھی، لیکن وہاں یہ محض ایک منظر کے طور پر پیش ہوئی تھی، یہاں اسے جدائی کے عارضی ہونے کی ایک روشن دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

اس ندی کو دیکھو جو پہاڑ کی پیشانی سے گاتی ہوئی اترتی ہے۔ فضا میں اُڑنے والے پرندے اس کے گیت سے نغمے سیکھتے ہیں۔ اس کے پانی کا آئینہ حُور کے رُخسار کی طرح روشن ہوتا ہے لیکن یہ وادی کی چٹانوں پر گرتا ہے تو چُور چُور ہو جاتا ہے۔ پہلے وہ ندی تھی، اب اس کی جگہ پیارے پیارے موتی نمودار ہو گئے اور یہ موتی نیچے گر کر پانی کے تارے بن گئے۔ وہ ندی جو بہتا ہوا پارہ معلوم ہوتی تھی، پھٹی، بکھر گئی اور اس سے بے قرار بوندوں کی ایک دنیا نکل آئی۔

ان چار شعروں میں ندی کی روانی اور بلندی سے نیچے گرنے پر اس کی پریشانی کا نظارہ بڑے ہی دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ:

جو ندی بلندی سے گر کر قطرہ قطرہ ہو گئی تھی، دو قدم آگے بڑھ کر دیکھو تو پھر وہ قطرے مل کر ایک ندی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو چاندی کا تار معلوم ہوتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ بلندی سے گرنے پر ندی کے قطروں میں جو جدائی اور انتشار پیدا ہوا تھا، وہ عارضی تھا۔ دو قدم آگے بڑھتے ہی وہ مل گئے تو واضح ہوا کہ جدائی ان کے لیے وصل کی تعلیم تھی۔

بالکل یہی کیفیت زندگی کی بہنے والی ندی کی ہے۔ اس کی اصل ایک ہے۔ وہ بلندی سے نیچے گری تو انسانوں کے بہت بڑے انبوہ کی شکل اختیار کر گئی۔ دنیا کی پستی میں پہنچ کر انسان پھر ایک دوسرے سے جدا ہو تے ہیں لیکن اس جدائی کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ہم پھر مل جائیں۔ ہماری کوتاہی یہ ہے کہ اس عارضی بچھڑنے کو ہمیشہ کے لیے بچھڑنا قرار دے لیتے ہیں اور رونا شروع کر دیتے ہیں۔

چھٹا بند جو لوگ مرتے ہیں وہ مرتے ضرور ہیں لیکن فنا نہیں ہوتے اور حقیقت پوچھی جائے تو یہ ہے کہ کبھی ہم سے جدا نہیں ہوتے۔

جب انسان کی عقل زمانے کی مصیبتوں اور آفتوں میں گھری ہوئی ہو یا وہ جوانی کی اندھیری رات میں چھپ جائے۔ جب دل کا دامن نیکی بدی کی کشمکش اور کھینچ تان کا میدان بن جائے۔ راستے پر اس درجہ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جائے کہ منزلِ مقصود کی طرف سفر مشکل ہو جائے۔ ہمت کا رہنما ہو لوں سے الگ ہو بیٹھا ہو۔ فکر عاجز آ جائے۔ ضمیر کی

آواز خاموش ہو جائے۔ زندگی کی منزل میں کوئی ساتھی سنگی نہ ہو اور راستہ دکھانے کے لیے جگنو کی چنگاری تک نظر نہ آئے تو اس اندھیرے میں بھی مرنے والوں کی پیشانی اسی طرح چمکتی رہتی ہے جس طرح اندھیری رات میں تارے چمکتے ہیں۔

آخری بند میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ جو جلیل القدر اور بلند مرتبہ ہستیاں ہم سے پہلے گزر چکی ہیں، ان کی مثالیں ہمارے لیے زندگی کے راستے میں مشعلوں کا کام دیتی ہیں۔ ہم اپنی ہر مشکل میں ان کی مثالوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ ہمارے لیے اچھے سبق چھوڑ گئیں۔ اگر زندہ ہوتیں تو بھی یہی سبق دیتیں جو اب ہمیں ان کے کارناموں سے ملتا ہے، گویا وہ چمکنے والے تارے ہیں جو اندھیری رات میں ہمیں راستے کا پتا دیتے ہیں۔

داغ اور سسلی کے مرثیوں کے بعد اقبال کا یہ تیسرا اہم مرثیہ ہے، جس میں غم کی حقیقت واضح کرنے کے علاوہ بتایا گیا ہے کہ زندگی موت پر ختم نہیں ہوتی اور جو لوگ عظیم الشان کارنامے پیچھے چھوڑ گئے، وہ موت کے بعد بھی انسانوں کے لیے رہنمائی کا زندہ پیغام ہیں۔

پھول کا تحفہ عطا ہونے پر

تمہیدی نوٹ

معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو کسی غیر معلوم دوست کی طرف سے پھول تحفے کے طور پر بھیجے گئے تھے۔ اس موقع پر یہ شعر کہے گئے۔

رقیب : حریف، مقابل

وہ نازنین کبھی باغ میں جاتی ہے تو کلی کلی کی زبان پکار اٹھتی ہے: اے خدا! وہ اگر پھول چننا چاہتی ہے تو مجھے چنے۔ میں ننھی سی کلی ہوں۔ نازنین اگر مجھے چن لے تو سورج کے پھول کے لیے رشک کا باعث بن جاؤں گی، یعنی سورج بھی مجھ پر رشک کرنے لگے گا۔

شاعر کلی سے کہتا ہے کہ اس نے تجھے شاخ سے توڑا تو جان کہ تیرے نصیب جاگ اٹھے۔ اس عزت کے لیے باغ

ہیں تیرے رقیب اور حریف تڑپتے رہ گئے۔ اے کلی! تو شاخ سے ٹوٹی۔ اس طرح جدائی کا صدمہ برداشت کیا اور اس ناز نین تک پہنچ گئی۔ تجھے وصال حاصل ہوا اور تیرے دل کی مراد پوری ہو گئی۔ تیری زندگی کے جوہر نے کمال کا درجہ حاصل کر لیا۔ میرا کنول جس پر اہلِ نظر قربان ہو رہے ہیں، وہ پھول جس پر میری جوانی کے باغ کو ناز ہے، یہ کبھی اپنے مقصد سے بغل گیر نہ ہوا یعنی مقصد حاصل نہ کر سکا اور کسی حسین کے دامنِ رنگین تک نہ پہنچا۔ اسے موسمِ بہار کی ہوا کبھی کھلا نہ سکے گی، کیونکہ اُسے پھول چننے والے کے انتظار نے غمگین بنا رکھا ہے۔

ترانۂ ملّی

تمہیدی نوٹ

یہ نظم عوام میں صرف "ترانہ" یا "اقبال کا ترانہ" کے نام سے مشہور ہے۔ پہلے اقبال نے ہندی ترانہ لکھا تھا جو دورِ اوّل کی نظموں میں گزر چکا۔ قومی ترانہ اس کے بعد لکھا گیا۔

اندلس: یہ ہسپانیہ کے ایک حصّے کا نام تھا جو جنوبی اور وسطی ہسپانیہ پر مشتمل تھا۔ یہاں ایک زمانے میں ونڈال قوم آباد تھی اس کی وجہ سے ملک کا نام ونڈالوشیا پڑ گیا۔ وہی عربوں کی زبان پر اندلس بنا۔ عام استعمال میں یہ ہسپانیہ کے اس پورے علاقے کے لیے بولا جاتا ہے، جو مسلمانوں کی ساڑھے سات سو سال کی حکومت میں ان کی زیرِ نگیں رہا۔

دجلہ: عراق کا مشہور دریا جس پر بغداد واقع ہے۔ **ارضِ پاک:** عرب خصوصاً حجاز۔ **میرِ حجازؐ:** اشارہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات کی طرف۔

ہماری قومیت کسی سرزمین سے مخصوص نہیں۔ چین بھی ہمارا ہے، عرب بھی ہمارا ہے، ہندوستان بھی ہمارا ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور ساری دنیا ہمارا وطن ہے۔ ہم ہر خطّے میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن ہماری قوم اور ہماری ملّت ایک ہے۔ خواہ ہم چینی ہوں، خواہ عربی، خواہ ہندوستانی۔ اسلام نے ہمیں عالمگیر برادری کے رشتے میں باندھ دیا ہے اور کسی ملک کی سرحد برادری کے اس رشتے میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ ہمارے آقا و مولا (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ مسلمان ایک دیوار کی اینٹوں کی طرح ہیں جو ایک دوسری کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ ہمیں رنگ، نسل، خون، خاندان

وغیرہ کی تقسیمیں الگ الگ نہیں کر سکتیں۔ ہم کالے ہوں یا گورے، مشرق میں رہتے ہوں یا مغرب میں سب ایک ہیں۔

خدا نے ہمارے دلوں میں توحید کی امانت رکھ دی ہے۔ ہم اس دنیا میں خدا کے ایک ہونے کا نعرہ لگا رہے ہیں یہی نعرہ اس کائنات کے دل کی آواز ہے۔ جب تک یہ امانت ہمارے سینوں میں موجود ہے ہمارا نام و نشان مٹانا آسان نہیں۔ اگر ہم مٹ جائیں تو اس کائنات کی روح مٹ جائے اور یہ دنیا اسی طرح اندھیری رہ جائے، جس طرح توحید کی روشنی سے پہلے اندھیری تھی۔

کعبہ خدا کا گھر ہے۔ ساری دنیا بت خانوں سے بھری ہوئی تھی۔ خدا کا یہ گھر سب سے پہلے اس دنیا میں آباد ہوا۔ قرآن مجید میں ہے: اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ بے شک سب سے پہلا گھر ہے جو مقرر ہوا لوگوں کے واسطے، یہی ہے جو مکّہ میں ہے۔ برکت والا اور ہدایت جہان کے لوگوں کو۔ (آل عمران) یہی پہلا گھر ہے جس کی نگہبانی اور پہرہ داری ہمارے حوالے ہوئی۔ ہم اس گھر کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں، یہ گھر ہماری حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ واضح رہے کہ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے جب تمام مسلمان اس پاک گھر کی حفاظت کے ذمہ دار بنا دیے گئے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ پاک گھر اس دنیا کے تمام مسلمانوں کی جمعیت اور اتحاد کا مرکز بن گیا۔ کروڑوں مسلمانوں کا اتحاد اس گھر کی برکت سے قائم ہے، لہٰذا یہ گھر مسلمانوں کا پاسبان ہوا اور مسلمان اس کے پاسبان ہیں۔

ہم بچپن سے تلواروں کے سائے میں پل پل کر جوان ہوئے ہیں۔ ہلال کا خنجر ہمارا قومی نشان ہے۔ یہ اشارہ ہے اسلامی جھنڈے کی طرف جس کا نشان چاند تارا ہے۔ اقبال نے ہلال کو خنجر سے تشبیہ دی اور بتایا کہ جن مسلمانوں کا نشان ہی ہلال کا خنجر ہے، وہ یقیناً تلواروں کے سائے میں پلے ہیں۔ جو بچے تلواروں کے سائے میں پل کر جوان ہوئے ہوں، انھیں دنیا کی کون سی طاقت ڈرا سکتی ہے؟

ہماری اذان مغرب کی وادیوں میں گونجی۔ ہم نے الجزائر، مراکش، ہسپانیہ، فرانس اور جنوبی و مشرقی یورپ کے دوسرے ملکوں میں فتح کے جھنڈے گاڑے اور ہر جگہ اذانوں سے گونج پیدا کی۔ ہم جس طرف رُخ کرتے تھے، ایک تیز و تند سیل کی طرح بڑھتے تھے اور کسی میں اس سیل کو روکنے کی ہمت نہ تھی۔

اے آسمان! ہم حق و صداقت کے علم دار ہیں۔ باطل ہمیں دبا نہیں سکتا۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے: قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَھَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا۔ (اے رسولؐ! ان سے کہہ دیجیے کہ سچ آگیا، جھوٹ نکل بھاگا بے شک جھوٹ ہے نکل بھاگنے والا۔ (بنی اسرائیل) تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ تُو سو مرتبہ ہمارا امتحان کر چکا ہے۔

اور اس امتحان میں ہم ہمیشہ کامیاب و سُرخ رُو رہے۔

اے اندلس کے باغ! تجھے وہ دن یاد ہیں جب تیری ڈالیوں میں ہمارا گھونسلا تھا؟ ہم نے ہسپانیہ کو فتح کیا۔ ہم نے وہاں عالیشان حکومت قائم کی جو آٹھ صدیوں تک یورپ کے اندھیرے میں علم و فضل کی روشنی کا مینار بنی رہیں۔ ہم نے یورپ والوں کو علوم سکھائے۔ ہم نے انھیں تہذیب سے آشنا کیا۔ آج یورپ کو جن سامانوں پر ناز ہے۔ وہ ہمارے دیئے ہوئے ہیں۔ یورپ کو یہ حقیقت یاد رہی ہو یا نہ رہی ہو، اے اندلس! تو تو اس حقیقت کو نہیں بھول سکتا۔ تیری وسعت میں اب بھی ہمارے نشان موجود ہیں۔ مثلاً: قرطبہ کی مسجد جامع، غرناطہ کا الحمراء۔

اے دریائے دجلہ کی لہر! تو بھی ہمیں بخوبی پہچانتی ہے۔ تیرا دریا اب تک ہمارے قصّے سنا رہا ہے۔ یہی دریا ہے جس کے دونوں کناروں پر ہم نے بغداد جیسا نادر روزگار شہر تعمیر کیا، جو ایشیا کی سب سے بڑی سلطنت کا مرکز تھا جس کے ہر محلے میں علم و تہذیب کی نہریں بہتی تھیں۔ بغداد کی عظمت کے نشان مٹ گئے لیکن دجلہ کی روانی کو وہ عظمت کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔

اے سرزمین حجاز! اے سرزمین عرب! ہم نے تیری عزّت و حرمت کے لیے اپنا خون بے دریغ بہایا۔ تیری خاک کے ذرّے ذرّے کو ہم اپنی جانوں سے بدرجہا عزیز سمجھتے رہے۔ تیری رگوں میں اب تک ہمارا خون دوڑ رہا ہے یعنی تیرا ایک بھی ذرّہ نہیں ہے جسے ہم نے لہو سے نہ سینچ دیا ہو۔

ہمارے قافلے کے سالار حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہی پاک نام ہے جس کی برکت سے ہماری جانوں کو راحت مل رہی ہے۔ یہی نام ہمارے دلوں کی تسکین کا سرمایہ ہے۔

اقبال کا ترانہ مسلمانوں کے قافلے کے لیے بانگِ درا کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس گھنٹی کی آواز اسی وقت بلند ہوتی ہے، جب قافلہ چلنے کے لیے تیار ہو۔ لو ہمارا قافلہ پھر چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

وطنیّت

وطن بہ حیثیت ایک سیاسی تصوّر کے

تمہیدی نوٹ

اقبال نے جہاں جہاں وطنیّت کی مذمّت کی ہے، اس کا مطلب عام لوگ غلط سمجھتے رہے ہیں وطنیّت

کے دو مفہوم ہیں :

اوّل کسی خاص وطن کا باشندہ ہونا۔ انسان جہاں پیدا ہوتا ہے، پرورش پاتا ہے، زندگی کے دن گزارتا ہے، اس خاک سے اسے طبعی محبّت ہوتی ہے۔ وہ اس کی بہتری اور بہبود کے لیے زیادہ سے زیادہ محنت کرتا ہے۔ دشمنوں کی یورش سے بچانے کے لیے تکلیفیں اٹھاتا اور اپنا خون بہاتا ہے کیونکہ اسی خاک کی حفاظت پر خود اس کی، اس کے بال بچّوں، عزیزوں اور کروڑوں دوسرے ہم وطنوں کی بہتری موقوف ہوتی ہے۔ اقبال نے کہیں بھی وطنیت کے اس مفہوم کو بُرا نہیں کہا۔

دوسرا مفہوم وہ ہے جو اہلِ یورپ نے اختیار کیا یعنی وطن کو قوم کی بنیاد قرار دے لیا۔ یورپ میں ہر قوم کی بنیاد وطن پر ہے۔ مثلاً انگریز قوم وہ ہے جو انگلستان میں رہتی ہے فرانسیسی قوم وہ ہے جو فرانس میں آباد ہے۔ انگی جرمن جرمنی میں، روسی روس میں وغیرہ۔ وطنیت کے اس مفہوم نے انسانوں کے ٹکڑے کر دیے۔ ان میں لڑائیاں اور خونریزیاں شروع ہو گئیں۔ یورپ اسی وطنیت کی وجہ سے دو مرتبہ نہایت خوف ناک جنگوں کا تختۂ مشق بنا اور تیسری جنگ کے بادل اب سر پر منڈلا رہے ہیں۔ وطنیت کے اسی مفہوم کے خلاف لگاتار آواز بلند کرتے رہنا اقبال کی زندگی کے بہت بڑے کارناموں میں ایک قابلِ قدر کارنامہ تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ یورپ دنیا پر مسلّط ہے۔ مسلمان سیاسی حیثیت سے کمزور ہو چکے ہیں۔ یورپی تہذیب اور علوم ان میں پھیل رہے ہیں۔ بعض مسلمان قوموں نے وطنیت کے یورپی مفہوم کو بھی اپنا لیا ہے۔ جو شے یورپ میں عام جنگ و جدل کا باعث بنی تھی وہ اسلامی ملکوں میں بھی پہنچ رہی ہے۔ اس وجہ سے انھوں نے مسلمانوں کو اس مصیبت سے بچانے رکھنا زندگی کا ایک مشن قرار دے لیا تھا اور وہ برابر اس میں لگے رہے۔ یہ نظم اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

افسوس کہ اکثر مسلمانوں نے وطنیت کے اُس مفہوم کا صحیح اندازہ نہ کیا جس کی مذمّت اقبال کر رہے تھے اور سمجھ لیا کہ وہ مرحوم عام وطن پروری کے بھی خلاف تھے جو ہر انسان کا فطری خاصّہ ہوتی ہے۔ غالباً اسی لیے اقبال کو تصریح کرنی پڑی کہ یہاں وطن بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے مراد ہے۔

وطنیت کے یورپی مفہوم کی کیفیت واضح کرنے کے لیے چند باتیں کہہ دینا ضروری ہے۔ مثلاً:

۱۔ اہلِ یورپ وطن کو قومی تعمیر کی بنیاد بناتے ہیں اور اسی کو تمام وفاداریوں کا مرکز قرار دیتے ہیں۔
۲۔ وطن اور مذہب یا وطن اور انسانیت میں کشمکش ہو جائے تو وہ حق و باطل سے قطع نظر کرتے ہوئے وطن کو ترجیح دیں گے۔
۳۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک مذہب اور سیاست الگ الگ چیزیں ہوئیں۔ اسلام زندگی کا مکمل نظام ہے۔ اس میں سیاست اور مذہب کی تفریق ہو ہی نہیں سکتی۔
۴۔ وطنیت کے یورپی تصور سے لادینی کی ہوا چلی اور یورپ کا بڑا حصہ پابندی سے آزاد ہو گیا۔
۵۔ وطنیت کے اس تصور نے انسانی زندگی کے بلند مقاصد ختم کر دیے اور ہر چیز سمٹ کر خاک کے اسی ٹکڑے میں جمع ہو گئی، جسے عرفِ عام میں وطن کہتے ہیں۔

اسلام ان میں سے کسی ایک چیز کا روادار نہیں ہو سکتا ——— وطنیت کا یورپی مفہوم اسلام کی دینی برادری کی بنیادیں ڈھا دینے والا ہے، لہٰذا اقبال کسی صورت میں بھی اس سے مصالحت روا نہیں رکھتے۔

تہذیب نوی : نئی تہذیب

موجودہ دور میں شراب، پیالہ، جشید سب وہی ہیں۔ شراب پلانے والے نے مہربانی اور ظلم کے دوسرے ہی طریقوں کی بنیاد ڈالی ہے۔ یعنی حکومت، قومیت اور سیاست کے نام پرانے طریقے بدل گئے اور نئے طریقے جاری ہو گئے۔ جن قوموں کو قوت اور طاقت کا مرتبہ حاصل ہوا، انھوں نے سب کچھ اپنے رنگ میں ڈھال لینے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ مسلمان نے بھی اپنے لیے نیا کعبہ بنا لیا۔ یورپی تہذیب کے بُت تراشوں نے نئے نئے بُت تراش لیے۔ ان بتوں میں جن کی پرستش آج کل کی جا رہی ہے سب سے بڑا بت وطن ہے۔ اس بُت کا لباس مذہب کا کفن ہے یعنی جب تک مذہب کو دفن نہ کر دیا جائے اس بُت کی پوجا نہیں ہو سکتی۔

یہ بُت جو نئی تہذیب نے تراش کر قائم کیا ہے۔ دینِ نبوی کا گھر تباہ و برباد کرنے والا ہے، یعنی اس بُت کے ہوتے ہوئے اسلام باقی نہیں رہ سکتا۔ اے مسلمان! تیرے بازو کو خدا نے توحید کی برکت سے قوت بخشی ہے۔ تیرا دیس اسلام ہے۔ تو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیوا ہے۔ اُٹھ، زمانے کو پھر پرانا نظارہ دکھا دے۔ اے مصطفیٰ کے نام لیوا اس بُت کو مٹا کر خاک میں ملا دے۔

اگر تو نے اہلِ یورپ کی پیروی میں اپنے آپ کو زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے وابستہ کر لیا تو اس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ تجھے چاہیے کہ سمندر میں مچھلی کی طرح وطن کی قید سے آزاد رہے۔ ترکِ وطن یعنی ہجرت خدا کے پیارے رسول کی

سُنّت ہے۔ تو بھی وطن سے بے نیاز ہو کر نبیؐ کے سچّے پیرو نہ بنے پر گواہی دے۔ سیاست کی بات چیت میں وطن کا مطلب اور ہے اور نبیؐ نے وطن کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس کا مطلب اور ہے۔ آخری مصرع میں غالباً اشارہ اس قول کی طرف ہے جسے عام طور پر غلطی سے حدیث سمجھا جاتا ہے۔ یعنی حُبِّ وطن ایمان کی نشانی ہے۔ اقبال نے اس شعر کے پہلے مصرع میں وطنیت کے یورپی مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے، دوسرے مصرع میں وطن پروری کی طرف اشارہ ہے۔

دنیا کی قوموں میں وطنیت کے یورپی مفہوم ہی کے باعث دشمنی پیدا ہوگئی ہے۔ اسی مفہوم کی بدولت تجارت کا مقصد یہ ٹھہر گیا کہ ساری دنیا پر قبضہ جمالیا جائے۔ سیاست میں سچائی باقی نہ رہے۔ حق و انصاف کا پاس اُٹھ گیا۔ کمزوروں اور ضعیفوں کو لوٹ کر اپنے گھر بھر لینا عام ہوگیا۔ خدا کی مخلوق سینکڑوں قوموں میں بٹ گئی اور اسلام دنیا میں محبّت، الفت اور اتحاد کا جو پیغام لے کر آیا تھا اس کی جڑ کاٹنے والا وطنیت کا یہی مفہوم ہے۔

سیاست کا سچائی سے خالی ہونا کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ یورپ کی پوری سیاست مکر و فریب، دغا بازی اور دھوکے پر مبنی رہی ہے۔ اسے عام اصطلاح میں ڈپلومیسی کہتے ہیں اور جو سیاست داں مکاری میں اونچا درجہ حاصل کرے اسے بڑا ڈپلومیٹ مانا جاتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یورپ نے اسی سیاست کی بدولت کمزور قوموں کو تباہ کیا یا غلام بنالیا۔

ایک حاجی مدینے کے راستے میں

تمہیدی نوٹ

سُلطان عبدالعزیز ابن سعود مرحوم کے حجاز آنے سے پیشتر مکّہ معظمہ اور مدینہ منوّرہ کے راستے مدّتِ دراز تک غیر محفوظ رہے۔ ہر سال بدو حاجیوں کے قافلوں پر حملے کرتے تھے۔ لوٹ مار اور خون ریزی ہوتی تھی۔ اِکّا دُکّا حاجی کے لیے تو آنا جانا بالکل ناممکن تھا جو لوگ قافلوں سے چند قدم بھی اِدھر اُدھر ہو جاتے تھے کم ہی بچتے تھے۔ انہیں وجہ سے حج و زیارت کا سفر لوگوں کے لیے جان بازی کا امتحان بن گیا تھا۔ اس دور میں اقبال کو غالباً یہ احساس ہوا کہ خطرات مسلمانوں کے جذبۂ زیارت میں افسردگی نہ پیدا کر دیں۔ ممکن ہے کوئی خاص واقعہ بھی انھوں نے کسی سے سُن لیا ہو، جس کا ذکر حکایتی نوجوان کے رنگ میں کیا ہے۔ بہر حال اس نظم کا مقصود یہ ہے کہ خطرات کتنی ہی نازک صورت اختیار کر جائیں، لیکن مسلمان

کو عشقِ رسولؐ کے کیف و سرور میں جان سے بے پروا ہو کر وہاں پہنچنا چاہیے۔ یہ نظم بہ اعتبارِ مضمون بھی اقبال کی عام تعلیم کے عین مطابق ہے۔ یعنی عشق کو عقل پر ترجیح دینا۔ راحت و آسایش کی زندگی کے بجائے خطرات و مصائب کی زندگی پسند کرنا مثلاً:

اگر خواہی حیات اندر خطر زی۔

یہ نظم ایک حاجی کی زبان سے کہی گئی ہے جو قافلے کے ساتھ مکّہ سے مدینہ جا رہا تھا۔ راستے میں ڈاکہ پڑا، کچھ لوگ مارے گئے، باقی مدینے کا قصد چھوڑ کر مکّہ کی جانب لوٹ پڑے اور یہ اکیلا رہ گیا۔

دشنہ: خنجر۔ **زہراب:** لفظی معنی زہر بھرا پانی۔ اصطلاحی معنی زہر یا پینے کی نہایت کڑوی شے۔ **مدفونِ یثرب:** لفظی معنی وہ پاک ذات جو مدینۂ منوّرہ میں دفن ہے۔ مراد ہے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے۔ **محملِ شامی:** جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ محمل کجاوے کو کہتے ہیں۔ مصر اور شام سے حرم کعبہ اور حرم مدینہ کے لیے غلاف بھیجنے کا دستور ہو گیا تھا۔ بڑے تکلف سے غلاف کے کپڑے تیار کیے جاتے تھے اور حج کے موقع سے کچھ روز پیشتر یہ مکّہ اور مدینہ پہنچتے تھے۔ اس غرض سے بادشاہوں نے شام اور مصر میں اوقاف قائم کر دیے تھے۔ تیاری کے بعد غلاف کجاووں میں رکھ کر بھیجے جاتے تھے۔ ان کی حفاظت کے لیے فوج ساتھ جاتی تھی۔ ہزاروں حاجی اور زائر بھی قافلے کی شکل میں ہمراہ ہوتے تھے۔ محملِ شامی سے مراد غلاف لانے والا وہ قافلہ ہے جو شام سے مدینۂ منورہ آتا تھا۔ **جاں کاہی:** لفظی معنی جان گھٹنا، مراد ہے محنت، مشقّت اور دکھ برداشت کرنے سے۔ **زیاں اندیش:** نقصان کی فکر کرنے والی۔

قافلہ کو بیاباں میں لوٹ لیا گیا۔ منزل بہت فاصلے پر ہے۔ بیابان کی حیثیت ایک خشک سمندر کی ہے۔ اس کا کنارہ دور ہے۔ یعنی سامان لُٹ جانے کے بعد بیابان کو طے کرنا اور آبادی میں پہنچنا بڑی مشکلات کا باعث ہو گا۔ میرے جتنے ساتھی تھے، لٹیروں کے خنجر کا شکار ہو گئے۔ جو بچ گئے وہ ہمّت ہار کر کعبے کی طرف لوٹ پڑے۔

ہمارے ساتھیوں میں بخارا کا ایک نوجوان بھی تھا۔ اس نے کس خوشی سے جان دے دی۔ معلوم ہوتا تھا کہ موت کا زہر بھرا پیالہ اس کے لیے زندگی کا سامان تھا۔ اس نے لٹیرے کے خنجر کو عید کا چاند سمجھ لیا۔ دل سے ہائے یثرب کا نعرہ اٹھتا تھا۔ لب پر لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کا ترانہ جاری تھا۔

جان کے خوف کا تقاضا یہ ہے کہ مدینے کی طرف اکیلے نہ جانا چاہیے لیکن عشقِ رسولؐ کا فرمان یہ ہے کہ تو مسلمان ہے بے خوف ہو کر چل۔ میں اگر روضۂ انور کی زیارت کے بغیر کعبے واپس چلا جاؤں گا تو قیامت کے دن عاشقانِ رسولؐ کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ حجاز کے بیابان میں پھرنے والے کو جان کا خوف نہ ہونا چاہیے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت میں یہی بھید چھپا ہوا ہے یعنی ہجرت سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔

حاجی اپنے دل سے کہتا ہے کہ اگرچہ محملِ شامی کے ساتھ سفر کرنے میں سلامتی ہے لیکن عشق خطرات کی مصیبتوں اور دکھوں ہی میں لذت پاتا ہے۔ عشق کا تقاضا یہی ہے کہ محبوب کے لیے جان خطرے میں ڈالی جائے۔
آہ! نقصان کی فکر کرنے والی عقل کیا چالاک بنتی ہے، وہ ہر وقت سود و زیاں کے چکروں میں پڑی رہتی ہے لیکن عشق کا جذبہ بہت بے باک، بے خوف اور نڈر ہے۔ وہ خطرات قبول کرتے وقت مشکلات کا کوئی خیال نہیں کرتا۔ اس کی نظر صرف محبوب پر جمی رہتی ہے۔

قطعہ

مرشدانِ خود بیں: صرف اپنی عزت اور نفع پر نظر رکھنے والے رہنما۔ اقبال انھیں صرف اصطلاحی معنی میں رہنما سمجھ رہے ہیں، نہ کہ حقیقی معنی میں۔ اسی لیے انھوں نے مرشدانِ خود بیں پر داوین لگا دیے۔
کل ایک دیوانہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری آرام گاہ پر رو رو کر کہہ رہا تھا کہ مصر اور ہندوستان کے مسلمان اسلامی ملت کی بنیاد ڈھا رہے ہیں۔ اس سے اقبال کی مراد یقیناً یہ ہے کہ دونوں جگہ کے مسلمان قومیت کی اسلامی بنیاد چھوڑ کر یورپی بنیاد اختیار کر رہے ہیں، نیز انھوں نے قوم کی حقیقی فلاح و بہبود کا طریقہ ترک کر کے حاکموں کی مصلحتوں کے مطابق کام شروع کر دیا ہے۔ ذاتی فائدے کے لیے وہ قومی فائدے کو قربان کر رہے ہیں۔
یہ لوگ یورپ کو کعبہ سمجھتے ہیں اور اس کی زیارت اپنے لیے فخر کا باعث جانتے ہیں۔ یہ ہزار ہمارے رہبر بنیں لیکن اے رسولِ پاک! جب انھوں نے آپ کی تعلیمات سے فائدہ نہ اٹھایا، آپ کے تجویز فرمائے ہوئے راستے سے شناسائی پیدا نہ کی تو ہمیں ان سے کیا واسطہ ہے؟
یہ اپنے خیال کے مطابق رہنما بنے ہوئے ہیں لیکن اپنی عزت اور نفع کے سوا انھیں کچھ نہیں سوجھتا۔ خدا ایسے رہنماؤں سے آپ کی قوم کو بچائے رکھے! یہ مسلمانوں کو بگاڑ کر اپنی عزت بنا رہے ہیں۔
اقبال! آپ کی یہ باتیں کون سنے گا؟ یہاں کا تو سارا نقشہ ہی بدل گیا۔ پرانی انجمن ہی باقی نہ رہی، نیا زمانہ آ گیا۔ اب اس میں پرانی باتیں سنانے سے کیا فائدہ ہے؟

شکوہ

تمہیدی نوٹ

یہ وہ شہرۂ آفاق نظم ہے جو اپریل ۱۹۱۱ء کے جلسۂ انجمن حمایتِ اسلام میں پڑھی گئی" تصویرِ درد" پڑھنے کے بعد اقبال ولایت چلے گئے۔ وہاں سے ۱۹۰۸ء میں واپس آئے اور دو تین سال انھوں نے "حمایتِ اسلام" کے جلسے میں کوئی نظم نہ پڑھی۔

اپریل ۱۹۱۱ء کا جلسہ ریواز ہوسٹل کے صحن میں ہوا تھا۔ اقبال نے یہ نظم معمول کے خلاف چھپوائی نہ تھی۔ اس کا مسودہ خریدنے کے لیے لوگوں نے بڑھ بڑھ کر بولیاں دیں۔ چونکہ وہ پہلے ترنم سے نظمیں پڑھتے رہے تھے اور یہ تحت اللفظ میں پڑھنی شروع کی تو شور مچا کہ ترنم سے سنائی جائے۔ فرمایا کہ یہ اسی طرح پڑھی جائے گی اور میں بہتر جانتا ہوں کہ نظم کیونکر سنانی چاہیے۔ یہ "پنجاب ریویو" میں چھپی تھی" مخزن" نے بھی جون ۱۹۱۱ء کی اشاعت میں چھاپ دی تھی۔

اس کی بنیادی خوبی جس کی طرف ابتدا ہی میں اجمالاً اشارہ کر دینا ضروری ہے، یہ ہے کہ اگرچہ موضوع کے لحاظ سے اس میں ایسی چیزیں آنی چاہییں تھیں، جو اوجِ عروج کے بعد مسلمانوں کے زوال کی دردناک داستان پیش کرتیں۔ خواجہ حالی مرحوم نے "شکوۂ ہند" میں یہی طریقہ اختیار کیا تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ نظم پڑھنے کے بعد آج بھی ہر انسان پر افسردگی اور پژمردگی طاری ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح قوم کے دلولوں اور حوصلوں پر اچھا اثر نہیں پڑتا۔ اس کے برعکس اقبال نے "شکوہ" میں ایسا انداز اختیار کیا، جس میں مسلمانوں کے عظیم الشّان، حوصلہ افزا اور زندۂ جاوید کارنامے پیش کرنے ہی پر اکتفا کی۔ لہٰذا اس نظم کے پڑھنے سے حوصلے بلند ہوتے ہیں۔ قوّتِ عمل میں تازگی آتی ہے۔ جوشش و ہمّت کو تقویت پہنچتی ہے۔ یہ اگرچہ شکوہ ہے اور شکوہ ہمیشہ ناخوشگوار حالات کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن نظم پڑھنے کے دوران میں ہرگز احساس نہیں ہوتا کہ مسلمان ناخوشگوار حالات سے دوچار ہیں۔ عظیم الشان کارنامے اس حسنِ ترتیب سے جمع کر دیے گئے ہیں کہ موجودہ پست حالی کے بجائے صرف عظمت و برتری ہی سامنے رہتی ہے۔ گویا یہ شکوہ بھی ہے اور ساتھ ہی بہترین دعوتِ عمل بھی۔ اس لحاظ سے اُردو زبان میں یہ اپنی نوعیت کی بالکل یگانہ نظم ہے۔

بند ۱

زیاں کار: اپنا نقصان کرنے والا۔ سُود فراموش: نفع بھلا دینے والا۔ جرأت آموز: دلیری سکھانے والی۔ گفتگو پر

آمادہ کرنے والی۔ **تابِ سخن**: شعر کہنے کا کمال۔ **خاکم بہ دہن**: لفظی معنی میرے منہ میں خاک۔ یہ جملہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے، جب کسی بڑی ہستی سے کوئی ایسی بات کہی جائے جو تقاضائے ادب کے خلاف ہو۔

میں کیوں اپنا نقصان کروں؟ کس وجہ سے اپنے نفع کو پس پشت ڈالے رہوں؟ کیا سبب ہے کہ میں آیندہ کی فکر نہ کروں اور گزشتہ کے غم میں ڈوبا رہوں؟ بلبل کے نالے سننے کے لیے سر سے پاؤں تک کان بنا رہا ہوں؟ اے میرے ہم زبان! اے میرے رفیق! کیا میں پھول ہوں کہ چپ بیٹھا رہوں؟ میری شاعری کا کمال مجھے لب کھولنے کا حوصلہ دلا رہا ہے۔ "میرے منہ میں خاک" آج مجھے خدا سے شکایت منظور ہے۔

بند ۲

شیوۂ تسلیم: فرماں برداری کی عادت یا روش۔

کوئی شبہ نہیں کہ فرماں برداری کی عادت اور روش میں ہمیں عام شہرت حاصل ہے۔ قضا و قدر کی بارگاہ سے جو فرمان ہمارے لیے جاری ہوا، ہمارا طریقہ یہی رہا کہ اس کے سامنے سر جھکا دیے، لیکن آج مجبور ہو کر اپنا دکھ بھرا ماجرا سناتے ہیں۔ ہماری حیثیت اس خاموش ساز کی ہے جو فریاد و فغاں سے بھرا ہوا ہو۔ اگر ہمارے لب پر نالہ آتا ہے تو ہمیں معذور اور بے بس سمجھنا چاہیے۔ اے خدا! ہم نادادوں کی زبان سے شکایت بھی سن لے۔ ہم ہمیشہ سے تیری حمد و ستائش کے عادی ہیں، آج تھوڑا سا گلہ بھی سماعت فرما لے۔

بند ۳

شمیم: خوشبو۔ **صاحبِ الطافِ عمیم**: عام لطف و عنایات کا مالک

اے خدا! اگرچہ تیری ذاتِ قدیم ازل ہی سے موجود تھی لیکن اس کی حیثیت کیا تھی؟ یہ کہ پھول تو باغ میں موجود تھا مگر اس کی خوش بو پھیلی نہ تھی۔

بے شک خدا کی ذات کائنات کی پیدائش سے بھی پہلے موجود تھی لیکن دنیا نے اس کا اقرار نہ کیا تھا اور اس کی موزوں مثال یہی ہو سکتی ہے کہ پھول موجود ہو اور خوش بو کا کسی کو پتا نہ چلے۔

اے عام لطف و عنایت کے مالک! تو عدل و انصاف کرنے والا ہے۔ ذرا یہ تو فرما کہ اگر ہوا نہ چلتی تو خوشبو ہر طرف کیونکر پھیلتی؟ ہم نے ہوا کا کام کیا اور خوشبو کو ساری دنیا میں پہنچا دیا۔ اسی کام کے لیے ہم مشرق و مغرب میں دوڑتے پھرتے رہے اور خوشبو پھیلانے کے سلسلے میں پریشانی کو اپنے دل کی تسلی کا سامان بنا لیا۔ اگر یہ مقصد سامنے نہ ہوتا

تو کیا تیرے محبوب خاص حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دیوانی تھی کہ جگہ جگہ خاک چھانتی پھرتی ؟

بند ۴

مسجود: جسے سجدہ کیا جائے۔ **معبود:** جس کی عبادت کی جائے۔ **پیکرِ محسوس:** مادی اور ٹھوس جسم۔ یہاں مراد ہے عبادت کی ان چیزوں سے جنھیں خدا کے سوا لوگ پوجتے تھے۔ جیسے پتھر کے بت، درخت، چاند، تارے وغیرہ۔

اے خدا! مسلمانوں کے ظہور سے پہلے تیری دنیا کا نقشہ بڑا ہی عجیب و غریب تھا۔ کہیں لوگ پتھروں کو سجدے کرتے تھے۔ کہیں درختوں کی پوجا ہوتی تھی۔ انسان کی نظر ٹھوس جسموں کی پرستش کی عادی تھی۔ پھر اُس خدا کو کوئی کیوں کر مانتا جو نظر نہ آسکے اور جس کی صفت لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ہے ؟ تجھے خود معلوم ہے کہ کیا کوئی شخص تیرا نام لیتا تھا ؟ ہرگز نہیں تیری ساری خدمت مسلمانوں کی قوتِ بازو نے انجام دی اور تیرا نام ہر جگہ پہنچایا۔

بند ۵

سلجوق: ترکوں کا قبیلہ جو اسلام لانے کے بعد ایشیا کی بہت بڑی سلطنت کا مالک بنا۔ الپ ارسلان اور ملک شاہ اس قبیلے کے مشہور تاجدار تھے، لیکن یہاں سلجوق سے اس قبیلے کے وہ افراد مراد ہیں جو اسلام سے پہلے موجود تھے۔ **تورانی:** توران کے باشندے یعنی ترکستانی۔ **ساسانی:** ایران کا مشہور شاہی خاندان جس سے مسلمان عربوں نے ایران کی سلطنت چھینی اسی کے بادشاہ نوشیرواں اور خسرو پرویز تھے۔ **معمورہ:** بستی یعنی دنیا۔

یہاں سلجوقی اور تورانی بھی تھے۔ چین میں اہل چین اور ایران میں ساسانی بھی موجود تھے۔ یونانی بھی اسی روئے زمین پر آباد تھے۔ یہودی اور عیسائی بھی اسی دنیا میں رہتے تھے، لیکن ان میں سے کون تھا، جس نے تیرے نام پر تلوار اٹھائی ؟ کون تھا جس نے تیری توحید کی خاطر زمانے بھر سے دشمنی مول لی ؟ ملک ملک میں بادشاہوں اور سرداروں کی پوجا ہوتی تھی گھر گھر بتوں کی عبادت کی جاتی تھی۔ تیرا نام لینے والا کوئی نہ تھا۔ دنیا کا نظام بگڑ گیا تھا۔ اے خدا! اسے ہمارے سوا کس نے سنوارا ؟

بند ۶

صرف ہمیں تھے جو تیری خاطر میدانِ کارزار گرم کرتے تھے۔ کبھی ہم نے خشکیوں میں لڑائیاں کیں، کبھی سمندروں میں کبھی ہم نے یورپ پہنچ کر وہاں کے گرجوں میں اذانیں کہیں، کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے بیابان ہماری اللہ اکبر کی

صداؤں سے گونج اٹھے۔ بڑے بڑے بادشاہوں کی شان ہماری آنکھوں میں نہ جچتی تھی اور ہم تلواروں کی چھاؤں میں بھی کلمہ پڑھتے تھے۔

بند ۷

ہماری زندگیاں تیرے نام کی خاطر جنگ کی مصیبتیں جھیلنے کے لیے وقف تھیں۔ ہماری جانیں تیرے نام کی بڑائی کے لیے قربان ہوتی تھیں۔ ہم تلواریں اس لیے نہ چلاتے تھے کہ سلطنت اور حکومت قائم کریں۔ کیا ہم اس غرض سے سربکف دنیا میں پھرتے تھے کہ دولت سے دامن بھر لیں؟ اگر ہماری قوم دنیا کے زر و مال کی شیدائی ہوتی تو بتوں کو بیچنے کے بجائے انھیں توڑنے کا کام کیوں انجام دیتی؟

آخری مصرع میں سلطان محمود غزنوی کے اُس واقعے کی طرف اشارہ ہے جو عام تاریخی روایت کے مطابق سومنات میں پیش آیا۔ سومنات کی فتح کے بعد محمود نے وہاں کے بُت کو توڑنا چاہا تو پجاریوں نے دولت کے ڈھیر اس کے سامنے پیش کیے کہ اس کو توڑا نہ جائے۔ محمود نے یہ دولت رد کر دی اور جواب دیا کہ میں قیامت کے دن اپنے لیے "بُت فروش" کے بجائے "بُت شکن" کا لقب پسند کرتا ہوں۔

یہ واقعہ عام تاریخوں میں بھی موجود ہے اور خواجہ فریدالدین عطّار نے بھی منطق الطیر میں اسے اسی طرح بیان کیا ہے لیکن یہ مستند نہیں۔ تاہم اس سے اقبال کے شعر پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ انھوں نے جو مضمون پیش کیا ہے اس کی سینکڑوں مثالیں اسلامی تاریخ میں موجود ہیں اور مضمون اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ خواہ تلمیحی واقعہ کی حیثیت کچھ ہو۔

بند ۸

اگر میدانِ جنگ میں کسی سے مقابلہ پیش آجاتا تھا تو ہمارے قدم پیچھے نہ ہٹتے تھے۔ اس لیے کہ قرآن مجید نے جنگ میں روگردانی سے منع کر دیا تھا، جیسا کہ فرمایا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ (اے ایمان والو! جب کافروں سے تمھیں مقابلہ پیش آجائے تو انھیں پیٹھ نہ دکھاؤ) بڑے بڑے شیر مرد بھی سامنے ہوتے تھے تو ان کے پاؤں اکھڑ جاتے تھے۔ اگر کوئی تجھ سے سرکشی اختیار کرتا تھا اور برتر انا فرمان بن جاتا تھا تو ہم آگ بگولا ہو جاتے تھے۔ تلوار کیا چیز ہے ہمیں تو توپ سے بھی لڑ جانے میں باک نہ تھا۔ ہمیں ہیں جنھوں نے توحید کا نقش ہر دل پر بٹھا دیا۔ دشمن تلوار لے کر بھی سر پر کھڑا ہو جاتا تو ہماری زبان سے یہی پیغام نکلتا کہ خدا ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔

۹
بند

خیبر: مدینہ منورہ سے شمال مغرب میں آٹھ منزل پر یہودیوں کی ایک بستی تھی، جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۷ھ میں فتح کیا۔ اس فتح کا سہرا حضرت علیؓ کے سر رہا۔ در خیبر سے مراد در اصل قلعہ قموص کی فتح ہے جو یہودیوں کے بڑے پہلوان مرحب کا مرکز تھا اور جس کی تسخیر کے لیے کئی مہیں ناکام رہیں۔ حضرت علیؓ نے مرحب کو قتل کر کے یہ قلعہ فتح کیا۔

قیصر کا شہر: اس سے مراد قسطنطنیہ ہے۔ جسے ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح عثمانی نے فتح کیا۔ **مخلوق خداوندان:** آپ تراشے ہوئے معبود یعنی بُت۔ **آتش کدۂ ایران:** اسلام کے ہاتھوں ایران کی فتح سے پہلے جو قوم وہاں حکمران تھی، وہ آتش پرست تھی یعنی آگ کو پوجتی تھی۔ ان کی عبادت گاہوں میں ہر وقت آگ جلتی رہتی تھی اور انھیں آتش کدے کہتے تھے۔ **یزدان:** خدا۔

اسے خدا! تو ہی بتا کہ خیبر کس نے فتح کیا اور اس کے سب سے مضبوط قلعہ قموص کا دروازہ کس نے اکھاڑا؟ قیصر کے شہر قسطنطنیہ کو کس نے سر کیا؟ انسانوں کے تراشے ہوئے بُت جنھیں پوجا جاتا تھا، کس نے توڑے؟ کافروں کے لشکر کس نے کاٹ کر رکھ دیے؟ کون تھا جس نے ایران کا آتش کدہ ٹھنڈا کیا؟ اور کون تھا جس نے خدا کا ذکر زندہ کر دیا؟

۱۰
بند

هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ: وہ اللہ ایک ہے۔

ہمارے سوا کون سی قوم ہے جو فقط تیری طلب میں مگن رہی اور تیری خاطر لڑائیوں کی سختیاں سہتی رہی؟ کس کی تلوار نے دنیا کو فتح کیا اور اس کا انتظام سنبھالے رکھا؟ کس کے نعرۂ تکبیر سے غفلت کی ماتی دنیا کی آنکھیں کھلیں؟ کون تھا جس کے رُعب اور دبدبے سے بتوں پر خوف طاری ہو جاتا تھا اور وہ سہم جاتے تھے؟ کون تھا جس کے رُو برو بُت منہ کے بل گر گر کر خدا کے ایک ہونے کا اقرار کرتے تھے؟ یعنی یہ سب کارنامے مسلمانوں نے انجام دیے۔

۱۱
بند

یہاں تک توحید کی اشاعت اور دینِ پاک کی خدمت کے لیے مسلمانوں کے ہمیشہ زندہ رہنے والے کارناموں کا ذکر تھا۔ اس بند میں اسلامی مساوات کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اسلامی مساوات کی بہترین تصویر نماز ہی میں نظر آتی ہے اقبالؔ کا کمال یہ ہے کہ نماز کا نقشہ بھی میدانِ جنگ میں پیش کیا۔

لڑائی کے دوران میں نماز کا وقت آجاتا تھا تو مسلمان قوم قبلے کی طرف منہ کر کے سجدے میں گر جاتی تھی۔ اعلیٰ ادنیٰ، بادشاہ اور خادم ایک صف میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ آقا اور غلام میں کوئی تمیز نہ رہتی تھی۔ خدمت گار اور صاحب فقیر اور امیر ایک ہو جاتے تھے اور تیرے دربار میں پہنچ کر ان میں کوئی فرق نہ رہتا تھا۔

۱۲
بند

بحر ظلمات: اس سے وہ سمندر مراد ہے جسے ہمارے ہاں اوقیانوس یا اٹلانٹک کہتے ہیں۔ یہ افریقہ، یورپ اور امریکہ کے درمیان واقع ہے۔ گھوڑے دوڑانے سے عقبہ بن نافع کے واقعے کی طرف اشارہ کیا، جس نے مراکش فتح کیا اور جب سمندر کے کنارے پہنچا تو بہ حالتِ جوش گھوڑا سمندر میں ڈال دیا۔ پھر آسمان کی طرف منہ کر کے بولا۔ اے خدا! افسوس کہ تیری زمین ختم ہو گئی، ورنہ میں اسی طرح فتح کرتا اور ہر جگہ تیرے دین کی روشنی پہنچاتا چلا جاتا۔

ہم صبح اور شام اس دنیا کی محفل میں پھرتے رہے۔ ہمارے ہاتھ میں توحید کی شراب تھی اور اسی طرح گردش کرتے رہے جس طرح پیالہ گردش میں رہتا ہے۔ ہم تیرا پیغام لے کر پہاڑوں اور بیابانوں میں پھر نکلے اور تو خوب جانتا ہے کہ کبھی نامراد بھی واپس ہوئے؟ بیابان تو ایک طرف رہے۔ ہم نے تو سمندر بھی نہ چھوڑے اور بحر ظلمات کی موجوں میں گھوڑے ڈال دیے۔

۱۳
بند

ہم نے روئے زمین سے باطل کا نقش مٹا کر رکھ دیا۔ انسان غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ یہ زنجیریں توڑ کر ہم نے انھیں آزاد کر دیا۔ تیرے کعبے میں ہم نے اپنے سجدوں سے آبادی کی رونق اور چہل پہل پیدا کر دی۔ تیرے قرآن کو ہم نے سینوں سے لگا کر رکھا۔ ان سب خدمتوں کے باوجود تجھے یہ گلہ ہے کہ ہم نے وفاداری کی شرطیں پوری نہ کیں۔ تو ہمیں بے وفا قرار دیتا ہے، لیکن تو نے دل داری کا حق کب ادا کیا؟

۱۴
بند

دنیا میں اور امتیں بھی ہیں۔ ان میں گنہگار بھی ہیں، عاجز بھی ہیں، غرور کی شراب کے بدمست بھی ہیں، سست، غافل یا ہوشیار، غرض ہر قسم کے لوگ ہیں اور سینکڑوں ایسے ہیں جو تیرا نام بھی سننے کے روادار نہیں۔ لیکن تعجب کا مقام

ہے کہ غیروں کے کاشانوں پر تو تیری رحمت کے بادل موتی برسا رہے ہیں اور بے چارے مسلمانوں پر بجلیاں گر رہی ہیں۔

بند ۱۵

اب یہ حال ہے کہ بت خانوں میں پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مسلمان رخصت ہو گئے۔ وہ خوش ہیں کہ کعبے کے پہرے دار چلے گئے۔ وہ لوگ اٹھ گئے جو اونٹوں کے قافلے میں حُدی خوانی کرتے تھے۔ جاتے وقت قرآن کو انھوں نے اپنی بغلوں میں دبا رکھا تھا۔ یعنی مسلمان ہی رخصت نہ ہوئے، ان کے ساتھ قرآن کی تعلیم بھی رخصت ہو گئی، کفر اس صورتِ حال کی ہنسی اُڑا رہا ہے۔ اے خدا! کیا تجھے کچھ احساس نہیں؟ ہمیں تو چھوڑ دے کیا تجھے اپنی توحید کا بھی کوئی خیال نہیں؟

بند ۱۶

حُور و قصور: یہ دونوں چیزیں بہشت کی خاص نعمتیں سمجھی جاتی ہیں یعنی خوب صورت بیویاں اور عالی شان محل۔ یہاں بہ ظاہر اقبال کا اشارہ غیر مسلموں کی دولت و ثروت اور عیش و عشرت کے سامانوں کی طرف ہے۔ **مدارات:** خاطر داری۔

ہمیں یہ شکایت نہیں کہ ان لوگوں کے خزانے دولت سے بھرے ہوئے ہیں، جنھیں مجلس میں بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں مثلاً کھانا پینا وغیرہ۔ غضب تو یہ ہے کہ کافروں کو دنیوی عیش و عشرت کے تمام سامان حاصل ہیں۔ ان کے پاس عالی شان محل اور بنگلے ہیں اور زندگی کی کوئی ضروری چیز نہیں جو ان کے ہاں کثرت سے موجود نہ ہو، لیکن مسلمان بے چارہ صرف حور کے وعدے پر جی رہا ہے۔ ہم پر پہلے کی سی مہربانیاں اور عنایتیں باقی نہیں رہیں۔ کیا بات ہے کہ وہ خاطر داری اب نظر نہیں آتی؟

بند ۱۷

سیلی زدہ: جسے تھپڑ مارا جائے۔

مسلمانوں میں دنیا کی دولت کیوں نظر نہیں آتی؟ ان کے پاس روپیہ نہیں، سلطنت نہیں، حکومت نہیں۔ وہ کیوں ان تمام چیزوں سے محروم ہو گئے؟ اے خدا! تیری قدرت کی تو نہ کوئی حد ہے اور نہ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تیری مرضی ہو تو جس بیابان میں منزلوں تک پانی کا نشان نہ مل سکے، وہ سمندر بن جائے اور اس کی سطح پر بلبلے ابھرنے لگیں۔ سراب کی جگہ موجیں اٹھنے لگیں اور مسافران کے تھپیڑوں کا تختۂ مشق بن جائے۔ پھر مسلمانوں کے تعلق میں تیری قدرت کے کرشمے کیوں ظاہر نہیں ہوتے؟ ان کا حال یہ ہے کہ غیر طعنے دے رہے ہیں۔ بدنامی اور مفلسی نے گھیر رکھا ہے۔ ہماری قوم ہمیشہ

تیرے نام پر مرتی رہی، کیا ان قربانیوں کا بدلہ ذلّت و نامرادی ہے؟

بند ۱۸

دنیا اب غیروں سے محبت کر رہی ہے ہمارے لیے تو اس میں کوئی جگہ نہیں رہی۔ صرف ایک خیالی دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم رخصت ہو گئے۔ دوسروں نے آ کر تیری دنیا کو سنبھال لیا۔ پھر یہ شکایت نہ کرنا کہ یہ جہان توحید کی شراب سے خالی ہو گیا ہماری زندگی کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ تیرا نام مشرق و مغرب میں روشن رہے اگر ہمیں نہ رہے تو پھر تیرا نام کون لے گا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ شراب پلانے والا تو اٹھ جائے اور پیالہ باقی رہ جائے؟ مراد یہ ہے کہ دنیا کو توحید کی شراب مسلمانوں نے پلائی۔ وہی اس مے خانے کے ساقی تھے۔ اگر وہ مٹ گئے تو شراب توحید کا پیالہ کیونکر گردش میں رہے گا؟

بند ۱۹

خدا پرستی کی محفل بھی ختم ہو گئی۔ خدا پرست بھی اٹھ گئے۔ وہی لوگ تھے جو رات بھر تیرے عشق میں آہیں بھرتے تھے۔ ان کی زبانوں سے نالہ و شیون کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری رہتے تھے۔ یہ سب چیزیں ان کے ساتھ ختم ہو گئیں وہ اپنا دل تجھے دے گئے۔ اس کا صلہ ان کے مقدّر میں تھا۔ لے گئے۔ وہ آ کر محفل میں اطمینان سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ نکال دیے گئے۔ یعنی ان کا دور بہت جلد ختم ہو گیا۔ وہ سچّے عاشق آئندہ کل کا وعدہ لے کر چلے گئے۔ اب انھیں اپنے حسین و درخشاں چہرے کا چراغ لے کر ڈھونڈ لے۔

اس بند میں بظاہر مسلمانوں کے ابتدائی دور کا حال بیان کیا گیا ہے۔

بند ۲۰

رمِ آہو: ہرن کا دوڑنا بھاگنا۔ آزردگیٔ بےسبب: بے وجہ ناراضی۔

اس بند میں موجودہ حالت کی طرف رجوع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محبوب کا در اب بھی وہی ہے اور عاشق کے پہلو میں اب بھی پہلا سا جذبہ موجود ہے۔ نجد کے بیابانوں اور پہاڑوں میں اب بھی ہرن دوڑ بھاگ رہے ہیں۔ عاشقوں کے عشق میں کوئی فرق نہیں آیا۔ حسن کا جادو بھی پہلے کی طرح کارگر ہے۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امّت بھی وہی ہے۔ اور اے خدا تو بھی وہی ہے۔ پھر یہ بے وجہ ناراضی کیوں؟ اور جو لوگ تجھ پر جانیں فدا کرنے کے لیے بے قرار رہتے ہیں۔

ان پر خفا ہونے کا کیا سبب ہے؟

ظاہر ہے کہ اس بند میں در و لیلا اور حسن کا جادو سے مراد اسلام، قرآن اور دینِ حق ہے۔ "قیس کا پہلو" اور "عشق کا دل" سے اشارہ مسلمانوں کی طرف ہے۔ یعنی مسلمانوں نے اپنی طرف سے دینِ حق کے عشق میں ذرا کوتاہی نہ کی۔ وہ خدا کی راہ میں جانیں قربان کرتے رہے، لیکن معلوم نہیں، کس وجہ سے ان پر عتاب نازل ہوا؟ اگلے دو بندوں میں اس مضمون کی مزید تشریح کی ہے۔

۲۱
بند

آشفتہ سری: دیوانگی۔

اے خدا! کیا ہم نے تجھے یا رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیا؟ کیا بتوں کا توڑنا ترک کر کے بتوں کا تراشنا اپنا پیشہ بنا لیا؟ کیا ہمارے عشق اور سر اس کی دیوانگی میں کوئی فرق آگیا؟ کیا حضرت سلمانؓ فارسی اور حضرت اویسؓ قرنی کے طریقوں سے دست بردار ہو گئے؟ ان میں سے تو کوئی بھی بات نہیں ہوئی۔ ہمارے سینوں میں اب بھی تکبیر کی آگ دبی ہوئی ہے اور ہماری زندگی حضرت بلالؓ حبشی جیسی ہے جو اسلام اور عشق رسولؐ کی خاطر دنیا بھر کی تکلیفوں کو صبر سے برداشت کرتے رہے۔

۲۲
بند

مانا کہ ہم میں عشق کی پہلی سی ادا باقی نہیں رہی۔ ہم تسلیم و رضا کے راستے پر اس طرح قائم نہ رہے، جس طرح قائم رہنے کا حق تھا۔ یہ بھی مانا کہ اب ہمارے دل قبلہ نما کی طرح بے قرار نہیں اور وفا کے طور طریقوں کے پابند بھی ہم نہیں رہے لیکن گستاخی معاف، یہ عجیب بات ہے کہ کبھی ہم سے یارانہ گانٹھا جاتا ہے اور کبھی غیروں سے پینگیں بڑھائی جاتی ہیں۔ کہنا زیب نہیں دیتا، لیکن کہے بغیر چارہ بھی نہیں، تو بھی تو ہرجائی ہو گیا ہے تو نے بھی تو ہم سے وفاداری کا عہد نہیں نبایا۔

۲۳
بند

فاران: حجاز کا پہاڑ۔ توراۃ کی کتاب استثنا میں ہے:

خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر آشکارا ہوا اور کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا۔

(استثنا، باب ۳۳ آیت ۲-)

سینا، شعیر اور فاران سے دعوتِ موسویؑ، دعوتِ عیسویؑ اور دعوتِ محمدیؐ کی طرف اشارہ ہے۔ اقبال نے سرِ فاران پر جس دین کے کامل ہونے کا ذکر کیا ہے وہ اسلام تھا۔ آتش اندوز: آگ جمع کرنے والا۔ تپش اور حرارت

سے بھرا ہوا۔ **شررآباد:** چنگاریوں سے بھرے ہوئے۔ **سوختہ ساماں:** جو اپنا سامان جلا بیٹھے ہوں یعنی عاشق۔
اے خدا! تو نے دینِ اسلام کو فاران کی چوٹی پر مکمل کر دیا ——— اشارہ ہے اس آیتِ پاک کی طرف کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ——— آج کے دن میں نے تمھارا دین تمھارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمھارے لیے دینِ اسلام پر راضی ہوا۔
ایک اشارہ کر کے تُو نے ہزاروں کے دل چھین لیے۔ عشق کے حاصل میں بلا کی تپش اور حرارت بھر دی، یعنی عشق کو اس درجے پر پہنچا دیا کہ اس سے اونچا درجہ ممکن نہیں۔ گویا اپنے چہرے کی تاب ناکی سے محفل کے دل میں آگ لگا دی۔
پھر کیا سبب ہے کہ آج ہمارے سینوں میں پہلے کی طرح چنگاریوں کی فراوانی نہیں رہی ؟ ہم وہی پرانے عاشق ہیں کیا تجھے یاد نہیں رہا ؟

۲۴
بند

سلاسل: سلسلہ کی جمع۔ زنجیریں۔

کیا وجہ ہے کہ نجد کی وادی میں زنجیروں کا شور نہیں رہا۔ قیس اب لیلا کا محمل دیکھنے کے لیے دیوانہ وار نہیں پھرتا پرانے حوصلے ختم ہو گئے۔ ہم بھی بدل گئے۔ ہمارے دل بھی بدل گئے۔ یہ سارا گھر اس سبب سے اُجڑ گیا کہ تو ہماری محفل میں رونق کا باعث نہیں رہا۔ یعنی ہماری قربانیاں، ہماری جان بازیاں اور ہمارا سارا جوش تیرے لطف و نوازش کے باعث تھا۔ اب ہماری تمام پرانی خصوصیتیں ختم ہو چکی ہیں۔ وہ دن کتنا مُبارک ہو گا جب تو ہماری محفل میں دوبارہ آ گئے گا اور سینکڑوں تازہ ادائیں لے کر آئے گا۔ پھر بے تکلف ہماری محفل کے لیے رونق کا باعث بن جائے گا۔

۲۵
بند

جام بکف: ہاتھ میں شراب کا پیالہ لیے ہوئے۔ **نغمۂ کوکو:** قمری کا گیت۔ **ہُو:** ھو اللّٰہ کا مخفف یعنی وہ اللّٰہ۔
اہلِ فکر کی محفل میں دستور ہے کہ وہ حلقہ بنا کر بیٹھتے اور اللّٰہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ حلقے کا رئیس تھوڑی دیر کے بعد ہُو کا نعرہ لگاتا ہے۔ ساتھ ہی اہلِ حلقہ پر بے تابی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بھی اللّٰہ اللّٰہ یا اِلّا اللّٰہ اِلّا اللّٰہ کے نعرے لگاتے ہیں۔ شعر میں اشارہ فارسی کی مشہور مثل دیوانہ را ہوئے بس است کی طرف بھی ہے۔ یعنی دیوانے کو کھیل کھیلنے کے لیے صرف کلمۂ ھُو کافی ہوتا ہے۔ **خود افروزی:** اپنے آپ کو چمکانا۔
غیر مُسلم باغ میں ندّی کے کنارے بیٹھے شراب پی رہے ہیں۔ یعنی عیش و عشرت میں مصروف ہیں۔ شراب کے پیالے

ہتھیلیوں پر رکھے ہیں اور قمری کے گیت کانوں میں پہنچ رہے ہیں۔ تیرے دیوانوں کا یہ حال ہے کہ باغ کے اس ہنگامے سے الگ تھلگ دور بیٹھے ہیں اور انھیں "ہو" کے نعرے کا انتظار ہے۔ جو عاشق پروانوں کی طرح تجھ پر جل مرنے کے لیے تیار ہیں، ان میں پھر اپنے آپ کو چمکانے اور جلانے کا شوق پیدا کر۔ عشق کی پرانی بجلی کو حکم دے کہ ہمارے کلیجوں میں آگ لگا دے۔

پہلے شعر میں اغیار کی حالت ایسے انداز میں بیان کی ہے، جس سے واضح ہو جائے کہ مسلمانوں کو وہ مقام نصیب نہیں، لیکن تیری نظر عنایت ہو تو ان میں پہلی سی شانِ فداکاری پیدا ہو سکتی ہے۔

۲۶
بند

عنانِ تاب: باگ موڑنے والی۔

اے خدا! میری قوم نے سرگردانی اور پریشان حالی سے بیزار ہو کر اپنی باگ پھر اپنے مرکز حجاز کی طرف موڑی ہے، یعنی اس میں خدمت اسلام کے جذبات ابھرے ہیں۔ اگرچہ یہ بے پر بلبل ہے اور اس کے پاس اڑنے اور بلندی پر پہنچنے کا ساز و سامان موجود نہیں، لیکن پرواز کا شوق اسے بے اُڑا ہے۔ باغ کی ہر کلی میں عجز و نیاز اور تسلیم و فرماں برداری کی خوشبو بسے قرار ہو رہی ہے۔ ہمارا ساز مضراب کا پیاسا ہے۔ تو اُسے ذرا چھیڑ کر دیکھ۔ اس کے اندر جو نغمے بھرے ہوئے ہیں، وہ تاروں سے نکلنے کے لیے بے تاب ہیں اور طُور اسی آگ میں جلنے کے لیے بے چین ہے۔

مراد یہ ہے کہ ہم میں پھر پُرانے جذبے تازہ ہو گئے ہیں۔ ہم اپنی غلطیوں اور گناہوں پر پشیمان ہو کر دوبارہ تیری چوکھٹ پر آ گرے ہیں۔ تو ہم پر نظرِ عنایت فرما تاکہ دینِ حق کی وہی خدمت پھر انجام دیں جو ہمارے بزرگوں نے انجام دی تھی۔

۲۷
بند

مورِ بے مایہ: حقیر اور بے سامان چیونٹی۔

اے خدا! اپنے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی مشکلیں آسان کر دے۔ یہ حقیر اور بے سامان چیونٹی ہے اسے سلیمان کا رتبہ بخش۔ محبت کی جو جنس آج کل نہیں ملتی، اسے پھر عام اور سستا کر دے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں بُت پرستوں کے میل ملاپ کے باعث انھیں کی سی خصلتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ یہ نام کے مسلمان نہ رہیں۔ انھیں پھر سچے مسلمان بنا دے۔ ہمارے دل میں مدت سے جو حسرت بیٹھی ہوئی ہے۔ اس سے خون کی ندی بہ نکلی ہے اور ہمارے نشتروں سے بھرے ہوئے سینے میں نالے تڑپ رہے ہیں۔

بند ۲۸

غمّازہ: چغل خور۔ زمزمہ پرداز: گیت گانے والا۔ تلاطم: طوفان۔

خود پھول کی خوشبو باغ کا بھید باغ سے باہر لے گئی۔ غضب ہو گیا کہ خود پھول باغ کی چغلی کھانے لگے۔ بہار کا موسم ختم ہو گیا۔ چمن کا کاروبار درہم برہم ہو گیا۔ گیت گانے والے ڈالیوں سے اُڑ گئے۔ صرف ایک بلبل رہ گئی جو اب تک گانے میں مگن ہے اور اس کے سینے میں نغموں کا طوفان بپا ہے۔

آخری شعر میں ایک بلبل سے اشارہ اقبال نے اپنی طرف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خود مسلمانوں نے چغلیاں کھا کر مسلمانوں کو تباہ کیا اور ان کے سچے رہنما ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔

بند ۲۹

قمریاں صنوبر کی شاخ چھوڑ کر اڑ گئیں۔ پھول کی پتّیاں جھڑ جھڑ کر بکھر گئیں۔ باغ کی پرانی کیاریاں اجڑ گئیں۔ ڈالیاں پتّوں کے لباس سے خالی ہو گئیں۔ باغ کی اس ویرانی و بربادی کے باوجود اس بلبل کے گانے پر کوئی اثر نہ پڑا۔ وہ بہار و خزاں سے بالکل بے پروا رہی۔ کاش! اس باغ میں کوئی ایسا ہوتا جو اس کی فریاد سمجھ سکتا۔

بند ۳۰

اپنی حالت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اب تو نہ جینے میں کوئی لطف ہے اور نہ مرنے میں کوئی مزہ۔ خونِ جگر پینے کے سوا کوئی کام نہیں۔ میں کیا بتاؤں کہ میرے آئینے کے جوہر کتنے بے قرار ہیں اور میرے سینے میں کس قدر جلوے تڑپ رہے ہیں، لیکن اس باغ میں دیکھنے والے کہاں ہیں؟ لالے کے وہ پھول کہاں ہیں جن کے سینے داغدار ہوں؟

بند ۳۱

آخری بند دُعائیہ ہے۔ فرماتے ہیں: اے خدا! اس اکیلی بلبل کے نغموں سے دلوں کو پھر گرما دے۔ میری آواز ذرا سے سب کو جگا دے۔ وفا کے نئے عہد سے دلوں کو پھر زندہ کر دے اور انھیں پرانی شراب کے پیاسے بنا دے میرا خم اگرچہ عجمی ہے لیکن میری شراب خالص اسلامی ہے۔ میرا نغمہ اگرچہ ہندی ہے مگر اس کی لَے حجازی ہے۔

مُراد یہ ہے کہ اگرچہ میں نے اپنے شعروں میں ایرانی شاعروں کا سا رنگ اختیار کیا اور اگرچہ اردو میں یہ نظم لکھی

لیکن اس کا مضمون اور انداز سراسر اسلامی ہے۔

چاند

حسیم خاکی : دُنیا

پہلا بند

اسے چاند! تیرا حُسن کائنات کے لیے عزّت و آبرو کا باعث ہے۔ اس دنیا کے اردگرد چکّر لگانا ابتدا سے تیری عادت چلی آتی ہے۔ یہ تیرے سینے میں جو داغ سا نظر آتا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا تو کسی کا عاشق ہے اور یہ آرزو کا داغ ہے؟ میں زمین پر بے قرار رہتا ہوں تو آسمان پر بے چین ہے۔ تو بھی کسی کی تلاش میں ہے، میں بھی کسی کی تلاش میں ہوں۔ تیری محفل وہی ہے جس میں انسان شمع بنا ہوا ہے۔ یعنی کائنات جس کی رونق انسان کے دم سے ہے میں جس طرف جا رہا ہوں، کیا تیری منزلِ مقصود بھی وہی ہے۔

دوسرا بند

تو جس محبوب کو تاروں کی سنسان فضا میں ڈھونڈتا ہے وہ شاید زندگی کے شور و غل میں چھپا ہوا ہے۔ وہ سرو کی شکل میں کھڑا ہے۔ سبزے کے لباس میں سو رہا ہے۔ بُلبل کی صورت میں نغمے گاتا ہے۔ اور کلی کے رنگ میں چُپ یا خاموش ہے۔ آ، میں تجھے اس کا روشن چہرہ ندیوں کے آئینے اور شبنم کی آرسی میں دکھاؤں۔ اے چاند! بیابان، جنگل، آبادی اور پہاڑ میں وہی ہے۔ انسان کے دل اور تیرے چہرے میں بھی اُسی کا جلوہ ہے۔

اس نظم میں بھی فکر کا وہی انداز ہے جو جگنو اور بعض دوسری نظموں میں اختیار کیا گیا تھا۔

رات اور شاعر

۱
رات

رات شاعر سے مخاطب ہو کر کہتی ہے: تو میری چاندنی میں پریشان کیوں پھر رہا ہے؟ صورت دیکھو تو پھول کی طرح خاموش۔ حالت دیکھو تو خوشبو کی طرح آوارہ و سرگرداں۔ تو شاید تاروں کے موتیوں کا جوہری ہے یعنی پرکھ رہا ہے کہ ان میں سے کون سے موتی سچے ہیں اور کون سے جھوٹے۔ تیرے تڑپتے پھرنے سے خیال ہوتا ہے کہ ہو نہ ہو تو میرے دریائے نور کی کوئی مچھلی ہے۔ چاندنی رات میں شاعر کی پریشانی اور بے قراری کے لیے کتنی عمدہ تشبیہ پیدا کی۔

یا میں یہ سمجھوں کہ تو میری پیشانی کا کوئی گرا ہوا تارا ہے جو بلندی کو چھوڑ کر پستی میں آ کر بس گیا ہے۔ سازِ زندگی کے تار خاموش ہو گئے۔ مستِ خواب دنیا کی تصویر میرے آئینے میں نظر آ رہی ہے۔ دریا کی تہ میں بھنور کی آنکھ نیند سے بند ہو گئی ہے۔ بے قرار لہر کنارے سے لگ کر سو گئی ہے۔ زمین کی بستی میں دن کے وقت کتنے ہنگامے بپا رہتے ہیں۔ اب وہ اس طرح محوِ خواب ہے، جیسے اس میں کوئی آبادی نہ ہو، لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ شاعر کے دل کو کیوں سکون اور چین نہیں؟ ساری دنیا پر میرا جادو چل گیا تو کس طرح اس سے بچ نکلا؟

۲
شاعر

شاعر جواب دیتا ہے: اے رات! میں تیرے چاند کی کھیتی میں موتی بوتا ہوں۔ انسانوں سے چھپ کر صبح کی طرح روتا ہوں۔

صبح کے رونے سے مراد ہے شبنم کا گرنا یعنی جس طرح صبح کے وقت شبنم گرتی ہے اسی طرح میں رو رو کر چاند کی کھیتی میں موتیوں کے دانے بوتا ہوں۔

میرے آنسو دن کے شور و غل میں نکلتے ہوئے شرماتے ہیں اور رات کو تنہائی نصیب ہوتی ہے تو بے اختیار بہنے لگتے ہیں۔ مجھ میں جو فریاد چھپی ہوئی ہے وہ کسے سناؤں؟ کون ہے جو میرے عشق کی جلن دیکھے؟ میرے سینے پر طور کی بجلی پڑی رو رہی ہے، لیکن کیا بتاؤں کہ اسے دیکھنے والی آنکھ کہاں سو رہی ہے؟ قبر کے چراغ کی طرح میں

اس محفل میں جل رہا ہوں، جس میں مُردے ہی مُردے ہیں۔ زندہ کوئی نہیں۔ اے رات! آہ! میری منزل بڑی دور ہے۔

مراد یہ ہے کہ جنھیں خوابِ غفلت سے جگانا چاہتا ہوں، ان کی نیند مُردوں کی سی ہے۔ یہ کب زندہ ہوں؟ کب میری فریاد سنیں؟ اور کب میں منزلِ مقصود پر پہنچوں؟

اس محفل کے لیے موجودہ دور کی ہوا سازگار نہیں اور یہ اپنے نقصان سے بالکل بے پروا ہے۔ جب میں محبّت کے پیغام کو ضبط کرتے کرتے تنگ آجاتا ہوں تو اے رات! یہ پیغام تیرے چمکتے ہوئے تاروں کو سنا کر دل کی بھڑاس نکال لیتا ہوں۔

بزمِ انجم

فلک فروزی: آسمان کو روشن کرنا۔ **جذبِ باہمی**: ایک دوسرے کو کھینچنا، مراد ہے کشش جس سے تاروں، چاند، سورج، زمین وغیرہ کا نظام قائم ہے۔

پہلا بند

سورج نے غروب ہوتے ہوتے شام پر جس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ افق کے تھال سے لالے کے پھول لے کر پھینکے۔

مراد یہ ہے کہ سورج چھپ گیا۔ شام ہوگئی، ہلکا ہلکا اندھیرا چھا گیا۔ افق پر شفق کی سُرخی نمایاں ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن چیزوں پر سفیدی جھلکتی ہوئی نظر آتی تھی، ان پر سنہرا رنگ چھا گیا۔ گویا قدرت نے چاندی کے تمام گہنے اتار دیے اور شفق نے ہر شے کو سونے کا زیور پہنا دیا۔

رات کے اندھیرے کی لیلا مخاموشی کے کجاوے میں بیٹھ کر آئی یعنی اندھیرا چھانے لگا اور شور و غل کی جگہ خاموشی پھیلنے لگی رات کی دلھن کے پیارے پیارے موتی چمکنے لگے، وہی موتی جو دنیا کے ہنگاموں سے بہت دور رہتے ہیں اور جنھیں انسان اپنی زبان میں تارے کہتا ہے۔ تارے آسمان کی انجمن ہیں۔ وہ آسمان کو روشن کرنے میں مگن ہو گئے۔ عین اس موقع پر عرش کے جھروکوں سے ایک فرشتے کی صدا آئی۔

دوسرا بند

وہ صدا کیا تھی؟ یہ تھی کہ اے رات کے پہرے دارو! اے آسمان کے تارو! تمھاری پوری قوم آسمان پر بیٹھی ہوئی چمک دمک رہی ہے۔ کوئی ایسا نغمہ چھیڑو جو سونے والوں کو جگا دے۔ تمھاری پیشانی کی چمک قافلوں کو راستہ دکھاتی ہے یعنی قافلے تاروں کو دیکھ کر منزلِ مقصود کی راہ لیتے ہیں۔ زمین والے تمھیں اپنی قسمتوں کے آئینے سمجھتے ہیں یعنی نجومی تاروں کی گردش کے حساب سے لوگوں کی قسمتوں کا حال بیان کرتے ہیں۔ شاید وہ تمھاری صدا سُن لیں۔
فرشتے کی صدا سُنتے ہی تاروں بھری فضا کی خاموشی ختم ہو گئی اور مندرجہ ذیل صدا آسمان کے پھیلاؤ میں گونجنے لگی۔ یہ تاروں کی صدا تھی۔

تیسرا بند

تاروں کی دل کشی میں حُسنِ ازل اسی طرح نمایاں ہے جس طرح شبنم کی آرسی میں پھول کا عکس نظر آتا ہے۔ نئے قاعدوں سے ڈرنا اور پرانے طور طریقوں پر اڑے رہنا قوموں کی زندگی میں سب سے کٹھن منزل ہے۔ یعنی قومیں ہمیشہ نئے دستوروں سے دور بھاگتی ہیں اور لکیر کی فقیر بنی رہنا چاہتی ہیں۔ خود اسلام کے پیغام کا بھی جواب بعض طبقوں نے یہی دیا تھا کہ مَا اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا۔ ہم تو انھیں رسموں کے پابند رہیں گے جو ہمارے باپ دادا نے اختیار کر رکھی تھیں۔ جو قومیں نئے تقاضوں کا صحیح جواب نہیں دیتیں وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہیں، یہاں تک کہ ختم ہو جاتی ہیں۔ نئی اور پرانی چیزوں کی کشمکش کا دور ہر قوم کے لیے حد درجہ نازک ہوتا ہے۔ جو قوم اس منزل سے بخیر و خوبی گزر جاتی ہے وہی زندگی کی دوڑ میں کامیاب رہتی ہے۔ نئی یا پرانی چیزیں سب کی سب اچھی نہیں ہوتیں قوموں قوموں اور ان کے لیڈروں میں انتخاب کا سلیقہ ہونا چاہیے۔
زندگی کا قافلہ بہت تیز رفتار ہے اس کے چل چلاؤ میں قومیں کچلی جا چکی ہیں۔ ہماری نظروں سے ہزاروں ستارے غائب ہیں لیکن ہم انھیں بھی اپنی برادری میں شمار کرتے ہیں۔ زمین والے اس بات کو لمبی مدّت میں بھی نہ سمجھ سکے ہم نے تھوڑی سی زندگی میں سمجھا۔

مراد یہ ہے کہ مسلمان اور انسان کو صرف انھیں کو مسلمان یا انسان نہ سمجھیں جو اُن کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اسلامی اور انسانی برادری ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہر ایک کو سب کا پاس رکھنا چاہیے۔ تاروں نے یہ نکتہ سمجھ لیا، انسانوں نے نہ سمجھا۔۔۔۔ تمام نظام صرف باہمی کشش کے باعث قائم ہیں، یعنی جب تک ایک دوسرے سے محبت اور تعلق قائم ہے، نظام باقی ہے۔ جہاں یہ کشش ختم ہوئی، نظام درہم برہم ہو گیا۔ تاروں کی زندگی سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔

سیرِ فلک

رازِ سربستہ: چھپا ہوا بھید۔ **خاتم:** ختم کرنے والا۔ **نوشانوش:** پینا پلانا۔ **کرّۂ زمہریر:** زمین کے اردگرد ہوا کا ایک حلقہ ہے۔ اس سے گزریں تو پرانے جغرافیہ دانوں کے قول کے مطابق ایک ایسا کرّہ آتا ہے جس میں حد سے زیادہ سردی ہوتی ہے۔ اسے کرّۂ زمہریر کہتے ہیں۔ **سروش:** فرشتہ۔ **تہی آغوش:** خالی۔ **مستعار:** مانگے ہوئے۔ **عبرت کوش:** نصیحت حاصل کرنے والے۔

پہلا بند

میرا خیال میرا ہم سفر تھا اور چلتے چلتے میں آسمان پر پہنچ گیا۔ یعنی عالمِ خیال میں آسمان پر جا پہنچا۔ میں اڑتا جا رہا تھا اور آسمان پر مجھے جاننے والا کوئی نہ تھا۔ میرے سفر کا بھید سب کی نگاہوں سے چھپا ہوا تھا۔ تارے بھی مجھے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ چلتے چلتے میں دنیا کے پرانے نظام سے باہر نکل گیا اور صبح و شام کے حلقے سے آزاد ہو گیا۔

دوسرا بند

میں کیا بتاؤں کہ بہشت کیا ہے؟ بس یہ سمجھ لو کہ آنکھ اور کان جن چیزوں کی آرزو کر سکتے ہیں۔ بہشت میں سب موجود ہیں۔ گویا آنکھ اور کان کو اس سے بڑھ کر کوئی آرزو ہو ہی نہیں سکتی۔ طوبٰی کی شاخ پر پرندے نغمے گا رہے تھے۔ حوریں بے پردہ جلوے دکھا رہی تھیں۔ خوب صورت ساقیوں کے ہاتھ میں شراب کے پیالے تھے۔ پینے والوں میں پینے پلانے کا شور بپا تھا۔ بہشت سے بہت دور میں نے ایک اندھیرا گھر دیکھا جو نہایت ٹھنڈا اور سنسان تھا۔ اس کی تاریکی مجنوں کی قسمت سے اور اس کی سیاہی لیلا کی زلف سے ملتی جلتی تھی۔ ٹھنڈا اتنا تھا کہ کرّۂ زمہریر نے بھی شرما کر منہ چھپا لیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ فرشتے نے یہ حیرانی پیدا کرنے والا جواب دیا:

یہ ٹھنڈا مکان دوزخ ہے۔ نہ اس میں آگ ہے، نہ روشنی۔ اس کے مانگے ہوئے شعلے ایسے ہوتے ہیں جنھیں دیکھ کر عبرت حاصل کرنے والے انسان پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ یہ شعلے کہاں سے لیے جاتے ہیں؟ جو دنیا دار لوگ اس گھر میں آتے ہیں، وہ اپنے انگارے ساتھ لاتے ہیں۔

اس نظم میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ دوزخ کا عذاب اصل میں انسانوں کے بُرے عملوں سے پیدا ہوتا ہے۔ جو شخص جیسے بُرے عمل کرتا ہے، اسے ویسا ہی عذاب ملتا ہے۔ قرآن مجید کا اصول یہ ہے کہ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ:

جو بُرائی کرتا ہے۔ اسے اس کی سزا ملتی ہے۔ خود اقبال نے بھی فرمایا :

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

نصیحت

تمہید

یہ نظم اقبال نے انجمنِ حمایتِ اسلام کے اجلاس (اپریل ۱۹۱۱ء) میں شکوہ سے پہلے پڑھی تھی۔ پھر کسی قدر ترمیم کے بعد مئی ۱۹۱۱ء کے "مخزن" میں قطعہ کے عنوان سے شایع کرادی۔ مدیر مخزن نے اسے شایع کرتے وقت مندرجہ ذیل نوٹ لکھا تھا :

ذیل میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم اے۔ پی۔ ایچ ڈی۔ بیرسٹرایٹ لا کا وہ قطعہ درج کیا جاتا ہے جو انھوں نے لاہور کی انجمن کے سالانہ جلسے میں پڑھا تھا اور جس پر انھیں بے حد داد ملی تھی۔ اب یہ قطعہ انھوں نے کسی قدر ترمیم کے ساتھ اشاعت کے لیے ہمیں عنایت کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس زمانے میں بہ وجوہات اس قدر کم گو ہو گئے ہیں کہ ان کا کلام جس مقدار میں بھی حاصل ہو مغتنم ہے۔ ("مخزن" مئی ۱۹۱۱ء) صفحہ ۵

"مخزن" میں اس کے سولہ شعر شایع ہوئے تھے۔ نظرِ ثانی کے وقت صرف بارہ باقی رکھے گئے اور اس کا عنوان بدل دیا نیز بعض اشعار میں معمولی ترمیم کر دی۔

اربابِ ریا : ریاکار لوگ۔ **تملق** : خوشامد۔ **موجد** : ایجاد کرنے والا۔ **مقامِ محمود** : لفظی معنی پسندیدہ مقام۔ قرآن مجید میں مقامِ محمود کا وعدہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کیا گیا ہے : عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔ قریب ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود عطا فرمائے۔ اس سے مراد قربِ الٰہی کا نہایت بلند مقام ہے۔ ہو سکتا ہے۔ اقبال نے مقامِ محمود کے لفظی معنی کے علاوہ خاص نعمتِ الٰہی کے معنی بھی پیشِ نظر رکھے ہوں۔
دست پرورد : لفظی معنی ہاتھ کے پالے ہوئے یعنی احسان مند۔ **تشہیر** : شہرت دینا۔ شہرت۔

میں نے اقبال سے نصیحت کے طور پر کہا کہ تو روزے بھی نہیں رکھتا اور نماز بھی نہیں پڑھتا۔ تو بھی ریاکاروں کے طریقے میں کمال حاصل کر چکا ہے۔ دل میں تو یہ ہوس بھری ہوئی ہے کہ لندن پہنچے اور زبان پر حجاز کا ذکر رہتا ہے تو جھوٹ ضرور بولتا

ہے۔ لیکن اس کے متعلق کچھ پوچھ گچھ ہوتی ہے تو عذر میں کوئی نہ کوئی مصلحت پیش کر دیتا ہے۔ تو نے خوشامد اور چاپلوسی کا جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے وہ تو سر سے پاؤں تک اعجاز و کرامت نظر آتا ہے۔ تو تقریر کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اسے حکومت کی تعریف و ستایش پر ختم کرتا ہے۔ تیری روشن فکر نے نیازمندی کے نئے نئے طریقے ایجاد کر لیے ہیں۔ تو حاکموں کے دروازے کو پسندیدہ مقام سمجھتا ہے اور اسی کو اپنی عزت و سربلندی کا ذریعہ جانتا ہے۔ تیری پالیسی بڑی پیچ دار ہے۔ کہنا چاہیے کہ پیچ و خم میں وہ ایاز کی زلف سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ دوسرے لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ عہدے اور منصب کی حرص کو دین کی خدمت کے پردے میں چھپا لیتے ہیں یعنی اگرچہ ان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ حکومت سے کوئی اونچا منصب مل جائے، لیکن قوم کے سامنے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اے اقبال تو بھی یہ کام تجربی انجام دے سکتا ہے۔ عید کے دن عام مسلمانوں کو دکھانے کے لیے مسجد میں بھی جا پہنچتا ہے۔ وعظ سننے تو کسی قدر آنسو بھی بہا لیتا ہے۔ ملک کے اخباروں کو تو نے اپنا احسان مند بنا رکھا ہے۔ وہ تیرے اشارے پر تیری شہرت کا ساز بجانا اپنا فرض سمجھتے ہیں یعنی ہر وقت تیرا نام بلند کرتے رہتے ہیں۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے۔ اور تیری شاعری کی صراحی میں شیراز کی شراب بھری ہوئی ہے[1]۔ غرض لیڈر میں جتنے وصف ہونے چاہئیں وہ سب تجھ میں موجود ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تو دوسروں کی طرح اپنے لیے سعی و کوشش کو لازم نہیں سمجھتا۔ صیاد کا غم نہیں اور پر و بال بھی موجود ہیں۔ پھر کیا سبب ہے کہ تو اڑنے کا خیال نہیں کرتا؟ آخر کار سب کو مردوں کی وادی میں پہنچنا ہے۔ اب تو آسمان کے گنبد میں غلغلہ پیدا کرنا چاہیے۔

آخری شعر خواجہ حافظ شیرازی کا ہے۔

اس نصیحت کا جو جواب اقبال نے دیا تھا۔ وہ سننے کے قابل ہے:

سن کے کہنے لگا اقبال! بجا فرمایا ۔۔۔ شک مجھے آپ کی باتوں میں نہیں بندہ نواز

مجھ میں اوصاف ضروری تو ہیں موجود مگر ۔۔۔ ہے کمی ایک کہوں تم سے جو ہو فاش نہ راز

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی

اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی

یہ شعر نظر ثانی میں حذف کر دیے تھے۔ اس نظم میں دراصل مسلمانوں کے غلط کار لیڈروں کا خاکہ اڑایا گیا ہے ان کے عام اوصاف یہ تھے:

۱۔ شریعت کے احکام میں سے نماز روزے جیسے اہم فرائض سے بے پروائی۔

---

[1] بانگ درا میں "تیرے مینائے سخن" کے بجائے کاتب نے غلطی سے "تیری مینائے سخن" لکھ دیا۔

۲۔ پرلے درجے کی ریاکاری۔

۳۔ جھوٹ اور خوشامد۔

۴۔ ہر حال میں حکومت کی تعریف۔

۵۔ حاکموں کی نیازمندی کو ذریعۂ عزّت سمجھنا۔

۶۔ پرپیچ پالیسی۔

۷۔ دنیوی سربلندی کی حرص کو خدمتِ دین کا لباس پہنانا۔

۸۔ عید کے دن مسجد میں چلے جانا۔

۹۔ وعظ سن کر ریاکاری سے آنسو بہانا۔

۱۰۔ اخباروں کو کچھ دے دلا کر اپنے ہاتھ میں رکھنا اور اپنے حق میں مضمون لکھواتے رہنا۔

رام

فکرِ فلک رس: آسمان پر پہنچنے والا خیال۔ **ملک سرشت** فرشتہ خصلت

یہ نظم سری رام چندر جی کے متعلق لکھی گئی ہے اور ان کی سیرت آخری شعر میں نہایت خوبصورتی سے پیش کر دی ہے۔

ہندوستان کا پیالہ حقیقت کی شراب سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ یورپ کے تمام فلسفیوں کا دل ہندوستان نے موہ رکھا ہے۔ یہ اہلِ ہند کی آسمان پر پہنچنے والی فکر کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کی چھت بلندی میں آسمان سے بھی اونچی چلی گئی۔ اس دیس میں فرشتوں جیسی خصلت والے ہزاروں پیدا ہوئے، جن کی برکت سے دنیا میں ہندوستان کے نام نے شہرت پائی۔ رام چندر جی کے وجود پر ہندوستان کو ناز ہے۔ اہلِ نظر انھیں ہندوستان کا پیشوا سمجھتے ہیں۔ ہدایت و رہنمائی کے اس چراغ کا معجزہ ہے کہ زمانے بھر میں ہندوستان کی شام صبح سے زیادہ روشن نظر آتی ہے۔ رام چندر جی تلوار کے دھنی تھے، بہادری میں بے مثال، پاکیزگی اور جوشِ محبت میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔

موٹر

تمہیدی نوٹ

نواب سردار ذوالفقار علی خاں مرحوم مالیر کوٹلہ کے خوانین میں سے تھے۔ اعلیٰ تعلیم پانے کے بعد کچھ مدت پٹیالہ میں وزیر اعظم رہے۔ پھر لاہور چلے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ کونسل آف سٹیٹ اور مرکزی اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔ بڑے ہی نیک دل اور ہمدرد رئیس تھے۔ جو بھی شخص کسی کام کے لیے چلا جاتا، اس کی اعانت میں تامل نہ فرماتے۔ کوئنز روڈ پر انھوں نے ایک عالی شان کوٹھی تعمیر کرائی تھی جس کا نام "زرافشاں" اقبال ہی نے تجویز کیا تھا۔

اقبال سے ان کے دوستانہ تعلقات غالباً ۱۹۰۸ء میں ہوئے جب وہ مستقل طور پر لاہور میں رہنے لگے مرزا جلال الدین بیرسٹر ایٹ لا اس دوستی کا واسطہ بنے تھے۔ برسوں یہ کیفیت رہی کہ اقبال اور مرزا صاحب کی شام عموماً نواب صاحب ہی کے ہاں گزرتی۔ نواب موصوف نے اقبال کی شاعری کے متعلق ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا مدعا یہ تھا کہ اس کی شاعری کا تعارف مغرب سے کرایا جائے۔ یہ کتاب اب بہت کم یاب ہے۔

سر جوگندر سنگھ، سردار امراؤ سنگھ اور سردار سندر سنگھ بھی نواب صاحب کے عزیز دوستوں میں تھے۔ وہ بھی اس مجلس خاص کے رکن بن گئے۔ اس کے دو رکن اور تھے۔ ایک سردار سر جواہر سنگھ رئیس مصطفےٰ آباد، دوسرے سردار دلجیت سنگھ آہلو والیہ رئیس جالندھر۔ ان کی دوستی اتنی گہری تھی کہ برسوں یہ عام لوگوں کے لیے مثال بنی رہی

نواب ذوالفقار علی خاں نے ایک مرتبہ نہایت بیش قیمت موٹر خریدی۔ اس زمانے کی عام موٹریں چلتی تھیں تو ان کے انجنوں میں شور بہت ہوتا تھا۔ نواب صاحب کی موٹر اس شور سے بالکل پاک تھی۔ ایک مرتبہ نواب صاحب، سر جوگندر سنگھ، اقبال اور مرزا جلال الدین اس میں بیٹھ کر شالا مار کی سیر کو نکلے۔ راستے میں سر جوگندر سنگھ نے از راہِ حیرت کہا کہ نواب صاحب کی موٹر کس قدر خاموش واقع ہوئی ہے۔ بس یہی ایک کلمہ اقبال کے لیے نظم کا بہانہ بن گیا۔ مرزا جلال الدین فرماتے ہیں: "بظاہر یہ بات کوئی ایسی پتے کی نہ تھی کہ اقبال اس سے یوں متاثر ہو جاتے اور اسی فقرے پر اپنی نظم کی بنیاد رکھ دیتے۔"

لیکن ہوا یہی کہ اقبال کی حکیمانہ طبیعت نے اسی سے نہایت عمدہ مضامین پیدا کر لیے۔ (ملفوظاتِ اقبال)

قلقل: بھری ہوئی صراحی سے شراب یا پانی انڈیلتے وقت جو صدا بلند ہوتی ہے۔ وہ قلقل سے ملتی جلتی ہے۔

کل جوگندر نے کیسی پتے کی بات کہہ دی کہ ذوالفقار علی خاں کا موٹر کس قدر خاموش ہے۔ یہ چلتا ہے تو اس سے کوئی شور نہیں اٹھتا۔ یہ بجلی کی طرح تیز ہے۔ ہوا کی طرح خاموش ہے۔ میں نے کہا یہ موٹر ہی پر موقوف نہیں، زندگی کے راستے میں ہر

تیز چلنے والا خاموش چلتا ہے۔ گھنٹی شور و فریاد کی وادی ہے۔ اس لیے اس کے پاؤں ٹوٹے ہوئے ہیں اور چل نہیں سکتی۔ خوشبو کا قافلہ ہر طرف چل نکلتا ہے اور وہ صبا کی طرح خاموش ہوتا ہے۔ شراب کی صراحی قلقل کا شور مچاتی ہے اس لیے اپنی جگہ ٹھہری رہتی ہے اور اِدھر اُدھر نہیں پھر سکتی، لیکن پیالہ گردش میں رہتا ہے اور اس کی طبیعت خاموش ہے۔ اس سے کوئی صدا بلند نہیں ہوتی۔ شاعر کو دیکھو کہ اس کے تخیل کے لیے خاموشی اڑنے والے پَر بن جاتی ہے اور خاموشی ہی کے باعث اس کی آواز میں گرمی، حرارت اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا خاموشی ہی گرمیِ آواز کا سرمایہ ہے۔

اِنسان

ہیئت: شکل اور وضع قطع

باغ کے نظّارے اچھے ہوں یا بُرے، قابلِ دید ہوں یا ناقابلِ دید، نرگس انھیں دیکھنے پر مجبور ہے اور خود عمل سے محروم ہونے کے باعث اس کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتی۔

صنوبر کو دیکھو۔ وہ اپنی جگہ کھڑا رہتا ہے۔ اسے چلنے کی لذّت کا کوئی احساس ہی نہیں اور اس کی فطرت میں تمنّا پیدا ہی نہیں ہوتی۔

غرض دنیا کی جس چیز کو دیکھو، وہ تسلیم، اطاعت اور فرماں برداری کی عادی ہے۔ صرف انسان ہے جو ہر وقت اپنی ہر قوت آس پاس کی چیزوں کو بدل ڈالنے میں لگائے رکھتا ہے اور کبھی آرام سے نہیں بیٹھتا۔ ہمیشہ سرگرم تقاضا رہتا ہے یہ اگرچہ ذرّے کی مانند ہے، لیکن اسے ہر وقت پھیلنے کی ہوس لگی رہتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذرّہ نہیں بلکہ بیابان نے سمٹ کر ذرّے کی شکل اختیار کر لی ہے۔

انسان پر ہے تو کائنات کے پورے باغ کی شکل بدل ڈالے، اس لیے کہ یہ عقل مند ہے۔ اسے اچھائی برائی کی تمیز عطا کی گئی ہے اور اس میں ہمّت و قوّت موجود ہے۔

اس نظم میں انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کو بڑے اچھوتے اور پُر تاثیر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اشرفیت کی بنیادیں تین ہیں: اوّل دانائی۔ دوم نیک و بد کی تمیز، سوم جو کچھ خیال میں آئے، اسے عمل میں لانے کی قوت۔

خطاب بہ جوانانِ اسلام

تمہیدی نوٹ

یہ ایک قطعہ ہے جو بعض دوسرے قطعات اور مزاحی اشعار کے ساتھ ۱۹۱۴ء میں یعنی "شمع اور شاعر" کے دو سال بعد انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھا گیا تھا۔ اُس سال جلسہ اسلامیہ کالج لاہور کے میدان میں حبیبیہ ہال کے عین سامنے منعقد ہوا تھا۔ اقبال نے اس کے لیے کوئی خاص نظم نہ لکھی تھی۔ آخری وقت میں انجمن کے کارکنوں کی طرف سے شدید اصرار ہوا تو متفرق چیزیں پڑھ دیں۔ ان میں ایک یہ قطعہ بھی تھا۔ گویا یہ "شمع اور شاعر" سے پہلے لکھا گیا۔ اگرچہ مدت بعد پڑھا گیا۔ اس میں ان قیمتی کتابوں کا ذکر ہے جو اہلِ یورپ ہمارے ہاں سے خرید کر لے گئے اور ہم اپنے بزرگوں کی اس علمی دولت کی قدر نہ کر سکے۔

تدبر: غور و فکر۔ سوچ بچار۔ **تمدن آفریں:** تہذیب پیدا کرنے والا **خلاقِ آئینِ جہاں داری:** حکومت کے اصول وضع اور ایجاد کرنے والا۔ **الفقر فخری:** فقر میرا فخر ہے یعنی میرے لیے فقر باعث ناز و امتیاز ہے۔

امارت: امیری۔ **منعم:** امیر۔ دولت مند۔ غنی۔ **سیپارہ:** لفظی معنی تیس ٹکڑے۔ یہاں مراد ہے ٹکڑے ٹکڑے۔ قرآن کے مختلف پاروں کو بھی سیپارہ کہتے ہیں لہٰذا اس لفظ نے یہاں دوبالا شان پیدا کر لی۔ **غنی:** خطۂ کشمیر کا ایک مشہور فارسی شاعر جس کا نام محمد طاہر تھا اور تخلص غنیؔ۔ جہانگیر کے آخری عہد میں پیدا ہوا۔ عالمگیر کے ابتدائی عہد میں وفات پائی۔

اے نوجوان مسلمان! تو نے کبھی یہ بھی سوچا اور اس حقیقت پر بھی غور کیا کہ وہ کون سا آسمان تھا جس کا تو ایک ٹوٹا ہوا تارا ہے؟ تجھے اس قوم نے محبت کی گود میں پالا تھا جس نے ایران کا شاہی تاج پاؤں کے نیچے روند ڈالا تھا۔ وہ قوم عرب کے صحرا سے اٹھی تھی۔ وہی صحرا جسے شتربانوں کا گہوارہ کہنا چاہیے۔ اس نے ایک عظیم الشان تہذیب پیدا کی اور دنیا کو حکمرانی کے قاعدے سکھائے۔ وہ قوم امیری کی سربلندیوں پر پہنچ کر بھی فقر ہی کو اپنے لیے فخر کا سامان سمجھتی رہی۔ یہ سچ کہا خواجہ حافظ نے کہ چہرہ حسین اور خوبصورت ہو تو وہ بناوٹی زیب و زینت اور سجاوٹ سے بے نیاز ہوتا ہے۔

خواجہ حافظ نے چار لفظ استعمال کیے۔ آب و رنگ و خال و خط۔ آب سے مراد ہے چہرہ خوب دھو کر صاف کرنا رنگ سے مراد ہے غازہ اور سُرخی، خال سے مراد ہے چہرے پر تل بنانا۔ خط سے مراد ہے، ابرو کے مقام پر سیاہ لکیر کھینچنا ہے۔ یہ سب بناوٹ کی چیزیں ہیں۔ ذاتی حسن بناوٹ سے بے پروا ہوتا ہے۔

اس قوم کے افراد اللہ والے تھے۔ وہ فقیری کی حالت میں بھی اتنے غیور تھے کہ دولت مندوں کو ان کی خدمت میں

کچھ پیش کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ کیا جانے قبول کریں یا نہ کریں۔ ممکن ہے، دینے پر بگڑ جائیں۔ غرض میں کیا کہوں، کہ وہ بیابان میں رہنے والے کیا تھے؟ انھوں نے دنیا کو فتح کیا۔ دنیا پر حکمرانی کی۔ دنیا کی حفاظت کا فرض انجام دیا۔ اور دنیا کو آراستہ کر دیا۔ میں اگر چاہوں تو ان کا نقشہ الفاظ میں کھینچ کر پیش کر سکتا ہوں، مگر وہ نظارہ ایسا ہوگا کہ تیرا خیال بھی اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ وہ تیرے خیال سے بہت اونچا ہوگا۔ تجھے اپنے بزرگوں سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی تو صرف باتیں بنانا جانتا ہے، وہ سر سے پاؤں تک سیرت اور عمل تھے تو ایک جگہ ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ ہر طرف حرکت میں رہتے تھے۔

ہم نے اپنے بزرگوں سے جو ورثہ پایا تھا وہ سارے کا سارا کھو دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آسمان نے ہمیں ثریا کی بلندی سے اٹھا کر زمین کی پستی میں دے پٹکا۔

حکومت کا رونا تو کیا رویا جائے؟ وہ تو ایک عارضی چیز تھی۔ دنیا کا قاعدہ یہی چلا آتا ہے کہ حکومتیں بدلتی رہتی ہیں۔ ہمارے لیے اس عام قاعدے سے بچے رہنے کا کیا موقع تھا جو سب پر جاری ہوتا رہا؟ مگر افسوس یہ ہے کہ ہم نے علم کے وہ موتی کھو دیے جو بزرگوں سے ہمیں ملے تھے، یعنی وہ بیش قیمت کتابیں جنھیں یورپ میں دیکھ کر دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے اور بے اختیار یہ شعر زبان پر آ جاتا ہے کہ اے غنی! حضرت یعقوب علیہ السلام کی سیاہ بختی کو دیکھ کر ان کی آنکھوں کا نور (حضرت یوسفؑ) زلیخا کی آنکھ کے لیے روشنی کا سامان بنا ہوا ہے:

مراد یہ ہے کہ کتابیں ہماری تھیں اور فائدہ ان سے دوسرے اٹھا رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے حضرت یعقوبؑ کے نور نظر سے زلیخا کی آنکھیں منور ہو رہی تھیں اور حضرت یعقوبؑ فراق میں بینائی کھو چکے تھے۔

غرۂ شوّال یا ہلالِ عیدؒ

تمہید

یہ نظم روزنامہ "زمیندار" کے ایک عید نمبر میں شایع ہوئی تھی۔ ہلال عید پر ایسی نظم نہ اس سے پہلے کبھی لکھی گئی اور نہ بعد میں کسی سے بن آئی۔

غرۂ شوال: شوّال کے مہینے کا ہلال۔ **رایت:** جھنڈا۔ **پختہ زنّاری:** زنّار اس دھاگے کو کہتے ہیں جو ہندو لوگ گردن اور کمر میں خاص مذہبی نشان کے طور پر ڈالتے ہیں۔ پختہ زنّاری سے مراد ہے اپنے مذہب پر پکا ہو جانا

حوادث: حادثہ کی جمع۔ **آئینہ دیواری**: آئینہ کی طرح کمزور دیواریں ہونا۔ **خودداری**: اپنی عزت کرنا جو انسان کا بہت بڑا وصف ہے۔

پہلا بند

اے شوال کے نئے چاند! اے روزہ رکھنے والوں کی نگاہوں کے نور! آ۔ مسلمان تیرے لیے سر سے پاؤں تک انتظار بنے ہوئے تھے۔ ہلال عید کو روزہ داروں کی نگاہوں کا نور اس لیے کہا کہ اس کے نکلنے پر روزے ختم ہو جاتے ہیں اور روزہ داری میں طبعاً جو مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں وہ باقی نہیں رہتیں۔

اے ہلال! تیرے ماتھے پر عید کا پیغام لکھا ہوا ہے۔ اگرچہ تو شام کے وقت نکلتا ہے لیکن تیری شام ہی عیش کی صبح کا آغاز ہے۔ تو اسلامی ملت کی سرگزشت کا آئینہ ہے اور تجھ سے وہ سب کچھ معلوم ہو سکتا ہے جو مسلمانوں پر گزرا۔ اے نئے چاند! ہمیں تجھ سے پرانی محبت ہے ہم جس جھنڈے کے سائے میں تلواریں چلاتے تھے اور دشمنوں کے خون سے اپنے کپڑے رنگتے اور ہولی کھیلتے تھے، قدرت کا فیصلہ یہی ہے کہ تو اس جھنڈے سے بغل گیر رہے۔ تیرا روز بروز بڑھنے والا حسن ہماری ملت کے لیے عزت و آبرو کا سامان ہے۔ اسلامی جھنڈے سے بغل گیری کا مطلب یہ ہے کہ ہلال مدت سے اسلامی جھنڈے کا خاص نشان بنا ہوا ہے۔

اے ہلال! ہماری قوم دوستوں کو پالنے والی ہے اور تیرا دستور بھی یہی ہے کہ وفا پر قائم رہے۔ یہ تیرا چاند جیسا لباس دیکھ کر دل میں محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ تو آسمان کی بلندی سے ذرا دنیا کی پستی پر تو ایک نظر ڈال۔ تو بہت اونچے مقام پر بیٹھا ہے وہاں سے ہمارے گھر کی پستی تو دیکھ۔

دوسرا بند

یہاں سے چاند کو اپنی دنیا کا منظر دکھاتے اور مسلمانوں کی پریشانی حالی کے مناظر پیش کرتے اور فرماتے ہیں: اے چاند! تو مختلف قوموں کے قافلوں کو دیکھ کہ وہ کتنی تیز رفتاری سے چلے جا رہے ہیں۔ ایک مسافر بچھڑا ہوا ہے اور وہ منزل سے بالکل بیزار ہو چکا ہے۔ یہ اسلامی ملت ہے۔

تو جب طلوع ہوتا تھا تو تجھے دیکھ کر ہم موتی لٹایا کرتے تھے۔ اے خالی پیالے! آج ہماری مفلسی اور ناداری بھی دیکھ۔ تہی ساغر اس لیے کہا کہ نیا چاند دیکھنے میں خالی پیالہ معلوم ہوتا ہے۔

مسلمان فرقہ بندی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اے چاند! تو اپنے آپ کو بھی دیکھ کہ کس آزادی سے چلا جا رہا ہے اور مسلمانوں کو بھی دیکھ کہ وہ کن جنجالوں میں گرفتار ہیں۔

یہ بھی دیکھ کہ مسجد میں شیخ کی تسبیح کا دھاگا ٹوٹ گیا، یعنی اس میں پہلا سا مذہبی دم خم باقی نہ رہا اور اس کا دینی

جذبہ افسردہ ہو کر رہ گیا۔ اس کے برعکس بُت خانے کی حالت دیکھ کہ وہاں برہمن کا زنّار کتنا پکّا ہو گیا یعنی وہ اپنے مذہبی طور طریقوں میں کتنا پختہ ہے۔

ذرا دیکھ! کافروں نے مسلمانوں کے سے شیوے اور طریقے اختیار کر لیے اور مسلمانوں کو دیکھ کہ وہ کس طرح ایک دوسرے کو دُکھ دینے کے درپے ہیں؟

یہ بھی دیکھ کہ یہاں کس طرح ہر طرف حادثے کے پتھروں کا مینہ برس رہا ہے۔ یعنی مصیبت پر مصیبت نازل ہو رہی ہے اور یہ بھی دیکھ کہ ملتِ اسلامیہ کے گھر کی دیواریں آئینے سے بنی ہوئی ہیں، یعنی اس کے پاس حفاظت کا کوئی سامان نہیں۔ کوئی پتھر لگے گا اور یہ گھر ریزہ ریزہ ہو کر رہ جائے گا۔

ہم اس دنیا میں عزّت و آبرو کے مالک تھے۔ اسے چاند! دیکھ! ہم نے خوشامد کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ جو لوگ بالکل بے آبرو تھے، وہ کس قدر خود دار بن گئے۔

جس قوم کو کل تک بات کرنی بھی نہ آتی تھی اور اسے ہم نے گفتگو کی لذّت سے آگاہ کیا، دیکھ! وہ آج کس طرح بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہی ہے؟ اس شعر میں بہ ظاہر اشارہ ہندوؤں کی طرف ہے کہ ہم سے انھوں نے تہذیب، تمدن حقوق اور ان کے لیے سعی و کوشش کے طریقے سیکھے۔ ہم نے ان کے دل میں آزادی کی لو لگائی، وہ آج ہم سے منزلوں آگے بڑھ گئے۔ یورپ کے محل شادمانی کے ساز کی صدا سے گونج رہے ہیں یعنی وہاں شادمانی کے نغمے گائے جا رہے ہیں اور ایران میں ماتم کی تیاری ہو رہی ہے۔

آخری مصرع میں ایران کے ان دردناک واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ جو محمد علی شاہ قاچار کی معزولی کے بعد پیش آئے ایران میں دستوری حکومت کی بنیاد سیّد جمال الدین افغانی نے رکھی تھی۔ قاچار بادشاہوں کو قوم و ملک کا کوئی خیال نہ تھا اپنے عیش و عشرت اور رنگ رلیوں میں لگے ہوئے تھے۔ ناصر الدین شاہ قاچار نے یورپ کے کئی سفر کیے۔ ان میں بہت روپیہ خرچ ہوا اور یورپی فرموں کو اس نے ایران میں کئی ٹھیکے دے دیے۔ وہ ۱۸۹۶ء میں سیّد جمال الدین کے ایک شاگرد محمد رضا کرمانی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ مظفر الدین شاہ اس کا جانشین بنا۔ اس نے قوم کے مطالبے سے مجبور ہو کر دستوری حکومت کا انتظام کر دیا لیکن اس میں برابر رد و بدل ہوتا رہا۔ اس کا بیٹا محمد علی روسیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گیا اور وہ سب کچھ انھیں کی مرضی کے مطابق کرتا تھا۔ روسیوں نے ایران کو اپنے قبضے میں لانے کے لیے جال پھیلا رکھے تھے۔ قوم نے ۱۹۰۹ء میں محمد علی شاہ کو معزول کر دیا اور اس کے کم سن فرزند احمد شاہ کو بادشاہ بنا لیا۔ محمد علی شاہ اور اس کے بھائی سالار الدولہ نے دیر تک روسیوں کی مدد سے ایران پر حملے جاری رکھے۔ روسی فوجیں جہاں جہاں قابض ہوئیں انھوں نے آزادی کے علم داروں خصوصاً دینی عالموں کو پھانسی کی سزائیں دے دیں اور مشہد مقدس پر گولہ باری

بھی کی۔ اقبال نے انہیں واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ محمد علی اور سالار الدولہ کی وفات نے ایران کی مصیبتوں میں ایک حد تک کمی کی۔ یہی زمانہ ہے جب برطانیہ اور روس نے ایک خفیہ معاہدے کی بنا پر ایران کو باہم تقسیم کر لیا تھا۔ اور اپنے الگ الگ حلقے بنا لیے تھے۔ پہلی جنگ یورپ میں زاروں کی حکومت ختم ہوئی تو بالشویکوں نے تمام خفیہ معاہدے ختم کر دیے۔ اس وقت ایران کو آزادی کا سانس لینا نصیب ہوا۔ پھر احمد شاہ اپنے باپ دادا کے طریقے پر چلنے لگا۔ ۱۹۲۵ء میں قوم نے اسے معزول کر کے رضا شاہ پہلوی مرحوم کو بادشاہ بنایا۔

بے سمجھ ترک نے اپنی خلافت کی قبا ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالی۔ مسلمان کی سادہ مزاجی بھی دیکھ۔ دوسروں کی مکاری کا بھی اندازہ کر۔

اس شعر میں سلطان عبدالحمید خاں ثانی کو تخت حکومت اور تخت خلافت سے الگ کر دینے کی طرف اشارہ ہے اس زمانے میں عام مسلمانوں کا خیال یہ تھا کہ سلطان عبدالحمید خاں اتحادِ اسلامی کے علم دار ہیں۔ جس کی وجہ سے اہل یورپ ان سے ڈر رہے تھے۔ چونکہ سلطان محمد رشاد خاں معروف بہ سلطان محمد خامس کے عہد میں دستوری حکومت قائم ہو گئی تھی اس وجہ سے عام مسلمان سمجھ رہے تھے کہ خلافت اپنی پہلی شکل میں باقی نہیں رہی۔ اقبال اس عقیدے میں عام مسلمانوں کے ہم نوا نہ تھے، لیکن ان کا بھی یہی خیال تھا کہ سلطان عبدالحمید خاں کے عہد خلافت کو جو دبدبہ اور شکوہ حاصل تھا، معزولی کی وجہ سے اسے نقصان پہنچا اور عام مسلمانوں کو تخت گاہِ خلافت سے جو عقیدت تھی اس میں خلل پیدا ہوا۔ ترک اس حقیقت کا صحیح اندازہ نہ کر سکے اور سادہ مزاجی سے صرف انتظامی اصلاح ہی پر اُن کی نظریں جمی رہیں، لیکن اس دور میں سلطنت ترکی کے اندرونی حالات کا عموماً کسی کو صحیح اندازہ نہ تھا۔ نہ یہ معلوم تھا کہ سلطان عبدالحمید خاں کے جبر مطلق العنانی اور مخلص قومی کارکنوں پر بے پناہ سختیوں کے باعث کیا کیا مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں۔

ایران اور ترکی کے علاوہ ایک رنج دہ واقعہ مراکش میں بھی پیش آیا تھا یعنی فرانسیسی سفیر نے مولانا حفیظ سلطان مراکش کو ایک معمولی بات پر معزول کرا دیا تھا۔ اقبال نے اس نظم میں اس واقعے کا بھی ذکر کیا تھا۔ بعد میں معلوم نہیں کہ وہ شعر کیوں حذف کر دیا؟ شعر یہ تھا:

مکر کے پھندے میں شہبازِ مراکش آ گیا
اُمّتِ عیسیٰ کا آئینِ جہاں داری بھی دیکھ

اے چاند! یہ سب کچھ دیکھ! اور آئینے کی مانند چُپ رہ۔ آج جو شور و غل بپا ہے اس سے بے پروا ہو کر اپنے ماضی کے گیت میں مگن رہ۔

شمع اور شاعر

تمہیدی نوٹ

یہ معروف نظم اقبال نے ۱۹۱۲ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھی تھی۔ اس سال اجلاس اسلامیہ کالج کے میدان میں ہوا تھا۔ اتفاق یہ کہ انجمن حمایت اسلام کے دو بڑے سرپرستوں سلطان احمد صاحب اور فقیر افتخار الدین صاحب نے اصرار کیا کہ اقبال کی نظم ان کی صدارت میں پڑھی جائے۔ مجبور ہو کر انجمن نے اقبال کو اس امر پر راضی کیا کہ نصف نظم ایک صاحب کی صدارت میں پڑھیں اور نصف دوسرے صاحب کی صدارت میں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اقبال نے یہ نظم ترنم سے پڑھی تھی۔ اور چھ بند پڑھ کر وہ تھک بھی گئے تھے۔ پہلی صدارت ختم ہوئی۔ دوسرے صدر کے کرسی نشین ہونے اور رسمی تقریر کرنے تک اقبال کو آرام لینے کا موقع مل گیا۔ آخری چھ بند فقیر افتخار الدین کی صدارت میں سنائے۔ نظم سنانے سے پیشتر انھوں نے ایک قطعہ بھی سنایا تھا جس میں دو صدروں کے واقعہ کا ذکر تھا۔ قطعہ یہ تھا:

ہم نشینِ بے ریایم از سرِ اخلاص گفت ۔۔۔ کائے کلامِ تو فروغِ دیدۂ برنا و پیر

درمیانِ انجمن معشوقِ ہر جائی مباش ۔۔۔ گاہ با سلطان باشی گاہ باشی با فقیر

گفتمش اے ہم نشیں! معذور می دارم ترا ۔۔۔ در طلسمِ امتیازِ ظاہری ہستی اسیر

من کہ شمعِ عشق را در بزمِ دل افروختم ۔۔۔ سوختم خود را و سامانِ دوئی ہم سوختم

یہ نظم مولانا ظفر علی خاں نے اپنے پریس میں خاص اہتمام سے دس ہزار کی تعداد میں چھپوائی تھی اور آٹھ آنے فی کاپی قیمت رکھی تھی۔ انھوں نے اعلان کیا تھا کہ اس کی فروخت سے جو پانچ ہزار روپیہ وصول ہوگا۔ وہ ڈاکٹر اقبال کو شے کر تبلیغ اسلام کے لیے جاپان بھیجا جائے گا۔

پہلا بند شاعر شمع سے مخاطب ہے! کل میں نے اپنے اجڑے ہوئے گھر کی شمع سے کہا: تیری زلفوں کے لیے پروانے کا پرشانے کا کام دیتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ تیری رونق پروانوں کے جلنے سے ہے۔

میں اس دنیا میں بیابانی لالے کے چراغ کی طرح ہوں جس سے نہ کسی محفل میں روشنی ہوتی ہے اور نہ کسی گھر میں۔ لالۂ صحرا کو چراغ اس لیے کہا کہ اس میں داغ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس چراغ سے نہ کوئی محفل کام لے سکتی ہے نہ کوئی گھر۔ شاعر کے پیشِ نظر اپنا اور شمع کا مقابلہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شمع پر تو پروانے جلنے کے لیے تیار رہتے ہیں اور اس کا سوز نتیجہ خیز ہے لیکن میرے سوز سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

اے شمع! اگرچہ میں بھی تیری طرح مدت سے اپنے آپ کو جلا رہا ہوں لیکن میرے شعلوں کے طواف کے لیے تو اب تک کسی پروانے نے پر نہیں مارا۔ میری جان میں جو امیدوں اور آرزوؤں کی کشمکش میں کھیلتی رہی۔ سینکڑوں جلوے تڑپ رہے ہیں لیکن اس محفل میں سے ایک بھی دیوانہ دل نہیں اٹھتا۔ مراد یہ ہے کہ میرے سامنے سینکڑوں آرزوئیں اور تمنائیں ہیں انھیں پورا کرنے کی کوشش میں میں اپنی جان کھپا رہا ہوں۔ سینکڑوں تمنائیں ہیں جو بر آنے کے لیے تڑپ رہی ہیں۔ لیکن کوئی ان کا شناسا نظر نہیں آتا۔ کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیتا جو ان تمناؤں میں میرا ساتھی اور رفیق بن سکے۔

اے شمع! تو نے دنیا کو روشن کرنے والی آگ کہاں سے لی جس کی بدولت ایک بے حقیقت پتنگے کو حضرت موسےٰ علیہ السلام کا سا سوز سکھا دیا؟

مضمون بالکل واضح ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ شمع پر جل مرنے کے لیے تو پروانے تیار ہیں۔ میرا ساتھ دینے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ کاش مجھے بھی وہی آگ، وہی حرارت اور وہی سوز مل جائے جو شمع کو نصیب ہے تاکہ میں بھی اپنی محفل کو پروانوں کی طرح جلنے کے لیے بے تاب کر دوں۔

دوسرا بند شمع شاعر سے مخاطب ہے:

سانس کی جو لہر میرے لیے موت کا پیغام ہے، اسی لہر کی بدولت تیرا لب نغمے گا رہا ہے۔ یعنی پھونک مارنے سے شمع بجھ جاتی ہے اور پھونک سانس کی لہر سے پیدا ہوتی ہے۔ وہی سانس شاعر کے لیے نغموں کا سامان ہے اور اسی سانس کے دم سے ہر شاعر زندہ ہے۔

میں تو اس لیے جلتی ہوں کہ میری طبیعت میں سوز چھپا ہوا ہے اور میری فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ جلوں۔ خواہ پروانے آئیں یا نہ آئیں۔ تو اس ہوس میں جل رہا ہے کہ پروانے تیرے شیدائی ہوں۔ مراد یہ ہے کہ شمع کا سوز بے غرض ہے اور شاعر کے سوز کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں اس کی قدر و منزلت پیدا ہو۔

میں اس لیے روتی ہوں کہ میرے دل میں آنسوؤں کا طوفان موجزن ہے تو اس غرض سے شبنم کی طرح آنسو بہاتا ہے کہ پھولوں کی بزم میں تجھے شہرت حاصل ہو۔ اس شعر میں بھی پہلے شعر کا مضمون نئے انداز میں دہرا گیا ہے۔

میری رات کے لہو سے میری صبح کا دامن پھولوں سے بھرا ہوتا ہے یعنی میں رات بھر جل جل کر اندھیرے کو نابود کرنے میں لگی رہتی ہوں اور صبح ہونے تک میری جلن میں کوئی فرق نہیں آتا۔ گویا میری زندگی لگاتار اس جدوجہد میں گزرتی ہے کہ روشنی رہے اور اندھیرا نہ ہونے پائے۔ تیرا حال یہ ہے کہ تیرے امروز کو فردا سے کوئی تعلق نہیں یعنی تیری زندگی کے ایک پہلو کو دوسرے پہلو سے کوئی لگاؤ نہیں۔ تجھے نہ حال کی فکر ہے، نہ مستقبل کا کوئی خیال ہے گویا حال و مستقبل میں کوئی ربط نہیں۔

بے شک تو روشن ضرور ہے لیکن تیرا سینہ اندرونی جلن سے بالکل خالی ہے۔ تیرے شعلے کی حیثیت وہی ہے، جو بیابانی لالے کے چراغ کی ہوتی ہے کہ اس میں چمک دمک تو پائی جاتی ہے، سوز نہیں ہوتا، حالانکہ زندگی سوز ہی کا دوسرا نام ہے۔

تو ذرا اس امر پر غور کر کہ تجھے ساقی کہنا زیبا ہے؟ تیری محفل پیاسی بیٹھی ہے اور تیرے پیالے میں شراب کا ایک قطرہ بھی نہیں۔ ساقی وہی ہوتا ہے، جس کا پیالہ شراب سے لبالب بھرا رہے۔ اور اہلِ محفل اسی کے فیض سے پیاس بجھاتے رہیں۔ مراد یہ ہے کہ قوم کی رہنمائی اسی کے لیے زیبا ہے جو قومی ضرورتیں پوری کرے اور افرادِ قوم کو ہر موقع پر صحیح پیغام دیتا اور آگے بڑھاتا رہے۔

تیرا طریقہ اور ہے اور قوم نے دوسرا ہی قاعدہ اختیار کر رکھا ہے۔ تو تو دید صورت ہے اور اسی وجہ سے تیرا آئینہ رسوا ہو رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اگر رہنما وہی طریقہ اختیار کرے جو قوم کے لیے مفید ہو تو اس کی رہنمائی یقیناً قابلِ قدر رہے گی، لیکن رہنما بدعمل ہو تو نتیجہ رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

کعبہ تیرے پہلو میں ہے اور تو بت خانے کے لیے دیوانہ ہو رہا ہے۔ تیرا عشق جو نیک و بد کی تمیز سے خالی ہے کس قدر دیوانہ ہے! مراد یہ ہے کہ اگرچہ تو عشق کا دعویدار ہے لیکن اچھائی برائی کی تجھے کوئی خبر نہیں۔ کعبے کو چھوڑ کر بت خانے کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ قومی بہبود کے حقیقی ذریعوں کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے اور ان سرگرمیوں میں وقت صرف کر رہا ہے جو کبھی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچا سکتیں۔ پھر تیرے عشق کو کس بنا پر معقول سمجھا جائے؟

تیری محفل میں مجنوں کیوں کر پیدا ہو سکتے ہیں؟ تیرا بیابان تنگ ہے اور تیرے کجاوے میں لیلا موجود نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تیرا پیغام قوم میں حقیقی جذبۂ عمل کیوں کر پیدا کر سکتا ہے۔ جب اس میں وہ جوہر موجود نہیں جو جذبۂ عمل کی جان ہے اور کوئی بڑا مقصد بھی تیرے سامنے نہیں تو چھوٹی چھوٹی باتوں کے پیچھے لگا ہوا ہے۔

اے چمکتے ہوئے موتی! جس نے لہروں کی گود میں پرورش پائی، تیرے دریا میں طوفان کی لذت کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟ یعنی تجھ میں چمک دمک تو موجود ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ تو نے لہروں کی گود میں پرورش پائی، لیکن طوفان کی لذت تجھے نصیب نہ ہوئی۔ زندگی وہی ہے جو طوفانوں میں گزرے اور خطروں سے بالکل بے پروا ہو کر گوہرِ مقصود حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ قومی رہنمائی میں تیری آب و تاب بے سود ہے۔ اس میں خطرات سے دوچار ہونے کی ہمت کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا

اپنے نغمے سنانے سے کیا حاصل؟ تیرا باغ تو اجڑ چکا تیرے گیت بالکل بے موقع ہیں اور تیرا راگ بالکل بے موسم ہے۔

تیسرا بند | شعلہ آشام: لفظی معنی شعلے پینے والا۔ مراد ہے حد سے زیادہ شراب پینے والے۔ آتش بہ جام: لفظی معنی پیالے میں آگ۔ مراد ہے نہایت تیز و تند شراب کا پیالہ لیے ہوئے۔

اہلِ نظر تو رخصت ہو گئے جو حسن کے دیدار سے فیض یاب ہو سکتے تھے اب تو دیدارِ عام کا وعدہ لے کر آیا تو اس سے

کیا حاصل؟ اس لیے کہ کوئی دیکھنے والا ہی نہ رہا۔

محفل سے وہ پرانے لوگ تو چلے گئے جو حد سے زیادہ شراب پیتے تھے۔ اے ساقی! اگر تو اب تیز و تند شراب کا پیالہ لیے ہوئے آیا تو اس سے کیا فائدہ؟

آہ! باغ کا شیرازہ بکھر گیا۔ اب اگر پھول کے لیے بادِ بہاری کا پیغام آیا تو کس کام کا؟

رات کے آخری حصے میں محبت کے بسمل کی تڑپ دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ صبح کے وقت اگر محبوب نے لب بام جلوہ دکھایا تو اس سے کیا فائدہ؟

وہ شمع تو بجھ گئی جس پر ہر پروانہ جل مرنے کے لیے تیار تھا۔ اب کوئی مکمل سوز کا دیوانہ بن کر آیا تو لاحاصل ہے۔

پھول بالکل بے پروا ہو گئے۔ تو نغمہ سرائی کر یا نہ کر۔ قافلے میں کوئی احساس باقی نہ رہا۔ اب درا سے صدا بلند ہو یا نہ ہو۔

چوتھا بند تیسرے بند کی طرح اس بند میں بھی قوم اور اس کے لیڈروں کی بے حسی کا نقشہ نہایت دردناک انداز میں کھینچا گیا ہے۔ فرماتے ہیں: تو محفل کی شمع بننے کا دعویدار ہے لیکن تیرا دل سوز سے خالی ہے۔ لیڈر ہونے کے باوجود تیرے سینے میں حبِّ قومی کی کوئی تڑپ نہیں پھر جو لوگ تیرے پیچھے چلتے ہیں جنھیں تو پروانوں کی طرح اپنا شیدائی بنائے رکھنا چاہتا ہے ان میں سوز کی لذت کہاں سے پیدا ہوتی؟ وہ بھی اس سے بے گانے رہ گئے۔

تیری تسبیح کے دانے بکھر کے بکھرے رہ گئے۔ انھیں ایک رشتے میں پرونے کی صورت یہی تھی کہ ان میں باہم محبت و الفت پیدا کی جاتی، لیکن تو یہ رشتہ مہیا نہ کر سکا اور قوم میں جمعیت و اتحاد کی کوئی صورت رونما نہ ہو سکی۔ محبت اور الفت وہ شے ہے جسے قرآن مجید نے مسلمانوں کے لیے اللہ کی خاص نعمت قرار دیا۔ ارشاد ہوتا ہے: كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا (تم آپس میں دشمن تھے۔ اللہ نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی اور محبت پیدا کر دی اور اللہ کی نعمت سے تم بھائی بھائی ہو گئے)

تیری محفل میں دو قسم کے لوگ تھے، ایک وہ جو مقاصد کے عشق میں نتائج کا بھی کچھ خیال نہ کرتے تھے اور ہر لحظہ جد و جہد میں لگے رہتے تھے۔ دوسرے وہ جن کے افکار آسمان کی سیر کرتے تھے۔ وہ ہر وقت سوچ بچار میں مگن رہتے تھے۔ ان کا سارا وقت سیاست، نظم و نسق یا مطالعہ و تصنیف میں صرف ہوتا تھا۔ انھیں دانشمند کہا جاتا تھا۔ اب نہ جد و جہد کا وہ جوش و خروش ہے اور نہ فکر و نظر کی وہ بلندی ہے۔ گویا قوم دیوانوں سے بھی خالی ہو گئی اور فرزانوں سے بھی۔

ہم نے مانا کہ شمع کے گرد اب بھی پروانے نظر آتے ہیں۔ لیڈروں کے ساتھ ساتھ قوم کے کچھ گروہ دکھائی دیتے ہیں، لیکن اس سے کیا فائدہ۔ جب شمع کی روشنی کسی کو نہیں جلا سکتی۔ جب دلوں میں سچی تڑپ پیدا نہیں ہو سکتی اور کوئی پروانہ شعلوں میں جل مرنے کو تیار نہیں ہوتا۔

ہم نے مانا کہ تو نے ساقی کا مرتبہ حاصل کر لیا، لیکن شراب پلائے گا کسے؟ نہ وہ پہلے سے شراب نوش باقی ہیں نہ پرانے مے خانے نظر آتے ہیں۔ یعنی قوم کا سارا نقشہ ہی بدل گیا۔ اس میں بے حسی پیدا ہو گئی۔ مقصد کی بات سننے والا کوئی نہ رہا۔ اگر کسی کے پاس کوئی پیغام ہو بھی تو وہ کسے سنائے؟

جس ساقی کے لبالب پیمانے کل تک ہر طرف گردش کر رہے تھے۔ آج اس کے حال پر ایک ٹوٹی ہوئی صراحی آنسو بہا رہی ہے۔

ساقی اور اس کے پیمانوں سے مراد مسلمان قوم اور اس کی شان و شوکت ہے اور ٹوٹی ہوئی صراحی سے بظاہر اپنی طرف اشارہ کیا ہے کہ اسلامی شان و شوکت مٹ گئی۔ اور اسی یعنی خستگی کی حالت میں رو رہا ہوں۔

وہ بیابان جہاں دیوانگی پرورش پاتی تھی، آج بالکل سنسان نظر آتے ہیں۔ نہ وہاں لیلا رقص کرتی ہے، نہ لیلا کے دیوانوں کا جوش و خروش۔

وائے ناکامی! کیسی نامرادی کی حالت ہے کہ قافلے کا سامان بالکل لٹ گیا اور اسے اپنے نقصان کا احساس تک نہیں۔

پانچواں بند | جن کے ہنگاموں سے کبھی بیابانوں میں آبادی کی چہل پہل اور رونق نظر آتی تھی۔ ان کے تعمیر کیے ہوئے شہر مٹ گئے۔ ان کی بسائی ہوئی آبادیاں جنگل بن گئیں۔

جن نمازوں سے توحید کی شان و شوکت قائم تھی، وہ نمازیں ہندوستان میں برہمن کی نذر ہو گئیں۔ یعنی ہندوستان کے مسلمان وہ نمازیں بھی بھول گئے، جن کی وجہ سے دنیا کو یقین ہوتا تھا کہ یہ واقعی ایک خدا کی عبادت کرنے والے ہیں۔

اس دنیا میں دائمی خوشی حاصل کرنے کی شکل صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ آئین کی یعنی شریعت کی پابندی کی جائے۔ لہر کو دیکھو کہ وہ پابندی سے آزاد رہنا چاہتی ہے اور اس کی زندگی نالہ و فریاد میں گزرتی ہے۔ موج چلتی ہے تو ایک شور بلند ہوتا ہے۔ اسی کو موج کا نالہ و فریاد قرار دیا۔

کوہِ طور کو روشن کرنے والا جلوۂ ذات جن نگاہوں کے متعلق آرزو مند تھا کہ وہ ہر وقت اسے دیکھتی رہیں، وہ نگاہیں اس نور کے جلوے سے بالکل ناامید ہو چکی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ قضا و قدر نے جس ملّتِ اسلامیہ کو ہمیشہ کے لیے دنیا کی رہنمائی کا منصب عطا کیا تھا، وہ اتنی پست ہو گئی ہے کہ خود اسے راہ و منزل کا کچھ سراغ نہیں ملتا۔

باغ میں ہزاروں بلبلیں اڑتی پھرتی تھیں خدا جانے ان کے دل میں کیا آئی کہ پاؤں توڑ کر گھونسلوں میں بیٹھ گئیں۔

آسمان کے پھیلاؤ میں جن بجلیوں کی تڑپ پر نگاہیں نہ ٹھہر سکتی تھیں اور آنکھیں چندھیا جاتی تھیں وہ بجلیاں کھلیان کے دامن پر پہنچ کر ٹھنڈی ہو گئیں۔

ان اشعار کا مضمون کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ ان میں مسلمانوں کی ابتدائی حالت، عروج اور بعد کی حالتِ زوال کا نقشہ پیش کیا گیا تھا۔

خون رونے والی آنکھ باغ کا احسان کیوں اٹھائے؟ خون کے آنسوؤں نے تو خود نگاہوں کے دامن پھولوں سے بھر دیئے ہیں ـــــ یہاں تک اقبال نے قوم کی حالتِ زار کا ماتم کیا، لیکن وہ آنسو بہانے نہ آئے تھے، قوم کو نئی زندگی اور حیاتِ تازہ کا پیغام دینے آئے تھے، لہٰذا تباہی کا نقشہ کھینچنے پر انھوں نے قناعت نہ کی اور قوم کو امید کا پیغام دیا۔ فرماتے ہیں: اگرچہ ہم پر غم کی شام طاری ہے لیکن اس سے بھی ہمیں صبح عید کا پیغام ملتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں امید کی کرن چمکتی دکھتی نظر آتی ہے۔

چھٹا بند | **پیمانہ بردار:** شراب پینے پلانے والا۔ **خُمستان:** وہ مقام جہاں شراب کے مٹکے رکھے ہوئے ہوں یعنی میخانہ **بہا:** قیمت۔ **ماہِ سیمایانِ ہند:** لفظی معنی ہندوستان کے چاند جیسی پیشانی والے حسین۔ یہ ظاہراً اشارہ انگریزوں کی طرف ہے جو ہندوستان پر حکمران تھے۔ **خانہ ساز:** گھر میں تیار کی ہوئی۔

اے حجاز کے میخانے سے شراب پینے پلانے والے! تجھے خوش خبری ہو کہ تیرے رند بڑی مدت کے بعد پھر ہوش میں آئے ہیں یعنی مسلمانوں میں پھر قومی زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی ہے۔ اس شعر میں اشارہ اس قومی بیداری کی طرف ہے جو طرابلس پر اٹلی کے حملے اور سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف یورپی مملکتوں کی سازش کے باعث پیدا ہو گئی۔

کل تک وہ رند اپنی خودداری کی پونجی دے کر غیروں سے شراب خرید رہے تھے، لیکن آج وہ پھر تیری دکان پر آگئے ہیں اور دکان کے در و دیوار پینے پلانے کی ہا و ہو سے گونج رہے ہیں۔ یعنی مسلمان خوابِ غفلت سے بیدار ہو چکے ہیں۔

یقین رکھو کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کا طلسم ٹوٹنے والا ہے اور محبوبۂ عرب کی نظر پھر اپنے شیدائیوں کو جوش و تحریکش کا پیغام دے رہی ہے۔ یعنی مسلمانوں میں از سرِ نو اسلامیت کا جوش پیدا ہو رہا ہے۔

پھر ہر طرف شور بپا ہے کہ اے ساقی! گھر کی تیار کی ہوئی شراب پلا۔ یہ جو فرنگی شراب تھی اس نے دل کی گرمیاں ٹھنڈی کر دیں۔

تو پھر نغمہ سرائی کر، یہ خاموش رہنے کا وقت نہیں۔ صبح کے آسمان نے سورج کی صراحی کندھے پر اٹھالی ہے۔ مراد یہ ہے کہ مصیبتوں کی رات ختم ہو گئی۔ صبح طلوع ہو رہی ہے، ایسے وقت میں تو چپ کیوں ہے؟ گیت کیوں نہیں گاتا؟ دوسرے کے غم میں جل اور دوسروں کو بھی اسی آگ میں جلا۔ میں نے تجھے ایک قیمتی بات سنادی جس کی سچائی سارے دنیا پر آشکارا ہے۔ ہو سکے تو اس پر عمل کر۔ مراد یہ ہے کہ خود بھی قوم کے غم میں گھل اور دوسروں کو بھی اسی غم میں گھلا۔

مشہور قول ہے کہ شاعری پیغمبری کا ایک جزو ہے تو بھی شاعر ہے لہٰذا ملت کی محفل کو فرشتے کا پیغام سنانے۔ ملت کو خواب سے چونکا دے اور اسے یہ پیغام دے کر جگا دے کہ عزت و عظمت کا دور آنے والا ہے۔ اس کی پیشوائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اپنے کمالِ شعر کے سوز سے دلوں میں زندگی کی حرارت پیدا کر دے۔

یہاں پہنچ کر شمع کی گفتگو ختم ہو گئی۔ اب شاعر کی زبان سے فرشتے کا پیغام شروع ہوتا ہے۔

ساتواں بند | ذوقِ تن آسانی: آرام طلبی کی لذّت۔

حکومت، سلطنت اور مال و دولت نے تجھ میں آرام طلبی کا شوق پیدا کر دیا۔ تیری ہمّت اور اولوالعزمی لٹ گئی اور تجھ میں مجاہدانہ شان باقی نہ رہی۔ جب تک تو بیابان میں تھا اور اسلام کی فطری سادگی تیری آرزوؤں کا مرکز تھی، اس وقت تک تجھے وسیع سمندر کی حیثیت حاصل تھی، جس کے کناروں کا کچھ پتا نہ چلتا تھا، لیکن جب تو باغ میں پہنچا یعنی سادہ اور بدوی زندگی کو چھوڑ کر جاہ و جلال کی زندگی اختیار کی تو تو ایک چھوٹی سی ندی بن کر رہ گیا۔

جب تک تو اپنی اصل حالت پر قائم تھا تو تیری اجتماعی شان بھی قائم تھی۔ جب تو نے اپنے اصول چھوڑ دیے تو وہ شان بھی قائم نہ رہی۔ خوشبو کے قافلے کو دیکھو۔ وہ جب تک پھول میں رہتا ہے، اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ پھول سے نکلتے ہی ہر طرف بکھر جاتا ہے۔

قطرے کا وجود تمھیں زندگی کے بھید سکھاتا ہے۔ دیکھو وہی قطرہ کبھی سیپی کی گود میں پرورش پا کر موتی بن جاتا ہے اور بادشاہوں کے تاج اس سے زینت پاتے ہیں۔ وہی قطرہ صبح کے وقت شبنم بن کر پھولوں پر گرتا ہے اور سارے باغ میں تازگی و شادابی پیدا کرتا ہے۔ وہی قطرہ آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپکتا ہے۔ تینوں حالتیں ایک دوسری سے مختلف ہیں، لیکن تینوں زندگی کے نہایت اہم فرض انجام دیتی ہیں۔ انسان کو اس سے سبق لینا چاہیے کہ کیسی ہی حالت پیش آ جائے اسے خدمت کا فرض بھولنا نہ چاہیے۔

اگر دل پہلو میں نہ ہو تو زندگی کس کام کی؟ کہیں سے دل پیدا کر، ہمت و جواں مردی کا سبق لے۔ یہ بہت بڑی دولت ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے   کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

اے مسلمان! تیری عزّت و آبرو اسی وقت تک تھی، جب تک تیری ملّت کی اجتماعی شان باقی تھی۔ یہ شان جاتی رہی۔ تو تو بھی دنیا میں خوار و رسوا ہو گیا۔ یاد رکھ کہ فرد کا وجود اسی وقت تک ہے جب تک ملّت سے اس کا رشتہ بندھا ہوا ہے۔ تنہا فرد کی حیثیت کچھ نہیں۔ لہر کو دیکھو جب تک وہ دریا میں رہتی ہے لہر ہے، دریا سے باہر آ جائے تو کچھ بھی نہیں۔

اس شعر کی تشریح خود اقبال نے مندرجۂ ذیل الفاظ میں کی ہے:

"کائناتِ عالم میں زندگی کی لہر کو میں ایک وسیع سمندر تصور کرتا ہوں، جس کی موجیں نامعلوم طور پر معرضِ وجود میں آتی ہیں۔ یہ موجیں محدود اور غیر مشترک انفرادی حیثیتوں میں ایک دوسری سے ایسا ربط رکھتی ہیں جو بظاہر نظر نہیں آتا۔ ہر موج بجائے خود ایک عالم ہے۔ (لب نٹز) تاہم وہ اپنے جیسے عالموں کے ساتھ مربوط ہے۔ (برگساں) زندگی کے

یہ دو ابتدائی اصولی نظریے قائم کرنے میں یورپ کے فلسفیوں کو کئی صدیاں لگیں، لیکن قرآن مجید اس نظریے کو نہایت خوبصورتی سے ظاہر کرتا ہے: وَخَلَقْنَاكُم مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ——— اور ہم نے پیدا کیا تم کو نفسِ واحد سے) یہ ظاہر ہے کہ ہر موج سمندر میں رہ کر اپنی انفرادی حیثیت قائم رکھتی ہے اور سمندر سے الگ ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھتی ہے۔

تھوڑے سے غور سے یہ بات معلوم ہو گی کہ ہر فرد افراد کے اس مجمع عظیم میں اپنے ماحول کا کس قدر ممنون ہے۔ جسم جو ہماری ہستی کو مادی مفہوم میں بہ طور فرد کے مشخص کرتا ہے، زبان جو ہم بولتے ہیں، لباس جو ہم پہنتے ہیں اور بڑی حد تک خیال جو ہم سوچتے ہیں، مذہب جس پر ہماری زندگی منحصر ہے، وہ سب اسی جماعت کے اوضاع و اطوار کے پابند ہیں جس میں ہم پیدا ہوتے ہیں۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فرد کا اپنی انفرادی ہستی قائم رکھتے ہوئے جماعت سے وابستہ رہنا کتنا ضروری ہے اور مثال سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ موج دریا میں موج ہے۔ دریا سے باہر اس کا کوئی وجود نہیں۔

آٹھواں بند: تلمیذ: شاگرد۔

تو ابھی اپنی محبت کو دل کے پردے میں چھپائے رکھ اور صراحی کی طرح اپنی شراب کو رسوا نہ ہونے دے۔ مراد یہ ہے کہ ابھی مسلمان قوم ان مقاصد کے لیے کھلم کھلا جدوجہد کے واسطے پوری طرح تیار نہیں ہوئی۔ جب تک اسے تیار نہ کر لیا جائے تیز و تند باتیں کہنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ وہ نقصان پہنچائیں گی۔

تو بھی حضرت موسیٰؑ کی طرح کوہ سینا کی وادی میں ڈیرے ڈال۔ انھیں دور سے آگ چمکتی ہوئی نظر آئی تھی۔ وہ اس کے پیچھے طور پر پہنچ گئے اور انھیں پیغمبری کا منصب مل گیا۔ تو بھی تحقیق کے شعلے سے اپنے گھر کو جلا۔ یعنی اپنی ترقی اور جدوجہد کے لیے سوچ سمجھ کر کوئی نظامِ عمل مرتب کر۔

شمع رات بھر پروانوں کو جلاتی رہی۔ اسے بھی تو اس ظلم و ستم کا انجام معلوم ہونا چاہیے۔ اس کے لیے صبح کا طلوع ہونا موت کا پیغام ہے، لہٰذا تو پروانوں کی خاکستر جمع کر اور اس سے صبح کا منظر تیار کرنے کا کام لے۔ چونکہ خاکستر کا رنگ سفیدی مائل ہوتا ہے اس لیے فرمایا کہ اس سے صبح کا منظر آراستہ کیا جائے۔ مراد یہ ہے کہ ہم پر غیروں نے جو ظلم و ستم کیے ہیں انھیں کو لے کر غیروں سے بدلے کا بندوبست کرنا چاہیے۔

اگر تجھ میں خودداری موجود ہے تو تو ساقی کا احسان کیوں اٹھاتا ہے؟ خودداری کا سبق بلبلے سے لینا چاہیے، جو دریا میں ہوتے ہوئے بھی اپنا پیالہ الٹا رکھتا ہے، یعنی دریا سے بھی کچھ نہیں لیتا۔ لینے کی آرزو ہوتی تو اپنا پیالہ سیدھا رکھتا۔

پرانے پہاڑوں اور بیابانوں میں اب کوئی لطف نہیں۔ تیری دیوانگی نئی قسم کی ہے۔ اس کے لیے بیابان بھی نیا تلاش

کرنا چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کہ جن ذریعوں سے پہلے فائدہ اٹھایا گیا۔ وہ موجودہ دور میں کام نہیں دے سکتے، حالات بدل گئے ہیں۔ اس لیے اصولِ کار بھی نئے ہونے چاہئیں۔

اگر قسمت نے تجھے مٹی میں ملا دیا ہے تو پھر کیا ہوا؟ کیا دانہ مٹی میں مل جانے کے بعد اُگ نہیں آتا؟ اور اس کا گرنا ہی اٹھ کھڑا ہونے کا نیا سامان نہیں بن جاتا۔ تو بھی دانے کی طرح اپنے گرنے سے اُٹھ کھڑا ہونے کے لیے عصا جیسا سہارا پیدا کرلے۔

پھر پرانی شاخ پر آشیاں باندھ لے اور باغ میں رہنے والوں کو اپنے مستانے نغموں کا شیدائی بنالے۔

اس باغ میں زندگی کی دو صورتیں ہیں یا تو بُلبل کی پیروی کر اور سر سے پاؤں تک نالہ و فریاد بن جا یا پھر پھول کی شاگردی اختیار کرلے اور ساری عمر خاموشی میں گزار دے۔ صدا لب تک آنے ہی نہ دے۔ اس شعر میں اقبال نے انتہا پسندی کی تعلیم دی ہے۔ یعنی حکومت کی مخالفت منظور ہے تو اسے درجۂ کمال پر پہنچا دے یا پھر سرے سے کوئی حرکت ہی نہ کر اور چُپ چاپ بیٹھا ہوا مناسب موقع کا انتظار کرتا رہ۔ اس لیے کہ درمیانی راستہ نقصان کے سوا کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس سے قوم حاکموں کے زیرِ عتاب آئے گی اور اسے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔

تو باغ میں شبنم کی طرح خاموشی کی حالت میں کیوں اترتا ہے؟ لب کھول، تو دنیا کے ساز کا نغمہ ہے۔

نواں بند | خاشاک: گھاس پھوس

اے کسان! تو اپنی حقیقت پہچان۔ تو دانہ بھی ہے، کھیتی بھی ہے، بارش بھی ہے اور پیداوار بھی۔ یعنی تجھ میں تمام اوصاف موجود ہیں تو کسی چیز کا محتاج نہیں۔

تو کس کی تلاش میں آوارہ و سرگرداں پھرتا ہے۔ راستہ بھی تو ہے، راستہ چلنے والا بھی تو ہے، رہنما بھی تو ہے اور منزل بھی تو۔ تیرا دل طوفان کے خوف سے کیوں کانپ رہا ہے۔ جب ناخدا بھی تو ہے، سمندر بھی تو، کشتی بھی تو اور کنارہ بھی تو۔

کبھی تو چاکِ گریبان کے کوچے میں تو جھانک کر دیکھ۔ یعنی سچّی دیوانگی تو پیدا کر۔ مجنوں بھی تو ہے، لیلا بھی تو، بیاباں بھی تو ہے اور محمل بھی تو ——— تیری بے بسی افسوس ناک ہے کہ تو ساقی کا محتاج بن گیا۔ حالانکہ شراب بھی تو ہے اور مینا بھی۔ ساقی بھی تو ہے اور محفل بھی تو ——— تو شعلہ بن جا اور ذاتِ باری تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہے اُسے گھاس پھوس سمجھ کر جلا دے۔ تو باطل سے کیوں ڈرتا ہے؟ تو تو ہمیشہ اسے تباہ و برباد کرتا رہا۔

دسواں بند | ہیچ مقداری: بے حیثیتی۔ ہفت کشور: سات ولایتیں۔ یعنی دُنیا۔ کِسوت: لباس

اے غافل! تو اپنی اصلیت سے واقف ہو۔ اگرچہ دیکھنے میں ایک قطرہ معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقتِ حال کے اعتبار سے تو ایک بے کنارہ سمندر بھی ہے۔ تو کیوں بے حیثیتی کے طلسم میں اُلجھا ہوا ہے؟ ذرا غور تو کر۔ تجھ میں طوفان کی سی شان و شوکت بھی موجود ہے۔

تیرے سینے میں اُس پاک ذات کا پیغامِ ناز بہ طورِ امانت موجود ہے، جو اس دنیا کے نظام میں ظاہر بھی ہے اور چھپا ہوا بھی یعنی تو خدا کے آخری پیغام کا امانت دار ہے۔

اگر تیری نظر حقیقت پر ہو تو معلوم ہو جائے کہ تیرے پاس وہ سامان موجود ہے جس کی برکت سے سات ولایتیں جنگی ساز و سامان کے بغیر ہی فتح ہو سکتی ہیں۔ اس ساز و سامان سے مراد نظر بہ ظاہر قرآن پاک کی حقانی تعلیم ہے جس پر کاربند ہو کر مسلمان لڑے بھڑے بغیر دنیا کو مسخر کر سکتے ہیں۔

اسے غفلت کے ماتے! تجھے وہ عہد و پیمان بھی یاد ہے جس پر اب تک فاران پہاڑ کی خاموشی گواہی دے رہی ہے؟ اس سے مراد اسلام کا پیغام ہے جو حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں لائے۔

اسے بے سمجھ! تو ہی چند کلیوں پر قناعت کر کے بیٹھ گیا، ورنہ اس باغ میں دامن کی تنگی کا علاج بھی موجود ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہاں جو کچھ ملتا ہے عالی ہمتی اور اولوالعزمی کی بنا پر ملتا ہے جو لوگ ہمت سے خالی ہیں، وہ دوسروں کی دی ہوئی معمولی چیزوں پر قناعت کر لیتے ہیں۔ جو مردانگی سے کام لیتے ہیں، وہ جو کچھ چاہتے ہیں لے لیتے ہیں۔

میرے دل کی کیفیت میری تقریر کے پردے پر ظاہر ہو رہی ہے۔ میری مثال صراحی کی ہے کہ اس کے اندر کی شراب چھپی ہوئی بھی ہوتی ہے اور ظاہر بھی۔ چھپی ہوئی اس اعتبار سے کہ صراحی کے اندر ہوتی ہے اور ظاہر اس لحاظ سے کہ صراحی سے صاف نظر آتی ہے۔ آخری مصرع کا مضمون میرزا غالب نے بھی بڑے ہی دل کش انداز میں بیان کیا ہے۔ کہتا ہے:

در شاخ بود موجِ گل از جوشِ بہاراں   چوں بادہ بہ مینا کہ نہاں است و نہاں نیست

میرے آگ لگا دینے والے نغموں نے مجھے جلا ڈالا ہے، لیکن یہی نغمے میری زندگی کا سامان بھی ہیں۔

ان آگ لگا دینے والے نغموں کا بھید میرے سینے میں دیکھ اور تقدیر کا جلوہ میرے دل کے آئینے میں ملاحظہ کر۔

گیارھواں بند اب جو کچھ بیان ہو گا، وہ ملت کے لیے امید و آرزو کا نیا پیغام ہے۔ اس میں پیش گوئیاں بھی ہیں جن میں سے کچھ پوری ہو چکیں اور خدا کا فضل شامل حال ہوا تو امید ہے باقی بھی پوری ہو جائیں گی۔ انھیں پیش گوئیوں کو وہ تقدیر کا جلوہ قرار دیتے ہیں۔

ترنم آفریں: نغمے پیدا کرنے والی۔ **سینہ چاک**: جن کے سینے پھٹے ہوئے ہوں۔ یہ استعارہ ہے۔ پھولوں کا اور اس سے مراد ہے مسلمان۔

آسمان صبح کے نور سے آئینے کی طرح جگمگانے لگے گا۔ ایسا نظر آئے گا کہ اس نے آئینے کا لباس پہن لیا ہے اور رات کا اندھیرا پارے کی طرح اڑ جائے گا۔

بہار کی ہوا اس قدر نغمے پیدا کرے گی کہ کلی کی گود میں سوئی ہوئی خوشبو بھی نوا بن کر نکلنے لگے گی۔

باغ کے سینہ چاک اپنے جیسے سینہ چاکوں سے آملیں گے اور باد صبا پھولوں کی ہمدم بن جائے گی۔ مراد یہ ہے تمام مسلمان جماعتوں میں وحدت پیدا ہو جائے گی اور وہ ایک دوسری سے مل کر اسلام کے متعلق اپنا فرض ادا کریں گی۔

میرے آنسوؤں کی شبنم سے سوز و ساز پیدا ہو گا اور اس باغ کی ہر کلی درد کی لذت سے آشنا ہو جائے گی۔

دریا کی رفتار میں جو شان و شوکت نظر آتی ہے، اس کا انجام تم خود دیکھ لوگے۔ بے قرار موجیں ہی اس کے پاؤں کے لیے زنجیر بن جائیں گی۔ مطلب یہ ہے کہ مغربی قوموں کی قوت و طاقت آج سب کو بے پناہ نظر آتی ہے، لیکن وہ جس انداز پر چل رہی ہیں، اس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ انجام بہت جلد تمہارے سامنے آجائے گا اور تم دیکھ لوگے کہ جو موجیں اس دریا کی شان و شوکت کا سامان ہیں، وہی زنجیر بن کر اسے بربادی کی آخری منزل پر پہنچا دیں گی۔ یہی بات اقبال نے ۱۹۰۷ء میں کہی تھی یعنی:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا نا پائدار ہو گا۔

"شمع اور شاعر" ۱۹۱۲ء میں کہی گئی۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ یورپ چھڑی جو فرنگستانی قوموں کے لیے تباہی کا پہلا پیغام تھی۔ اقبال نے ۱۹۲۱ء میں "خضر راہ" لکھی تو اس میں اپنی اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

اقبال کی وفات سے تقریباً سوا سال بعد دوسری جنگِ یورپ چھڑی۔ اس کا انجام یورپ کے لیے جس خوفناک تباہی کا باعث بنا، وہ محتاجِ بیان نہیں۔

مسلمانوں کے دلوں میں پھر سجدوں کا پیغام زندہ ہو جائے گا اور ان کی پیشانیاں دوبارہ کعبے کی خاک پر گرنے لگیں گی، یعنی مسلمانوں میں دوبارہ سچی اسلامیت زندہ ہو جائے گی۔

جو لوگ آج شکاری ہونے کے دعویدار ہیں، وہ آہ و فریاد میں مبتلا ہو جائیں گے۔ جن پرندوں کو وہ شکار کرتے تھے وہ خوشی کا گیت گانے لگیں گے۔ پھول چننے والے کے خون سے کلی کا لباس سرخ ہو جائے گا۔ مراد یہ ہے کہ جو جابر و ظالم ہم پر حکمرانی کر رہے ہیں، وہ خود ظلم و ستم کی پاداش میں گرفتار ہو جائیں گے اور ہمیں آزادی مل جائے گی۔

آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میں تو حیرانی میں گم ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی اور اس میں کیسے

کیسے انقلابات آجائیں گے البتہ یہ کہ سکتا ہوں کہ سورج کا جلوہ چمکے گا۔ رات اندھیرا کافور ہو جائے گا اور باغ توحید کے نغموں سے لبریز ہو جائے گا۔

نظم کے مطالب کا خلاصہ

یہ نظم چونکہ ذرا پیچیدہ ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خلاصہ چند سطروں میں پیش کر دیا جائے تاکہ اس کے مطالب بخوبی ذہن نشین ہو سکیں۔

۱۔ پہلے بند میں شاعر شمع سے پوچھتا ہے کہ تجھے یہ سوز کہاں سے ملا جس کی بدولت پروانے تجھ پر گر گر کر جلتے رہتے ہیں۔ مجھ میں بھی سوز تو موجود ہے۔ مدت سے جل رہا ہوں، لیکن اب تک کوئی پروانہ میری آگ میں جلنے کے لیے تیار نہ ہوا۔

۲۔ شمع جواب میں شاعر کی نہیں بلکہ لیڈروں اور قوم کی خرابیاں کرتی ہے۔ اس سلسلے میں تیسرا، چوتھا اور پانچواں بند ملّتِ اسلامیہ کی تباہی و بربادی کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔

۳۔ یہ نقشہ مایوسی پیدا کرنے والا ہے۔ شمع کہتی ہے کہ اس حالت پر افسردہ نہ ہونا چاہیے۔ امید کی صبح طلوع ہونے والی ہے، اس لیے کہ قوم میں زندگی کی نئی رُوح پیدا ہو رہی ہے۔ شاعری پیغمبری کا ایک جزو ہے۔ اے شاعر! تو بھی فرشتے کا پیغام اپنی قوم کو سُنا دے۔

۴۔ ساتویں بند سے فرشتے کا پیغام شروع ہوتا ہے، جس میں قوم کو از سرِ نو اوج و عروج پر پہنچنے کے طریقے سکھائے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے ـــــــ کہ ظاہری بے سامانی سے پریشان نہ ہونا چاہیے۔ ایمان اور قوتِ عمل موجود ہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ساتواں، آٹھواں، نواں اور دسواں بند اسی مقصد کے لیے وقف ہیں۔

۵۔ گیارھویں بند میں حالاتِ آیندہ کے متعلق پیش گوئیاں ہیں۔

مسلم

جون ۱۹۱۲ء

سرودِ رفتہ: گزرے ہوئے زمانے یا ماضی کا راگ۔ وہ گیت جو پہلے کبھی گایا جاتا تھا۔ یاس آفریں: ناامیدی پیدا کرنے والی۔ شبِ دوشینہ: گزشتہ کل کی رات۔ شاہدِ عادل: سچا گواہ۔ جسارت: بے باکی۔ ناموس: ننگ و نام عزت۔

پہلا بند اے اقبال! تیرا ہر سانس آہ میں چھپا ہوا ہے۔ یعنی تیرا ہر سانس آہ ہے۔ تیرا جلتا ہوا سینہ نالہ و فریاد سے لبریز ہے۔

تیرے دل کے ساز میں امید کا کوئی نغمہ نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ کیلا تیرے کجاوے میں موجود نہیں۔ آخری مصرع کا مضمون استعارے کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

تیرے کان ان نغموں کو ڈھونڈ رہے ہیں جو کسی زمانے میں گائے جاتے تھے۔ اب ان کا دور گزر چکا اور تیرا دل موجودہ زمانے کے ہنگاموں سے بالکل بے پروا ہے۔

کیا تجھے معلوم نہیں کہ اس باغ میں گانے والے پرندے پھولوں کا افسانہ سننا پسند نہیں کرتے؟ تو جو اہل محفل کو گزرے ہوئے زمانے کا پیغام دیتا ہے، اس پر وہ کان دھرنے کے لیے تیار نہیں۔

اے سوئے ہوئے پاؤں والے قافلے کی درا! چپ ہو جا۔ تیری آواز بہت نا امیدی پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا تیرا خاموش ہی رہنا بہتر ہے۔

تو جس پرانی محفل کو دوبارہ دیکھنے کا آرزومند ہے، وہ اب زندہ نہیں ہو سکتی۔ شمع جلا دینے سے گزری ہوئی رات روشن نہیں ہو سکتی۔ مراد یہ ہے کہ محض گزشتہ دور کا ذکر کرتے رہنے سے وہ واپس نہیں آ سکتا۔

شعروں کا مطلب بالکل واضح ہے۔ اقبال اسلام کے پرانے دور کو زندہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ اسی دور کی داستانیں اپنی محفل کو سناتا ہے، لیکن اسے یہ جواب ملتا ہے کہ تو مایوسی کا پیغام دیتا ہے اور جو دور دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا، اس کے لیے سعی و کوشش سے کیا حاصل ہے؟

دوسرا بند اس میں اقبال نے اعتراض کرنے والوں کو جواب دیتے ہوئے بتایا ہے کہ مسلمان کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اس کے مقدر کا ستارہ ہمیشہ چمکتا رہے گا، اس لیے کہ وہ توحید کا حامل ہے اور توحید اس کائنات میں زندگی کی روح اور ہستی کا ناموس ہے۔ یہ مٹ جائے تو کائنات ختم ہو جائے۔

اے دوست! میں مسلمان ہوں۔ میں توحید کا پیغام لیے پھرتا ہوں اور توحید کی صداقت پر میں اس کائنات کے پیدا ہونے کے وقت سے سچا گواہ ہوں۔

اگر کائنات کی نبض میں گرمی یا حرارت موجود ہے تو توحید ہی کی بدولت ہے۔ اسی کی برکت سے مسلمان کے فکر و خیال میں بے باکی نظر آتی ہے۔

خدا نے دنیا اسی صداقت (توحید) کو آشکارا کرنے کے لیے پیدا کی اور مجھے اس صداقت کی حفاظت کا فرض سونپ دیا۔ اس دنیا میں باطل پرستی کو میں نے تباہ کیا اور سچ پوچھو تو ہستی کے ناموس کا محافظ میں ہوں۔

میری ہستی نے اس جہان کے ننگے بدن کے لیے لباس مہیا کیا۔ میں مٹ جاؤں تو آدم کی پوری اولاد ذلیل و خوار ہو کر رہ جائے ——— مسلمان دنیا کی قسمت کا جگمگاتا ہوا ستارہ ہے۔ اس کی چمک دمک کے سامنے صبح کا جادو بھی شرما جاتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ صبح کے طلوع ہونے پر ستارے ماند پڑ جاتے ہیں، لیکن اسلامی ستارے کی جگمگاہٹ کا یہ عالم ہے کہ صبح اس روشنی کم کرنے کے بجائے خود اس کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔

میری آنکھوں پر زندگی کے بھید آشکارا ہو چکے ہیں، لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میں زندگی کی جنگی کشمکشوں سے ناامید ہو چکا ہوں اور ان میں حصّہ لینے کے لیے تیار نہیں۔

یہ جو پریشان حالی کا غم لگا ہوا نظر آتا ہے، یہ ایک عارضی حالت ہے۔ کیا میں اس سے ڈر سکتا ہوں؟ ہرگز نہیں مجھے اپنی قوم کی خوش بختی پر پورا بھروسا ہے۔ وہ ان مصیبتوں کے اندھیرے سے جلد باہر نکل جائے گی اور اپنی پرانی عظمت حاصل کر لے گی۔

میری زندگی میں ناامیدی کا کوئی جزو نہیں۔ لڑائی کے لیے دل میں جوش و خروش موجود ہو تو سمجھنا چاہیے کہ کامل فتح حاصل ہو گی۔

یہ بالکل درست ہے کہ میری آنکھیں ہمیشہ گزرے ہوئے زمانے پر لگی رہتی ہیں اور میں اپنے اہلِ محفل کو پرانی داستانیں ہی سناتا رہتا ہوں۔ گزرے ہوئے زمانے کی یاد میری مٹی کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ میرا ماضی میرے مستقبل کی شرح ہے۔ میرا نصب العین وہی پرانا دور ہے جس میں ہر طرف خوشی ہی خوشی نظر آتی تھی۔ میں اپنے آیندہ کل کو گزشتہ کل کے آئینے میں دیکھتا ہوں۔ مراد یہ ہے کہ میں اسی دور کو واپس لانا چاہتا ہوں جو گزر چکا اور اسی کی برکت سے اپنے لیے تازہ عظمت کا سامان پیدا کر دوں گا۔

ظاہر ہے کہ اس نظم میں اقبال نے مسلمان کی اہمیت و عظمت کے جو بنیادی اوصاف و خصائص واضح کیے ہیں یا کیے ہیں وہ ملت کے لیے زندگی کا سب سے بڑا اور پُر تاثیر پیغام ہے۔

حضورِ رسالت مآب ﷺ میں

تمہیدی نوٹ

یہ مختصر سی نظم اس زمانے میں لکھی گئی تھی جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تھا۔ ترک، عرب اور مصری مل کر مقابلے میں کھڑے ہو گئے تھے اور انھوں نے غیر معمولی قربانیوں سے کام لے کر اٹلی کی پیش قدمی روک دی تھی۔

وہ دور بڑا نازک تھا۔ طرابلس جسے آج کل لیبیا کہتے ہیں۔ رسمی طور پر سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا۔ اٹلی کے پاس بحری بیڑا کوئی نہ تھا۔ اس کی فوجیں مصر سے گزر کر طرابلس پہنچ سکتی تھیں لیکن انگریزوں نے مصر کا راستہ روک لیا۔
نوجوان بہادر ترک بھیس بدل بدل کر مصر کے غیر معروف راستوں سے گزرتے ہوئے طرابلس پہنچے۔ اور عربوں کو منظم کر کے انھوں نے اٹلی کی فوجوں سے لڑایا۔ ان بہادر ترکوں میں انور پاشا شہید، نیازی بے شہید، غازی عصمت انونو، غازی مصطفےٰ کمال اور بیسیوں دوسرے جواں مرد قابلِ ذکر ہیں، جن کے نام تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ زندہ رہیں گے۔
یورپی طاقتوں پر اٹلی کی نامرادیوں کا راز آشکارا ہو گیا تو انھوں نے بلقانی ریاستوں کو شہ دے کر ترکی پر حملہ کرا دیا۔ اس طرح ترکوں کے گھر میں جنگ شروع ہو گئی اور بہادر ترک سالاروں کو طرابلس چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔
یہ نظم اقبال نے شاہی مسجد لاہور میں پڑھی تھی۔ خود بھی روئے تھے اور مسلمانوں کو بھی بے طرح رُلایا تھا۔
نظرِ ثانی میں اس کا یہ شعر قلم زد کر دیا:

ہوا رفیق اجل اشتیاقِ آزادی
سمندِ عمر کو اک اور تازیانہ ہوا۔

گراں: ناقابلِ برداشت یعنی شاق۔ **آیۂ رحمت:** حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی ذاتِ مبارک سراپا رحمت تھی۔ **ولا:** محبت۔ **ملائک:** مَلَک کی جمع۔ فرشتے۔ **آبگینہ:** شیشہ۔ صراحی۔

پہلا بند جب زمانہ کا ہنگامہ میرے لیے حد درجہ ناگوار اور ناقابلِ برداشت ہو گیا تو میں سفر کا سامان باندھا اور دنیا سے رخصت ہو گیا اگرچہ میں نے صبح و شام کی قید میں زندگی کے دن کاٹے لیکن اس دنیا کے پرانے نظام سے ربط پیدا نہ کیا۔ فرشتے مجھے رسالت کی محفل میں لے گئے اور رحمت عالم صلعم کے حضور پیش کر دیا۔

دوسرا بند حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے حجاز کے باغ کی بلبل! جس کے نغموں کی حرارت سے باغ کی ہر کلی کا دل پگھل رہا ہے۔ تیرا دل ہمیشہ ہماری محبت کی شراب کے نشے میں چور رہتا ہے۔ تیری افتاد کا بھی وہی درجہ ہے کہ عجز بھرے سجدوں کو اس پر رشک آئے۔ تو دنیا کی پستی سے اُڑ کر آسمان کی طرف آیا۔ فرشتوں نے تجھے اونچا اڑنا سکھا دیا۔ باغِ جہاں سے خوشبو کی طرح نکل کر آیا ہے۔ بھلا یہ تو بتا کہ ہمارے لیے کیا تحفہ لایا ہے؟

تیسرا بند میں نے عرض کیا کہ حضور! دنیا میں آرام اور امن چین نصیب نہیں۔ وہ زندگی میسر نہیں آتی جس کی سب کو تلاش ہے۔ اگرچہ وہاں کے باغ میں لالے اور گلاب کے ہزاروں پھول ہیں لیکن وہ کلی دکھائی نہیں دیتی جس میں وفا کی خوشبو ہو۔ تاہم میں حضور کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لیے شیشے کی ایک صراحی لایا ہوں جو چیز اس میں بھری ہوئی ہے وہ بہشت میں بھی نہیں ملتی۔ حضور والا! اس میں آپ کی اُمت کی آبرو جھلک رہی ہے یعنی یہ شہیدانِ طرابلس کے خون سے لبریز ہے۔

شفاخانۂ حجاز

تمہیدی نوٹ

اخباروں میں یہ اطلاع چھپی تھی کہ انگریزوں کی کوشش سے جدّہ میں ایک شفاخانہ کھولا جا رہا ہے۔ اور اس کے لیے یہاں چندہ بھی ہوا تھا۔ جو بزرگانِ ملّت حجازِ مقدس میں انگریزی اثر کے پھیلنے کو قومی اور اسلامی مصلحتوں کے خلاف جانتے تھے، انھوں نے اسے اچھا نہ سمجھا۔ اسی موقع پر اقبال نے یہ شعر کہے تھے۔ چنانچہ وہ تجویز ملتوی ہو گئی اور اس کے التوا میں یہ نظم سب سے بڑھ کر مؤثر ثابت ہوئی۔

جدّہ: حجاز کی مشہور بندرگاہ جہاں سے مکّۂ معظمہ صرف اڑتالیس میل ہے۔ عام بحری جہاز اسی بندرگاہ پر حاجیوں کو اتارتے ہیں۔ **جیب:** عربی میں اس کے معنی ہیں گریبان۔ فارسی اور اردو میں کیسہ۔ اقبال نے جیب کو ایسے انداز سے استعمال کیا ہے کہ ذہن دونوں معنی کی طرف منتقل ہوتا ہے یعنی یہ معنی بھی لیے جا سکتے ہیں کہ اپنا ہاتھ گریبان کی طرف بڑھا اور یہ دیوانگی کی ایک علامت ہے۔ یہ بھی مراد لی جا سکتی ہے کہ جیب میں ہاتھ ڈال اور چندہ نکال۔

دارالشفا: شفاخانہ۔ ہسپتال۔ **حوالی:** گرد و نواح۔ **بطحا:** بلفظی معنی کنکریلی زمین۔ مکّۂ معظمہ میں زمین کے ایک ٹکڑے کا نام ہے جہاں کنکر زیادہ ہیں۔ عام اصطلاح میں اس سے مراد خود مکّۂ معظمہ ہے۔ **عیسٰیؑ** اور **مسیحا** دونوں لفظ اس نظم میں ڈاکٹر کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔

پہلا بند: قوم کے ایک رہنما نے اقبال سے کہا کہ جدّہ میں ایک ہسپتال شفاخانۂ حجاز کے نام سے کھلنے والا ہے تو حجاز کے خاص شیدائیوں میں سے ہے۔ جب کسی سے اس پاک سرزمین کی داستان سنتا ہے تو تیری خاک کا ذرّہ ذرّہ تڑپ اٹھتا ہے اور لوگ تجھے حجاز کا دیوانہ کہتے ہیں۔ اب وقت ہے کہ تو اپنی دیوانگی کا کرشمہ دکھائے۔ ذرا اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھا اور چندہ دے۔ مکّۂ معظمہ کے گرد و نواح میں شفاخانے کا ہونا بہت ضروری ہے۔ لازم ہے کہ بیمار کی نبض ماہر ڈاکٹر کے ہاتھ میں رہے۔

دوسرا بند: میں نے کہا کہ جس طرح حقیقت مجاز کے لباس میں چھپی ہوتی ہے اسی طرح زندگی موت کے پردے میں چھپی ہوتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ زندگی عارضی شے ہے۔ اس کی حیثیت مجاز کی ہے اور موت حقیقت ہے وہ لازماً آئے گی۔ اس سے مفر نہیں۔ عاشق نے موت کے زہر کا گھونٹ پی کر جو لذت حاصل کی وہ خضر علیہ السلام کو لمبی عمر کی شراب پی کر حاصل نہ ہوئی۔ آپ دوسروں کو زندگی کا پیغام دیں۔ مجھے اس پیغام کی ضرورت نہیں۔ میں تو حجاز کی مقدس سرزمین میں موت کا

آرزومند ہوں۔ آپ میرے لیے شفا کا پیغام کیا لاتے ہیں بھلا آرزومند لوگوں کو ڈاکٹر سے کیا کام؟

تمہیدی نوٹ

یہ نظم ۱۹۱۳ء کے ایک جلسۂ عام میں پڑھی گئی تھی، جو موچی دروازے کے باہر بعد نماز مغرب منعقد ہوا تھا۔ یہ نظم بھی اقبال چھپوا کر لائے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں یہ جلسہ گاہ ہی میں بک گئی تھی۔ اس کی پوری رقم بلقان فنڈ میں دے دی گئی تھی۔ جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے۔ یہ گویا خدا کی طرف سے شکوہ کا جواب ہے۔ نظر ثانی میں اس کے بعض بند قلم زد کر دیے گئے اور بعض بندوں کی ترتیب بھی بدل دی۔

قدسی الاصل: جس کی اصل پاک ہو۔ **کہکشاں**: وہ چھوٹے چھوٹے ان گنت ستارے جو رات کو آسمان پر ایک راستے کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ **رضوان**: بہشت کا داروغہ۔ **سُکّانِ زمین**: سُکّان ساکن کی جمع۔ زمین کے رہنے والے۔ **کیف و کم**: چیزوں کی کیفیت اور مقدار۔ کیف و کم کا عالم اور دانا سے کہیں گے جو جسمانی و عقلی، مادی و روحانی حقیقتوں سے پوری طرح آگاہ ہو۔ **شانِ کئی**: ایران کے قدیم شہنشاہوں میں ایک خاندان تھا جس کے ہر بادشاہ کے نام سے پہلے کَے کا لفظ آتا تھا۔ مثلاً: کیخسرو، کیکاؤس، کیقباد۔ یہاں مراد ہے اونچے درجے کے شہنشاہوں کی شان۔ **الحاد**: دین سے پھر جانا۔ **فاطرِ ہستی**: کائنات پیدا کرنے والا۔ **لوث**: آلائش۔ کھوٹ۔ **مراعات**: رعایت۔ **فوق الادراک**: سمجھ سے بالا **فغفور**: چین کے بادشاہوں کا پرانا لقب۔ **قہجور**: بچھڑے ہوئے۔ **گل برانداز**: پھول باہر پھینکنے والی یعنی پھول برسانے والی۔ **اُفق تابی**: افق کو چمکانا۔ **ثمرچیدہ**: جو پھل چُن چکی ہوں یعنی کامیاب۔ **کاہیدہ**: کمزور اور مرجھائے ہوئے **بالیدہ**: خوب بڑھے ہوئے۔ **بطن**: پیٹ۔ **برومندی**: پھل پانا پھلنا پھولنا یعنی کامیاب ہونا۔ **یورشِ تاتار**: اشارہ ہے چنگیز خاں کے حملے کی طرف جس نے اسلامی دنیا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اس یورش میں لاکھوں مسلمان شہید ہوئے۔ بڑے بڑے اسلامی شہر جیسے سمرقند، بخارا، ہرات، نیشاپور، رے، اصفہان، بغداد وغیرہ ویران کر ڈالے گئے۔ لیکن چنگیز خاں کی اولاد نے تیسری چوتھی پشت میں خود اسلام قبول کر لیا۔ اور وہ امن و دین حق کے محافظ بن گئے **یورشِ بلغاری**: مراد ہے بلغاریہ کا حملہ ترکی پر۔ یہ اشارہ بلغاریہ اور اس کی ساتھی بلقانی ریاستوں کی طرف ہے جن کے حملے کے باعث جنگ بلقان چھڑی۔ **صہیل**: گھوڑے کا ہنہنانا۔ **وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ**: اشارہ ہے سورہ الم نشرح کی آیت کی طرف۔ معنی ہیں: اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے تیرا ذکر بلند کر دیا۔

مردم چشم : آنکھ کی پتلی - کالی دنیا : اشارہ ہے افریقہ کی طرف - ہلالی دنیا : وہ دنیا جس کا پرچم ہلالی ہے - اشارہ ہے افریقہ کی طرف، لیکن اقبال یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ ساری دنیا مسلمان کی ہے - سپر : ڈھال -

بند ۱

جو بات دل سے نکلے وہ بڑی مؤثر ہوتی ہے، اگرچہ اس کے پر نہ ہوں لیکن اس میں اُڑنے کی قوت ہوتی ہے اور وہ ہر جگہ پھیلتی ہے - ایسی بات کی اصل پاک ہوتی ہے - اس لیے وہ بلندی کی طرف جاتی ہے اور زمین سے اٹھ کر آسمان پر پہنچ جاتی ہے - میرا عشق فتنہ پیدا کرنے والا، سرکش اور چالاک تھا - اسے کوئی چیز ڈرا یا دبا نہ سکتی تھی - میرا بے خوف نالہ دل سے اٹھا تو آسمان چیر کر نکل گیا -

بند ۲

یہ نالہ بوڑھے آسمان نے سُنا تو کہا - بھئی! کہیں کوئی فریاد کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے - سیّارے بولے کہ کہیں کا سوال نہیں، یہ آواز تو عرش بریں سے آرہی ہے - چاند کہہ رہا تھا کہ تم غلط کہتے ہو - یہ صدا تو زمین کے کسی رہنے والے کی ہے - کہکشاں نے کہا کہ میں تو سمجھتی ہوں یہیں کوئی چھپا ہوا بیٹھا ہے - میری شکایت کو اگر کسی نے کچھ سمجھا تو وہ رضوان تھا - اس نے فوراً اندازہ کر لیا کہ یہ تو بہشت سے نکلا ہوا آدمی ہے -

بند ۳

فرشتے بھی حیران تھے کہ یہ آواز کیا ہے! عرش والوں پر بھی کچھ نہ کھلا کہ اس میں کیا بھید ہے - انھیں تعجب تھا کہ کیا آدمی کی دوڑ دھوپ عرش تک بھی ہے؟ مٹی کی چٹکی بھی اڑنا سیکھ گئی ہے؟ افسوس، زمین کے رہنے والے ادب کے تقاضوں کو کس طرح پس پشت ڈالے ہوتے ہیں! یہ پستی کے باشندے کس قدر شوخ اور گستاخ ہیں!

بند ۴

شوخی بھی سہی لیکن اتنی کہ خدا سے بھی ناراضی کا اظہار کیا جا رہا ہے! کیا یہ وہی آدم ہے جسے فرشتوں نے سجدہ کیا تھا؟ ہم نے مانا کہ وہ کائنات کی تمام حقیقتوں سے آگاہ ہے، لیکن عجز اور بندگی کے بھیدا سے اب تک نہ معلوم ہوئے - انسانوں کو اپنی قوت تقریر پر بڑا فخر ہے لیکن بے سمجھوں کو بات تک کرنے کی تمیز نہیں -

بند ۵

عین اس حالت میں باری تعالیٰ کی بارگاہ سے آواز آئی کہ تیری کہانی بڑی دردناک ہے، اسے سُن کر رنج ہوا تیرا پیالہ بے قرار آنسوؤں سے بھرا ہوا ہے - تیرے نعرۂ مستانہ سے آسمان گونج اُٹھے - تیرے دیوانے دل کی زبان کتنی شیریں ہے؟ اگرچہ تو نے شکایت کی، لیکن اسے اس حسن و خوبی سے ادا کیا کہ شکایت شکر بن گئی اور بندوں کو خدا سے بات چیت کا موقع مل گیا -

بند ۶

ہم تو ہمیشہ بخشش پر مائل رہتے ہیں لیکن کوئی سوالی ہی نہیں۔ چلنے والا ہی کوئی نہ ہو تو راستہ کسے دکھائیں؟ ہم نے تو پرورش کو عام کر رکھا ہے لیکن قبول کرنے والا جوہر ہی نہ ہو تو نتیجہ کیا نکلے؟ ہم تو سمجھتے ہیں کہ یہ وہ مٹی ہی نہیں، جس سے آدم بن سکے۔ کسی میں قابلیت ہو تو ہم اسے شہنشاہوں کی شان عطا کرتے ہیں اور ڈھونڈنے والے کو نئی دنیا دے دیتے ہیں۔ آخری مصرع میں اشارہ ہے کولمبس کی طرف جس نے امریکہ دریافت کیا اور امریکہ ہی کو نئی دنیا کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ بہت بعد میں دریافت ہوئی۔

بند ۷

مسلمانوں کی حالت کیا ہے؟ ہاتھوں میں زور نہیں۔ دل دین سے پھر جانے کے عادی ہیں۔ یہ امتی تو رسول (حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے لیے کچھ عزت کا باعث نہیں ہو سکتے۔ وہ جو بت توڑنے والے مسلمان تھے اٹھ گئے جو باقی رہے وہ تو بت تراشتے پھرتے ہیں۔ باپ ابراہیمؑ تھے اور بیٹے آذر ہو گئے۔ شراب پینے والے بھی نئے، شراب بھی نئی اور مٹکے بھی نئے، کعبے کا حرم بھی نیا۔ بت بھی نئے اور تم بھی نئے۔

مراد یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات اور اسلامی کردار کی کوئی چیز باقی نہ رہی۔ پورا کارخانہ ہی بدل گیا۔ تمہاری خصلتیں تمہارے شیوے، تمہارے طریقے، تمہارا نصب العین، ان میں سے کوئی بھی چیز اسلامی نہیں۔

بند ۸

وہ بھی زمانہ تھا جب اسلام ہی ہر اچھائی کا سرمایہ سمجھا جاتا تھا۔ اسی جنگل میں پیدا ہونے والے لالے پر موسم بہار کو ناز تھا۔ جنگل میں پیدا ہونے والا لالہ اس لیے کہا کہ اسلام نے عرب میں پرورش پائی، جہاں آبادی بہت کم ہے اور اس کا بڑا حصّہ بیابان ہے۔ ہر مسلمان خدا کی راہ میں مر مٹنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ تم نے "شکوہ" میں مجھے "ہرجائی" ہونے کا طعنہ دیا۔ یہی "ہرجائی" کبھی تمہاری محبتوں کا مرکز تھا۔ اگر میں ہرجائی ہوں تو جاؤ کسی ایسے آقا سے غلامی کا رشتہ جوڑ لو جو یک جائی ہو اور میرے بھیجے ہوئے رسول (محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کی ملّت کو آفاقی اور عالم گیر نہ رہنے دو مقامی بنا لو یعنی کسی ایک مقام سے وابستہ کر لو۔۔۔۔ یہ بند شکوہ کے اس شعر کا جواب ہے:

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے۔

بند ۹

صبح کے وقت اٹھنا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق خدا کی عبادت کرنا تمہارے لیے کس قدر بوجھل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم سے تمہیں کوئی پیار نہیں۔ نیند سے پیار ہے۔ طبیعتیں آزاد ہو گئیں۔ ان پر

رمضان شریف کے روزے رکھنا بھی بھاری ہے۔ اسلام کے بنیادی حکموں سے بے پروائی کو سامنے رکھو اور کہو کہ کیا وفاداری کے طریقے یہی ہوتے ہیں؟ قوم مذہب سے بنتی ہے تمھیں مذہب سے کوئی تعلق نہیں، لہٰذا تمھاری قوم کا بھی وجود نہ رہا اگر کشش باقی نہ رہے تو ستاروں کی محفل کیونکر قائم رہ سکے؟

اس شعر میں یہ حقیقت بیان کی کہ جس طرح ستاروں کا نظام کشش کی بنا پر قائم ہے، اسی طرح قومی نظام مذہب کی بنا پر چلتا ہے۔ اس بند میں شکوہ کے مندرجہ ذیل شعر کا جواب ہے:

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں

بند ۱۰

جنھیں دنیا میں کوئی ہنر نہیں آتا، وہ تم ہو۔ تمھاری ہی قوم ہے جسے اپنے ٹھکانے کی کوئی پروا نہیں۔ تم وہ کھلیان ہو جس میں بجلیاں آرام کر رہی ہیں۔ تم تو اپنے بزرگوں کے قبرستان بھی بیچ کھاتے ہو۔ اگر قبروں کی تجارت کو اپنے لیے نیک نامی کا باعث سمجھتے ہو اور تمھیں اس بیوپار سے عار نہیں آتی تو کیا پتھر کے بت بنانے پر انھیں بیچنے نہ لگو گے؟

اس زمانے میں لاہور کے مختلف حصّوں کے اسلامی قبرستان لوگوں کے قبضے میں جا رہے تھے اور وہ قبریں صاف کر کے ان پر مکان بنا رہے تھے۔ شعر میں اسی حالت کی طرف اشارہ ہے۔

اس میں شکوہ کے مندرجہ ذیل شعر کا جواب ہے:

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی بُت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی

بند ۱۱

زمانے کے صفحے سے کس نے باطل کو مٹایا؟ انسانوں کو کس نے غلامی سے چھڑایا؟ میرے کعبے کو کس نے پیشانیوں سے بسایا؟ میرے قرآن کو کس نے سینوں سے لگایا؟ بے شک وہ تمھارے ہی باپ دادا تھے، مگر تمھاری حالت کیا ہے؟ ہاتھ پر ہاتھ رکھے آنے والی کل کا انتظار کر رہے ہو۔

اس بند کے ابتدائی دو شعر شکوہ کے ہیں صرف "ہم نے" کی جگہ "کس نے" بنا دیا۔

بند ۱۲

تم نے کیا کہا کہ مسلمان سے ہم نے حور کا صرف وعدہ ہی کیا؟ اگر کوئی غلط شکایت بھی کرے تو اس کے لیے لازم ہے کہ عقل سے کام لے۔ کائنات پیدا کرنے والا خدا عادل ہے۔ روزِ ازل سے عدل و انصاف ہی اس کا دستور چلا آتا ہے۔ کافر کو حوریں اور محل اس وقت ملے جب اس نے مسلمانوں کے سے طریقے اختیار کر لیے۔ تم میں حوروں کا چاہنے والا ہی کوئی نہیں۔ طُور کا جلوہ تو اب بھی موجود ہے لیکن اس کے لیے موسیٰ بھی تو ہونا چاہیے۔

اس میں شکوہ کے مندرجۂ ذیل شعر کا جواب ہے:

قہد تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور — اور بے چارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

بند ۱۳

مسلمان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام افراد کا نفع اور نقصان مشترک ہوتا ہے۔ اس کا نبیؐ، دین، ایمان، کعبہ، خدا اور قرآن ایک ہے۔ پھر وہ لوگ فرقوں میں کیوں کر بٹ سکتے ہیں؟ اسے کاش! تم لوگ بھی ایک ہوتے، لیکن تمھاری حالت کیا ہے؟ کہیں فرقہ بندی کے باعث پھوٹ پڑی ہوئی ہے۔ کہیں ذاتوں کے اختلاف نے تمھیں ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا ہے۔ کیا دنیا میں فروغ پانے کے یہی ڈھنگ ہیں؟

بند ۱۴

کون ہے جس نے برگزیدہ اور چنے ہوئے رسولِ پاکؐ کا طریقہ ترک کیا؟ کون ہے، جس نے حق و صداقت کو چھوڑ کر وقت کی مصلحت کو اپنے کاروبار کا معیار قرار دیا؟ یعنی حقیقت کو چھوڑ کر مصلحت کو سامنے رکھا۔ کون ہے جس کی آنکھوں میں غیروں کے طور طریقوں کو خاص عزت اور وقعت حاصل ہوئی؟ کون ہے جس کی نگاہیں بزرگوں کے دستور سے بیزار ہو گئیں؟ یہ سب کچھ موجودہ زمانے کے مسلمان کر رہے ہیں۔ ان کے دلوں میں دین کی کوئی حرارت نہیں ان کی روح احساس سے خالی ہو چکی ہے۔ یہ کیا اندھیر ہے کہ انھیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کا کچھ بھی پاس نہیں رہا

بند ۱۵

مسجدوں میں صفیں باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں تو غریب۔ روزے کی مشقتیں برداشت کرتے ہیں تو غریب۔ اگر کوئی ہمارا نام لیتا ہے تو غریب۔ اگر کوئی تمھارا پردہ رکھتا ہے تو غریب۔ غرض اسلام کا جو کچھ بھی باقی ہے، وہ غریبوں میں پایا جاتا ہے۔ ملتِ بیضا انھیں کے دم سے زندہ ہے۔ اس کے برعکس امیروں کی حالت دیکھو وہ دولت کے نشے میں ہم سے بالکل غافل ہو چکے ہیں۔

بند ۱۶

قوم کے واعظوں میں خیالات کی پختگی باقی نہ رہی۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس میں روحِ ایمان کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ ایک وقت تھا کہ ان کی طبیعتیں بجلی کی طرح تیز تھیں اور ان کی زبان سے جو الفاظ نکلتے تھے، وہ دلوں میں آگ لگا دیتے تھے۔ اب وہ حالت جاتی رہی۔ اذان کی رسم بے شک اب تک باقی ہے، لیکن اس میں بلال کی روح کہاں؟ فلسفہ سکھانے والے بہت مل جائیں گے، لیکن غزالی کی طرح فلسفے سے دین کا صحیح کام لینے والے کہاں ہیں؟ مسجدیں رو رہی ہیں اس لیے کہ وہ نمازی باقی نہ رہے جو اصل اسلامی اوصاف کے پیکر تھے۔

بند ۱۷

شور مچا ہوا ہے کہ مسلمان دنیا سے اٹھ گئے، لیکن جن مسلمانوں کے اٹھ جانے کا شکوہ کیا جا رہا ہے، ہم کہتے ہیں کہ وہ تھے کہاں؟ تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو، جن کی وضع قطع عیسائیوں کی سی ہے اور رہنا سہنا ہندوؤں کا سا ہے؟ ایسے مسلمانوں کو دیکھ کر تو یہودی بھی شرما جائیں۔ تم نے اپنے آپ کو ذاتوں میں بانٹ رکھا ہے۔ کوئی سیّد ہے، کوئی مغل ہے، کوئی افغان ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ کوئی مسلمان بھی ہے؟

مراد یہ ہے کہ ذاتوں پر فخر اس قدر ترقی کر گیا کہ مسلمان ہونے کا امتیاز ہی بھول گئے۔ حالانکہ قرآن نے سب کا نام مسلمان رکھا تھا، جیسا کہ وَهُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ سے ظاہر ہے۔

بند ۱۸

مسلمان کی شان کیا تھی؟ وہ تقریر کرتا تھا تو اس کی حق گوئی اور راست بازی ہر خوف سے پاک ہوتی تھی۔ اس کے عدل و انصاف کا یہ حال تھا کہ اس کے دامن پر رعایت کا کوئی دھبہ نہ لگ سکتا تھا۔ مسلمان کی فطرت کا پودا حیا سے نمی حاصل کرتا تھا یعنی حیا اس کی فطرت کا جوہر تھی باقی رہی بہادری اور جواں مردی تو اس میں اس کا پایہ اتنا بلند تھا کہ سمجھ ہی میں نہ آسکتا تھا

واضح رہے کہ اقبال نے ان چار خصوصیتوں میں خلفائے راشدینؓ کے ممتاز ترین وصف سامنے رکھے ہیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ سے صداقت اور راست بازی لی۔ حضرت عمر فاروقؓ سے عدل، حضرت عثمان غنیؓ سے حیا اور حضرت علیؓ مرتضیٰ سے شجاعت۔

اپنے آپ کو دوسروں کے غم میں گھلا دینا اس کی شراب کا کیف تھا اور ذاتی اغراض سے پاک رہنا اس کی صراحی تھی۔ مراد یہ ہے کہ مسلمان ہر لحظہ دوسروں کو راحت پہنچانے کے لیے وقف رہتے تھے۔ ان کی ذاتی غرض کوئی نہ تھی۔ وہ اپنے کاموں کا اجر خدا تعالیٰ کے حوالے کر دیتے تھے۔

بند ۱۹

ہر مسلمان باطل کی رگ پر نشتر بن کر لگتا تھا۔ عمل اس کی زندگی کے آئینے کا جوہر تھا۔ اسے اپنی قوت بازو پر بھروسا ہوتا تھا اور اپنی بھروسے پر وہ مردانہ وار سارے کام کرتا تھا۔ تمھیں ہر لحظہ موت کا خوف کھائے جا رہا ہے۔ مسلمان خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرتا تھا۔ اگر بیٹے کو باپ کا علم یاد نہ ہو تو اسے باپ کا ورثہ پانے کے قابل کیوں سمجھا جائے؟

بند ۲۰

تمھارا حال کیا ہے؟ جسے دیکھو، آرام طلبی کی شراب سے مست نظر آتا ہے۔ تم اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہو؟

مسلمانوں کا یہی طریقہ ہوتا ہے؟ تم میں حیدر (حضرت علیؓ) کا سا فقر نہیں۔ عثمانؓ (حضرت عثمان غنیؓ) کی سی دولت نہیں۔ بزرگوں سے تمھیں کیا روحانی نسبت ہے؟ بزرگوں کی حالت یہ تھی کہ انھوں نے اپنے اسلام کی بدولت زمانے بھر میں عزت پائی اور تم قرآن کو چھوڑ کر ہر جگہ ذلیل و خوار ہو رہے ۔

بند ۲۱

تم آپس میں ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہو۔ تمھارے بزرگ ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور مہربانی سے پیش آتے تھے۔ وہ قرآن کے الفاظ میں رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ کی زندہ مثالیں تھے۔ تم خطاؤں کے پتلے ہو اور ایک دوسرے کا نقص نکالنے کے درپے رہتے ہو۔ تمھارے بزرگ دوسروں کی خطاؤں پر پردہ ڈالتے تھے اور باہم لطف و کرم سے پیش آتے تھے۔ یقیناً ہر گروہ یہی چاہتا ہے کہ ثریّا کی بلندی پر جا بیٹھیں اور تمھاری خواہش بھی یہی ہے کہ اپنے بزرگوں کی طرح عروج حاصل کرو، لیکن پہلے بزرگوں کا سا سلیم اور پاکیزہ قلب تو پیدا کرو۔ ان میں اسلامی حمیت لہریں لے رہی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انھیں چین و ایران کی شہنشاہیاں مل گئیں۔ تم یونہی باتیں کر رہے ہو یا تم میں بزرگوں کی سی حمیّت موجود ہے؟

بند ۲۲

تم اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہو اور اپنی ہستیاں مٹا رہے ہو، تمھارے بزرگ غیرت مند اور خود دار تھے۔ تم بھائی چارے سے دور بھاگتے ہو، وہ بھائی چارے پر قربان ہوتے تھے۔ تمھیں باتوں کے سوا کچھ نہیں آتا، وہ سر سے پاؤں تک عمل ہی عمل تھے۔ تم ایک ایک کلی کے لیے ترستے ہو، ان کے پہلو میں باغ موجود تھے۔ قوموں کو اب تک ان کی داستانیں یاد ہیں۔ اس کائنات کے صفحے پر ان کی حق گوئی اور راست بازی کے نقش کندہ ہیں۔

بند ۲۳

تمھاری حالت کیا ہے؟ نوجوانوں پر ایک نظر ڈالو۔ وہ ستاروں کی طرح قوم کے افق پر چمکتے ہیں۔ ہندی بت کی محبت میں برہمن کی طرح اسے پوجنے لگے۔ اپنے دینی اصول و مقاصد کا کوئی خیال نہ رکھا۔ اڑنے کا شوق ہوا تو ایسے اُڑے کہ ٹھکانے ہی سے الگ ہو گئے۔ ان میں بے عملی پہلے سے تھی، دین سے بھی بدگمانی شروع ہو گئی۔ نئی تہذیب نے انھیں ہر پابندی سے آزاد کر دیا اور کعبے سے اٹھا کر بت خانے میں لا بسایا۔

یہاں ہم زمانے کے نوجوانوں کا حال ہے جو کالجوں میں زیرِ تعلیم تھے یا تعلیم پا کر فارغ ہو چکے تھے۔

بند ۲۴

قیس کی طرح جنونِ عشق کے دعوے داروں نے بیابان کی تنہائی میں مصیبتیں اٹھانے کا سلسلہ ختم کر دیا۔

انھوں نے شہر میں ہوا کھائی اور صحرا میں گشت لگانا ترک کر دیا۔ مجنوں تو خیر دیوانہ ہے، وہ بستی میں رہے یا نہ رہے، لیکن اس بات پر اصرار ہے کہ لیلا کے چہرے سے پردہ اٹھ جائے۔ محبوبوں کے ظلم کا گلہ باقی نہ رہے، بیداد کی شکایت نہ کی جائے۔ جب عشق آزاد ہو چکا ہے تو حسن کی آزادی ضروری نہیں؟

اس بند میں بھی نوجوانوں ہی کی حالت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے، جو پردہ اٹھانے کے سرگرم حامی تھے اور اپنے قومی شیوؤں کو چھوڑتے جارہے تھے۔

بند ۲۵

مادیت کا موجودہ دور ایک بجلی ہے جو ہر کھلیان کو پھونک رہی ہے۔ اس سے نہ کوئی باغ محفوظ ہے، نہ کوئی بیابان۔ یہ جو نئی آگ بھڑکی ہے، پرانی قومیں اور تہذیبیں اس کا ایندھن بن رہی ہیں۔ یہ سب کو جلا کر خاکستر کر دے گی۔ آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کے پیراہن تک بھی شعلے پہنچ رہے ہیں۔ آج بھی اگر حضرت ابراہیمؑ کا سا ایمان پیدا کر لیا جائے، تو یہ آگ باغ بن سکتی ہے۔

بند ۲۶

یہاں سے امید کا پیغام شروع ہوتا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا از سر نو عروج قریب آ گیا ہے۔ اس کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ اسلام کبھی مٹ نہیں سکتا۔ دنیا کو مسلمان کی ضرورت ہے۔ اسے چاہیے کہ ہمت نہ ہارے۔ جہاں جائے، توحید کا پیغام پہنچائے اور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک سے ہر جگہ اُجالا کر دے۔

اے مالی! تو باغ کا بگڑا ہوا رنگ دیکھ کر پریشان نہ ہو۔ دیکھ، شاخوں سے کلیاں پھوٹنے والی ہیں۔ یہ تاروں کی طرح چمکیں گی اور شاخوں میں روشنی پھیل جائے گی۔ گھاس پھوس اور کوڑا کرکٹ یہاں سے صاف ہو رہا ہے۔ مسلمان شہیدوں کے خون کی لالی پھول برسا رہی ہے۔ ذرا دیکھ تو آسمان کا رنگ عنّابی ہے اور افق پر وہ روشنی نمودار ہو چکی ہے جو سورج کے نکلتے وقت نمودار ہوتی ہے۔

بند ۲۷

زندگی کے باغ میں ایسی قومیں بھی ہیں جو محنت کا پھل پا چکی ہیں۔ ایسی بھی ہیں جو پھل سے محروم رہیں اور ان پر خزاں چھا گئی یعنی وہ پیچھے رہ گئیں۔ سینکڑوں پودے ہیں جو بڑھ نہ سکے۔ ایسے بھی ہیں جو نشوونما پاکر کہیں کے کہیں پہنچ گئے۔ سینکڑوں پودے ایسے بھی ہیں جو ابھی باغ کی تہ میں چھپے ہوئے ہیں۔ اسلام کا پودا پھولنے پھلنے میں ایک نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سینکڑوں صدیوں کی باغ بانی کا پھل ہے۔ یہی سب کے لیے نشوونما کا سلیقہ ہے۔

بند ۲۸

اے مسلمان! تیرے دامن کا سرا وطن کی گرد سے پاک ہے یعنی تیرے دامن کا ایک گوشہ بھی یورپی وطنیت کے غبار سے آلودہ نہ ہونا چاہیے۔ تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر تیرے لیے کنعان کا حکم رکھتا ہے۔ یعنی دنیا کا ہر خطہ تیرا وطن ہے۔ اور اسلام تیری قومیت ہے۔ تیرا قافلہ کبھی برباد نہ ہو سکے گا۔ تیرا سامان گھنٹی کی ایک آواز کے سوا کچھ نہیں۔ تو جہاں جائے گا، یہی سامان ساتھ لے جائے گا، یعنی توحید کا پیغام، قرآن پاک کی تعلیم اور رسول پاکؐ کا مبارک عملی نمونہ۔ تو شمع کا پودا ہے۔ اور تیرا ریشہ شعلے میں دوڑتا ہے۔ تیرے فکر کا سایہ آخر سوز ہی بنے گا۔

شمع کو پودا اس لیے کہا کہ موم بتی کی حیثیت ایک پودے کی سی ہوتی ہے۔ اس میں جو دھاگا ہوتا ہے اسے ریشہ قرار دیا۔ شمع اس دھاگے کے بغیر جل نہیں سکتی۔ لہٰذا کہا کہ تیرا ریشہ شعلے میں دوڑتا ہے۔ عاقبت یہ معنی آخر، درخت کا سایہ ہوتا ہے۔ اس رعایت سے کہا کہ تیری فکر کا سایہ بہرحال سوز اور جلن کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ مراد یہ ہے کہ مسلمان صرف عشق حق کا پیغام لیے پھرتا ہے اور جہاں جاتا ہے یہی پیغام پہنچاتا ہے۔

بند ۲۹

تو ایران یا کسی دوسرے ملک کے مٹ جانے سے مٹ نہ سکے گا۔ کیا شراب کے نشے کو پیمانے سے کوئی تعلق ہوتا ہے؟

مراد یہ ہے تو شراب کا نشہ ہے اور ملک پیمانے ہیں۔ اگر نشہ پیمانے کے بغیر بھی قائم رہتا ہے تو تو ملک چھن جانے سے کیوں مٹے گا؟ اچھا اس حقیقت کی گواہی تاریخ سے لے لے۔

تاتاریوں نے اسلامی دنیا پر یورش کی اور دور دور تک تباہی پھیلائی لیکن آخر کار وہ خود اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے۔ اس طرح کعبے کو بت خانے سے نگہبان مل گئے۔ اے مسلمان! زمانے میں حق کی کشتی کا سہارا تو ہی ہے موجودہ عہد ایک اندھیری رات ہے۔ اس میں صرف ایک دھندلا ستارہ چمکتا ہے اور وہ تو ہے۔

اس بند میں مسلمان کو یہ پیغام دیا کہ اگر ملک چھن گئے تو کیا ہوا؟ تیری دولت وہ پیغام ہے جس کی برکت سے ملک ملے اور اس دولت کی برکت سے تو دنیا کو دوبارہ مسخر کر سکتا ہے۔

مراد یہ نہیں کہ مسلمانوں کو ملکوں کے چھن جانے سے بے پروا ہو جانا چاہیے۔ مراد یہ ہے کہ مایوس نہ ہونا چاہیے اور اسلام کی روشنی پھیلانے میں لگے رہنا چاہیے۔ جیسے جیسے یہ روشنی پھیلے گی، دنیا مسلمانوں کی ملکیت بنتی جائے گی۔

بند ۳۰

یہ بلغاریوں کے حملے کا جو ہنگامہ بپا ہے، اس پر پریشان نہ ہو۔ یہ تو اس لیے ہوا کہ جو لوگ غافل پڑے سو رہے تھے،

وہ جاگ اُٹھیں اور اپنے بچاؤ کے فرائض انجام دینے لگیں۔ تو اس یورش کو دل آزاری کا سامان سمجھتا ہے؟ یہ تو تیری قربانی اور خودداری کا امتحان ہے۔ یہ بلا اس لیے نازل ہوئی کہ دیکھا جائے تو اپنی عزّت و حرمت کو بچانے کے لیے کتنی قربانیاں کرتا ہے اور سرفروشی کا کیسا ثبوت دیتا ہے۔ تو دشمنوں کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے کیوں سہم رہا ہے؟ خدا کا نور دشمنوں کی پھونکوں سے نہ بجھ سکے گا۔

آخری مصرع میں قرآن مجید کی اس آیت کا مفہوم پیش کیا گیا ہے: يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ
چاہتے ہیں کہ بجھا دیں روشنی اللہ کی اپنے منہ سے اور اللہ نہ رہے گا بدون پورا کیے اپنی روشنی کے اور پڑے بُرا مانیں کافر۔ (سورۂ توبہ)

بند ۳۱

اے مسلمان! قوموں کی آنکھ سے تیری حقیقت چھپی ہوئی ہے۔ زندگی کی محفل کو ابھی تک تیری ضرورت ہے۔ تیری ہی ایمانی حرارت کی بدولت زمانہ زندہ ہے۔ تیری خلافت اس جہان کی قسمت کا ستارہ ہے۔ یہ ستارہ ڈوب جائے تو زمانہ بدبختی کی تاریکی میں مبتلا ہو جائے۔ ابھی تیرے لیے فراغت کا وقت نہیں آیا۔ بہت سا کام باقی ہے۔ توحید کے نور کو ابھی کمال کے درجے پر پہنچانا ہے۔

بند ۳۲

تو خوشبو کی طرح کلی میں کیوں بند پڑا ہے؟ نکل کر بکھر جا اور اس باغ کی ہوا کے کندھے پر اپنا سر و سامان رکھ دے۔ اگر تیرا سرمایہ بہت حقیر ہے تو ذرّے سے بیابان بن جا۔ موج کے نغمے کی جگہ طوفان کے ہنگامے کی صورت پیدا کر لے۔ اپنے عشق کی قوت سے ہر پستی کو اوپر لے جا اور اس دنیا میں محمّد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک کی روشنی پھیلا دے۔

بند ۳۳

یہاں سے نعتیہ اشعار شروع ہوتے ہیں۔

محمّد صلی اللہ علیہ وسلم کا پھول نہ ہو تو بلبل گیت گانا چھوڑ دے۔ اس زمانے کے باغ میں کلیوں کی مسکراہٹ کبھی نظر نہ آئے۔ یہ وجود صلی اللہ علیہ وسلم ساقی نہ ہو تو پھر نہ شراب رہے، نہ مٹکے رہیں، نہ توحید کی محفل رہے۔ نہ تم رہو۔ یہی پاک نام ہے، جس کی برکت سے آسمانوں کا خیمہ کھڑا ہے اور اسی کی برکت سے زندگی کی نبض چل رہی ہے۔

بند ۳۴

یہ پاک ذات جنگل میں، پہاڑ کے دامن میں، میدان میں، سمندر میں، لہر کی گود میں، طوفان میں غرض ہر جگہ موجود ہے کیونکہ اس کے نام لیواؤں سے کوئی مقام خالی نہیں، چین کی گھنی آبادیوں سے مراکش کے بیابان تک اس کا آوازہ ہر جگہ بلند ہے اور یہی نام مبارک مسلمان کے ایمان میں چھپا ہوا ہے یعنی ایمان کی روح یہی ہے۔ قوموں کی آنکھ یہ نظارہ رہتی دنیا تک دیکھتی رہے گی اور انھیں نظر آتا رہے گا کہ رَفَعنَا لَکَ ذِکرَکَ کی شان کتنی بلند ہے۔

بند ۳۵

زمین کی آنکھ کی پتلی یعنی وہ کالی دنیا جس میں تمھارے شہید پلتے ہیں، جسے سورج کی گرمی نے پالا ہے جس پر ہلال کا پرچم لہرا رہا ہے، اس لیے اسے ہلالی دنیا کہنا زیبا ہے اور عاشقوں نے اس کا نام بلالی دنیا (حضرت بلالؓ کی دنیا) رکھا ہے۔

اس سے مراد ہے افریقہ۔ وہ دنیا محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک نام سے پارے کی طرح بے قرار ہے اور اسی کی برکت سے آنکھ کے تارے کی طرح نور کے دریا میں غوطے لگا رہی ہے۔

بند ۳۶

اے مسلمان! عقل تیری ڈھال اور عشق تیری تلوار ہے۔ تو اللہ کا درویش ہے۔ تیری خلافت سارے جہان پر چھائی ہوئی ہے۔ ذات باری کے سوا جو کچھ ہے، اس کے لیے تیری تکبیر آگ کا حکم رکھتی ہے۔ تو اگر سچا مسلمان بن جائے تو تیری تدبیر ہی خدا کی تقدیر بن جائے۔ اگر تو نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے وفاداری کا حق ادا کیا۔ تو ہم تیرے ہو جائیں گے۔ یہ جہان تو کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا، لوح و قلم تیرے ہو جائیں گے۔

ساقی

بقائے دوام: ہمیشہ کی زندگی۔ **ہنگامہ گستری**: ہنگامہ پیدا کرنا۔

اے ساقی! شراب پلا کر مدہوش کر دینا اور زمین پر گرا دینا تو سبھی جانتے ہیں۔ بات جب ہے کہ تو گرتوں کو سہارا دے کر تھام لے۔

مطلب یہ کہ اے مسلمانوں کے رہنما! قوم کو طرح طرح کے فریب دے کر اسے ذلیل کرنا سب کو

آتا ہے۔ تیرا کمال تو ہم جب مانیں کہ تو گمراہ اور خستہ حال مسلمانوں کو قرآن و حدیث کا پابند کر کے سیدھے راستے پر لائے اور پستی کے گڑھے سے نکال کر ترقی کے آسمان پر پہنچائے۔

جو پرانے شراب پینے والے تھے۔ وہ تو ایک ایک کر کے دنیا سے اٹھتے جاتے ہیں۔ اے ساقی! کہیں سے آبِ حیات حاصل کر کے بزم کے رندوں کو پلا تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہیں۔

مراد یہ کہ اے قوم کے رہنما! سچے اور بے باک و جلیل القدر مسلمان تو رفتہ رفتہ ملک عدم کو چلے جا رہے ہیں ان کی خالی جگہ پُر کرنے کے لیے افرادِ قوم کو کتاب و سنت کا درس دے، ورنہ تیری بزم بے رونق ہو جائے گی۔ تو اور تیری قوم دونوں پستی و ذلت کے گڑھے میں گر کر بے نام و نشان ہو کر رہ جائیں گے۔

اے ساقی! تیری رات تو ہنگامہ برپا کرنے میں گزر گئی۔ اب صبح ہونے والی ہے۔ اٹھ اور خدا کا نام لے، یعنی اے رہنما! تو نے ساری عمر غفلت اور عیش و نشاط میں گزار دی۔ اب تیری زندگی کے دن گنتی کے رہ گئے۔ اس لیے خود بھی خدا و رسول ؐ کے احکام پر عمل کر اور قوم کو بھی اسی راستے پر چلا تاکہ آخرت کے لیے نیک اعمال کا توشہ جمع ہو جائے۔

تعلیم اور اس کے نتائج

تضمین بر شعرِ ملّا عرشی

تمہیدی نوٹ

اس نظم میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ نئی تعلیم نے اگرچہ جوانوں کو علم سے روشناس کر دیا، لیکن ساتھ ہی الحاد بھی ان میں آ گیا۔ گویا جو کچھ ہم نے بویا تھا، وہ تو اس قابل نہیں کہ کاٹا جائے اور اسے دیکھ کر شرم آتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ کوئی نئی چیز بوئیں۔ تضمین کے لیے ملّا عرشی کا شعر انتخاب کیا گیا، جس کا نام طہماسپ قلی بیگ تھا۔ ابتدا میں اس نے احدی تخلص اختیار کر لیا تھا۔ پھر اپنی طبیعت کی بلندی کو پیش نظر رکھتے ہوئے عرشی تخلص کرنے لگا۔ وہ شاہ طہماسپ صفوی کے دربار کا شاعر تھا۔

جو شعر اقبال نے تضمین کے لیے منتخب کیا، اس کے متعلق صاحب "آتش کدہ آزر" نے ایک دلچسپ لطیفہ لکھا ہے اور وہ یہ کہ ملّا عرشی کا اکلوتا فرزند بڑا ہی بدصورت تھا۔ کسی ظریف نے اسے دیکھ کر ملّا صاحب سے کہا کہ یہ شعر غالباً آپ نے مخدوم زادے ہی کے متعلق موزوں فرمایا ہے۔

شرح ہم جوانوں کی ترقی سے خوش تو ہیں لیکن کبھی کبھی ہنستے ہوئے لب سے فریاد بھی بلند ہو جاتی ہے۔
ہم تو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ نوجوان تعلیم پائیں گے تو انھیں اچھے کاروبار کا موقع ملے گا، اچھی ملازمتیں حاصل کریں گے
اور مالی اعتبار سے فارغ البال ہو جائیں گے لیکن ہمیں کیا خبر تھی کہ اس تعلیم کے ساتھ الحاد اور دین سے بیزاری بھی آجائے گی۔
اس میں شبہ نہیں کہ پرویز کے گھر میں شیریں کے جلوے تو نظر آنے لگے مگر وہ اپنے ساتھ فرہاد کا تیشہ بھی لے آئی یعنی
مالی اعتبار سے فارغ البالی تو میسر آگئی، لیکن ساتھ ہی دین کی بربادی کا سامان بھی ہو گیا۔
یہ تو ملّا عرشی والی بات ہوئی کہ اب نیا بیج کہیں سے حاصل کریں اور اسے از سر نو بوئیں کیونکہ جو کچھ ہم نے پہلے بویا تھا،
اس کی فصل تو ہم شرمندگی کے مارے کاٹ نہیں سکتے۔

قربِ سلطان

اس نظم میں اقبال نے ۱۲-۱۹۱۱ء کے عام سیاسی طور طریقوں پر نکتہ چینی کی ہے۔
حاکم اور محکوم کی تمیز مٹ نہیں سکتی۔ یہ بدستور قائم رہے گی اس لیے کہ بھکاری بادشاہ کی برابری اور ہمسری نہیں کر سکتا اس
دنیا میں غلامی و چاکری کا کمال یہ ہے کہ آقا کی فرماں برداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے یہاں تک کہ اسی کو عبادت بنا لیا جائے
سچ کہا گیا ہے کہ آقا کی خوشنودی حاصل کرو اور رنگین لباس پہنو، لیکن مصیبت یہ ہے کہ اگر حاکم کی خوشنودی کو نصب العین
بنا لیا جائے تو قوم کہتی ہے کہ یہ شخص عہدے اور منصب کا بھوکا ہے اور قوم فروشی اس کا شیوہ ہے۔ غرض پرانے طریقے پر
کام کریں تو ہزار مشکلیں ہیں اور نئے اصول سے عقل و فکر کی گود خالی ہے یعنی نئے اصول سمجھ میں نہیں آتے۔
اس آسمان کے نیچے رہنے کا مزہ تو یوں ہے کہ منہ میں ہزار باتیں ہوں لیکن لب چپ رہے یعنی کہا کچھ نہ جائے
اس شعر کا فارسی مصرع خواجہ حافظ کا ہے۔ پورا شعر یوں ہے:

تسلّا آں کہ اہلِ نظر بر کنارہ می رفت ند ہزار گونہ سخن بر دہان و لب خاموش

زندگی میں سکون حاصل کرنا منظور ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اے حافظ! تو گوشہ نشین درویش ہے، بہتر یہی ہے
کہ چپ رہ اور شور و غوغا نہ کر۔ یہ مصرع بھی حافظ کا ہے۔ پورا شعر یوں ہے:

رموزِ مصلحتِ خویش خسرواں دانند گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

لیکن اگر تیرے دل میں شور و غوغا کی رغبت ہے تو بسم اللہ، صاف شراب لے اور ساز بجاتا ہوا پی، یعنی کھلے بندوں
پی۔ امیر، وزیر اور بادشاہ کی محفل میں شریک ہو۔ ہوش کے شیشے کو حرص و ہوس کے پتھر سے ٹکرا کر چکنا چور کر دے۔ مطلب

یہ کہ امیر، وزیروں اور سلطان کی محفل میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو عقل و ہوش سے بے پروا ہو جائے اور صرف اپنی اغراض پر نظر جمائے رکھے۔ لیکن شیراز کے مرشد کا پیغام بھی سُن لے۔ یہ فرشتے کے ضمیر کا بھید ہے جہاں راز کی باتیں چھپی رہتی ہیں۔ بادشاہ کی روشن رائے نورِ تجلّی کے چمکنے کا خاص مقام ہے، یعنی بادشاہ کی رائے پر تجلّی کا نور برستا ہے۔ جب تو اس کے پاس بیٹھنے کا طلب گار ہو تو نیت صاف رکھنے کی کوشش کر۔ آخری شعر حافظ کا ہے اور انھیں کو مرشدِ شیراز کہا ہے۔

شاعر

پہلا بند **جوئے سرود آفرین:** نغمہ پیدا کرنے والی ندّی۔

نغمہ پیدا کرنے والی ندّی بہار کے مے خانے سے سُرخ شراب پی کر پہاڑ سے وادیوں میں آ رہی ہے یعنی بہار کے موسم میں جب پہاڑوں پر بارش ہوتی ہے تو ندّی راگ الاپتی ہوئی وادیوں میں جا کر انھیں سرسبز و شاداب کر دیتی ہے۔ سرسبزی و شادابی پر پرندے اور آدمی خوشی کے گیت گانے لگتے ہیں ـــــ ناز بھری چال کی شراب سے مست ندّی کا پیغام سُن۔ وہ زبانِ حال سے کہ رہی ہے: زندہ اسی کو کہ سکتے ہیں جسے قرار اور آرام سے کچھ واسطہ نہیں یعنی زندہ لوگ ہمیشہ تگ و دو اور جد و جہد سے عمل میں مصروف رہتے ہیں۔ ندّی بھی ہر لحظہ رواں دواں ہو کر اپنا فرض انجام دیتی رہتی ہے ـــــ بادل کی دلکش چال والی بیٹی یعنی ندّی عجیب انداز سے وادیوں میں چکر لگا رہی ہے۔ اور عشق و محبت کے ساتھ چراگاہ کے سبزے سے اٹکھیلیاں کرنے میں مشغول ہے۔ یعنی ندّی کا پانی لہلہاتے ہوئے سبزے سے کھیل رہا ہے اور سبزہ اس کی بلائیں لے رہا ہے ـــــ ندی پہاڑ کے مے خانے سے شراب کا پیالہ اٹھا لیتی ہے اور اونچی نیچی جگہوں کو پھاندتی ہوئی کھیتوں کو جا کر پلا دیتی ہے۔ یعنی جب پہاڑ پر مینہ برستا ہے تو ندی اچھلتی کودتی کھیتوں میں پہنچ کر انھیں سیراب کر دیتی ہے۔

دوسرا بند اسی طرح اگر کوئی ایسا شاعر جس کا کلام بیداری، ترقی اور زندگی کا پیغام ہو، کوئی کھری بات کہ دے تو اس کے اعجاز بھرے اثر سے زندگی کا کھیت ہرا ہو جاتا ہے یعنی شاعر اپنے اشعار کے جادو سے مُردہ قوم میں نئی اور تازہ زندگی پیدا کر دیتا ہے۔ جب اس شاعر کی قوم آزر کا شیوہ اختیار کر لیتی ہے تو اس کے کلام سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی شان ظاہر ہوتی ہے۔ یعنی جب کوئی قوم شرک، بت پرستی، بدعملی، بے حسی اور دوسری برائیوں میں ڈوب جاتی ہے تو شاعر برائیوں کے تمام بُت ریزہ ریزہ کر کے قوم کو نئی زندگی کی شاہراہ پر لے آتا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم کے مسلک کی پیروی ہے۔ اسی لیے اقبال نے اسے شانِ خلیل سے تعبیر کیا۔

جو شاعری خونِ جگر سے پرورش پاتی ہے۔ وہ اہلِ زمین کے لیے ہمیشہ کی زندگی کا نسخہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ جو بات دل سے اٹھے گی۔ اسی میں سچی تڑپ اور بے اندازہ تاثیر ہوگی۔ وہ تمام ذاتی غرضوں سے پاک رہے گی۔ اس میں قوم کی بھلائی اور بہتری کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ لوگ اس سے زندگی کا سبق ہمیشہ لیتے رہیں گے۔ اگر دنیا کے باغ میں شرابِ شعر کی ندّی نہ ہو تو نہ پھول ہو، نہ کلی، نہ سبزہ ہو، نہ خود باغ۔

اس نظم میں اقبال نے ایک لحاظ سے اپنی شاعری کا صحیح نقشہ پیش کیا ہے، دوسرے نقطۂ نگاہ سے یہ آنے والے شاعروں کے لیے ایک پرخلوص دعوت ہے یعنی صحیح شاعری ہی ہے جو خلوص، صداقت اور بے غرضی پر مبنی ہو اور جس کا سرچشمہ دلی تڑپ ہو۔

نوید صبح

سنہ ۱۹۱۲ء

یہ نظم اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ اقبال کی زندگی یکسر مسلمان کی بیداری اور اصلاح کے لیے وقف ہو گئی تھی۔ قدرت کے نگارخانے میں جس چیز پر ان کی نظر پڑتی ہے، اسی کو وہ مسلمان کے لیے بیداری اور تازہ زندگی کا پیغام بنا لیتے ہیں۔ یہ نظم اسی زمانے میں شائع ہو گئی تھی۔

ہنگامہ در دامن: دامن میں ہنگامہ لیے ہوئے۔ احرام: وہ خاص لباس جو حاجی حج کی نیت کرتے وقت پہنتے ہیں اور وہ حج کے احکام پورے کر لینے پر اتارا جاتا ہے۔ یہاں مراد ہے عام لباس۔ ستیز: جنگ، لڑائی۔ آداب گریز: بھاگنے کے طور طریقے۔ خودافشانی: لفظی معنی اپنے آپ کو چھڑکنا۔ مراد ہے جوہر نمایاں کرنا۔ خفّاش: چمگادڑ۔

پہلا بند جب صبح اپنے دامن میں ہنگامے لیے ہوئے مشرق سے نمودار ہوتی ہے تو دنیا کی منزل سے خاموشی کوچ کر جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ صبح کے طلوع ہوتے ہی رات کے سنسان نظارے ختم ہو جاتے ہیں اور ہر طرف چہل پہل شروع ہو جاتی ہے۔ قدرت کی محفل پر رات کے وقت خاموشی کا جو طلسم چھایا ہوتا ہے وہ ٹوٹ جاتا ہے اور ہر چیز راحت و آسایش کی بے حسی چھوڑ کر اپنی زندگی کا ثبوت دینے لگ جاتی ہے یعنی کام کاج کے لیے حرکت میں آجاتی ہے۔ پرندے پیغام حیات پاتے ہی چہچہانے لگتے ہیں۔ پھول بھی باغ میں زندگی کا لباس پہن لیتے ہیں۔ کائنات کی عام کیفیت ہمیں ہر روز صبح کے وقت نظر آتی ہے۔ اے سوئے ہوئے مسلمان! تو بھی نیند سے اٹھ اور اسی طرح ہنگامہ بپا کر، جس طرح صبح کے نمودار ہوتے ہی ہر شے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ہنگاموں میں لگ جاتی ہے۔ دیکھ! وہ افق پر روشنی نمودار ہوئی تو بھی اپنی ہستی کے تقاضے پورے کرنے میں مصروف ہو جا۔

دوسرا بند اس دنیا کے پھیلاؤ میں تو بھی سورج کی طرح سفر شروع کر۔ آسمان کے دامن پر بادل کے جتنے داغ ہیں انھیں اپنی روشنی سے محو کر دے۔ تو کرن کی تلوار میان سے کھینچ، باطل کی تاریکی سے لڑائی میں سرگرم ہو جا اور اسے بھاگنے کے آداب سکھا دے یعنی اسے بالکل مٹا کر رکھ دے۔ تو سر سے پاؤں تک نور ہی نور ہے۔ تیرے لیے بہتر یہی ہے کہ سب کے سامنے کھلم کھلا ظاہر ہو جائے۔ ظاہر ہوتے ہی اپنے تمام جوہر نمایاں کر دے۔ نمایاں ہو کر تو چمگادڑ کی آنکھوں کے لیے بجلی بن جا یعنی جو نگاہیں

تیرا حقانی نور دیکھنا گوارا نہیں کرتیں، انھیں جلا کر راکھ کر دے۔ تو اس کائنات کے دل کا چھپا ہوا بھید ہے تجھے سب کھل جانا چاہیئے۔

دعا

تمہیدی نوٹ میرزا جلال الدین بیرسٹر ایٹ لا فرماتے ہیں کہ اقبال ہر شام بلا ناغہ میرے ہاں تشریف لاتے۔ وہاں گانا بھی ہوتا جب ان کا قلب متاثر ہونے لگتا:

وہ ایک دھیمی آواز میں گنگنانا شروع کرتے جس کے ساتھ ساتھ اپنے داہنے زانو کو ہاتھ سے تھپکتے جاتے... سازندے جو اقبال کی طبیعت سے واقف ہو چکے تھے نہایت مدھم سروں میں ایک قسم کی تال سی دیتے تھے اور وہ اپنی مخصوص لے میں جس کی دل کشی کا اظہار الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا، اپنے اشعار پڑھنا شروع کرتے ان کی آواز سازندوں کی ہم آہنگی کی وجہ سے کچھ ایسی دل نواز ہو جاتی کہ ایک سماں سا بندھ جاتا... "یارب دلِ مُسلم کو وہ زندہ تمنّا دے" والی نظم کی بنیاد ایک ایسی ہی مجلس میں رکھی گئی تھی اور ملی ترانے کا پہلا شعر بھی اسی حالت میں موزوں ہوا تھا۔ (ملفوظاتِ اقبال ص۹۸)

اے خدا! مسلمان کے دل کو وہ زندہ آرزو بخش، جس سے دل میں حرارت پیدا ہو جائے اور روح تڑپ اٹھے۔ وادیٔ فاران کے ہر ذرّے میں چمک پیدا ہو جائے اسے پھر دیکھنے کا شوق اور تقاضے کی لذت عطا کر، مسلمان بصیرت کی روشنی سے محروم ہو چکا ہے۔ اسے پھر دیکھنے والی آنکھ عطا کر تاکہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ دوسرے بھی دیکھ سکیں۔ یہ ہرن راستے سے بھٹک کر پریشان پھر رہا ہے، اسے کعبے کے راستے پر لگا دے۔ یہ شہر کا عادی ہو چکا ہے اس کی نظریں تنگ اور حوصلے پست ہیں اسے پھر بیابان کا پھیلاؤ عطا کر جس سے نگاہوں میں تیزی اور حوصلوں میں بلندی پیدا ہو۔

مسلمان کا دل اجڑا ہوا ہے۔ اس میں کسی تمنا اور آرزو کا سُراغ نہیں ملتا۔ اس اجڑے ہوئے مقام میں دوبارہ قیامت کا شور پیدا کر دے۔ یہ کجاوہ خالی ہو چکا ہے اس میں پھر پیاری لیلا کو بٹھا دے۔ یہ دور سراسر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ دل پریشان ہیں انھیں محبت کا ایسا داغ عطا کر جسے دیکھ کر چاند بھی شرمائے۔

اے خدا! مسلمانوں کے مقاصد کو ایسی بلندی عطا کر کہ وہ ثریّا سے پہلو مارنے لگیں۔ ان میں دریا کے کنارے کی سی خودداری اور دریا کا سا جوشِ آزادی پیدا ہو جائے۔ ان کی محبت ہر غرض سے پاک ہو ان کی صداقت اور راست بازی کو کوئی طاقت ڈرا نہ سکے۔ ان کے سینے روشنی سے بھر دے۔ ان کے دل صراحی کی طرح پاک ہو جائیں۔ مصیبت کے جو نشان جابجا نظر آ رہے ہیں۔ مسلمانوں کو ان کا احساس عنایت کر تاکہ وہ آج کے شور و غل میں آنے والی کل کی فکر سے

سے غافل نہ رہیں۔ یعنی حال ہی کے چکروں میں ضرا لجھے رہیں بلکہ مستقبل پر بھی ان کی نظریں جمی رہیں۔
اے خدا! میں ایک اجڑے ہوئے باغ کی بلبل ہوں جسے قدرت نے نالہ و فغاں کا کام سونپ دیا ہے میں تاثیر کی بھیک مانگتا ہوں۔ تو سب کچھ دینے والا ہے، مجھ حاجت مند کا یہ سوال پورا کر دے۔

عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں

تمہیدی نوٹ

عید کے موقع پر کسی نے شعروں کی فرمائش کی تھی۔ اقبال نے بے تکلف یہ شعر لکھ بھیجے، جن میں اپنے دل کی کیفیت صاف صاف واضح کر دی۔

شالامار: لاہور کا مشہور شاہی باغ جو شاہ جہاں کے عہد میں بنا تھا اور مغلوں کے دورِ عروج میں بادشاہوں کی خاص قیام گاہ رہا۔

شالامار میں موسم خزاں میں ایک زرد پتا کہتا تھا کہ بہار کا وہ موسم جس کا میں رازدار ہوں، گزر گیا۔ باغ کی سیر کو آنے والے مجھے کیوں پاؤں کے نیچے روندتے ہیں۔ کیا انھیں یاد نہیں کہ میں اسی شاخ کی یادگار ہوں، جس پر ان کا گھونسلا تھا، یعنی اسی شاخ سے گرا ہوا ہوں۔

ذرا سے پتے کی بات نے میرے دل کو تڑپا دیا۔ باغ میں آ کر میں سر سے پاؤں تک موسم بہار کا غم بن گیا۔ خزاں کے زمانے میں مجھے بہار کی یاد آنسو بہانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مجھے عید کی کیا خوشی ہو۔ میں تو ماتم میں ڈوبا ہوا ہوں۔ پرانے زمانے کے تمام شراب خانے اجڑ گئے۔ جو شراب پینے والے اب باقی نہیں رہے میں انھیں کی یادگار ہوں۔ عید کا چاند ہمیں عیش اور خوشی کا پیغام سناتا ہے تو سمجھنا چاہیے کہ ہماری ہنسی اڑاتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ جب ہماری حالت خوشی کی نہیں ماتم کی ہے تو عید ہمارے لیے کس بنا پر خوشی کا پیغام ہو سکتی ہے؟

فاطمہ بنتِ عبداللہ

عرب لڑکی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی

تمہیدی نوٹ

اقبالؒ نے فاطمہ بنت عبداللہ کے حالات ۱۳ نومبر ۱۹۱۲ء کے الہلال (جلد اوّل ص۱۸) میں پڑھے تھے۔ حالات کے ساتھ فاطمہ کی ایک رنگین تصویر بھی چھپی تھی۔ جس پر مندرجہ ذیل عبارت ثبت تھی:

ماھذا بشراان ھذا الاملک کریم ط

ایک یازدہ سالہ مجاہدہ!

السیّدہ فاطمہ بنت عبداللہ

مضمون کا خلاصہ یہ تھا کہ فاطمہ بنت عبداللہ قبیلہ البراعصہ کے سردار شیخ عبداللہ کی صاحبزادی تھی۔ یہ قبیلہ تعداد اور اثر ورسوخ کے اعتبار سے سب میں بڑا تھا۔ ترک عرب مجاہدوں کو سرکاری خزانے سے خوراک وغیرہ کے لیے کچھ رقم دیا کرتے تھے۔ شیخ نے اس رقم کے قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا اور حقیقی معنی میں جہاد فی سبیل اللہ کا حق ادا کیا۔ ان کے خاندان کی تمام عورتیں اور مرد میدانِ جنگ میں شہید ہوئے اور شیخ نے بھی شہادت پائی۔

فاطمہ کے متعلق ڈاکٹر اسمٰعیل شباتی بے نے جو حالات بیان کیے ان کا خلاصہ یہ تھا کہ اس کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی۔ اگرچہ عربوں کی بہت سی عورتیں زخمیوں کی خدمت اور دیکھ بھال کرتی تھیں، اس لیے کہ زخمی عموماً ان کے عزیز اور ہم قبیلہ ہوتے تھے، لیکن فاطمہ اس وجہ سے خاص طور پر قابل ذکر تھی کہ وہ عمر میں سب سے چھوٹی تھی۔ دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنا چھوٹا سا مشکیزہ کندھے پر اٹھائے ہر لحظہ پیاسوں کو پانی پلانے اور زخمیوں کی خدمت بجا لانے میں مصروف رہتی تھی۔ اگرچہ قدم قدم پر گولوں اور گولیوں کی بوچھاڑ ہوتی تھی لیکن فاطمہ کبھی کسی خطرے سے ہراساں نہ ہوئی۔ ۱۹۱۲ء جون ۱۹۱۲ء میں بارہ ہزار اطالویوں نے زرادہ کے مقام پر حملہ کیا۔ مقابلہ میں عرب اور ترک صرف تین ہزار تھے۔ لڑائی عصر کے وقت تک جاری رہی۔ آخر اطالوی بارہ سو لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔

فاطمہ کی شہادت کا واقعہ ڈاکٹر اسمٰعیل نے یوں بیان کیا ہے کہ اطالوی توپوں سے آگ برس رہی تھی۔ میں نے ظہر کے وقت فاطمہ کو دیکھا۔ اس کا چہرہ دھوئیں اور تپش سے جھلسا ہوا تھا۔ بالوں پر سرخی مائل ریت کی تہ جمی ہوئی تھی۔ اس کے والد شیخ عبداللہ جنگ میں شریک تھے اور والدہ خود فاطمہ کی طرح زخمیوں کی دیکھ بھال میں لگی ہوئی تھی۔ عصر کے وقت عرب مجاہدوں کا ایک دستہ اطالویوں پر ٹوٹ پڑا۔ احمد نوری بے (ایک ترک افسر) بھی اپنے تیس سپاہیوں کو لے کر ساتھ

ہوگیا۔ راستے میں ان کی مُٹھ بھیڑ ایک اطالوی جیش سے ہوگئی جو گھات میں چھپا بیٹھا تھا۔ فاطمہ اس ترک دستے کے ساتھ تھی۔ اطالویوں نے دستے کو نرغے میں لے لیا۔ آخر ترکوں نے جوشِ شجاعت سے کام لے کر اپنے لیے راستہ پیدا کر لیا۔ ان کے چار بہادر سپاہی زخم کھا کر گر گئے۔ فاطمہ نے دوڑ کر اپنا مشکیزہ ایک زخمی ترک کے سینے پر رکھ دیا اور چاہتی تھی کہ مشکیزے کا منہ زخمی کے لبوں سے لگا دے۔ اس اثنا میں ایک اطالوی نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ فاطمہ نے اپنے آپ کو بے قابو پا کر بجلی کی سی تیزی سے زخمی ترک کی تلوار اٹھائی اور اس زور سے اطالوی پر وار کیا کہ اس کا پنجہ کٹ کر لٹک گیا۔ فاطمہ پھر اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ اطالوی نے پیچھے ہٹ کر بندوق اٹھائی اور اس معصوم بچاری کو چشم زدن میں شہید کر ڈالا۔ جنگ کے بعد عرب اور ترک اپنے زخمیوں کی تلاش میں نکلے تو اس مقام پر چار بہادر ترک بے ہوش پڑے تھے۔ ان کے پاس سیدہ فاطمہ کی نعش تھی۔ اس کا مشکیزہ ترک غازی کے سینے پر پڑا تھا۔ مشکیزہ کا منہ لبوں پر نہ تھا جس سے معلوم ہوا کہ سیدہ فاطمہ ترک غازی کو پانی نہ پلا سکی۔

اسی واقعے سے متاثر ہو کر اقبال نے یہ نظم لکھی۔ نظرثانی میں اس کے بعض شعر قلم زد کر دیے۔ بعض میں جزوی ترمیم فرما دی۔

امّتِ مرحوم: لفظی معنی وہ اُمّت جس پر رحم کیا گیا ہو۔ مراد ہے ملّتِ اسلامیہ۔ **سقّائی**: پانی پلانا۔ **خزاں منظر**: جس پر خزاں کا سماں چھایا ہو۔

پہلا بند اے فاطمہ! تو ملّتِ اسلامیہ کے لیے عزّت و آبرو کا سامان ہے۔ تیرے جسم کی خاک کا ایک ایک ذرّہ پاک اور معصوم ہے۔ اے صحرائی حور! تجھے غازیانِ دین کو پانی پلانے کی خدمت نصیب ہوئی اور یہ سعادتمندی تیری قسمت میں تھی۔ تو نے خدا کی راہ میں تلوار اور ڈھال کے بغیر جہاد کیا۔ اللہ اللہ شہادت حاصل کرنے کے شوق نے تجھ میں کیسی جرأت و دلیری پیدا کر دی۔ اللہ اکبر! جس باغ پر خزاں کا سماں چھایا ہو، اس میں ایسی کلی پیدا ہوئی اور ہماری راکھ میں اس قسم کی چنگاری بھی چھپی ہوئی تھی۔ ملت اسلامیہ کو راکھ سے اس لیے تشبیہ دی کہ اس کے افراد میں جواں مردی اور ہمتِ عمل کا وہ جوش باقی نہ رہا جس نے بزرگوں کو ثریا کی بلندی پر پہنچا دیا ؎

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم　　　　ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

نہیں، اس صورتِ حال پر حیران نہ ہونا چاہیے۔ ہمارے بیابان میں ابھی بہت سے ہرن چھپے ہوئے ہیں۔ بادل اگرچہ برس چکا ہے لیکن اس میں بھی بجلیاں سوئی ہوئی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ہم موجودہ حالتِ زار میں بھی کسی سے کم نہیں اور جواں مردی کے ایسے معجزے دکھا سکتے ہیں جو دوسروں کی قدرت سے باہر ہیں۔

دوسرا بند اے فاطمہ! اگرچہ تیرے غم میں ہماری آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں، لیکن ماتمی نالہ و فغاں کے ساتھ ہمارے دل سے خوشی کے نغمے بھی اٹھتے ہیں۔ وہ کیوں؟ اس لیے کہ تیری خاک کا رقص دل میں عجیب و غریب نشاط پیدا کرتا ہے۔

اس کا ایک ایک ذرہ زندگی کی تڑپ سے بھرا ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تیری قبر کی خاموشی میں کوئی ہنگامہ چھپا ہوا ہے اور اس کی گود میں ایک نئی قوم پل رہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ قومیں ایسے ہی عظیم الشان کارناموں کی آغوش میں پرورش پاتی ہیں جیسا کہ سیّدہ فاطمہ نے ذرا سی عمر کے میدانِ جنگ میں انجام دیا۔

میں اس نئی قوم کے ارادوں اور مقصدوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ کتنے بلند اور کتنے وسیع ہیں۔ البتہ مجھے یہ نظر آ رہا ہے کہ وہ تیری ہی قبر سے پیدا ہوگی۔ آسمان کی فضا میں ایسے نئے ستارے روشن ہونے والے ہیں جن کی چمک دمک کی لہریں ابھی تک انسان کی آنکھ نے نہیں دیکھیں۔ وہ ستارے ابھی زمانے کے اندھیرے سے باہر نکلے ہیں۔ ان کی روشنی صبح و شام کی پابندی سے آزاد ہے۔ یعنی یہ صورت نہیں کہ شام ہو تو چمکیں اور صبح ہو تو غائب ہو جائیں وہ ہمیشہ چمکتے رہیں گے ان کی چمک دمک میں پرانا رنگ ڈھنگ بھی ہے اور نیا رنگ ڈھنگ بھی اور اے فاطمہ! اس میں تیری قسمت کے ستارے کا جلوہ بھی شامل ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہ نئی قوم ہمارے ماضی کے کارناموں کو بھی زندہ کرے گی، زمانۂ حال کے سلسلے میں بھی تمام فرائض انجام دے گی اور اس کے ذریعے سے ہمارے مستقبل کی بنیادیں بھی مضبوط ہو جائیں گی۔

شبنم اور ستارے

زہرہ : ایک مشہور ستارہ جسے ناہید اور رقاصۂ فلک بھی کہتے ہیں۔ **قرطاسِ فضا :** لفظی معنی فضا کا کاغذ مراد پھیلاؤ

پہلا بند ایک رات ستاروں نے شبنم سے کہا کہ تو ہر صبح نئے نئے نظارے دیکھتی ہے۔ کوئی کیا جانتا ہے کہ تو کتنے جہان دیکھ چکی ہے جو بن کر مٹ گئے تو نے ان کے نشان بھی دیکھے ہیں۔ زہرہ ستارہ نے ایک فرشتے سے یہ سُنا ہے کہ انسانوں کی بستی آسمان سے بہت دور ہے۔ تو ہر روز وہاں جاتی ہے۔ ذرا اس خوبصورت ولایت کی کہانی ہمیں بھی سنا جس کی محبت کے گیت چاند گاتا رہتا ہے۔

دوسرا بند شبنم نے کہا اے تارو! دنیا کے باغ کا حال کچھ نہ پوچھو۔ وہ باغ نہیں، نالہ و فریاد کی بستی ہے۔ بلاشبہ صبا اس باغ میں آتی ہے، لیکن آتے ہی پلٹ جاتی ہے۔ کلیاں بے چاری کھلتی ہیں تو اس غرض سے کہ مرجھا جائیں۔ یعنی دنیا میں کسی چیز کے لیے بھی پائداری نہیں۔ ہر شے بالکل عارضی ہے آج ہے اور کل نہیں۔

میں تمھیں کیا بتاؤں کہ کلی کس طرح باغ کی زینت بڑھا دیتی ہے؟ وہ چھوٹی سی چنگاری نظر آتی ہے جس میں جلن بالکل نہ ہو۔ کلی کو جلن کے بغیر چنگاری کہنا تشبیہ کا معجزہ ہے

پھول کی حالت دیکھو۔ وہ بلبل کا نالہ و فریاد نہیں سُن سکتا اور اپنے دامن سے میرے موتی بھی نہیں چُن سکتا یعنی نہ اس

میں سننے کی قوت ہے، نہ خوبصورت چیزوں کو چن چن کر جمع کر رکھنے کی۔

جو پرندے نغمے گا رہے ہیں، کیا غضب ہے کہ انھیں قید کر لیا جاتا ہے اور دیکھو، پھول کے سائے میں کانٹے اگتے ہیں۔ نرگس کی آنکھ ہمیشہ تر رہتی ہے یعنی اس میں آنسو بھرے رہتے ہیں۔ اسے یہ دکھ ہے کہ دل نظارے کا طلبگار ہے اور آنکھ نظر سے محروم ہے۔ یعنی وہ دیکھ نہیں سکتی۔ شمشاد کا حال ملاحظہ کرو۔ وہ کہنے کو آزاد ہے لیکن اصل میں قیدی ہے۔ اس وجہ سے وہ فریاد کرتا ہے۔ اور فریاد کی گرمی سے اس کا دل جل گیا ہے۔

کیا تمھیں معلوم ہے کہ انسانوں کی زبان میں تاروں کو کیا کہا جاتا ہے؟ انھیں آہ و فریاد کی چنگاریاں کہا جاتا ہے اور مجھے باغ کی زبان میں آسمان کے آنسو قرار دیا جاتا ہے۔ چاند زمین کے گرد گھومتا ہے تو یہ اس کی بے سمجھی ہے۔ خدا جانے اسے کیونکر یقین ہو گیا کہ اس طرح اسے داغِ جگر کا علاج میسّر آ جائے گا؟ مجھ سے سنو، دنیا کے کارخانے کی بنیاد ہوا پر ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ فضا کے صفحے پر نالہ و فریاد کی تصویر ہے۔

اس نظم کا ماحصل یہ ہے کہ تاروں نے زمین کی خوبیاں سُن کر شبنم سے اس کی حقیقت پوچھی۔ اس نے اسے ناپائداری اور حق ناشناسی کی تصویر بنا کر پیش کر دیا۔

محاصرۂ ادرنہ

تمہیدی نوٹ

ادرنہ جسے انگریزی میں ایڈریانوپل کہتے ہیں، یورپی ترکی کا ایک مشہور شہر ہے جو قسطنطنیہ سے پہلے فتح ہوا اور اس سے پیشتر سلطنت عثمانیہ کا دارالحکومت رہا۔ جب جنگ بلقان چھڑی تو ایک لاکھ سے زیادہ بلغاری اور سردی فوجوں نے اس پر یورش کی۔ غازی شکری پاشا اس ترک فوج کے سپہ سالار تھے جو ادرنہ کی حفاظت پر مامور تھی۔ وہ دن کم پانچ ماہ غازی شکری پاشا نے مقابلہ جاری رکھا۔ اگرچہ ان کے پاس فوج بہت کم تھی اور ساز و سامانِ جنگ و رسد بھی نہ مل رہا تھا ۲۵ مارچ ۱۹۱۳ء کو دشمن نے آخری حملہ کیا اور ۲۶ کو شہر فتح ہو گیا۔ دشمن کی توپوں نے صرف ایک دن میں تیس ہزار پھٹنے والے گولے ادرنہ پر پھینکے۔ شہر فتح ہونے پر غازی شکری پاشا اور ان کے ماتحت سالار قید ہو گئے۔ جب وہ بلغاریہ کے دارالحکومت صوفیہ میں پہنچے تو تمام بڑے بڑے جنگی اور سول افسروں نے سٹیشن پر ان کا استقبال کیا۔ اور ان کی جوانمردی کے اعتراف میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ چند ماہ بعد بلقانی ریاستوں میں پھوٹ پڑی اور وہ آپس میں لڑنے لگیں تو غازی انور پاشا تھوڑی سی ترک فوج لے کر بڑھے اور یکایک ادرنہ پر قابض ہو گئے۔ آج کل یہ جمہوریہ ترکیہ کا ایک مشہور شہر ہے۔

اقبال نے نظم میں جس واقعے کا ذکر کیا ہے وہ محاصرے کے دوران میں پیش آیا تھا۔ اس میں اسلام کے کمال حق شناسی کے علاوہ ترکوں کی دینی شان نمایاں کی گئی ہے۔

صلیب: سولی۔ یہاں مراد ہے عیسائیوں کے قومی نشان سے۔ قمر: چاند۔ مراد ہے مسلمانوں کے قومی نشان سے آئینِ جنگ: فوجی قانون یا مارشل لا۔ منتقل: ایک جگہ سے دوسری جگہ لائی گئی۔ عصفوریہ: چڑیا۔ فقیہ شہر: شہر کا مفتی۔ صاعقہ: چمکنے والی بجلی۔ ذمّی: وہ غیر مسلم جس کی حفاظت کا مسلم حکومت نے ذمّہ اٹھایا ہو۔

یورپ کے بلقانی حلقے میں جب حق و باطل کے درمیان لڑائی چھڑ گئی، بلقانی ریاستوں نے بے سبب ترکی پر حملہ کر دیا تو حق کو بھی مجبوراً تلوار اٹھانی پڑی یعنی ترکی کو بھی اپنی حفاظت کے لیے میدانِ جنگ میں اترنا پڑا۔ عیسائی فوجوں نے اسلامی فوج کو نرغے میں لے لیا۔ گویا صلیب کے گرد و غبار نے چاند کے گرد حلقہ ڈال لیا۔ غازی شکری پاشا ادرنہ میں گھر گئے۔ بلغاری اور سروی فوجوں نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ مسلمان غازیوں کے لیے رسد کے جو ذخیرے جمع کر رکھے تھے، وہ رفتہ رفتہ ختم ہو گئے۔ باہر سے رسد پہنچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ امید کا چہرہ نگاہوں سے چھپ گیا۔ یعنی امید باقی نہ رہی۔

مجبور ہو کر ترک لشکر کے سپہ سالار نے شہر میں فوجی قانون یا مارشل لا جاری کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فوجی ضرورت کے ماتحت خوراک کے وہ تمام ذخیرے قبضے میں لے لیے گئے جو لوگوں کے گھروں میں موجود تھے۔ سلطانی فوج رعایا سے غلہ لینے پر مجبور ہو گئی۔ گویا شاہین دانے کے لیے چڑیا سے بھیک مانگنے لگا۔ لیکن شہر کے مفتی نے جب یہ خبر سنی تو اسے اتنا غصّہ آیا گویا وہ طُور کی بجلی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کہا جن غیر مسلموں کی حفاظت کا ذمّہ مسلمانوں نے اٹھا رکھا ہے۔ ان کا مال مسلمان لشکر کے لیے حرام ہے۔ یہ فتویٰ شہر میں پھیل گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ترک فوج یہودیوں اور عیسائیوں کے غلّے کو چھوتی تک نہ تھی۔ کیوں؟ اس لیے کہ خدا کا حکم یہی تھا اور مسلمان خدا کے حکم کے سامنے بے اختیار جھک جاتا ہے۔

غلام قادر رہیلہ

تمہیدی نوٹ

غلام قادر رہیلہ ضابطہ خان کا بیٹا اور نجیب الدّولہ کا پوتا تھا۔ شاہ عالم ثانی کے زمانے میں ملک کے حالات بہت ابتر تھے۔ سلطنت کا مرکز بہت کمزور ہو چکا تھا۔ مختلف امیروں نے علاقے سنبھال رکھے تھے۔ مرہٹوں اور جاٹوں کی ترک تازیں جاری تھیں۔ امیر آپس میں بھی لڑتے رہتے تھے اور ایک دوسرے کی دشمنی میں مرہٹوں یا جاٹوں کو بھی بیچ

دے کر حملہ کرا دیتے تھے۔ انھیں حالات میں ایک مرتبہ خود شہنشاہِ ہند نے مرہٹوں کے اُکسانے پر ضابطہ خاں کو حملے کا نشانہ بنا لیا۔ ضابطہ خاں پر بڑی مصیبتیں آئیں، اس کا گھر بار تباہ ہوا۔ خواتین کی عزّت و حرمت بھی باقی نہ رہی۔ غلام قادر اس وقت بارہ تیرہ سال کا تھا۔ یہ واقعہ اس کے دل میں آگ بن کر سُلگتا رہا۔ آخر اسے ۱۷۸۸ء میں بدلہ لینے کا موقع ملا۔ وہ دہلی کے لال قلعے پر قابض ہو گیا۔۔۔ اور چھپے ہوئے خزانے کی نشان دہی کے سلسلے میں شاہی خاندان کے بہت سے افراد کو ظلم و ستم کا ہدف بنایا۔ آخر شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکال دیں۔ کچھ دیر بعد شہنشاہ کے کہنے پر مرہٹوں نے اس کا پیچھا کیا۔ متھرا میں وہ گرفتار ہوا اور اسے سخت اذیتیں دے کر مار دیا گیا۔ اقبال نے اس نظم میں جو واقعہ بیان کیا ہے۔ معلوم نہیں، یہ کہاں سے لیا؟ یہ نظم بھی "خطاب بہ جوانانِ اسلام" کے ساتھ ترنّم سے انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس میں سنائی گئی تھی۔

روہیلہ: غلام قادر۔ **شاہ تیموری:** شاہ عالم ثانی۔ **سمن بر:** چنبیلی جیسے جسم والی۔ **سامانِ طرب:** عیش و نشاط کا سرمایہ۔ **مِغفَر:** خود۔ لڑائی میں سر پر پہننے کی فولادی ٹوپی جس سے چہرہ اور گردن بھی ڈھک جاتے تھے۔ **احمر:** سُرخ۔ **اخگر:** شعلہ۔

غلام قادر روہیلہ کتنا ظالم، ستم گر اور بغض و کینہ رکھنے والا شخص تھا کہ اس نے نوکِ خنجر سے شہنشاہ تیموری شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکال دیں۔ پھر شاہی بیگمات کو اس ظالم نے حکم دیا کہ میرے سامنے ناچو۔ یہ ایسا ظلم تھا کہ اسے قیامت کی نشانیوں سے کم نہ سمجھنا چاہیئے۔ بھلا غور کرو، ایسے فرمان کو وہ بیگمات مان سکتی تھیں جن کے جسم چنبیلی کے سے تھے اور جسے ماننا اس وقت تک ہرگز ممکن نہ تھا، جب تک غیرت بالکل نہ مر جاتی، بے درد غلام قادر نے ان خواتین کو عیش و نشاط کا سامان بنا لیا، جن کا حسن سورج، چاند اور تاروں کی آنکھوں سے بھی پوشیدہ تھا۔ بیگمات کے نازک دل کانپ رہے تھے لیکن ان کے قدم ناچ پر مجبور تھے۔ ان کی آنکھوں سے خون کے دریا بہہ رہے تھے۔

غلام قادر کچھ دیر تک یہ نظارہ دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے گھبرا کر اپنے سر کو خود کے بوجھ سے نجات دے دی۔ اُٹھا اور کمر سے وہ تلوار کھول ڈالی جو جانیں لیتی تھی، آگ برساتی تھی اور جس کے جوہروں کی آب و تاب ستاروں کو بھی چمکنا سکھاتی تھی۔ اس نے خنجر سامنے رکھا۔ پھر کچھ سوچ کر لیٹ گیا۔ ظاہر یہ کیا کہ اس کی سُرخ آنکھیں نیند کی ماتی ہو رہی ہیں تھوڑی دیر لیٹا رہا اور اس نے اپنی آنکھوں کے شعلے نیند کے پانی سے بجھا دیے۔ جو دردناک نظارہ اس کے سامنے تھا اس سے ظالم کی نگاہیں شرما گئیں۔ پھر اٹھا اور تیموری بیگمات سے بولا کہ تمھیں اپنی قسمت کی شکایت نہ کرنی چاہیے۔ میں سویا نہ تھا میرا سونا محض دکھاوے کا تھا وہ ایک بناوٹی بات تھی جو لوگ لشکروں کو جنگ کے لیے آراستہ کرتے ہیں وہ غافل نہیں ہو سکتے۔ غفلت ان سے کوسوں دُور رہتی ہے۔ میری غرض یہ تھی کہ شاید تیموری خاندان کی کوئی شہزادی مجھے غافل پا کر تلوار اٹھائے اور میرا کام تمام کر دے۔ یہ نہ ہوا اور اس طرح یہ بھید سارے زمانے پر آشکارا ہو گیا کہ تیمور کے گھرانے میں

غیرت و حمیت اب باقی نہ رہی اگر ہوتی تو کوئی تیموری شہزادی جان پر کھیل کر مجھے قتل کر ڈالتی۔
فکر اقبال کے اعجاز دیکھیے کہ نظم میں غیرت و حمیت کا پیغام اس شخص کی زبان سے دیا جس نے کمال بے دردی سے حمیت کش فعل کا ارتکاب کیا تھا اور اسی کی زبان سے یہ کہلوایا:
کہ غفلت دُور ہے چشمِ صف آرایانِ لشکر سے

ایک مکالمہ

ایک گھریلو پرندے نے فضا میں اڑنے والے پرندے سے کہا: اگر تیرے پر ہیں تو کیا میرے پر نہیں۔ اگر تو ہوا میں اڑ سکتا ہے تو میں بھی ہوا میں اڑ سکتا ہوں۔ اگر تو آزاد ہے تو میں بھی پابند نہیں ہوں جس کے پر ہوں وہ لازماً اڑے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ فضا میں اڑنے والے پرندے اتنے مغرور کیوں ہیں؟
یہ دل دکھانے والی باتیں سن کر فضا میں اڑنے والے پرندے کی غیرت کو ٹھیس لگی اور اس نے کہا: اس میں کوئی شک نہیں کہ اڑنے میں تجھے پوری آزادی حاصل ہے، لیکن اسے کیا کرے گا کہ تیری اڑان زیادہ سے زیادہ دیوار کی منڈیر تک ہے۔ تو فضا میں اڑنے والے پرندوں کی ہمت کا اندازہ کیا کر سکتا ہے؟ تیرا رہنا سہنا زمین پر ہے ان کا تعلق آسمان سے ہے۔ تو گھریلو پرندہ ہے اور زمین سے خوراک حاصل کرتا ہے ہم دانے کی تلاش میں ستاروں تک جا پہنچتے ہیں اور انھیں کو دانہ سمجھ کر چونچ مارنے لگتے ہیں۔
اس نظم کا حاصل یہ ہے کہ اگر مختلف لوگوں کے پاس ظاہری اسباب ایک قسم کے ہوں تو ضروری نہیں کہ ان سب کا درجہ بھی ایک ہو۔ درجہ ہر شخص کی ذات، ہمت اور مقاصد کی بلندی پر موقوف ہے۔

میں اور تو

میں نے مانا کہ میری نظر دیکھنے کی لذت سے بھی واقف نہیں اور تیری نگاہ فطرت کے بھید پا چکی ہے۔ پھر کیا ہوا؟
میری زبان زمانے کی شکایت کے لیے وقف ہے اور آسمان کی گردش تیری آرزو کے مطابق ہے۔ پھر کیا ہوا؟
مراد یہ کہ میرے لیے تو اس دنیا میں آرام کا کوئی سامان نہیں، لہٰذا ہر وقت زمانے کی شکایت میں لگا رہتا ہوں تو اپنی مراد میں کامیاب ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے؟

آسمان نے مجھے ہوا کی لہر کی طرح باغ میں سرگرداں رکھا اور تجھے گھونسلا عطا کر دیا۔ پھر کیا ہوا؟
تیری زندگی کا سرمایہ نفع کے سبب سے برابر بڑھ رہا ہے اور میری قسمت میں نقصان کی تکلیف کے سوا کچھ نہیں پھر کیا ہوا؟ تیرے ہوائی جہاز ہوا میں تیرتے پھر رہے ہیں اور میری کشتی کو بادبان بھی نصیب نہیں۔ پھر کیا ہوا؟
طاقت ور ہو گئے تو کیا؟ کمزور ہو گئے تو کیا؟ ایسے ہو گئے تو کیا؟ ویسے ہو گئے تو کیا؟ اس باغ یعنی دنیا میں کسی طور بھی قرار و قیام ممکن نہیں۔ تو بہار ہو گیا تو کیا؟ میں خزاں رہ گیا تو کیا؟

تضمین بر شعر ابوطالب کلیم

تو نے خواجۂ یثرب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا خوب پاس کیا! تیری زندگی زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ تو مسلمان نہیں۔ اے سلیمان! جس نگینے کے سبب سے آسمان تیری انگشتری کے حلقے میں قید تھا، اسے تو نے اپنی غفلت سے کھو دیا۔ مراد یہ ہے کہ جن خصوصیتوں کے باعث تو نے برتری حاصل کی تھی اور آسمان تیری مرادیں پوری کر رہا تھا، وہ خصوصیتیں تجھ میں باقی نہ رہیں۔ سجدے کا جو نشان ستارے کی طرح روشن تھا، اب اس سے تیری پیشانی کو کوئی واسطہ نہیں رہا۔ تو اپنے عمل کو دیکھ۔ کیا اس میں سچائی کی وہ بے باکی نظر آتی ہے جو لوگوں کے لیے حیرت کا باعث تھی؟ تیرے بزرگوں کی نگاہ جس باطل کے لیے بجلی کا حکم رکھتی تھی، اسے تو نے اپنے دل میں بٹھا لیا ہے۔
اے غافل! تو اپنا گھونسلا پھر آباد کر۔ دیکھ! حقیقت شناس کلیمِ معنی کے طور پر بیٹھا ہوا کیا راگ الاپ رہا ہے۔ کہتا ہے۔ تو نے جس سے سرکشی اختیار کی، پھر اس کا فرماں بردار بن جا تو جس مقام سے شعلے کی مانند اٹھا تھا پھر وہیں جا بیٹھ۔ آخری شعر کلیم ہمدانی کا ہے۔ کلیم کی رعایت سے طور کا لفظ لائے۔ کلیم کی تاریخ وفات یہ تھی۔ "طور معنی بود روشن از کلیم"۔ نغمہ زن ہے طور معنی پر کلیم نکتہ بیں" میں غالباً مصرع تاریخ وفات بھی پیش نظر تھا۔

شبلی و حالی

مولانا شبلی نے ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو وفات پائی۔ ایک مہینہ اور بارہ دن بعد ۳۰ دسمبر ۱۹۱۴ء کو خواجہ حالی رہگرائے عالم بقا ہوئے۔ اقبال نے ان دونوں بزرگوں کی وفات پر یہ قطعہ لکھا۔
چرخِ لاجورد: لاجورد کے رنگ کا آسمان یعنی گہرا نیلا۔ ہم نبرد: لڑنے والا۔

اقبال نے ایک روز مسلمان سے کہا کہ تیرا وجود اس دنیا کے دفتر میں یگانہ حیثیت رکھتا ہے یعنی تو یگانہ ہے تو پرانے زمانے میں جو نغمے الاپتا رہا، وہ نئے زمانے کے علم ہیں۔ جسے تہذیب کہا جاتا ہے، وہ تیرے گزرے ہوئے قافلوں کا غبار ہے۔ بلکہ انسان کی عزت و آبرو کا آئینہ اتنا نازک ہے کہ ہوا کی لہر بھی اس کے لیے پتھر کا حکم رکھتی ہے یعنی ہوا کی لہر بھی اسے توڑ سکتی ہے جن دلیروں میں عمل کی قوت ہوتی ہے وہ حادثوں کے اسباب تلاش کر کے ہمت سے کام لیتے ہوئے آسمان کے ظلم و ستم کا مداوا کرتے ہیں۔ اے مسلمان! تو باغ کے پرانے رازداروں سے مل۔ ان سے پوچھ کر تیرے باغ میں خزاں کیوں آ کر جنگ آزما ہوتی ہے یعنی تیرے باغ میں خزاں کیوں آ گئی۔

مسلمان میری بات سنتے ہی بے قرار ہو گیا۔ اس کے دل میں جو غم چھپا ہوا تھا وہ آہ سرد بن کر ظاہر ہو گیا۔ مسلمان نے کہا کیا تجھے خزاں کا نقشہ نظر نہیں آتا؟ دیکھ شجر زندگی کے پتے زرد ہو گئے ہیں۔ باغ کے جن رازداروں کی درد بھری صدائیں دلوں میں گداز پیدا کرتی تھی، وہ چپ ہو گئے۔ ابھی باغ والے تشنگی کو رو رہے تھے۔ اس اثنا میں حالیؔ نے بھی جنت کی راہ لی۔ اب باغبان سے کون پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا، پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا؟

مراد یہ ہے کہ رازداں ہی نہ رہے تو پوچھا کس سے جائے؟

ارتقا

ستیزہ کار: لڑائی کرنے والا۔ **شرارِ بولہبی:** ابولہب کا شرر۔ ابولہب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک چچا کی کنیت تھی۔ جو اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھا۔ لہٰذا شرارِ بولہبی سے مراد ہے کفر کا شرارہ۔ **نرم:** شری **آتشِ عنبی:** لفظی معنی انگور کی آگ یعنی شراب۔ **قطرۂ نیساں:** موسم بہار کی بارش کا قطرہ۔

اس دنیا کی پیدائش سے آج تک کے حالات پر ایک نظر ڈالو۔ یہی دکھائی دے گا کہ کفر کا شرارہ ایمان کے چراغ سے لڑتا رہا ہے۔ زندگی کا مزاج شعلے کی طرح گرم ہے۔ وہ بڑی ہی غیرت مند اور ہنگامہ پرور رہی ہے اس کی فطرت ہی یہ ہے کہ مشکلات جھیلے اور سختیاں طلب کرے۔ شام کی خاموشی سے صبح کے نغموں تک آدھی رات کی آہ و فغاں کو ہزاروں منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں مراد یہ ہے کہ شام ہوتے ہی دنیا پر خاموشی چھا جاتی ہے۔ صبح کے وقت پھر ہنگامے شروع ہوتے ہیں۔ اس مدت میں رات کو آہ و فغاں جاری رہتی ہے گویا خاموشی کو نغمہ بننے کے لیے رات بھر نالہ و فریاد کرنی پڑتی ہے۔

حلب کے آئینے پر نگاہ ڈالو وہ اس مٹی سے بنتا ہے جس میں کوئی جلا نہیں بلکہ سراسر سیاہ ہے لیکن دیکھو اس مٹی کو آئینہ بننے کے لیے سردی گرمی حرارت اور تراش خراش کی کتنی مصیبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں؟

موسم بہار کا مینہ برستا ہے۔ انگور کی بیل میں تازگی آتی ہے۔ انگور لگتے ہیں۔ پکتے ہیں۔ پھر انھیں توڑ کر شراب نکالی جاتی ہے لیکن غور کرو کہ بارش کا قطرہ گرنے اور شراب بننے کے درمیان باندھنے، توڑنے، نچوڑنے، تپانے اور عرق کھینچنے کے کتنے مقام آتے ہیں؟ یعنی پہلے بیل کو باندھا جاتا ہے۔ پھر انگور توڑے جاتے ہیں پھر ان سے شیرہ نچوڑا جاتا ہے، آخر میں بھٹی پر چڑھایا جاتا ہے جب کہیں شراب کھینچی جاتی ہے۔

اسی لگاتار کھینچ تان کی برکت سے قومیں زندہ ہیں۔ ملتِ اسلامیہ میں جو گرمیٔ عمل پائی جاتی ہے اس کا بھید یہی ہے۔ شراب بنانے والے بہ ظاہر انگور کے دانوں سے پانی نکالتے ہیں لیکن دراصل ستاروں کو توڑ کر سورج بناتے ہیں۔ ستاروں کو انگوروں سے اور شراب کو سورج سے تشبیہ دی ہے۔

صدیقؓ

اقبالؔ نے جو واقعہ نظم کیا ہے وہ جنگِ تبوک ۹ ھ کے موقع پر پیش آیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کی ترغیب فرمائی۔ اکثر صحابہؓ نے بڑی بڑی رقمیں پیش کیں۔ حضرت عمرؓ سارے مال و اسباب میں سے نصف لے آئے۔ حضرت صدیقؓ کے پاس جو کچھ تھا لا کر پیش کر دیا۔ یہاں تک کہ کرتے میں جو گھنڈیاں لگی ہوئی تھیں وہ بھی اتار کر پیش کش میں رکھ دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دریافت فرمایا کہ اہل و عیال کے لیے کیا چھوڑا؟ تو عرض کیا: ان کے لیے اللہ اور اس کا رسولؐ۔

رہوار: گھوڑا۔ **دست نگر:** محتاج۔ **ملکِ یمین:** لفظی معنی داہنے ہاتھ کی ملکیت۔ مراد لونڈی۔ غلام۔ **حمار:** گدھا۔ **فروغ گیر:** روشنی حاصل کرنے والے۔ **تکوین:** بنانا۔ وجود میں لانا۔ پیدا کرنا۔

ایک دن رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ جو لوگ تم میں مالدار ہیں، وہ خدا کی راہ میں مال خرچ کریں۔ یہ ارشاد سنا تو حضرت عمرؓ انتہائی خوشی سے اٹھے۔ اس روز ان کے پاس کئی ہزار درہم تھے۔ وہ دل میں کہہ رہے تھے کہ آج میرے ایثار کے گھوڑے کا قدم فرید صدیقؓ سے آگے رہے گا۔ غرض وہ اپنا مال رسولِ امین کے پاس لے آئے۔ کام کی ابتدا قربانی کی محتاج ہوتی ہے۔ ابتدائے کار سے دو مطلب سمجھے جا سکتے ہیں۔ اوّل ہر کام کا آغاز جس کے لیے قربانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ دوسرا ہر بڑی تحریک کا ابتدائی دور جس میں قربانیوں کے سوا چارہ نہیں ہوتا جب تحریک پھیل جاتی ہے تو پھر اسباب خود بخود بکثرت فراہم ہو جاتے ہیں۔ میرے نزدیک یہاں ابتدائے کار سے مراد ہے اسلام کا ابتدائی دور۔

حضور سرورِ عالمؐ نے پوچھا کہ اے عمرؓ! حق کا جوش تیرے دل کے لیے آرام و سکون کا باعث ہے۔ یہ بتا کہ تو نے اپنے بال بچوں کے لیے بھی کچھ رکھا ہے؟ مسلمان پر اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کا بھی حق ہوتا ہے اور یہ حق ادا ہونا

چاہیے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ میں نے آدھا مال بچوں کے لیے چھوڑ دیا۔ باقی آدھا قوم پر نثار کر دیا۔ اتنے میں حضرت رسول اکرم کا وہ رفیق بھی آ پہنچا جس کی برکت سے عشق و محبت کی بنیاد مضبوط ہوئی۔

رفیقِ نبوت سے اشارہ ہے حضرت صدیقؓ کی طرف، اس لیے کہ وہ اکثر مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔

اقبال خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے حضرت صدیق اکبرؓ کے تمام فضائل ایک مصرع میں جمع کر دیے ہیں یعنی ——— ع

ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر

وہ بلند مرتبہ انسان جس کی فطرت وفا تھی، ہر چیز اپنے ساتھ لے آیا جو دنیا کی نگاہوں میں اعتبار کا سبب بن سکتی تھی۔ یعنی کنیز و غلام، درم اور دینار، پہننے کے کپڑے، کھانے پینے کی چیزیں۔ چاند جیسے سُم والے گھوڑے، اونٹ، خچر اور گدھے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ بال بچوں کا بھی کچھ خیال چاہیے۔ یہ سُن کر عشق و محبت کا وہ رازدار بولا: اے وہ پاک ذات جس سے چاند اور تاروں کی آنکھیں روشنی حاصل کرتی ہیں اور جس کی خاطر یہ دنیا بنائی گئی، پروانے کے لیے چراغ کافی ہے اور بلبل کے لیے پھول۔ صدیقؓ کے لیے صرف خدا کا رسولؐ کافی ہے۔"

تہذیبِ حاضر

تضمین بر شعرِ فیضی

کُہنہ ادراکی: پختہ سمجھ۔

موجودہ تہذیب کی شراب میں بلا کی گرمی ہے۔ مسلمان کا خاکی جسم اسے پی کر آگ کے شعلوں کی طرح بھڑک اٹھا۔ اس جلوہ دکھانے والے سورج کی شوخی تو دیکھو کہ اس نے ذرّے کو عارضی چمک دے کر جگنو بنا دیا۔ اس تہذیب نے نوجوانوں کی طبیعت کو نئے طور طریقے سکھا دیے۔ یہ اپنے بناؤ سنگار پر خاص توجہ رکھنا اور فیشن کو زندگی کا ضروری جزو بنا لینا، یہ نمائشی بیداری جسے روح اور دل سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ آزادی جس نے تمام ضروری اور غیر ضروری پابندیاں توڑ کر رکھ دیں اور یہ بے باکی جس میں گستاخی کا رنگ غالب ہے۔ یہ سب کچھ نئی تہذیب سے پیدا ہوا۔ ان کے غور و فکر، سوچ سمجھ میں ایسی تبدیلی آ گئی کہ باغ میں غنچوں کے جگر چاک ہو جانے کو وہ ہنسی مذاق سمجھتے ہیں۔ یعنی انھیں دین اور قوم کے لیے نہایت عظیم الشان قربانیاں ہیچ معلوم ہوتی ہیں اور ان کے دل میں کسی بلند کارنامے کے لیے کوئی قدر نہیں۔ جادوگر نے ایسے دل فریب نظارے دکھائے کہ یہ نئے نئے اڑنے والے اپنا گھونسلا گم کر بیٹھے۔ اس شعر میں جادوگر سے مراد نئی تہذیب ہے۔

اس تہذیب سے جو زندگی پیدا ہوئی وہ عجیب و غریب لذتیں اپنے ساتھ لائی۔ مثلاً حسد، عداوت، بے غیرتی، بے حمیتی، بے صبری، انتہائی حرص و ہوس۔ جو اہلِ نظر نئی تہذیب کے اثرات کا گہرا مطالعہ کر چکے ہیں وہی اقبال کی اس حکیمانہ نکتہ نوازی کا صحیح

اندازہ فرما سکتے ہیں۔

نئی شمع کی روشنی سے مسلمان کی محفل بے شک جگمگا اٹھی یعنی نئی تہذیب مسلمانوں میں خوب پھیل گئی مگر اس شمع پر قربان ہونیوالے ہر پروانے سے میری پختہ سمجھ یہ کہہ رہی ہے کہ اے پروانے! یہ گرمی تو نے ایک محفل کی شمع سے حاصل کی ہے۔ دوسرے کی حرارت میں جلنا اہل سوز کے لیے زیبا نہیں۔ اگر تیرے دل میں جلن موجود ہے تو میری طرح اپنی آگ میں جل۔

والدۂ مرحومہ کی یاد میں

اقبال کی والدۂ ماجدہ کا انتقال پُرملال ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۵ء) میں ہوا۔ اکبر الٰہ آبادی نے ان کی وفات پر مندرجہ ذیل قطعہ لکھا تھا:

حضرت اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں — قوم کی نظریں جوان کے طرز کی شیدا ہوئیں
یہ حق آگاہی، یہ خوش گوئی، یہ ذوقِ معرفت — یہ طریقِ دوستی، خودداری با تمکنت
اس کے شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے — باخدا تھے، اہلِ دل تھے، صاحبِ اسرار تھے
جلوہ گر ان میں انھیں کا ہے یہ فیضِ تربیت — ہے ثمر اس باغ کا یہ طبعِ عالی منزلت
مادرِ مرحومۂ اقبال جنّت کو گئیں — چشم تر ہے آنسوؤں سے، قلب ہے اندوہگیں
روکنا مشکل ہے آہ و زاری و فریاد کو — نعمتِ عظمیٰ ہے ماں کی زندگی اولاد کو
اکبر اس غم میں شریکِ حضرت اقبال ہے — سالِ رحلت کا یہاں منظور اسے فی الحال ہے

واقعی مخدومۂ ملت تھیں وہ نیکو صفات
۱۳۳۳ھ
رحلتِ مخدومہ سے پیدا ہے تاریخِ وفات

تمہیدی نوٹ

یہ نظم اقبال نے والدۂ ماجدہ کی وفات پر لکھی اور اس کے تیرہ ۱۳ بند ہیں، جن کا مضمون ایک مرقع کی شکل میں شرح ختم ہونے پر درج کیا جائے گا تاکہ اسے ذہن نشین کرنے میں سہولت رہے۔ آپ پہلے اقبال کے کئی مرثیے پڑھ چکے ہیں۔ مثلاً داغ کا مرثیہ، سسلی کا مرثیہ، فلسفۂ غم جو درحقیقت ایک مرثیہ ہی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ان میں سے ہر مرثیہ کا انداز و اسلوب ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ والدۂ ماجدہ کا مرثیہ ان سب سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد اقبال نے صرف ایک قابل ذکر مرثیہ لکھا

اور وہ راس مسعود کا مرثیہ تھا جس پر "ارمغانِ حجاز" میں بحث ہوگی۔

زیر غور مرثیے کے چھیاسی شعر ہیں اور اتنے پرتاثیر ہیں کہ الفاظ میں ان کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ غالباً یہ مرثیہ شعر و ادب کی پوری تاریخ میں بالکل یگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اور شاید ہی کوئی دوسری زبان اس قسم کی نظم پیش کر سکے۔

گنج آبِ آوردہ: پانی کا لایا ہوا خزانہ۔ یہاں مراد ہے آنسوؤں کا طوفان۔ برنا و پیر: جوان اور بوڑھے۔ طوقِ گلو افشار: گلا گھونٹنے والا طوق۔ تجدید: تازہ کرنا۔ سنجیدن بپر: پر تولنا۔ دل آسائی: دل کا آرام۔

پہلے دو بندوں میں فلسفے اور حکمت کے نقطۂ نظر سے کائنات کے نظام کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

پہلا بند اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ تقدیر کا قیدی ہے یعنی خدائے بزرگ و برتر نے اس کے لیے جو اندازہ مقرر کر دیا ہے اس کا پابند چلا جا رہا ہے۔ جسے ہم تدبیر کہتے ہیں وہ دراصل مجبوری اور بے دست و پائی کا ایک پردہ ہے۔ آسمان بھی مجبور ہے، سورج اور چاند بھی مجبور ہیں۔ یہ ستارے جو پارے کی طرح بے قرار دوڑتے پھرتے ہیں، چلنے کے لیے مجبور ہیں، کہیں رُک نہیں سکتے۔ باغ میں کلیاں پھوٹتی ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے مٹکوں کا انجام ٹوٹنے کے سوا کچھ نہیں۔ یعنی وہ کھلتی ہیں، تھوڑی دیر کے لیے اپنی مہک فضا میں پھیلاتی ہیں۔ پھر مرجھا جاتی ہیں۔ سبزہ اور پھول بھی اُگنے اور کھلنے پر مجبور ہیں۔ بلبل کا نغمہ ہو یا ضمیر کی خاموشی آوازا، اس دنیا کی ہر چیز تقدیر کی عالم گیر زنجیر میں بندھی ہوتی ہے۔

دوسرا بند جب آنکھ پر مجبوری کا بھید کھل جاتا ہے تو دل سے آنسوؤں کا اٹھنے والا طوفان خشک ہو جاتا ہے۔ یعنی جب انسان اپنے علم اور حکمت کی بنا پر سمجھ لیتا ہے کہ ساری دنیا ایک خاص انداز سے پر چلی جا رہی ہے، جو پہلے سے اس کے لیے مقرر ہو چکا ہے تو پھر کسی افتاد پر رونے دھونے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی اور نہ اس میں کوئی فائدہ نظر آتا ہے۔ انسان کے دل میں عیش اور غم کا رقص باقی نہیں رہتا۔ نہ جینے کی خوشی ہوتی ہے، نہ مرنے کا غم۔ زندگی بالکل بے کیف سی ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ نغمہ تو سنائی دیتا ہے لیکن اس میں مدھم اور پنچم، نیچے سُر اور اونچے سُر کی کوئی لذّت باقی نہیں رہتی۔ جب عیش اور غم کا احساس ہی مٹ جائے تو زندگی کا کیا لطف رہے؟

علم و حکمت آنسو بہانے کا اور آہ و فریاد کرنے کا سامان چھین لیتے ہیں جس دل میں راز پا لینے کی صلاحیت پیدا ہو جائے، وہ دل نہیں رہتا بلکہ الماس کا ایک ٹکڑا بن جاتا ہے، جس پر کوئی چیز اثر نہیں ڈال سکتی۔ میں بھی علم و حکمت سے آگاہ ہوں اور میرے باغ میں شبنم کی تر و تازگی نہیں پائی جاتی۔ میری آنکھ سے خون کے آنسو نہیں بہتے۔ میں انسانی دُکھ درد کا بھید جانتا ہوں اور میری فطرت کے ساز میں شکایت کا کوئی ترانہ موجود نہیں۔ میں زمانے کی نیرنگیوں کا قصّہ سنانے کا بھی عادی نہیں۔ میرے دل میں نہ کوئی حیرانی ہے، نہ یہ ہنستا ہے، نہ یہ روتا ہے۔ یہ تمام حقیقتیں کائنات کی چیزوں کو حکیمانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کا نتیجہ ہیں، لیکن اے مادرِ مہربان! جب تیری تصویر آنکھوں کے سامنے آتی ہے تو لگاتار ٹپتے

کا پیغام دیتی ہے۔ یہ تصویر میرے علم و ہنر کی پختگی کو توڑ کر رکھ دیتی ہے، یعنی تقدیر کی مجبوری اور کائنات کی بے ثباتی اپنی جگہ مسلّم ہے، لیکن یہ علم والدہ کی وفات پر آنسو بہانے سے روک نہیں سکتا اور مرحومہ کا تصور بند تھا ہے تو حقیقتوں سے آگاہی کی پختگی اور دلیلیں پیش کرنے کی قابلیت کچھ کام نہیں دیتی۔

تیسرا بند لگاتار رونے سے زندگی کی بنیاد مضبوط اور پائیدار رہتی ہے۔ درد کی حقیقت معلوم ہو جائے تو پتّھر کے دل والی عقل اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔ میرا آئینہ آہ و فریاد کے دھوئیں کی لہروں سے روشن ہے۔ میرا دامن پانی سے لائے ہوئے خزانے یعنی آنسوؤں سے بھرا ہوا ہے۔ اے مادرِ مہربان! میں تیری تصویر کے اس معجزے پر حیران ہوں، جس نے وقت کی اُڑان کا رُخ بدل دیا، جس نے حال کو ماضی کے برابر لے جا کھڑا کیا اور میرے دل میں پھر بچپن کے زمانے کی یاد تازہ کر دی۔ جب میری کمزور جان تیرے دامن میں پل رہی تھی، میری زبان نے ٹھیک ٹھیک بات کرنی بھی نہ سیکھی تھی اور اب ہر طرف میرے کلام کی شوخی کے چرچے ہیں اور میری آنکھ جو موتی برساتی ہے، وہ بڑے ہی اَن مول سمجھے جاتے ہیں۔

چوتھا بند علم حاصل کر لینے کے بعد چچی تلی باتیں کہنا، بڑھاپے کی سمجھ بوجھ اور سوچ بچار، دنیوی عزّت کا دبدبہ جوانی کا گھمنڈ، یہ زندگی کی خاص بلندیاں سمجھی جاتی ہیں، لیکن انسان مادرِ مہربان کے سامنے پہنچتے ہی ان تمام بلندیوں سے نیچے اُتر آتا ہے اور ایک سادہ و معصوم بچّہ رہ جاتا ہے۔ اس صحبت میں تمام تکلفات چھوڑ کر ہنستا ہے۔ ہر فکر سے آزاد ہو جاتا ہے اور نئے سرے سے چھنی ہوئی بہشت میں جا بستا ہے۔

مطلب یہ کہ انسان کے لیے ماں کی گود بہشت ہے۔ وہ بڑا ہو کر اس دنیا میں کتنے ہی بلند رتبے حاصل کر لے لیکن محبّت کے وہ لطف اسے کبھی حاصل نہیں ہو سکتے جو ماں کی گود میں حاصل تھے۔ اس چھنی ہوئی بہشت کے مزے لینے ہوں تو وہ صرف مادرِ مہربان ہی کی صحبت میں مل سکتے ہیں۔

پانچواں بند اے مادرِ مہربان! تو چل بسی۔ اب وطن میں کون میرا انتظار کرے گا؟ کون میرا خط نہ پہنچنے کی وجہ سے بے قرار ہو گا؟ میں تیری قبر پر آؤں گا تو یہ فریاد لے کر آؤں گا کہ اب مجھے آدھی رات کی دُعاؤں میں کون یاد کرے گا؟ تیری پرورش کی بدولت مجھے ستاروں کی بلندی نصیب ہوئی۔ میرے بزرگوں کے گھرانے کو عزّت کا سرمایہ مل گیا۔ ہستی کے دفتر میں تیری زندگی ایک سنہرا ورق تھی، جو سر سے پاؤں تک دین اور دنیا کے بہترین سبق دیتی تھی۔ تیری محبت عمر بھر میری خدمت میں لگی رہی۔ جب میں تیری خدمت کے قابل ہوا تو تو اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ وہ جوان جو قد و قامت میں سرو کی طرح بلند ہے، برابر تیری خدمت میں لگا رہا اور مجھ سے بڑھ کر اس نے اس سعادت سے حصّہ پایا۔ وہ زندگی کے کاروبار میں میرا برابر کا ساتھی ہے۔ وہ تیری محبت کی تصویر ہے۔ وہ میرا بازو ہے۔ وہ تیرے غم میں بے بس بچّے کی طرح رو رہا ہے۔ اس کا کام صبح و شام آنسو بہانا ہے۔ اسے صبر نہیں آتا۔ تو جس محبت کا بیج ہماری جان کے کھیت میں بو گئی

وہ محبت تیرے ماتم میں شریک ہونے سے اور بھی مضبوط ہو گئی۔

بلند قامت جوان سے اشارہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد مرحوم کی طرف ہے۔ یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ ان کا قد واقعی اقبال کے مقابلے میں بلند تھا۔

چھٹا بند آہ! یہ دنیا تو بوڑھے اور جوان کا ماتم خانہ ہے۔ جسے دیکھو، سوگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ آدمی ماضی اور مستقبل کے کس طلسم میں گرفتار ہے! زندگی کس قدر مشکل ہے اور موت کتنی آسان ہے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موت دنیا کے باغ میں ہوا سے بھی زیادہ عام ہے۔ یہاں زلزلے آتے ہیں، بجلیاں گرتی ہیں، قحط پڑتے ہیں۔ بیماریاں پھیلتی ہیں زمانے کی ماں نے کیسی کیسی بیٹیاں جنی ہیں۔ موت ہر جگہ موجود ہے۔ نہ غریب کا گھر اس سے خالی ہے، نہ امیر کے محل اس سے محفوظ ہیں۔ یہ بیابان میں، آبادی میں، شہر میں، باغ میں، ویرانے میں غرض ہر جگہ موجود ہے۔ موت اس سمندر میں بھی ہنگامہ بپا رکھتی ہے۔ جو طوفان سے پاک ہو۔ اس کی لہروں میں ن کشتیاں ڈوب جاتی ہیں۔ نہ شکایت کی اجازت ہے۔ نہ کچھ کہنے کی تاب ہے۔ یہ زندگی کیا ہے۔ گلا گھونٹنے والا ایک طوق ہے۔ اس قافلے میں نالہ وفریاد کے سوا کوئی گھنٹی نہیں۔ اس کا سامان صرف ایک ہے اور وہ تر آنکھیں ہیں یعنی آنسو بہانے والی آنکھیں۔

ساتواں بند لیکن یہ امتحان کا زمانہ ہے جو بہرحال ختم ہو جائے گا۔ آسمانوں کے نو پردوں کے پیچھے اور زمانے بھی ہیں جو باری باری آئیں گے۔ اگر لالے اور گلاب کے پھولوں کا سینہ اس باغ میں چاک چاک ہے تو کیا ہوا؟ اگر بلبل نالہ وفریاد پر مجبور ہے تو اس کا غم کیا؟ جن کے جھاڑیوں کے پنجرے میں خزاں کی آہ قید ہے، یعنی جو جھاڑیاں خزاں کے سبب سے برابر مرجھائی رہتی ہیں، انھیں ہمیشہ قائم رہنے والی بہار کی ہوا ضرور سرسبز کر دے گی اگر ہماری چنگاری پامال ہونے والی خاک میں سوئی ہوئی ہے تو کیا ہوا؟ اگر غبار کی یہ مٹھی ہمارا عارضی کجاوہ ہے تو کیا ہوا؟

خاک پے سپر سے مراد جسم خاکی اور شرارے سے مراد روح ہے، عارضی محمل سے مراد عارضی ٹھکانا اور مُشتِ غبار سے مراد جسم خاکی ہے۔

لیکن زندگی کی آگ کا انجام یہ نہیں کہ یہ راکھ ہو کر رہ جائے۔ یہ موتی ایسا نہیں کہ اس کی قسمت میں ٹوٹ جانا ہو۔

آٹھواں بند زندگی قدرت کی نگاہوں میں اس قدر پیاری ہے کہ ہر چیز کی فطرت میں اس کی حفاظت کا جذبہ رکھ دیا گیا ہے اگر زندگی کا نقش موت کے ہاتھوں سے مٹایا جا سکتا تو کائنات کے نظام میں اسے یوں عام نہ کر دیا جاتا۔ اگر موت اتنی ارزاں اور عام ہے تو سمجھنا چاہیے کہ یہ کچھ چیز نہیں۔ آدمی سو جاتا ہے تو کیا اس سے زندگی میں کوئی خلل پڑتا ہے؟ یہی حالت موت کی ہے گویا موت بھی ایک قسم کا سونا ہی ہے۔

آہ! اسے غفلت کے ماتے! موت کا چھپا ہوا بھید کچھ اور ہے۔ نقش کو کیوں ناپائیدار بنایا؟ اس سے کچھ اور ہی ظاہر ہوتا ہے۔ پانی کی سطح پر ہوا جو نقش بناتی ہے، وہ نگاہوں کو کتنا پیارا معلوم ہوتا ہے کہنا چاہیے کہ وہ نظارے کے لیے بہشت ہے۔

ہوا بے قرار لہر کو توڑ کر بلبلے بناتی ہے۔ تھوڑی دیر میں بلبلے کو لہر کے دامن میں چھپا دیتی ہے اور انتہائی بے دردی سے اپنا بنایا ہوا نقش خود ہی مٹا دیتی ہے۔ اگر ہوا بلبلا دوبارہ پیدا نہ کر سکتی تو پہلے بنائے ہوئے بلبلے کے متعلق بے پروائی کیوں اختیار کرتی؟ ہوا کے اس چلن کا تعمیر کی وضع اور صورت پر کچھ اثر نہیں پڑتا بلکہ یہ تو ہوا کی قوتِ تعمیر کی ایک دلیل ہے یعنی اگر ہوا اپنا بنایا ہوا نقش مٹا دیتی ہے تو اس سے اس کے بنانے کی قوت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ اس سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہوا میں ایسے ہزاروں نقش بنانے کی صلاحیت موجود ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ کہیں زندگی کی فطرت کسی بلند نقش کی آرزو میں ننگی ہوئی ہو۔ بار بار اپنے بنائے ہوئے نقش مٹانے کا مطلب یہ نہ ہو کہ اسے کسی بہتر اور عمدہ تر نقش کی تلاش ہے۔

نواں بند | یہ آسمان کو روشن کرنے والے ستارے جنھیں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے، کسی نے پارا بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ یہ چمکتی دمکتی چنگاریاں جو اپنی جگمگاہٹ کے لیے رات کی احسان مند ہیں یعنی ستارے روشن نظر آنے کے لیے رات کی تاریکی کے محتاج ہیں۔ عقل حیران ہے کہ یہ کب سے اسی طرح چلے آتے ہیں۔ بنی نوع انسان کی پوری سرگزشت ستاروں کی عمر کے مقابلے میں ایک گھڑی معلوم ہوتی ہے۔

ان کے مقابلے میں انسان کی حالت دیکھو، جس کی نظر آسمانوں سے بھی پرے جاتی ہے، جس کے مقاصد فرشتوں سے بھی زیادہ پاک ہیں۔ وہ انسان جو قدرت کی محفل میں روشن شمع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی فطرت کے پھیلاؤ کا یہ عالم ہے کہ آسمان اس میں ایک نقطہ معلوم ہوتا ہے۔ جسے نادان کہا جاتا ہے، لیکن وہ سچائی کے جلوے دیکھنے کے لیے بے قرار ہے، جس کا ناخن ہستی کے ساز کے لیے مضراب کا حکم رکھتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ شعلہ آسمان کی چنگاریوں سے بھی کم تر ہے؟ کیا یہ سورج اپنے ستاروں سے بھی قیمت میں فرو تر ہے؟

آخری مصرع میں نظام شمسی کی مثال سامنے رکھی ہے یعنی سورج کا نظام ستاروں کو روشنی پہنچاتا ہے اور پوری کائنات کا نظام انسان کی بنا پر چل رہا ہے۔

دسواں بند | پھول کے بیج کی آنکھ خاک کے نیچے بھی جاگتی رہتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پھولنے پھلنے کے لیے کس قدر بے قرار ہے؟ اس بیج میں زندگی کا جو شعلہ چھپا ہوا ہے وہ اپنی حقیقت کو نمایاں کرنے اور اپنے آپ کو پھیلانے کے لیے مجبور ہوتا ہے خاک اس کے لیے قبر ہوتی ہے لیکن قبر کی ٹھنڈک اسے بجھا نہیں سکتی۔ مٹی میں دب کر بیا تی جان کھو نہیں بیٹھتا بلکہ پھول بن کر اپنی قبر سے نکل آتا ہے۔ موت ہی اسے زندگی کا لباس پہنا دیتی ہے۔ لہٰذا اُس بکھری ہوئی قوت کو ایک شیرازے میں باندھ دیتی ہے۔ پھر یہ قوت اپنی کمند آسمان کی گردن میں ڈالنے لگتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ بیج مٹی کی آغوش میں اپنی بکھری ہوئی قوت جمع کر لیتا ہے پھر زمین سے نکل کر تناور درخت بن جاتا ہے جس کی بلندی

آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ اسی کیفیت کو شاعر نے آسمان گردن میں کمند ڈالنے سے تعبیر کیا۔

موت زندگی کی لذت کو تازہ کرنے کا پیغام ہے یہ دراصل نیند کے پردے میں بیداری کا پیغام ہے ـــــ مطلب یہ کہ مرنا بظاہر سو جانا ہے لیکن دراصل اس میں انسان کی روح بیدار ہو جاتی ہے۔ جو اڑنے کی عادی ہو، اسے اڑان سے کیا ڈر ہے؟ اس باغ میں موت پر توڑنے کے سوا کچھ نہیں۔

گیارھواں بند دنیا والے کہتے ہیں کہ موت کے درد کی کوئی دوا نہیں اور بچھڑنے کا زخم وقت کے مرہم سے بھر جاتا ہے۔ یعنی جو عزیز اور اقربا مر جاتے ہیں ان سے جدائی کے زخم پر آہستہ آہستہ مرہم لگتا رہتا ہے۔ خاصا وقت گزر جاتا ہے تو یہ زخم بھی باقی نہیں رہتے، لیکن جس دل میں مرنے والوں کا غم آباد ہوتا ہے، وہ صبح و شام کی زنجیر سے آزاد ہے۔ یعنی وقت اس کے درد کو کم نہیں کر سکتا۔

ماتم کے نالے اور آہیں وقت کے جادو سے رکتی نہیں، وقت جدائی کی تلوار کے زخم کا مرہم نہیں بن سکتا۔ جب اچانک سر پر کوئی مصیبت آ جاتی ہے تو انسان کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہنے لگتے ہیں۔ دل کو نالہ و فریاد سے تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا لہو آنسو بن کر آنکھوں کی راہ سے بہتا رہتا ہے۔ اگرچہ آدمی صبر کی طاقت نہیں رکھتا، لیکن اس کی فطرت میں یہ نامعلوم احساس موجود ہے کہ انسانی جوہر مٹ نہیں سکتا۔ بے شک یہ آنکھوں سے غائب ہو جاتا ہے، لیکن اسے "فنا" نہیں۔ غم کے شعلوں سے زندگی کا لباس خاک ہو جاتا ہے۔ یہ شعلے برستے ہیں تو ہستی کو جلا کر راکھ کر ڈالتے ہیں، لیکن یہ آگ اسی لطیف احساس کے پانی سے بجھتی ہے کہ انسان کے لیے فنا نہیں۔ اگر ضبط سے کام لے کر نالہ و فریاد کو روکا جاتا ہے تو یہ نہ سمجھنا چاہیے۔ کہ یہ غفلت کی خاموشی ہے۔ یہی آگاہی دل کی تسلی کا سامان ہے کہ انسان کو فنا نہیں۔ اسے بھول جانا نہ سمجھنا چاہیے۔

بارھواں بند جب مشرق کے پردے سے صبح جلوہ گر ہوتی ہے تو دنیا کے دامن سے رات کا داغ دُھل جاتا ہے۔ لالے کے مرجھاتے ہوئے پھول میں تازگی آ جاتی ہے اور وہ آتشیں لباس پہن لیتا ہے جو پرندے رات کے وقت چپ سادھے رہتے ہیں وہ چہچہانے لگتے ہیں سینۂ بلبل کے قید خانے سے راگ آزاد ہو جاتا ہے۔ یعنی بلبل گانے لگتی ہے۔ صبح کی ہوا مینکر شرف نغموں سے لبریز ہو جاتی ہے۔ لالہ زاروں، پہاڑوں اور دریاؤں میں سونے والے زندگی کی دُھن سے بغل گیر ہو جاتے ہیں۔ اگر کائنات کا دستور یہ ہے کہ ہر شام کے بعد صبح طلوع ہو تو انسان کی قبر کی رات کے بعد کیوں صبح نہ آئے؟ یعنی انسان کیوں مر کر دوبارہ زندہ نہ ہو؟

تیرھواں بند میرے فکر و خیال کا روپہلی جال زمانے بھر میں پھیل گیا ہے۔ اسی سے میں نے اسے مادر مہربان! تیری یاد قید کر لی ہے۔ میرا درد بھرا دل تیری یاد سے لبریز ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے کعبے کی فضا دعاؤں سے لبریز ہوتی ہے۔ یہ تشبیہ نہایت پاکیزہ اور اچھوتی ہے۔

فرانقش کا وہ سلسلہ جس کا نام زندگی ہے اس کے جلوے لاکھوں ناپائیدار دنیاؤں میں نظر آتے ہیں۔ زندگی کی ہر منزل کی رسم و راہ الگ ہے۔ ہم لوگ جسے آخرت کہتے ہیں وہ بھی زندگی ہی کی جولانی کا ایک میدان ہے۔ وہاں موت کی کھیتی بالکل

بے حاصل رہتی ہے۔ یعنی موت کو وہاں کوئی دخل نہیں۔ اس میدان کی آب و ہوا عمل کے بیج کے لیے بہت اچھی اور سازگار ہے۔
فطرت کا نور جسم کے اندھیرے کا قیدی نہیں اور انسانی سوچ بچار کا دائرہ ایسا تنگ نہیں بلکہ بہت وسیع ہے۔
اے مادرِ مہربان! تیری زندگی چاند سے بھی زیادہ روشن تھی۔ اس دنیا سے تیرا سفر صبح کے ستارے سے بھی زیادہ
حسین تھا۔ خدا کرے، تیری قبر صبح کے ایوان کی طرح روشن رہے اور یہ خاکی آرام گاہ بقعۂ نور بنی رہے۔ آسمان تیری قبر
پر شبنم برساتا رہے اور نیا اُگا ہوا سبزہ اس گھر کی نگہبانی کا فرض انجام دے۔

مطالب کا خلاصہ

آپ پوری نظم پڑھ چکے، اب اس کے مطالب کا نقشہ ملاحظہ فرما لیجیے۔

۱۔ پہلے بند میں بتلایا گیا ہے کہ اس دنیا کے کارخانے کے متعلق علم و حکمت نے اب تک جو کچھ دریافت کیا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں
کہ قدرت نے اپنی مرضی کے مطابق ایک سلسلہ قائم کر دیا ہے اور ہر چیز بہ حالتِ مجبوری اس سلسلے میں بندھی چلی جا رہی ہے۔

۲۔ دوسرے بند میں یہ بتایا ہے کہ علم و حکمت کے اصول کے مطابق کسی عزیز کی وفات پر رونا دھونا بے سود ہے لیکن
اے مادرِ مہربان! تیری تصویر نے ان حکیمانہ باتوں کو بے حقیقت بنا دیا اور تیری یاد بے اختیار اشکباری کا پیغام بن گئی۔

۳۔ والدہ کی یاد تازہ ہوتے ہی عہدِ طفلی کی یاد تازہ ہو گئی۔ چوتھے بند میں یہ حقیقت بیان کی کہ انسان دنیا میں کتنا
ہی بڑا مرتبہ حاصل کر لے، والدہ کی خدمت میں پہنچ کر معصوم بچہ بن جاتا ہے۔

۴۔ پانچواں بند والدہ کی یاد میں اصل مرثیہ ہے جس کے اشعار سراپا درد ہیں۔

۵۔ چھٹے بند میں زندگی کی تکلیفوں اور مصیبتوں کی کیفیت بیان کی ہے۔

۶۔ ساتویں بند میں یہ بتایا ہے کہ زندگی کا انجام فنا نہیں۔

۷۔ آٹھویں بند میں یہ حقیقت روشن کی ہے کہ موت کا مقصد نقش کو مٹانا نہیں بلکہ بہتر نقش پیدا کرنا ہے۔
اس سلسلے میں سطحِ آب پر ہوا کی لہریں جو نقش بناتی اور مٹاتی رہتی ہیں ان کی مثال بطور دلیل پیش کی ہے۔

۸۔ نویں بند میں یہ بتایا ہے کہ ستارے نامعلوم مدت سے روشن چلے آتے ہیں، انسان جو محفلِ قدرت کا مرکز ہے کیا وہ
ان ستاروں سے بھی کم تر ہے؟

۹۔ دسویں بند میں بیج کی مثال دے کر بتایا ہے کہ زندگی کے لیے فنا نہیں۔

۱۰۔ گیارھویں بند میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ انسان کی فطرت میں ایک نامعلوم احساس رکھ دیا گیا ہے، جس کا
مفاد یہ ہے کہ انسان نظروں سے غائب تو ہو جاتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا۔ جو عزیز اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں ان

کی جدائی کے غم کو وقت نہیں بلکہ یہ احساس کم کرتے کرتے مٹا دیتا ہے۔

۱۱۔ بارھویں بند میں رات کے بعد صبح کا سماں پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اگر زندگی کا عام دستور یہ ہے تو کیوں نہ سمجھا جائے کہ انسان پر موت کی جو رات طاری ہوتی ہے اس کے بعد بھی صبح ہوگی؟

۱۲۔ تیرھویں بند میں یہ بتایا ہے کہ آخرت بھی زندگی ہی کی ایک منزل ہے۔ اس میں موت کو کوئی دخل نہیں آخر میں والدۂ مرحومہ کے لیے دعائیں کی ہیں۔

شعاعِ آفتاب

تمہیدی نوٹ

یہ نظم پنجاب کے گورنر سر مائیکل اوڈوائر کی فرمائش پر ۵ ستمبر ۱۹۱۸ء کے ایک مشاعرے میں پڑھی گئی تھی جو پہلی جنگ یورپ میں اتحادیوں کی کامیابی پر لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں صرف دو ترمیمیں ہوئیں:

۱۔ ساتویں شعر کے پہلے مصرع کا ابتدائی ٹکڑا بدل دیا گیا۔

۲۔ نظم کا آخری شعر ابتدا میں یوں تھا:

کند تلواریں ہوئیں عہدِ زرہ پوشی گیا ۔۔۔ جاگ اُٹھ تو بھی کہ دورِ خود فراموشی گیا

پہلا بند صبح کے وقت جب میری نگاہ سورج نکلنے کا سماں دیکھنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی، تو مجھے آسمان پر گھومتی اور تڑپتی ہوئی ایک کرن نظر آئی۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ تو سر سے پاؤں تک بے قراری ہی بے قراری ہے۔ تیری بے صبر جان میں یہ بے تابی اور بے چینی کیسی ہے؟ آخر تو کیوں اس قدر تڑپ رہی ہے؟ کیا تو چھوٹی سی بجلی ہے، جسے آسمان قوموں کے کھلیان کو خاکستر کر دینے کے لیے پال کر جوان کر رہا ہے؟ یہ تڑپ کسی خاص وجہ سے پیدا ہوئی ہے یا پیدائش کے آغاز سے تیری عادت ہی یہ ہے؟ یہ خوشی کا ناچ ہے یا قید و بند سے آزاد رہنے کا جنون ہے یا تجھے کسی چیز کی تلاش ہے؟ آخر اس کا کوئی مقصد تو ہونا چاہیے، بتا وہ مقصد کیا ہے؟

دوسرا بند کرن جواب دیتی ہے:

میری خاموشی زندگی میں بہت سے ہنگامے سوئے پڑے ہیں۔ میں نے صبح کی گود میں پرورش پائی ہے۔ قدرت نے میرے لیے جو انداز مقرر کر دیا ہے، وہ ہر لحظہ مجھے بے تاب رکھتا ہے۔ میں روشنی کی تلاش میں مضطرب ہو رہی ہوں۔ میں جلانے والی بجلی نہیں۔ اگرچہ میری فطرت ناری ہے، یعنی میں آگ سے بنی ہوئی ہوں۔ میں دنیا کو روشن کرنے

والے سورج کی طرف سے جاگ اٹھنے کا پیغام ہوں۔ میں سُرمہ بن کر انسانوں کی آنکھوں میں سما جاؤں گی۔ رات نے جو کچھ تاریکی کے پردے میں چھپا رکھا تھا، اسے سب کے سامنے کھول کر رکھ دوں گی تاکہ وہ اسے دیکھ لیں۔

میں تجھ سے پوچھتی ہوں کہ تیرے مستوں میں بھی کوئی ہوشیاری کا طلب گار ہے؟ ان سونے والوں میں بھی کوئی شخص جاگنے کی لذّت سے واقف ہے؟

یہ نظم بھی جیسا کہ اس کے مضمون سے بالکل واضح ہے، مسلمان کے لیے بیداری کا پیغام ہے اور اقبال کا طریقہ یہی تھا کہ وہ جس قدرتی منظر کو دیکھتے تھے، اس کا سماں پیش کرتے ہوئے اپنے اصل پیغام کے لیے ایک موقع پیدا کر لیتے تھے۔

عرفی

عرفی اکبری عہد کا مشہور شیرازی شاعر جس کے قصائد صدیوں تک ہندوستان کے فارسی نصاب میں شامل رہے۔ خانخاناں کے دربار سے وابستہ تھا۔ عالمِ جوانی میں بمقام لاہور وفات پائی۔ قصیدے کی طرح غزل میں بھی بہت بلند پایہ شاعر مانا جاتا ہے۔ **سینا** مشہور فلسفی اور طبیب شیخ الرئیس بوعلی سینا۔ **فارابی**: مشہور مسلمان فلسفی ابونصر فارابی۔ یہ فاراب (ترکستان) میں پیدا ہوا اور دمشق میں وفات پائی۔ فلسفے اور دوسرے علوم پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان میں سے کچھ رسالے چھپ گئے ہیں۔ بوعلی سینا نے ارسطو کی کتاب مابعد الطبیعیات فارابی ہی کی شرح دیکھ کر سمجھی تھی۔ مسلمانوں میں یہ معلمِ ثانی کے لقب سے معروف ہے۔ معلمِ اوّل وہ ارسطو کو سمجھتے ہیں۔
شب پرست: رات کی پوجا کرنے والا۔ مراد ہے چمگادڑ۔

عرفی نے فکر و خیالات کے کمالات سے ایک ایسا محل تعمیر کر دیا، جس پر بوعلی سینا اور ابونصر فارابی کے حیران کر دینے والے فلسفیانہ گورکھ دھندے بے تکلف قربان کیے جا سکتے ہیں۔ اس نے عشق کی فضا میں ایسے نغمے گائے جن کی بدولت اب تک آنکھیں رنگین آنسوؤں سے لب ریز ہیں۔

میرے دل نے ایک دن اس کی قبر سے شکایت کی کہ اب دنیا کے ہنگامے میں بے قراری کا کوئی سامان نظر نہیں آتا۔ انسانوں کے مزاج میں کچھ ایسی تبدیلی آگئی ہے کہ تڑپ اور دوڑ دھوپ کی جو کیفیت پہلے موجود تھی، وہ اب باقی نہیں رہی۔ اگر محفل کی آنکھ جاگنے کی لذّت سے واقف نہ ہو تو شاعر آدھی رات کے وقت جو آہ و فریاد کرتا ہے وہ کانوں کے لیے بوجھ بن جاتی ہے۔ یعنی گراں گزرنے لگتی ہے۔ کسی کی فریاد کا شعلہ اندھیرے کو کیونکر زائل کرے؟ چمگادڑوں کو تو صبح کے وقت آسمان کا چمکنا خاصا

تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے۔

عرفی کی قبر سے آواز آئی:

کہ دنیا والوں کی شکایت نہ کر۔ اگر نغمے کی لذت سرد پڑتی نظر آئے تو ساز کو زور زور سے بجا۔ ناقے کی پشت پر کجاوہ بھاری ہو اور ناقے کی رفتار سست ہو جائے تو حدی سے تیز کر دے۔

مراد یہ ہے کہ اگر قوم کی غفلت بڑھ رہی ہے تو اسے بیداری کا پیغام زیادہ جوش و سرگرمی سے دینا چاہیے۔

ایک خط کے جواب میں

ایک روایت ہے کہ کسی دربار سے اقبال کو دعوت آئی تھی، اس کے جواب میں یہ شعر لکھے گئے۔ دوسری روایت ہے کہ کسی دوست نے حکام کی نظروں میں اعتبار پیدا کرنے کے لیے مشورہ دیا تھا کہ انھیں کبھی کبھی کھانے یا چائے پر بلا لینا چاہیے۔ اس لیے کہ اونچے عہدے خوشامد اور خاطر تواضع ہی سے ملتے ہیں۔ اس کے جواب میں یہ نظم کہی گئی۔

ریزہ کار: باریک کام کرنے والا جسے خاص محنت اٹھانی پڑتی ہے۔

اگر مجھے اونچے عہدے یا خطاب یا دولت کی آرزو بھی ہو تو یہ چیزیں ڈھونڈنے سے ملتی ہیں۔ ان کے لیے بھاگ دوڑ چاہیے اور مجھ میں بھاگ دوڑ کی ہمت نہیں۔ خدا کا ہزار شکر ہے کہ میری طبیعت باریک جواہر ریزوں کو جوڑنے میں لگی رہتی ہے۔ اسی طرح خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ میرا دماغ فتنے نہیں تراش سکتا۔ میری شاعری کی برکت سے دلوں کی کھیتیاں لہلہاتی ہیں۔ میں اس دنیا میں وہ بادل ہوں جو زمین پر دریا برساتا ہے یعنی اتنا پانی برساتا ہے کہ اس سے دریا جاری ہو جاتے ہیں۔

سیاست کی پُر پیچ گتھیاں تجھی کو مبارک رہیں، میں اپنے ناخن ان کے کھولنے کے لیے وقف نہیں کر سکتا۔ میرے ناخن عشق کی برکت سے سینہ چھیلنے میں لگے رہتے ہیں۔ بادشاہ کی محفل میں بیٹھنے کی خواہش دل کے مردہ ہونے کی دلیل ہے۔ یہ نکتہ دلکش لکھنے والے خواجہ حافظ نے خوب آشکار کر دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اگر تجھے حضرت خضرؑ کے ساتھ بیٹھنے کی آرزو ہے تو آبِ حیات کی طرح سکندر کی آنکھوں سے پوشیدہ رہ۔

نانک

تمہیدی نوٹ

یہ نظم سکھ دھرم کے بانی گرو بابا نانک کے متعلق ہے اور اس میں ان کے پیغام توحید و مساوات کی کیفیت واضح کی گئی ہے۔ بابا نانک کی طرح بعض اور ہندو مصلحین نے بھی اسلامی اثر کے ماتحت بعض تحریکیں چلائیں۔ مثلاً بھگتی کی تحریک یا برہمو سماج، لیکن بابا نانک کی تحریک میں اسلامی اثر بہت غالب تھا، اگرچہ بعد کی سیاسی کشمکشوں نے سکھ دھرم کی صورت کچھ سے کچھ بنا دی

گوتم: بدھ مت کے بانی گوتم بدھ جنھوں نے ہندوستان میں حسنِ فکر، حسنِ عمل، حسنِ خیال اور مساوات کی تعلیم دی۔ **گوہر یک دانہ:** بے مثال موتی۔ **شودر:** ہندو دھرم نے ہندوستان کے انسانوں کو ذاتوں میں تقسیم کیا تو سب سے پست درجہ ان لوگوں کا رکھا جو یہاں کے اصلی باشندے تھے اور رنگ و نسل کے لحاظ سے آریا نہ تھے۔ برہمنوں نے کہا کہ شودر برہما (خدا) کے پاؤں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں ان کی بستیاں تک الگ بن گئی تھیں۔ مسلمان یہاں آئے تو ان کی حالت بہتر ہونے لگی۔

افسوس ہے کہ ہندو قوم نے گوتم بدھ کے پیغام کی ذرا پروا نہ کرتے ہوئے اسے پس پشت ڈال دیا اور اپنے بے مثال موتی کی قدر نہ کی یعنی ہندوؤں نے بے سمجھی سے اپنی قوم کے بہت بڑے مذہبی رہنما کی ذرا قدر و منزلت نہ کی۔ افسوس کہ یہ بدنصیب لوگ اس سچی آواز سے غافل رہے جو بدھ نے ان کے سامنے بلند کی۔ ان کی مثال اس میوہ دار درخت کی ہے کہ دوسرے تو اس کا پھل مزے سے کھاتے ہیں لیکن وہ خود اپنے پھل کی مٹھاس سے بے خبر اور محروم رہتا ہے۔ گوتم بدھ نے اہل ہند پر زندگی کا بھید کھول کر رکھ دیا لیکن وہ خود اپنے خیالی فلسفے پر مٹے ہوتے تھے۔ یعنی بدھ نے زندگی کی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے صاف صاف بتا دیا کہ انسان خاندان اور ذات کی بنا پر بڑا نہیں ہوتا بلکہ بڑا آدمی وہ ہے جس کے عمل نیک ہوں، جو پاکیزہ زندگی بسر کرے اور بنی آدم کی خدمت میں مشغول رہے۔ ذات پات میں کوئی تمیز نہ کرنی چاہیے۔ برہمن اور شودر ایک آدم کی اولاد ہونے کے باعث بھائی بھائی ہیں۔ کسی آدمی سے نفرت کرنا غیر مناسب ہے، کسی کو حقیر جاننا اچھا نہیں، چھوت چھات فضول ہے، لیکن اس تعلیم پر کچھ دیر تو عمل ہوا، پھر یہاں کے بڑے بڑے فلسفیوں نے اسے بے دردی سے مٹا دیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ مجلس ہی نہ تھی جو حق کے چراغ سے روشن ہو سکتی۔ رحمت کی برکھا تو خوب ہوئی، لیکن زمین اچھی نہ

تھی۔ زرخیز ہونے کے بجائے شور اور بنجر نکلی ——— مطلب یہ کہ اہلِ ہند کے دل و دماغ یہ روشنی قبول کرنے کی صلاحیت سے خالی تھے۔

افسوس کہ ہندوستان شودروں کے لیے غم اور دُکھ کا گھر ہے۔ اس ملک کا دل انسانی ہمدردی سے بالکل بیگانہ ہے۔

مراد یہ کہ اونچی ذات کے ہندو شودروں سے سخت نفرت کرتے ہیں یہاں تک کہ اگر کسی برہمن پر شودر کا سایہ بھی پڑ جائے تو اسے ہندو دھرم کے اصول و احکام کے مطابق اشنان وغیرہ کر کے پوتّر ہونے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس طرح بیچارے شودروں کے لیے یہ ملک رنج، الم، عذاب، دُکھ، آفت اور مصیبت کا بنا ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں انسانی ہمدردی بالکل ناپید ہے۔ اگر انسانوں کے لیے دل میں سچّی تڑپ موجود ہوتی تو کیا کروڑوں شودر ہزاروں سال تک جانوروں اور چوپایوں سے زیادہ ذلیل رہتے اور اونچی ذاتوں کے برابر درجہ حاصل کر لیتے؟

ہندو دھرم کے پروہت ابھی تک شرابِ غرور کے نشے میں چور ہیں اور گوتم بدھ کا چراغ دوسروں کی بزم میں جل رہا ہے، یعنی برہمن اپنے وہم و خیال میں اب تک یہی سمجھے بیٹھا ہے کہ میری برابری کوئی نہیں کر سکتا، میں مرتبے میں سب سے اونچا ہوں اور گوتم کا پیغام یہ تھا کہ تمام انسان درجے میں مساوی اور بھائی بھائی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گوتم کی تعلیم ہندوستان کے بجائے دوسرے ملکوں مثلاً چین، جاپان وغیرہ میں مقبولِ عام ہوئی۔

لیکن عرصے کے بعد پھر بُت خانہ روشن ہو گیا اور آزر کا گھر حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے نور سے جگمگا اٹھا۔

مطلب یہ کہ مدّت دراز کے بعد پھر ہندوستان میں ایک ایسا خدا پرست مذہبی پیشوا پیدا ہوا جس نے توحید کی روشنی سے شرک کی اس اندھیری سرزمین میں اجالا کر دیا۔

آخر پنجاب سے توحید کی آواز پھر بلند ہوئی اور ایک کامل مردِ حق نے ہندوستان کو خوابِ غفلت سے جگا دیا۔

مراد یہ کہ گرو نانک نے اسلام کی یہ تعلیم دی۔ خدا ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ بنی نوعِ انسان سب برابر اور آپس میں بھائی بھائی ہیں وغیرہ۔

کفر و اسلام

تضمین بر شعر میر رضی دانش

نمرود: وہ بادشاہ جس نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈال دینے کا حکم دیا تھا۔ **صاحب سینا:** حضرت موسیٰؑ

ایک دن اقبال نے کوہِ طور پر خدا سے کلام کرنے والے یعنی حضرت موسیٰؑ سے پوچھا کہ آپ کے نقشِ پا سے سینا کی وادی باغ و بہار بن گئی۔ ذرا یہ تو فرمایئے کہ نمرود کی آگ سے اب تک شعلے اٹھ رہے ہیں۔ آپ کا پرانا سوز کیوں آنکھوں سے پوشیدہ ہوگیا؟ پرانے سوز سے مراد ہے خدا پر ایمان اور اس سے محبت۔

حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا کہ اگر تو مسلمان ہے تو غائب کو چھوڑ کر حاضر پر فریفتہ نہ ہو۔ اگر تجھے حاضر کا شوق ہے تو ضروری ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کا سا ایمان پیدا کر کہ انھیں آگ میں ڈالنے کی دھمکی دی گئی تو اس حالت میں بھی اپنے ایمان پر قائم رہے۔ خدا کی رحمت سے آگ ان کے لیے ٹھنڈی ہوگئی۔ اگر خدا پر ایسا پختہ ایمان نہ ہو تو آگ زندگی کا لباس جلا کر خاکستر بنا دے گی۔

اگر تو غائب کا دیوانہ ہے یعنی تیرا ایمان بالغیب پکّا ہے تو جو کچھ پیش آ رہا ہے اس سے بالکل بے پروا ہو جا۔ فاران کی وادی میں خیمہ نصب کر لے اور قدرت کے کرشموں کا انتظار کر۔ فاران کی وادی میں خیمہ نصب کر لینے سے مراد ہے کہ اسلامی تعلیم کا پابند ہو جا۔

حاضر کی شان عارضی ہے اور غائب کا شکوہ و دبدبہ ہمیشہ قائم رہنے والا ہے، یعنی خدا کے سوا جو کچھ ہے اس کی شان جلد ختم ہو جائے گی۔ خدا کی شان ہمیشہ قائم رہے گی۔ اس سچائی کو محبت سے وہی تعلق ہے جو جان کو تن سے ہے۔ اگر کسی شخص کے دل میں خدا کی محبت ہے تو وہ اس سچائی کا پکّا معتقد ہوگا۔

نمرود کی آگ زمانے میں روشن ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ تو نے کیا نہیں دیکھا کہ شمعِ محفل کو روشن کرتی ہوئی اپنے آپ کو پگھلا دیتی ہے، لیکن ہمارا نور پتھر کی آگ کی طرح نگاہوں سے پوشیدہ ہی اچھا لگتا ہے۔

آخری شعر میں شمع سے اشارہ ہے آتشِ نمرود کی طرف اور ہمارے نور سے سچے ایمان کی طرف۔

بلال رضی اللہ عنہ

پورس : پنجاب کا ایک مشہور راجا جو جہلم اور چناب کے درمیانی علاقے پر قابض تھا اور اس نے سکندر کا مقابلہ کیا تھا اگرچہ شکست کھائی۔ **دارا** : ایران کا شہنشاہ جو سکندر کے مقابلے میں شکست کھا کر بھاگا، لیکن اپنے درباریوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ **مستنیر** : روشنی حاصل کرنے والی۔ روشن۔ **اسود و احمر** : کالا گورا۔

پہلا بند | یورپ میں ایک عالم تھا جسے سچائی کا اندازہ کر لینے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ اہل قلم اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ اس نے لکھا کہ سکندر رومی نے ایشیا میں اپنی فتوحات کے گھوڑے دوڑا لئے۔ اسے آسمان سے اونچا مرتبہ حاصل تھا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سکندر کے سامنے راجہ پورس اور شہنشاہ دارا نے مقابلے کے جو دعوے کیے تھے وہ بے بنیاد ثابت ہوئے۔ اس لیے کہ دونوں نے شکست کھائی۔ سکندر ستاروں جیسی سپاہ والا وہ شہنشاہ تھا، جسے نیلا آسمان بھی حیرت سے دیکھا کرتا تھا، لیکن دیکھو آج ایشیا میں اسے کوئی جانتا بھی نہیں۔ تاریخ دانوں کے لیے بھی اسے پہچاننا مشکل ہے۔

مراد یہ ہے کہ اس نے جتنے بڑے کارنامے انجام دیے، ان کی بنا پر اس کا چرچا ہر جگہ ہونا چاہیے تھا، لیکن اب اس کا نام بھی مشکل ہی سے سننے میں آتا ہے۔ زمانے کا ورق پلٹا اور اس کے سب کارنامے لوگوں کی یاد سے حرف غلط کی طرح مٹ گئے ——— معلوم نہ ہو سکا کہ اشارہ یورپ کے کس عالم کی طرف ہے؟

دوسرا بند | سکندر کے مقابلے میں حضرت بلال کو لاؤ۔ وہ ایک معمولی حبشی کے فرزند تھے۔ ان کی فطرت نے نبوّت کے نور سے روشنی حاصل کی۔ وہ اسلام کے مؤذّن مقرر ہو گئے۔ خدا نے یہ امانت ازل کے دن سے بلال رضی اللہ عنہ کے سینے میں رکھ دی تھی۔ وہ اذان جسے سن کر بادشاہ اور فقیر یکساں سر جھکا دیتے ہیں اور اس کی فرماں برداری لازم سمجھتے ہیں۔ وہ اذان جس سے کالے گورے کا فرق مٹ جاتا ہے۔ وہ سب آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔ غریب امیر کے پہلو میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ کلیجے کو پگھلانے والا وہ نغمہ آج تک تازہ ہے۔ بوڑھے آسمان کے کان صدیوں سے اسے سُن رہے ہیں۔ اقبال! ذرا سوچ کہ یہ کس پاک ذات کے عشق کا فیض ہے جس کی برکت سے حبشی کو دائمی زندگی ملی اور رومی اس سے محروم رہنے کے باعث اپنے عظیم الشان کارناموں کے باوجود مٹ گیا اور اس کا نام بھی عوام کو یاد نہ رہا۔

اس نظم میں اقبال نے جو نکتہ پیدا کیا ہے اسے اچھی طرح دل نشین کر لینا چاہیے۔ نکتہ یہ ہے کہ دنیا کے لیے بڑے بڑے کارنامے انجام دینے والوں کو کوئی پوچھتا تک نہیں، لیکن راہِ حق پر چلنے کی برکات کا یہ عالم ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان کی بدولت آج تک لوگوں میں یاد ہیں اور رہتی دنیا تک یاد رہیں گے۔

مسلمان اور تعلیمِ جدید

تضمین بر شعرِ ملک قمی

ملک قمی ساکن قم ایران کا مشہور شاعر تھا۔ اس کی عمر کا بڑا حصہ عادل شاہ بادشاہ بیجاپور کے دربار میں گزرا۔
ظہوری بھی اسی دربار سے وابستہ ہوگیا تھا۔ ملک نے اپنی بیٹی کی شادی ظہوری سے کردی تھی۔

مَتاعِ کس نخر: ایسا مال جسے کوئی نہ خریدے

مرشد نے مجھے یہ ہدایت کی تھی کہ اے دیوانے مسلمان! مسافر کے لیے دنیا میں سفر کا سامان بہم پہنچانا ضروری ہے
یعنی اس جہان میں مزے کی زندگی بسر کرنے کے لیے لازم ہے کہ حالات کے مطابق آرام و آسایش کے اسباب بھی
مہیا کر لیے جائیں۔

زمانے کے طور طریقے بدل گئے ہیں۔ دنیا میں ایسا انقلاب آگیا ہے کہ جو لوگ کسی زمانے میں بہت بڑے آدمی تھے،
جن کا مرتبہ علم وفضل اور مذہب واخلاق کے اعتبار سے نہایت اونچا تھا اب انھیں کوئی پوچھتا تک نہیں۔ مراد
یہ کہ صحیح معنی میں بلند پایہ شخصیتیں کس مپرسی میں پڑی ہوئی ہیں اور ان کی قدر و منزلت باقی نہیں رہی۔

تیرے اس چمک دمک والے نور نے جس سے اندھیرا بھاگ رہا تھا، گھٹ کر ایک چنگاری کی صورت اختیار کر لی اور
اب اس کی روشنی تارے سے بھی کم ہوگئی ہے۔ مطلب یہ کہ تیرے ایمان میں وہ قوت باقی نہیں رہی جو کفر کو شکست دے کر
بے نام ونشان کر دیا کرتی تھی۔

تو غائب کا مشتاق نہ ہو بلکہ موجودہ چیز کا شیدائی بن۔ آج کل قوموں پر سامنے نظر آنے والے خدا کا اثر چھایا ہوا ہے
یعنی مذہبی تعلیم چھوڑ کر زمانے کی تعلیم حاصل کر کیونکہ دنیوی ترقی اسی طرح میسّر آسکتی ہے۔

اس باغ میں تیری سعی وکوشش کامیاب نہیں ہو سکتی کیونکہ تیرا جال پرانا اور گھسا ہوا ہے اور تیز اڑنے والا
پرندہ ہوشیار و چالاک ہے۔ مراد یہ کہ آج کل تو ہندوستان میں اپنے مذہبی علوم پڑھ کر دنیوی ترقی حاصل نہیں کر سکتا اور
نہ تیری قوم ان علوم کے سیکھنے پر مائل ہو سکتی ہے۔

موجودہ زمانے میں تعلیم قوم کی بیماریوں کا علاج ہے۔ تعلیم بگڑے ہوئے اور گندے خون کے لیے نشتر کا حکم رکھتی ہے۔
مطلب یہ کہ عربی فارسی چھوڑ کر انگریزی تعلیم حاصل کر۔ یہ تعلیم تیرے غلط خیالات کی اصلاح کر دے گی۔

رہنما کے اشارے سے مجھے بھی تعلیم حاصل کرنے کا خبط ہوا کیونکہ بیابان گھومنے والے پر خضر کا حکم ماننا فرض ہے یعنی رہبر کی ہدایت سے مجھے بھی انگریزی تعلیم پانے کا بے حد شوق ہوگیا۔

لیکن باریک باتوں کو تاڑ جانے والی نظر میری بدقسمتی دیکھے کہ میں پاؤں سے کانٹا نکالنے لگا تو کجاوہ میری نگاہوں سے پوشیدہ ہوگیا۔ میں نے صرف ایک لمحے کے لیے غفلت کی اور لمبی مدت کے لیے راستے سے بھٹک گیا۔

مراد یہ کہ مسلمان مذہبی تعلیم چھوڑ کر سکولوں اور کالجوں کی موجودہ تعلیم حاصل کرنے لگا اور سرکاری ملازم ہو کر اسلام کی صراطِ مستقیم سے دور جا پڑا۔

پھولوں کی شہزادی

فردوس در دامن: دامن میں بہشت لیے ہوئے۔ حد سے زیادہ مسرور۔ سریر آرا: تخت کو زینت دینے والی۔ حکمران۔ افتندہ: گری ہوئی۔ پست۔ ذلیل۔ حقیر۔

پہلا بند ایک دن باغ میں شبنم کلی سے کہہ رہی تھی کہ میں نے بہت لمبے عرصے تک بہشت کے غنچوں میں زندگی بسر کی، لیکن تمہارے باغ کی فضا ایسی مست کر دینے والی ہے کہ اس کی تاثیر سے میری حیران آنکھ کی نظر دامن میں بہشت لیے ہوئے ہے۔ یعنی میری نگاہ کو ہر طرف جنت ہی جنت نظر آتی ہے۔ اس بنا پر تمہارا باغ بہشت سے بھی بڑھ کر ہے۔

میں نے سنا ہے کہ اس باغ کی حکمران ایک شہزادی ہے جس کے نشانِ قدم کی تاثیر سے بیابان میں پھول پیدا ہو جاتے ہیں مطلب یہ کہ فطرت ویرانے کو باغ میں تبدیل کر دیتی ہے۔

اے کلی! کسی روز تو مجھے خوشبو کی طرح دامن میں چھپا کر اپنے ساتھ اس کے در دولت پر لے چل۔

دوسرا بند کلی نے جواب دیا کہ ہماری حکمران وہ شہزادی ہے جس کی ٹھوکر کے اثر سے پتھر بھی نگینے بن کر چمکنے لگتے ہیں۔ لیکن تیری فطرت پست، حقیر اور گری ہوئی ہے، ہماری شہزادی کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس لیے تو ہماری رفیق بن کر اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ البتہ ایک صورت ہے کہ اگر تو کسی دکھی اور مصیبت کے مارے کا گرم آنسو بن جائے تو ہماری شہزادی تک پہنچ سکتی ہے۔ اس کی نظر غم زدوں اور سوگواروں کے لیے عید کا پیغام ہے۔ وہ دکھی لوگوں کی آنکھوں سے لگاتار بہنے والے آنسوؤں کو موتی بنا دیتی ہے۔

اس نظم کا ماحصل یہ ہے کہ فطرت ان لوگوں سے محبت اور ہمدردی کا اظہار کرتی ہے جو دکھ درد کے مارے اور غم زدہ ہیں، جنہیں آفتوں اور مصیبتوں کے باعث رات دن سرد آہیں بھرنے اور گرم آنسو بہانے کے سوا کوئی کام نہیں۔

تضمین بر شعرِ صائب

تقاضائے خود افزائی: ترقی کی آرزو۔ **شکر خائی:** لفظی معنی میٹھی چیز کھانا۔ مراد شیریں بیانی اور پاکیزہ شاعری۔
اے اقبال! تونے اپنا گھونسلا کس باغ میں آکر بنایا۔ اس میں تو بلبل کے نغمے اس کے لیے بدنامی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ تونے کس قوم کو اپنا پیغام سنانے کی ٹھانی ہے؟ اس قوم میں تو تیرا درس زندگی تیرے حق میں رسوائی کا سامان بن جائے گا۔

تو اس زمین میں وادیٔ ایمن کے شرار سے پر نور رہا ہے لیکن کوہِ سینا کے بیج کا پھوٹ پڑنا ممکن نہیں، یعنی تو مسلمانوں کو احکامِ اسلام پر عمل کرنے کا درس تو دے رہا ہے مگر ان پر اس کا کچھ اثر نہ ہوگا کیونکہ ان کے دل مردہ ہو چکے ہیں۔ جہاں ہر چیز پڑھنے اور ترقی کرنے کے زبردست شوق سے محروم ہو چکی ہو، وہاں کلی زورِ نفس سے بھی پھول نہیں بن سکتی۔ مراد یہ کہ جس قوم کے لوگوں کا احساسِ ترقی فنا ہو چکا ہو اور انہیں آگے قدم بڑھانے کا خیال تک نہ آئے، وہاں اگر کوئی شخص ترقی کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا۔

سخت افسوس ہے کہ باغ والوں کی فطرت سوئی پڑی ہے۔ نہ تو بوڑھوں کے دل بیدار ہیں اور نہ جوانوں ہی میں ہمّت و حوصلہ ہے۔ مطلب یہ کہ ملّتِ اسلامیہ کے افراد پر غفلت کی موت طاری ہے۔ نہ بوڑھوں میں ایمان ہے نہ جوانوں میں قربانی کا جذبہ۔

جب باخبر دل سینوں میں سو جاتے ہیں تو بیداری کا نغمہ گانے کے لیے شیریں نوائی زہر بن جاتی ہے۔ یعنی جب کوئی قوم مردہ دل ہو جائے تو رہنما یا شاعر کی شیریں بیانی لوگوں پر کچھ اثر نہیں کرتی اور اس کے لیے بھٹکی ہوئی قوم کو سیدھا راستہ دکھانا سخت مشکل ہو جاتا ہے۔
اگر تو اپنا نغمہ بند کر لینے کی طاقت نہیں رکھتا تو اس باغ سے اڑ جا کیونکہ اس بزم سے تو کسی بیابان کی تنہائی کہیں بہتر ہے۔ مراد یہ کہ اگر تو خاموش نہیں رہ سکتا تو اس قوم سے تعلق توڑ کر گوشہ نشین ہو جا۔ ایسی بے حس اور مردہ دل قوم میں رہنے سے تو کسی صحرا کے گوشے میں الگ تھلگ رہنا زیادہ اچھا ہے۔

یہی بہتر ہے کہ لیلا کسی بیابان کو اپنے جلووں سے روشن کرے کیونکہ شہر کی تنگ جگہ صحرائی حسن کی تاب لانے سے عاجز ہے۔ مطلب یہ کہ مسلمان بے حس اور مردہ دل ہو جانے کے باعث اسلام کے فطری حسن و جمال کی قدر نہیں کر سکتے۔ شاعر یا مصلح کو چاہیے کہ اس مردہ قوم کو اپنے حال پر چھوڑ دے اور کسی صحرا میں جا کر حیوانوں کو اسلام کی بے نظیر تحریروں کا نغمہ سنائے۔

فردوس میں ایک مکالمہ

فلک تاب: آسمان کو چمکا دینے والی۔ نہایت بلند پایہ۔ **تزلزل:** زلزلہ آنا۔ ہل جانا۔ تہ و بالا ہو جانا۔ **زمین گیر:** زمین کو پکڑنے والی۔ نہایت پست۔ **زمین تاز:** زمین پر دوڑنے والی۔ مادی فائدے کے لیے سرگرم کوشش کرنے والی۔

غیبی فرشتے نے مجھ سے کہا کہ ایک دن بہشت میں سعدی شیرازی نے حالی سے یوں کلام کیا کہ تو نے اپنی بلند پایہ نظم کے موتیوں کے نور سے چاند اور ستاروں کو روشن کر دیا ہے۔ ذرا ہندوستان کے مسلمانوں کا حال تو بیان کر کہ وہ راستہ چلتے چلتے تھک کر بیٹھ گئے ہیں یا دوڑ دھوپ میں مشغول و مصروف ہیں یعنی ان پر سستی اور غفلت سوار ہے کہ ترقی کرنے کے لیے تیزی سے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں؟ جس قوم کے نعروں کی حرارت سے کبھی آسمان جل جایا کرتا تھا، آیا اس کے افراد کی رگوں میں کچھ مذہبی جوش بھی دوڑ رہا ہے؟

سعدی کی باتوں سے حالی کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اسی حالت میں وہ کہنے لگا، اے شعر و ادب میں معجزے دکھانے والے! جب بڑھے آسمان نے زمانے کی کتاب کا ورق الٹ دیا تو یہ آواز ہر طرف گونجنے لگی کہ عزت اور مرتبہ تعلیم سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یعنی جب ہندوستان میں اسلامی حکومت کے خاتمے پر انقلاب آیا اور یہاں انگریزوں کا عمل دخل ہو گیا تو انھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ اگر بڑے بڑے عہدے اور عزت حاصل کرنا چاہتے ہو تو انگریزی تعلیم پاؤ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے حکومت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے انگریزی تعلیم حاصل کی۔ افسوس ہے کہ اس سے مسلمانوں کو دنیوی عزت اور مرتبہ تو مل گیا لیکن عقیدوں میں خرابی پیدا ہو گئی۔ دین کا پرندہ اڑ گیا یعنی وہ دین کی نعمت سے محروم ہو گئے۔ اگر دین قائم ہوتا اور مضبوط ہوتا تو مسلمانوں کے ارادوں میں بھی بلندی پیدا ہو سکتی تھی، لیکن اب تو قوم کے نوجوان دین سے ہاتھ دھو کر پست فطرت ہو گئے ہیں۔ اور انھیں اونچے اونچے منصب حاصل کر کے زر و مال جمع کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں رہا۔ لیں رات دن دولت فراہم کرنے کے جنون میں زمین کا گز بنے پھرتے ہیں۔

مذہب ہی کی بدولت قوم کے افراد میں ہم نوائی اور اتحاد پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر قوم کو ایک ساز فرض کیا جائے تو دین اس کی مضراب ہے یعنی اگر مذہب قائم نہ رہے تو قوم کا وجود بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر دیوار باغ کی بنیاد ہل جائے تو ظاہر ہے کہ یہ باغ ہی کے خاتمے کا پیش خیمہ ہے یعنی جب دین کی بنیاد ہی ڈھے جائے تو قوم بھی نابود ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کی نئی پود کو دین کے زمزم سے پانی نہیں ملا، لہٰذا اس میں الحاد کا رنگ ڈھنگ پیدا ہو گیا۔ لیکن خدا کے لیے یہ ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں نہ کرنا۔ ورنہ ہندوستان کے مسلمان مجھے چغل خور سمجھیں گے۔

ہم نے جو کانٹے بوئے تھے ان سے کھجور حاصل نہیں کر سکتے اور جو اون ہم نے بنی تھی اس سے مخمل یا ریشمی کپڑا نہیں بن سکتے۔

اس شعر میں وہی مضمون بیان کیا گیا ہے جو مولانا روم کے اس مشہور شعر میں بیان ہوا ہے ؎

گندم از گندم بروید جَو ز جَو از مکافاتِ عمل غافل مشو

یعنی جب تربیت کے اصول ہی صحیح نہ رکھے گئے ...... اور دین کو مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کا لازمی جزو نہ بنایا گیا تو نتیجہ اس کے سوا کیا نکل سکتا تھا جو نکلا، ان میں الحاد پیدا ہو گیا۔

مذہب

تضمین بر شعر میرزا بیدل

بیدل: میرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی مغلوں کے آخری دور کے مشہور فارسی شاعر تھے۔ عالمگیر کے فرزند شہزادہ اعظم جاہ کے دربار سے کچھ مدت وابستہ رہے۔ پھر ہر تعلق توڑ کر درویشانہ زندگی اختیار کر لی۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ان کے اشعار ایک لاکھ سے کم نہ ہوں گے۔ کچھ نثر کی کتابیں لکھیں۔ مثلاً چہار عنصر۔ فارسی بالا بیل اپنے رنگ کے وہ واحد شاعر گزرے ہیں۔ ۳ صفر ۱۱۳۳ھ (۲۱ نومبر ۱۷۲۰ء) کو دہلی میں وفات پائی لیکن ان کے اشعار "رقعاتِ عالمگیری" میں بھی ملتے ہیں۔ اس سے عالمگیر کی وسعتِ مطالعہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ **محسوس:** وہ وجود جس کا علم حواس کے ذریعے سے ہو سکے یعنی آنکھ، ناک، کان، زبان اور ہاتھ کے ذریعے سے اسے دیکھا، سونگھا، سنا، چکھا یا چھوا جا سکے۔ **انتعاش:** لغوی معنی اٹھنا اور بلند ہونا۔ اصطلاحی عیش و عشرت، لذت۔

فلسفۂ یورپ کا عالم یہ تعلیم دیتا ہے کہ جو لوگ کسی نظر نہ آنے والی، غائب اور غیر محسوس ہستی کی تلاش میں دوڑ دھوپ کر رہے ہیں، وہ بے سمجھ ہیں۔ مطلب یہ کہ مغرب کے فلسفی مادے ہی کے قائل ہیں، خدا کو نہیں مانتے۔

اگر غائب ہستی ظاہری آنکھوں سے نظر نہ آئے تو یہ فضول اور بے معنی بات ہے کہ شیخ بھی برہمن کی طرح بتوں کو پوجے

رہا ہے یعنی مسلمان بھی بت پرستوں اور ہندوؤں کی طرح ہستیٔ باری تعالیٰ سے بے گانے ہو گئے ہیں۔

نئے علوم و فنون کی بنیاد محسوس ہونے والی مادی اشیاء پر رکھی گئی ہے۔ موجودہ زمانے میں عقیدوں کا شیشہ چور چور کر دیا گیا ہے۔ مراد یہ کہ دنیا میں ہر طرف مادہ پرستی کا دور دورہ ہے۔ اور خدا کی ہستی پر ایمان رکھنے والوں کی بات کوئی نہیں سنتا توحید و ایمان کی روشنی مدھم پڑ گئی ہے اور شرک و کفر کا اندھیرا فضائے عالم پر چھا گیا ہے۔

جسے مذہب کہتے ہیں وہ آج کل ایک وہم و گمان اور دیوانگی کے سوا کچھ نہیں رہا۔ مذہب سے فقط دل خوش کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں۔ مرشدِ کامل نے مجھ پر زندگی کی حقیقت کا بھید کھول کر رکھ دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

ہر کمال کے ساتھ تھوڑی سی از خود رفتگی، آشفتہ حالی اور عشق کا ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ تو نے کمال جدوجہد سے عقلِ کل کا منصب بھی حاصل کر لیا ہے، پھر بھی ساتھ ساتھ جنون کا رنگ ہونا لابدی ہے۔ مطلب یہ کہ کوئی شخص خواہ وہ عقل و دانش کی بلند ترین چوٹی پر ہی کیوں نہ پہنچ جائے، عشق کے بغیر خدا، کائنات اور زندگی کی حقیقت کے راز سے آشنا نہیں ہو سکتا۔

جنگِ یرموک کا ایک واقعہ

امیرِ عساکر: فوجوں کا سالار۔ بو علیدہ: حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے منتخب صحابہ کرامؓ میں سے تھے۔ عرب بھر میں ان کی بہادری کے ڈنکے بجے ہوئے تھے۔

وہ ہر معرکے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے انھیں سپہ سالار بنا کر شام بھیجا اور وہ فتح مبین حاصل کر کے "فاتح شام" کے لقب سے سرفراز ہوئے۔ ۱۸ھ میں وفات پائی۔

عرب کے مسلح جوان صفیں باندھے لڑائی کے لیے تیار تھے اور سرزمینِ شام کی دلہن جھنڈی کا انتظار کر رہی تھی۔ مطلب یہ کہ جنگ شروع ہو کر خون کا دریا بہنے کو تھا۔

اتنے میں ایک نوجوان نے جو پارے کی طرح بے قرار تھا، سپہ سالار کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی:

اے حضرت ابو عبیدہؓ! آپ مجھے جنگ کی اجازت بخشیں کیونکہ اب میرے صبر کا پیمانہ لبالب بھر چکا ہے۔ یعنی میں صبر نہیں کر سکتا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی میں بے قرار ہو رہا ہوں۔ اور محبت میں ایک لمحے کے لیے بھی محبوب سے جدا رہنا حرام ہے۔ مراد یہ کہ میں فی الفور آں حضرتؐ پر جان قربان کر دینا چاہتا ہوں۔ میں رسولِ مقبولؐ کے حضور میں جا رہا

ہوں۔ اگر آپ کوئی پیغام دینا چاہتے ہوں تو فرمادیں میں خوشی سے پہنچا دوں گا۔ نوجوان کی یہ جاں نثاری اور جذبۂ عشق دیکھ کر حضرت ابو عبیدہؓ کی اس آنکھ میں آنسو ڈبڈبا آئے جس کی نظر تلوار کی طرح تیز تھی۔ لشکرِ اسلام کے سالار نے فرمایا: تو ایسا نوجوان ہے کہ تیرے عشقِ رسولؐ کی وجہ سے بوڑھوں کو بھی تیری عزت کرنی لازم ہے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا تیری مراد پوری کرے۔ تیرے عشق کا مقام نہایت اونچا ہے۔ جب تو رسولِ امینؐ کے دربار میں پہنچے تو میری طرف سے سلام کے بعد عرض کرنا: غیرت مند خدا نے ہم پر فضل فرمایا ہے۔ حضورؐ نے فتح و نصرت کے متعلق جس قدر وعدے فرمائے تھے وہ سب کے سب پورے ہو رہے ہیں۔

اس نظم کا ماحصل یہ ہے کہ اگر عہدِ حاضر کے مسلمان بھی دلوں میں عشقِ رسولؐ کا یہی رنگ پیدا کرلیں تو خدا کے لطف و کرم سے زندگی کے ہر شعبے میں کامیابی اور فتح مندی ان کے قدم چوم سکتی ہے

مذہب

اے مسلمان! تو اپنی قوم کا مقابلہ یورپی قوموں سے نہ کر کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمّت وضع و ترکیب میں ساری دنیا سے الگ ہے۔۔ اقوام یورپ کی ترکیب و ساخت کا مدار ملک اور خاندان پر ہے لیکن تیری جمعیت مذہب کی طاقت سے مضبوط ہے۔ مطلب یہ کہ اہلِ مغرب کے نزدیک قومیں وطن، نسل، رنگ، زبان وغیرہ سے بنتی اور شناخت کی جاتی ہیں مگر ملّتِ اسلامیہ کی بنیاد مذہب پر ہے کیونکہ اسلام نے وطن و نسل کے امتیازات مٹا کر رکھ دیے ہیں۔

اگر تو نے مذہب کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تو جمعیت کہاں باقی رہے گی؟ اور جمعیت فنا ہوگئی تو ساتھ ہی قوم بھی فنا ہو جائے گی۔ یعنی اے مسلمان! دین کی مضبوط رسّی پوری قوت سے تھامے رکھ اور اسلام کی صراطِ مستقیم پر عزم و ہمّت سے گامزن رہ۔ تیری بقا اور ترقی کا راز مذہب اور صرف مذہب میں پوشیدہ ہے۔

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

زرِ کامل عیار: کسوٹی پر پورا اترنے والا سونا۔ کھرا سونا

خزاں کے موسم میں جو شاخ درخت سے ٹوٹ جاتی ہے، وہ بہار کے بادل سے ہری بھری نہیں ہو سکتی۔ اس پہ ہمیشہ خزاں چھائی رہتی ہے۔ نہ کبھی اسے پتّے لگتے ہیں نہ پھل۔

اے مسلمان! تیرے باغ میں بھی پت جھڑ کے موسم کا دور دورہ ہے اور پھولوں کی جیب کھرے سونے سے خالی ہے۔ مطلب یہ کہ مسلمانوں کا ایمان کمزور ہو گیا ہے، اس لیے ان پر پستی اور زوال چھا گیا ہے۔

جو پرندے پتّوں کی تنہائی میں نغمے گا رہے تھے، وہ تیرے سائے والے درخت سے رخصت ہو گئے۔ یعنی جو شاخ درخت سے کٹ کر الگ ہو چکی ہو، وہ سوکھ جاتی ہے۔ اس پر نہ کوئی پرندہ بیٹھتا ہے اور نہ ان کی نغمہ زنی کی امید رکھی جا سکتی ہے۔

تو کسی ٹوٹی شاخ سے سبق حاصل کر۔ یہ اس لیے کہتا ہوں کہ تو زمانے کے قاعدے سے ناواقف ہے۔

قوم کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط رکھ۔ تیرے لیے بہار کی امید اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ درخت سے چمٹا رہے۔

شبِ معراج

آسمان سے شام کے ستارے کی آواز آ رہی ہے کہ جس رات کو صبح سجدہ کرتی ہے، وہ یہی رات ہے یعنی معراج کی رات ہمّت ہو تو عرشِ بریں ایک قدم کا راستہ ہے۔ معراج کی رات مسلمانوں کو یہی سبق دے رہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ معراج انسانی ہمّت، صلاحیت اور خدا کی رحمت کا اس دنیا میں سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ مسلمان کے لیے اس میں یہی سبق ہے کہ انسان کے عزم و ہمّت کی آخری منزل عرشِ بریں ہے۔ بلاشبہ درجے کی یہ بلندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی رحمت سے ملی، لیکن رحمت کا نزول بھی ہمّت و صلاحیت ہی کی بنا پر ہوتا ہے۔

پھول!

اے پھول! تجھے بلبل کے پارہ پارہ دل کی فکر کیوں پریشان کیے ہوتے ہے؟ تو پہلے اپنے پیراہن کے چاک تو رفو کر۔ اس کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص دوسروں کی اصلاح کا دعوے لے کر اٹھے تو اسے پہلے اپنی سیرت اور کردار کو درست کر لینا چاہیے تاکہ وہ قرآنِ مجید کے اس ارشاد کا نشانہ نہ بنے کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ — وہ کہتے کیوں ہو جس پر تم خود عمل نہیں کرتے؟

اگر تجھے دنیا کے باغ میں عزّت اور آبرو سے رہنے کی خواہش ہے تو اے پھول! تجھے چاہیے کہ کانٹوں میں پھنسے ہوئے زندگی بسر کرنے کی عادت ڈال لے۔ مراد یہ ہے کہ یہاں جینا سہل نہیں۔ طرح طرح کی تکلیفیں پیش آ سکتی ہیں۔ جب تک انسان ان تکلیفوں پر صبر کی ہمت پیدا نہ کرے، وہ عزّت سے نہیں رہ سکتا۔

صنوبر کا درخت دیکھو، وہ باغ میں بلندی کے اعتبار سے آزاد معلوم ہوتا ہے لیکن ایک جگہ گڑا ہوا ہے، اس لیے کہنا چاہیے کہ اس کے پاؤں مٹی میں دھنسے ہوئے ہیں۔ یعنی وہ قید بھی ہے اور آزاد بھی۔ تو بھی طرح طرح کی پابندیوں میں پھنسا ہوا ہے۔ تاہم تجھے آزادی کی کوشش جاری رکھنی چاہیے یعنی صنوبر کی طرح جتنا اوپر اٹھ سکتا ہے اٹھ۔

یہ نظم جس زمانے میں لکھی گئی تھی، اس زمانے کے مسلمانوں کے لیے یہ بڑا ہی اچھا سبق تھا۔ یعنی انگریزی حکومت نے طرح طرح کی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ اقبال نے مسلمانوں کو یہ سبق دیا کہ پابندیاں اس وقت تک قائم رہیں گی جب تک انگریز حکمران ہیں۔ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ساری زندگی پابندیوں ہی کی نذر کر دی جائے۔ جن جن دائروں میں موقع ملتا ہے اپنی قوت اور مقدور کے مطابق آزاد ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔

تجھ پر جو معمولی بخششیں ہوتی ہیں، ان سے بے نیاز ہو جا۔ اور جب تجھ پر یہ بخششیں ہوں تو اس طرح ٹھکرا دے کہ بخشش کرنے والے کو اپنی حالت پر ندامت آئے۔ تو شبنم کا احسان مند کیوں ہوتا ہے؟ اپنے پیالے اور صراحی کو اوندھا رکھ۔ یہ کہاں کی خودداری ہے کہ تجھے جو چاہے باغ سے توڑ کر دستار میں رکھ لے، جو چاہے گلے میں ڈال لے۔

ان دونوں شعروں میں قوم کو خودداری اور بلند نظری کی تعلیم دی گئی ہے۔ یعنی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے حکومت کے آگے جھکتے رہنا بالکل غلط ہے۔ مثلاً یہ کہ کوئی خطاب مل گیا یا جاگیر عطا ہو گئی یا کسی عزیز کو نوکری دے دی گئی یا ممبری کے لیے نامزد کر دیا گیا۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے شبنم کے چند قطرے پھول پر گر جائیں۔ انھیں قبول نہ کرو۔ یہ بھی مناسب نہیں کہ حکمرانوں یا ہم وطنوں میں سے کوئی مسلمانوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے یا حکومت سے جا کر یہ کہے کہ میں جو کام چاہوں ان سے لے لوں

باغ میں شبنم کلی سے یہ کہہ کر اڑ گئی کہ اگر تجھے پھول توڑنے والے کے ظلم و جبر کا مزہ چکھنا منظور ہو تو اپنے اندر رنگ اور بُو پیدا کر لے اور اگر تو یہ چاہتی ہے کہ تجھ پر کبھی خزاں نہ آئے تو پھر رنگ اور بُو کی دنیا سے خواہش کا ہر رشتہ توڑ لینا چاہیے۔

ان دو شعروں میں رنگ و بو سے ایک جگہ صحیح اسلامی کردار اور قومی جوہر مراد ہیں۔ یعنی جس مسلمان میں سچا اسلامی کردار موجود ہوگا، ناممکن ہے اس پر گل چیں کے ظلم نہ ہوں۔ دوسرے شعر میں رنگ و بو سے مراد دنیوی اعزازات ہیں کہ اگر ان اعزازات کی خواہش سے دل کو پاک کر لیا جائے تو پھر انسان میں پائیداری پیدا ہو جائے گی اور اس کی ہر دل عزیزی میں کبھی کمی نہ آئے گی۔ اعزاز کے خواہش مندوں کی حالت یہی ہے کہ آج اونچے رتبے پر براجمان ہیں، کل وہاں سے نکالے جاتے ہیں تو پریشان حال پھرتے ہیں۔

اسے پھول! دیکھ تیری زندگی کا کمال اس کے سوا کچھ نہیں کہ کوئی آئینہ رو تجھے اپنے دامن کی زینت بنا لے۔ مسلمان کی زندگی کا کمال یہ ہے کہ وہ اسلام کے لیے عزت اور سربلندی کا باعث ہو۔

شیکسپیئر

تمہیدی نوٹ

شیکسپیئر انگلستان کا سب سے بڑا شاعر اور ڈراما نگار تھا۔ آج دنیا کی چند بڑی ادبی ہستیوں میں شمار ہوتا ہے ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۱۶ء میں وفات پائی۔ سٹریٹ فورڈ آن دی ایوان میں اس کی قبر ہے۔

اقبال نے یہ نظم اس وقت لکھی تھی جب یورپ میں دنیا کے اکابر سے شیکسپیئر پر نظمیں لکھوانے کی ایک تحریک جاری ہوئی تھی اور ان نظموں کا مجموعہ ایک خاص کتاب میں چھاپا گیا تھا۔ یہ نظم لکھتے وقت اقبال کے پیش نظر یہ حقیقت بھی تھی کہ اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہوگا۔

پہلا بند صبح کی شفق کے لیے دریا کا چلنا آئینہ ہے۔ شام کے نغمے کے لیے شام کی خاموشی آئینہ ہے۔ پھول کی پتی بہار کے خوب صورت رخسار کا آئینہ ہے۔ مجموعۂ شراب کے لیے پیالے کی جلوہ گاہ آئینہ ہے۔ حسن حق کا آئینہ ہے اور دل حسن کا آئینہ۔ اے شیکسپیئر! تیرا حسن کلام انسانی دل کے لیے آئینہ ہے۔

تینوں شعروں کا مفہوم مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ صبح کے وقت شفق پھولتی ہے تو اس کے رنگ کی بہار دریا میں بہت دلکش معلوم ہوتی ہے۔ گو دریا اس کے لیے آئینے کا کام دیتا ہے۔ شام کے وقت ساری دنیا پر خاموشی چھا جاتی ہے

اس خاموشی میں شام کا نغمہ سنا جا سکتا ہے۔ پھول کی پتی واقعی بہار میں حد درجہ تر و تازہ، شاداب اور خوبصورت نظر آتی ہے گویا وہ بہار کے جوش نمو کا آئینہ بن جاتی ہے۔ رنگین شراب شیشے کے جام میں حد درجہ نظر افروز معلوم ہوتی ہے۔ حسن واقعی حق کا عکس ہے اور دل حسن کا آئینہ ہے۔ شیکسپیئر کا کلام اس وجہ سے انسانی دل کا آئینہ ہے کہ اس نے اپنے کلام میں انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں پر نہایت عمدہ روشنی ڈالی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس وصف میں دنیا کا کوئی شاعر شیکسپیئر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اے شیکسپیئر! تیرے آسمان پر پہنچنے والے تخیل سے ہستی نے کمال حاصل کیا۔ کیا تیری روشن فطرت ہستی کا آخری مقصود تھی؟

دوسرا بند تیرے کمالات کی مشتاق آنکھ نے جب تجھے ڈھونڈا تو سورج کی روشنی میں چھپا ہوا دیکھا۔ مراد یہ ہے کہ تیرے کمالات کا اندازہ تیرے کلام کو دیکھنے سے ہو سکتا ہے۔ خورشید سے اشارہ شیکسپیئر کی طرف اور تاب خورشید سے اس کے کلام کی طرف دنیا کی آنکھ سے تو تیری ہستی چھپی رہی، لیکن تیری آنکھ نے دنیا کو صاف صاف دیکھ لیا۔ مطلب یہ کہ اگرچہ زندگی میں تیری کوئی قدر و منزلت نہ ہوئی اور اہل علم تیرے کمالات کا اندازہ نہ کر سکے، لیکن تو نے انسانی زندگی کی حقیقتوں کو صاف صاف پالیا۔

فطرت کو اپنے بھید چھپانے کا ایسا جنون ہے کہ میرا خیال ہے، تجھ ایسا رازدانِ فطرت پھر کوئی پیدا نہ ہوگا۔ یعنی ایک ایسی شخصیت تو پیدا ہو گئی جس نے بہت سے بھید کھول کر رکھ دیے۔ اگر تجھ ایسا کوئی اور پیدا ہو گیا تو باقی بھید بھی کھل جائیں گے۔

میں اور تو

نانِ شعیر: جو کی روٹی۔ **ہری ہری:** خدا خدا۔ **مرحبی:** مرحب۔ خیبر کے مرکزی قلعہ قموص کا مشہور یہودی سردار جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ مرحبی اسی سے نکالا ہے۔ یعنی وہ اوصاف جو مرحب میں تھے۔ مراد ہے اسلام دشمنی۔

نہ مجھ میں حضرت موسیٰؑ کی شان باقی ہے نہ تجھ میں حضرت ابراہیمؑ کی کوئی خصوصیت موجود ہے۔ میں سامری کے جادو پر شاہد ہوں، تو آزر کے شیوے کا شیدائی ہے۔ یعنی تو بھی خدا کا راستہ چھوڑ کر اسی طرح بتوں کے پیچھے لگ گیا ہے جس طرح سامری نے حضرت موسیٰؑ کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر بنی اسرائیل کو بچھڑے کی پوجا پر لگا دیا تھا۔ تو نے بھی حضرت ابراہیمؑ کی جگہ آزر کا طریقہ اختیار کر لیا ہے یعنی بت پرستی میں لگا ہوا ہے۔

میرے دل سے جو نغمہ اٹھا تھا، وہ حلق ہی میں جل کر رہ گیا۔ تیری حالت یہ ہے کہ تیرا رنگ بھی اڑ گیا اور خوشبو بھی ختم ہو چکی۔ ہم، غم آرزو کی کہانی ہوں جو سنائی نہیں گئی، تو حسن و خوبی کے ماتم کا افسانہ ہے۔ مراد یہ ہے، میرے نغمے کا حلق میں جل کر رہ جو

اس امر کی دلیل ہے کہ لب تک نہ آسکا۔ لہٰذا آرزو بیان نہ ہو سکی۔ تو رنگ و بُو سے خالی ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تیری دلبری باقی نہ رہی اور تو اس کے ماتم کی کہانی بن گیا۔

میرا عیش غم بن چکا ہے۔ میرے شہد نے زہر کی صورت اختیار کر لی ہے۔ میری زندگی عدم کی ہمدم ہو گئی ہے۔ تیرے دل کا کعبہ عجم کے پاس رہن ہے۔ تیرا دین وہ ہے جو کافروں سے خریدا گیا ہے۔ زندگی کا دم زندگی کو ختم کر رہا ہے۔ زندگی کا غم کھانا زندگی کے لیے زہر ہے۔ تو زندگی کے جانے کا غم نہ کر اور غم کا زہر نہ کھا، قلندر کی شان یہی ہے۔

اگر تیری خاک میں زندگی کی کوئی چنگاری موجود ہے تو غریبی اور دولت مندی کا ذرا خیال نہ کر۔ کیا تو نہیں جانتا کہ حضرت علیؓ مرتضیٰ کی قوت کا مقابلہ کوئی نہ کر سکتا تھا اور وہ جَو کی روٹی کھاتے تھے؟ یعنی ظاہری اسباب سے محروم ہونے کے باوجود وہ کفر کی ساری دنیا پر بھاری تھے۔

اسے کعبے کے چراغ! مجھے اپنے گرد گھومنے کا کوئی ایسا طریقہ بتا کہ تیرا پتنگا سمندر کی فطرت اختیار کر لے۔ یعنی آگ اسے جلا نہ سکے۔

کعبے والوں نے کعبے سے وفاداری کے رنگ میں جو ظلم کیا، اگر میں اس کا گلہ کسی بت خانے میں جا کر بیان کروں تو بت بھی ہری ہری پکار اٹھے۔ یعنی پناہ مانگنے لگے۔

نہ دنیا کا میدانِ جنگ نیا ہے نہ اس میں پنجہ آزما ہونے والے حریف نئے ہیں۔ وہی حالت ہے جو پہلے دن سے چلی آ رہی ہے۔ ایک طرف شیرِ خدا حضرت علی مرتضیٰؓ کے مسلک پر چلنے والے کھڑے ہیں اور دوسری طرف مرحب و عنتر کے پیروکار ہیں۔

اسے عرب و عجم کے شہنشاہ! ہم پر لطف و کرم کی نظر فرمائیے۔ وہ بھکاری مدت سے کرم کے انتظار میں کھڑے ہیں جنھیں حضور نے اپنی نوازش سے سکندر کا سا شاہی دماغ عطا فرمایا ہے۔ یعنی اگرچہ ان کے پاس کچھ نہیں، لیکن دماغ ایسا نہیں جو شہنشاہوں سے کم ہو۔

اسیری

یہ چار شعر اس موقع پر لکھے گئے تھے جب دسمبر ۱۹۱۹ء میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی چار سال کی نظربندی کے بعد رہا ہو کر امرتسر تشریف لائے تھے اور وہاں کانگرس و خلافت کے اجلاس ہوئے تھے۔ اقبال نے امرتسر تشریف لے جاتے ہوئے راستے میں یہ شعر لکھے تھے اور مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی کو مخاطب کرتے ہوئے جلسے میں پڑھے تھے۔

مُشکِ اذفر[1]: خالص مُشک۔

قید ہونے والے کی فطرت بلند ہو تو قید اس کے لیے قدر و منزلت بڑھانے کا سامان بن جاتی ہے۔ ابرِ بہار کی بوند کو دیکھو کہ سیپی کی قید میں وہ موتی بن کر عزت و آبرو پا تا ہے۔

خالص مُشک کیا ہے؟ لہو کی ایک بوند ہے لیکن ھرن کی ناف میں بند ہو کر مشک بن جاتی ہے۔

قدرت ہر کسی کی اس طرح پرورش نہیں کرتی۔ بہت کم پرندے ہیں جنھیں جال اور پنجرے سے سابقہ پڑتا ہے۔ کوّے اور چیل کے پر و بال کو کوئی نہیں باندھتا اور نہ انھیں شکار کیا جاتا ہے۔ یہ سعادت صرف شہباز اور شاہین کا حصّہ ہو چکی ہے۔

آخری شعر خواجہ حافظ کا ہے۔

دریوزۂ خلافت

تمہیدی نوٹ

یہ نظم اس موقع پر لکھی گئی تھی، جب مولانا محمد علی مرحوم ایک وفد لے کر خلافت کا مسئلہ انگلستان کے وزیرِ اعظم لائڈ جارج کے سامنے پیش کرنے کے لیے گئے تھے۔ یہ وفد آخر ناکام واپس آیا۔

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے تو جانے دے، تو خدا کے حکموں سے بے وفائی نہ کر یعنی خدا نے جو قاعدے مقرر کر دیے ہیں، ان سے کیوں منہ پھیرتا ہے؟ کیا تجھے تاریخ سے واقفیت نہیں کہ خلافت کے لیے بھیک مانگنے پر تیار ہو گیا، جو بادشاہی ہم اپنے لہو سے نہ خریدیں اور اپنے زورِ بازو سے حاصل نہ کریں وہ مسلمانوں کے لیے باعثِ ننگ ہے۔

میرے لیے اپنے جسم کی ہڈیاں ٹوٹ جانا اس قدر باعثِ شرم نہیں جس قدر دوسروں کے سامنے مومیائی کے لیے ہاتھ پھیلانا۔

---

[1] "بانگِ درا" میں اذفر کو کاتب نے زے سے لکھ دیا جو غلط ہے۔

ہمایوں

تمہیدی نوٹ

یہ نظم میاں شاہ دین مرحوم کی وفات پر لکھی گئی جن کا تخلص ہمایوں تھا۔ اقبال کے تعلقات میاں صاحب سے بہت گہرے تھے۔ وہ اپنے عہد میں علم وفضل کے پیکر مانے جاتے تھے اور اہلِ پنجاب میں سے پہلے شخص تھے، جنھیں اس عہد کے چیف کورٹ کی جج ملی۔

شعلہ بہ گردوں نوردِ آسماں کی لپیٹ میں لے لینے والا شعلہ

اے ہمایوں! تیری زندگی سراسر قومی ہمدردی اور سوز و گداز سے لبریز تھی۔ تیرے دل کی چنگاری محفل کو روشن کرنے والا چراغ تھی یعنی تیری ذاتِ ملّتِ اسلامیہ کے لیے فخر و ناز کا باعث تھی۔

اگرچہ تیرا خاکی بدن کمزور اور نحیف تھا لیکن تیری بلند طبیعت ستارے کی طرح روشن تھی۔ مطلب یہ کہ تو جسمانی اعتبار سے تو دبلا پتلا اور کمزور تھا۔ لیکن تیرا دماغ نہایت قوی، روشن اور تیز تھا۔

واضح رہے کہ میاں شاہ دین مرحوم بہت دبلے پتلے سے آدمی تھے۔

تیرے کمزور جسم میں کتنا بے خوف دل پوشیدہ تھا گویا خاک کی ایک مٹھی میں آسمان کو لپیٹ میں لے لینے والا شعلہ چھپا ہوا تھا یعنی تو کسی دشمن سے نہ ڈرتا تھا اور تیری رگ رگ میں بے پناہ جذبہ، قوت اور جوش بھرا ہوا تھا۔

دانا دل موت کی ذرا پروا نہیں کرتا۔ رات کے سناٹے میں آنے والی کل ہنگامے کے سوا کچھ نہیں۔ مراد یہ کہ عقل مند شخص موت سے قطعاً خوف نہیں کھاتا کیونکہ جس طرح رات گزرنے کے بعد دن یقیناً آتا اور روشن ہوتا ہے اسی طرح موت کے بعد دوسری زندگی کا آنا بھی یقینی ہے۔

بے خبر لوگ موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھتے ہیں لیکن دراصل زندگی کی یہ شام زندگی کی ہمیشگی کی صبح ہے۔ مطلب یہ کہ بے سمجھ لوگ جانتے ہیں، مرنے کے بعد زندگی ختم ہو جاتی ہے، مگر یہ غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت کے بعد ایسی زندگی شروع ہوتی ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتی۔

خضرِ راہ

تمہیدی نوٹ

یہ نظم اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام کے سینتیسویں سالانہ اجلاس میں پڑھی تھی جو اپریل ۱۹۲۲ء میں اسلامیہ ہائی سکول اندرون شیرانوالہ دروازہ میں منعقد ہوا تھا۔ عالمِ اسلام کے لیے وہ وقت بے حد نازک تھا۔ قسطنطنیہ پر اتحادی قابض تھے۔ سلطنتِ عثمانیہ کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ اتحادیوں کے ایما پر یونانیوں نے اناطولیہ میں فوجیں اتار دی تھیں۔ شریف حسین جنگ کے زمانے میں انگریزوں کے ساتھ مل کر سلطنتِ عثمانیہ سے بغاوت کر چکا تھا۔ اس وجہ سے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو عرب کے مختلف حصّوں میں براہِ راست مداخلت کا موقع مل گیا تھا۔ اس طرح مسلمانوں پر رنج و قلق کی گھٹائیں چھا گئیں۔ ہمارے ملک میں ہجرت کی تحریک جاری ہوئی، پھر خلافت اور ترکِ موالات کا دور شروع ہوا۔ ہزاروں مسلمان قید ہو گئے۔ ادھر دنیائے اسلام کے روبرو نئے نئے مسائل آ گئے۔ اقبال نے انھیں میں سے بعض اہم مسائل کے متعلق حضرت خضرؑ کی زبان سے مسلمانوں کے سامنے صحیح روشنی پیش کی اور نظم کا نام "خضرِ راہ" اسی وجہ سے رکھا کہ یہ مشکلات و مصائب کے نہایت نازک دور میں راہنمائی کا منار تھی۔

یہ نظم سننے کے لیے بے شمار آدمی جمع ہو گئے تھے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ پورا مجمع بیس ہزار سے کم نہ ہوگا۔ بعض اشعار پر اقبال خود بھی بے اختیار رو دیتے اور مجمع بھی اشک بار ہو گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اقبال پر جتنی رقت "خضرِ راہ" پڑھنے کے دوران میں طاری ہوئی اتنی کسی نظم کے دوران میں نہ ہوئی۔ ابتدا میں نظم میں صرف دو عنوان تھے۔ پہلے دو بندوں کا عنوان تھا "شاعر" یعنی شاعر کا خطاب حضرت خضرؑ سے۔ باقی نو بندوں کا عنوان تھا "جوابِ خضرؑ"۔ نظرِ ثانی میں اقبال نے مختلف مسائل پر الگ الگ عنوان قائم کر دیے۔

خضرِ راہ اقبال کی مختلف نظموں میں بعض وجوہ سے یگانہ حیثیت کی مالک ہے۔ مثلاً:

۱- اس کا عام انداز دوسری نظموں سے بالکل جداگانہ ہے۔

۲- اگرچہ اس میں پرانے اسلوب کے تمام محاسن موجود ہیں، لیکن اظہارِ خیال کا ایسا طریقہ اختیار کیا گیا ہے جسے مغربی ادب سے گہرا قرب حاصل ہے۔

۳- اس میں نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ پورے عالمِ انسانیت کے اہم ترین مسائل ایسے رنگ میں بیان کیے گئے ہیں کہ ان سے عوام و خواص اپنے اپنے مدارجِ فہم و تصوّر کے مطابق یکساں مستفید ہو سکتے ہیں۔

۴۔ دوسری نظموں کے مقابلے میں اس کا انگریزی یا فرانسیسی یا جرمن یا اطالوی ترجمہ بہت سہل ہے اور اس ترجمے کو دیکھ کر اہلِ مغرب مشرقی ادب کی خصوصیات سے واقفیت حاصل کیے بغیر ہی متمتع ہو سکتے ہیں۔

ابتدا میں انھیں اشاروں پر قناعت کی جاتی ہے۔ آخر میں نظم کے مطالب ترتیب سے بیان کر دیے جائیں گے۔

سکوت افزا: خاموشی بڑھانے والی۔ حدِ دربحر خاموش۔ پیکِ جہاں پیما: دنیا کی سیر کرنے والا۔ دنیا میں گھومنے پھرنے والا قاصد۔ کشتیٔ مسکینؑ۔ جانِ پاکؑ۔ دیوارِ یتیمؑ: ان سے اشارہ ان تین واقعات کی طرف ہے جن کا ذکر سورۂ کہف میں ہوا۔ یعنی حضرت موسٰیؑ خدا کے خاص بندوں میں سے ایک بندے سے ملے۔ جسے براہِ راست علم عطا کیا گیا تھا۔ حضرت موسٰیؑ نے ان کے ساتھ رہ کر یہ علم سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ خدا کے اس خاص بندے نے فرمایا کہ آپ صبر نہ کر سکیں گے۔ بہر حال حضرت موسٰیؑ اور خدا کا وہ بندہ سفر کے لیے نکلے۔ اسی سفر میں تین واقعات پیش آئے۔

۱۔ سمندر کے کنارے پہنچے اور کشتی میں سوار ہوئے۔ خدا کے خاص بندے نے کشتی میں ایک دراڑ نکال دی حضرت موسٰیؑ یہ دیکھتے ہی بول اٹھے۔ کیا آپ نے کشتی میں اس لیے دراڑ نکال دی کہ مسافر غرق ہو جائیں؟ "کشتیٔ مسکینؑ" سے اشارہ اس واقعے کی طرف ہے۔

۲۔ دونوں آگے چلے تو ایک لڑکا ملا۔ خدا کے خاص بندے نے اسے قتل کر ڈالا۔ حضرت موسٰیؑ بول اٹھے کہ آپ نے ایک بے گناہ کی جان لے لی۔ حالانکہ اس نے کسی کی جان نہ لی تھی۔ آپ نے کیسی بُرائی کی بات کی۔ "جانِ پاکؑ" سے اشارہ اس واقعے کی طرف ہے۔

۳۔ آگے بڑھے تو ایک گاؤں کے لوگوں سے کہا کہ کھانے کا انتظام کر دو، انھوں نے انکار کر دیا۔ اس گاؤں میں ایک پرانی دیوار گرا چاہتی تھی۔ خدا کے خاص بندے نے اس کی مرمت کر دی۔ حضرت موسٰیؑ بول اُٹھے کہ آپ چاہتے تو اس محنت کا کچھ معاوضہ ان سے لے لیتے۔ "دیوارِ یتیمؑ" سے اشارہ اس واقعے کی طرف ہے۔

یہاں حضرت موسٰیؑ اور خدا کے اس بندے کا ساتھ ختم ہو گیا۔ رخصت ہوتے وقت اُس بندے نے ان تینوں کاموں کے معقول سبب بیان کر دیے۔ مثلاً: کشتی میں دراڑ اس وجہ سے نکالی گئی کہ ایک ظالم بادشاہ کشتیاں بیگار میں پکڑ رہا تھا۔ اس کشتی کو بھی لیتا تو چند مسکینوں کی روزی کا ذریعہ ختم ہو جاتا۔ لڑکے کو اس لیے قتل کیا کہ وہ اپنی سرکشی اور کفر سے نیک والدین کو دکھ پہنچاتے گا۔ امید ہے، خدا انھیں بہتر لڑکا دے دے۔ دیوار اس لیے درست کر دی کہ وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی ملکیت تھی اور اس کے نیچے خزانہ گڑا ہوا تھا۔ دیوار ڈھے جاتی تو لوگ خزانہ نکال کر لے جاتے۔

قرآن میں ان واقعات کے بیان سے مقصود یہ ہے کہ ہم ظاہری نظروں سے جو کچھ دیکھ رہے ہیں، ضروری نہیں کہ حقیقت بھی وہی ہو۔ ہو سکتا ہے بعض ظاہری برائیوں کے پس پردہ نیکی موجود ہو۔ حکم اگرچہ ظاہر ہی پر لگایا

جاتا ہے، تاہم غور و فکر، چھان بین اور تحقیق و کاوش کی پوری کوشش کرنی چاہیے تاکہ کوئی پہلو ڈھکا چھپا نہ رہ جائے۔
خدا کے اس خاص بندے کا نام صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت میں خضر بتایا گیا ہے۔

حیرت فروش: حیران۔ ہکا بکا۔ **صحرا نورد:** بیاباں طے کرنے والا۔ **پیرایہ پوش:** لباس پہنے ہوئے۔ **فطرت اسکندری:** ملوکیت یعنی بادشاہی کی فطرت۔ **ہاشمی:** اشارہ ہے شریف حسین کی طرف جو سلطنتِ عثمانیہ کی طرف سے ۱۹۰۸ء میں مکہ کا شریف مقرر ہوا تھا۔ پہلی جنگ یورپ میں وہ سلطنتِ عثمانیہ سے باغی ہو کر اتحادیوں سے مل گیا۔ اسے حجاز کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ اس کے بیٹے امیر فیصل کو پہلے شام پھر عراق کی سلطنت دے دی گئی۔ دوسرے بیٹے امیر عبداللہ کے لیے حجاز کے شمال میں شرق اردن کی سلطنت قائم کر دی گئی۔ **ترکمان سخت کوش:** سختیاں سہنے والے ترک۔ **تگاپوئے دمادم:** لگاتار دوڑ دھوپ اور سعی و کوشش۔ **رہینِ خانہ:** گھر کے گوشے میں بیٹھنے والا۔ **بانگِ رحیل:** کوچ کی صدا۔ **حضر:** قیام۔ ٹھہراؤ۔ سفر کے برعکس۔ **بے سنگِ میل:** جس میں نہ راستے کا کوئی نشان ہو۔ نہ مسافت کا کوئی حساب۔ **چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ:** لفظی معنی حضرت ابراہیمؑ کی دنیا کو دیکھنے والی آنکھ۔ اس سے اشارہ سورۂ انعام کی ان آیات کی طرف ہے جن میں حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے ان کی قوم کے غلط عقیدے واضح کیے گئے ہیں۔ وہ قوم ستارہ پرست تھی۔ تاروں، چاند اور سورج کی پوجا کرتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے نہایت پر تاثیر انداز میں بیان فرمایا کہ جو چیزیں ٹک نہ سکیں اور اپنے قیام کے لیے دوسرے سہارے کی محتاج ہوں۔ وہ پوجا کے لائق نہیں ہو سکتیں۔ ستارہ نکلا اور ڈوب گیا۔ چاند روشن ہوا، چھپ گیا۔ سورج کے طلوع ہونے ہی دنیا میں اجالا ہو گیا لیکن دل کی منزل پوری کر کے وہ بھی ڈوب گیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ حقائق بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ چیزیں خدا نہیں ہو سکتیں۔ خدا وہ ہے جس نے زمین اور آسمان بنائے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ انعام کی آیات ۷۵ تا ۷۹) **کشت و نخیل:** کھیتی باڑی اور باغات۔ **کن فکاں:** کائنات۔ **کوہکن:** لفظی معنی پہاڑ کاٹنے والا۔ مراد ہے فرہاد سے جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے اپنی محبوبہ شیریں کے لیے اس کی فرمائش کی تعمیل میں پہاڑ کاٹ کر نہر نکالی تھی کہ شیریں کے محل میں تازہ دودھ پہنچا رہے، لیکن جن لوگوں نے بلند پہاڑوں کی پیشانی سے اترنے والی ندیوں کا بہاؤ دیکھا ہے۔ انھیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دور سے یہ ندیاں اتنی سفید نظر آتی ہیں جیسے دودھ کی نہریں بہ رہی ہوں۔ غالباً اسی وجہ سے فرہاد کی ندی کا نام جوئے شیر پڑ گیا۔ اردو محاورے میں جوئے شیر لانے سے مراد ہے نہایت مشکل اور کٹھن کام انجام دینا۔ **شمشیر بے زنہار:** بے پناہ تلوار۔ **بدخشاں:** افغانستان کا ایک صوبہ۔ پرانے زمانے سے مشہور چلا آتا ہے کہ یہاں اعلیٰ درجے کے لعل کی بہت بڑی کان تھی اور لعلِ بدخشاں نے دنیا بھر میں شہرت حاصل کر لی۔ کہتے ہیں کہ اب بھی وہاں قیمتی پتھروں کی کئی کانیں ہیں۔ **اِنَّ الْمُلُوْكَ:** اشارہ ہے سورۂ نمل کی اس آیت کی طرف: اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ج وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ (بادشاہ جب کسی بستی میں گھستے ہیں تو اسے تباہ کر دیتے ہیں اور وہاں کے سرداروں کو بے عزت کر ڈالتے ہیں۔ اور وہ ایسا ہی کچھ کریں گے) جب حضرت سلیمانؑ کی طرف سے ملکہ سبا کو دعوت نامہ پہنچا اور اس نے اپنے مشیروں سے صلاح لی تو خود کہا کہ جنگ کی صورت پیش آ جانے پر ملک برباد ہو جائے

ہیں۔ **اسرائیل**: حضرت یعقوبؑ کا لقب ہے۔ اسی وجہ سے ان کی اولاد کو قرآن مجید میں بنو اسرائیل کہا گیا۔ یہاں اسرائیل سے اشارہ حضرت موسیٰؑ کی طرف ہے۔ **طلسمِ سامری**: سامری سے وہ شخص مراد ہے جس نے حضرت موسیٰؑ کی غیر حاضری میں بنو اسرائیل سے زیور لے کر چاندی سونے کا ایک بچھڑا بنا دیا تھا اور قوم اس کی پوجا میں لگ گئی تھی۔ یہ جادو کا کھیل تھا جسے حضرت موسیٰؑ نے توڑ کر رکھ دیا۔ **استبداد**: مطلق العنان شخصی حکومت ظلم و جبر۔ **پائے کوب**: ناچنے والا۔

مجلسِ آئین: قانون وضع کرنے والی مجلس۔ **جنگِ زرگری**: دکھلاوے اور فریب کاری کی جنگ۔ **ساحرِ الموت**: الموت ایک قلعہ کا نام ہے جو قزوین کے پہاڑی علاقے میں ایک دشوار گزار مقام پر واقع تھا۔ ساحرِ الموت سے مراد فرقہ باطنیہ کا رئیس حسن بن صباح ہے۔ یہ اسمٰعیلی فرقے کا داعی تھا۔ پھر اس نے ایک محفوظ مقام حاصل کر کے فدائیوں کی ایک عجیب و غریب جماعت پیدا کی جو مدّت دراز تک اسلامی حکمرانوں اور بلند مرتبہ آدمیوں کے لیے دہشت کا سامان بنی رہی۔ مشہور ہے کہ حسن بن صباح نے الموت میں ایک جنّت بنائی تھی جس میں نہایت خوبصورت عورتیں رکھیں جو لوگ اس کے مرید بنتے تھے، انھیں بھنگ پلا کر مدہوش کر لیا جاتا اور اس جنّت میں پہنچا دیا جاتا۔ چند روز وہاں رہنے کے بعد پھر باہر لے آتے اور کہتے کہ باطنی مقاصد کے لیے جان دینے پر آمادہ ہو جاؤ تو پھر اس جنت میں پہنچ جاؤ گے۔ ہلاکو خاں تاتاری نے اس قلعے کو فتح کر کے صباحی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

برگِ حشیش: بھنگ کی پتّی۔ **شاخِ نبات**: مصری کے کوزے کی تیلیاں۔ **خواجگی**: آقائی۔ سرمایہ داری۔ **مُسکرات**: نشہ لانے والی چیزیں۔ **مُسکر**: نشہ۔ **تثلیث**: تین خدا۔ عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ باپ، بیٹا اور روح القدس تینوں مل کر خدا بنتے ہیں۔ یا تینوں مظہر الوہیت ہیں۔ تثلیث کے فرزندوں سے مراد ہے عیسائی۔

میراثِ خلیل: حضرت ابراہیمؑ کی میراث یعنی اسلامی ورثہ یعنی توحید۔ **کلاہِ لالہ رنگ**: اشارہ ہے سُرخ ٹوپی کی طرف جو ایران کے قزلباشوں کی خاص کلاہ تھی۔ **پارس**: فارس۔ ایران۔ **گاز**: سونا کاٹنے والی قینچی۔ **ترکِ خرگاہی**: شاہی خیموں والا ترک۔ **اعرابیٔ والا گہر**: عالی خاندان عرب۔ **لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد**: اشارہ ہے سورۂ آلِ عمران کی آیت کے اس ٹکڑے کی طرف: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد (یقیناً اللہ کا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہو سکتا۔)

پہلا بند میں ایک رات دریا کے کنارے اِدھر اُدھر کے نظارے دیکھنے میں مگن تھا۔ میرے دل کے کونے میں پریشانیوں کی ایک دنیا چھپی ہوئی تھی۔ رات کا سماں حد درجہ سنسان تھا۔ ہوا ساکن تھی۔ دریا دھیمے دھیمے چل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر حیرانی ہوتی تھی کہ یہ دریا ہے یا پانی کی تصویر یعنی رفتار اتنی دھیمی تھی کہ وہ اصل کے بجائے صرف ایک تصویر نظر آتی تھی۔ جس میں حرکت بالکل نہیں ہوتی۔ بے قرار لہریں دریا کی گہرائیوں میں اس طرح مستِ خواب تھیں، جس طرح دودھ پینے والا بچہ پنگوڑے میں بے خبر سو جاتا ہے۔ رات کے جادو سے پرندے گھونسلوں میں پابند ہو چکے تھے۔ ستاروں کی روشنی چاندنی کے طلسم میں پھنس کر بہت ماند پڑ چکی تھی۔

ان تین چار شعروں میں رات کا سماں ایسے دلکش انداز میں پیش کیا ہے گویا ماحول اپنی حقیقی صورت میں سامنے آ گیا ہے اور ہر شعر حسنِ فکر و نظر کی ایک بولتی ہوئی تصویر ہے۔

اسی عالم میں کیا دیکھتا ہوں کہ دنیا کی پہنائیوں میں چکر لگانے والے حضرت خضرؑ نمودار ہو گئے ہیں۔ ان کے بڑھاپے میں بھی صبح کی طرح جوانی کا رنگ اور رعنائی نمایاں ہے۔ حضرت خضر کو پیر اس لیے کہا کہ عام تصور کے مطابق ان کی عمر لمبی ہے صبح سے تشبیہ سفیدی کے باعث دی۔ پھر صبح میں روشنی کی اسی سفیدی کے باعث ایک خاص شان اور سج دھج ہوتی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال نے اس ایک مصرع کے چند الفاظ میں کتنی خوبیاں جمع کر دی ہیں اور لطف یہ کہ مصرع میں بے تکلفی اتنی نمایاں ہے گویا یہ خود بخود سانچے میں ڈھل گیا۔

حضرت خضرؑ نے مجھ سے فرمایا: اے ازلی بھیدوں کی تلاش میں بے قرار پھرنے والے! کیا تجھے معلوم نہیں کہ دل کی آنکھ کھلی ہو تو اس دنیا کی تقدیر سے پردہ اٹھ جاتا ہے۔ اور ہر بھید شکل میں سامنے آ جاتی ہے؟

یہ ارشاد سنتے ہی دل میں قیامت کا سا ہنگامہ بپا ہو گیا۔ میں بھیدوں کی تلاش میں حد درجہ سرگرم تھا اور حضرت کی خدمت میں میں نے یوں عرض کیا:

دوسرا بند حضور والا! آپ کی نگاہیں دنیا کی حقیقتوں سے واقف ہیں۔ وہ ان طوفانوں کے متعلق بھی سب کچھ جانتی ہیں۔ جن کے ہنگامے ابھی دریا کی تہ میں چپ چاپ شور رہے ہیں یعنی آپ اُن اہم واقعات کو بخوبی جانتے ہیں جو ابھی پیش نہیں آئے اور مستقبل میں کسی خاص موقع پر ان کا ظہور ہو گا۔

مسکینوں کی کشتی میں دراڑ نکالنے، بظاہر ایک بے گناہ بچے کو قتل کرنے اور دو یتیم بچوں کی دیوار مزدوری لیے بغیر بنا دینے کے واقعات قرآن مجید میں بیان ہو چکے ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ حضرت موسےٰؑ جیسے بلند رتبہ پیغمبر کا علم بھی آپ کے علم کے سامنے حیرت کا پیکر بن گیا تھا۔ اس لیے کہ حضرت موسٰےؑ ظاہر پر حکم لگاتے تھے اور وہ حکم بالکل درست تھا لیکن اس واقعات کی تہ میں چھپا ہوا علم صرف آپ کو تھا جو خدا نے اپنی خاص رحمت سے آپ کو عطا کیا تھا۔ حضرت موسٰیؑ کو ان اسباب کا علم عطا نہ ہوا تھا۔

آپ آبادیوں کو چھوڑ کر جنگلوں اور بیابانوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ آپ کی زندگی اس طرح گزر رہی ہے کہ عام انسانوں کی زندگی کے خلاف نہ اس میں دن ہے، نہ رات ہے نہ آئندہ کل ہے، نہ گزشتہ کل۔ از راہِ عنایت فرمائیے کہ زندگی کا بھید کیا ہے؟ وہ شے جسے بادشاہی کہتے ہیں کیا چیز ہے؟ سرمایہ اور محنت، مال داروں اور مزدوروں میں جو جھگڑا اور غوغا بپا ہے، اس کا سبب کیا ہے؟ پھر ملاحظہ فرمائیے کہ ایشیا کی سرزمین زمانۂ قدیم سے عظمت کی مالک چلی آتی تھی اب اس کی عظمت کا پرانا لباس جگہ جگہ سے تار تار ہو رہا ہے۔ جو قومیں کل تک گم نامی میں ڈوبی ہوئی تھیں وہ قوت و سطوت

حاصل کر کے ساری دنیا پر چھا رہی ہیں اور ان کے نوجوان اچھے اچھے لباسوں میں آراستہ ہیں۔

عام روایت کے مطابق اگرچہ سکندری یعنی بادشاہی کی نصرت اب تک جی بھر کر پی پلا رہی ہے اور ہر قسم کے مزے اڑا رہی ہے پھر بھی دیکھیے کہ شریف حسین جو حضرت ہاشم کی اولاد ہونے کا دعویدار ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاک دین کی عزت و وقعت بیچ رہا ہے۔ حالانکہ اس پر اس عزت و قعت کی حفاظت فرض تھی اور یہ اس کے جدِ امجد کی میراث تھی لیکن ترک جو ہاشمی نہ تھے اس دین کی حفاظت میں ہر قسم کی سختیاں اٹھا رہے ہیں۔ مصیبتیں برداشت کر رہے ہیں اور خاک و خون میں مل رہے ہیں۔

حضرت دیکھیے، عجیب سماں پیشِ نظر ہے۔ آگ کا الاؤ شعلہ افروز ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کھڑی ہے۔ نمرود جور و ظلم پر تلا بیٹھا ہے۔ فرمائیے کیا پھر کسی کی قوتِ ایمان کا امتحان ہونے والا ہے؟

آگ سے مراد مصیبتوں کا وہ طوفان ہے جو ہر طرف سے مسلمانوں پر امڈا چلا آتا تھا۔ اولادِ ابراہیمؑ سے مقصود ملتِ اسلامیہ ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے۔ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا۔ نمرود سے اشارہ ان جابر اور ظالم قوتوں کی طرف ہے جو مسلمانوں کو مٹا دینے پر تُلی بیٹھی تھیں۔ دوسرے مصرع میں حضرت ابراہیمؑ کے واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جب نمرود نے بتوں کو توڑنے اور توحید کی صدا بلند کرنے پر انہیں آگ میں جلا دینے کا حکم دے دیا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ اس امتحان میں پورے اترے۔ خدا کی رحمت سے آگ ان پر ٹھنڈی ہو گئی۔ اقبال کے نزدیک سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء میں پھر ویسی ہی حالت پیدا ہو چکی تھی۔ اسی لیے وہ حضرت خضرؑ سے پوچھتے ہیں کہ کیا حضرت ابراہیمؑ والا امتحان دہرایا جائے گا؟

حضرت خضرؑ کا جواب

صحرا نوردی

پہلا بند حضرت خضرؑ شاعر کے جواب میں فرماتے ہیں:

بھلا میرے جنگلوں اور بیابانوں میں گھومنے پر تجھے حیرانی کیوں ہے؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ لگاتار دوڑ دھوپ اور سعی و کوشش ہی زندہ رہنے کی دلیل ہے؟ جہاں یہ دوڑ دھوپ ختم ہوئی، زندگی بھی ختم ہو گئی۔ اے گھر کے کونے میں بیٹھے رہنے والے! تو نے وہ سماں دیکھا ہی نہیں، جب قافلہ کوچ کے لیے تیار ہوتا ہے اور اس کی آواز سے بیابان کی فضا گونج اٹھتی ہے۔ تو کیا جانے کہ وہ منظر دل و دماغ میں کیا کیا ولولے پیدا کرتا ہے اور ہمت و سرگرمی کے کیسے کیسے روح افزا

پیغام دیتا ہے؟

پھر تجھے کیا معلوم کہ ریت کے ٹیلوں پر ہرن جب بے پروائی سے چوکڑی بھرتے ہیں تو یہ نظارہ کتنا دل کشا ہوتا ہے؟ وہ کسی ساز و سامان کے بغیر جہاں موقع پاتے ہیں ٹھہر جاتے ہیں اور جب سفر پر نکلتے ہیں تو نہ ان کے راستے میں کوئی نشان ہوتا ہے جس سے پتا چل سکے، کدھر جانا ہے۔ نہ مسافت کا کوئی اندازہ ہوتا ہے کہ کتنے میل چلے اور کتنے میل اور چلنا ہے۔ وہ صبح تیزی سے چلنے والے ستارے کا نمودار ہونا، جیسے آسمان کی چھت پر سے حضرت جبریلؑ کی پیشانی نمودار ہو۔ ستارۂ صبح اور جبینِ جبریلؑ میں تشبیہ بہ لحاظ نور بالکل نئی ہے۔ پھر شام کا وقت آتا ہے تو ہر طرف خاموشی چھا جاتی ہے۔ اس حالت میں سورج غروب ہونے کا نظارہ بڑا ہی دل کش ہوتا ہے۔ یہی نظارہ تھا جسے دیکھ کر حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی آنکھ میں نئی روشنی پیدا ہوئی تھی۔ وہ آنکھ جس کی نظر زمانے بھر کی حقیقتوں پر تھی۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، اس شعر میں اشارہ سورہ انعام کی ان آیات کی طرف ہے جن میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے ایک خاص انداز میں اپنی قوم کے غلط عقیدوں کی تردید کرتے ہوئے توحید کی دعوت دی تھی۔ اقبال فرماتے ہیں کہ آفتاب کے ڈوبنے پر حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا: یہ خدا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ خود قائم نہیں رہ سکتا اور سہارے کا محتاج ہے۔ حقیقت کی یہی روشنی تھی جس کی بنا پر فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ کی آنکھ "روشن تر" ہو گئی۔

پھر پانی کے چشمے پر قافلے کے ٹھہر جانے کا سماں دیکھو۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بہشت میں ایمان والے لوگ نہر سلسبیل کے کناروں پر جمع ہو گئے ہیں۔

ان تمام شعروں میں حضرت خضرؑ نے بیابان کے نظر افروز اور ایمان افزا نظارے پیش کر کے شاعر پر اپنی صحرانوردی کا سبب واضح کیا ہے۔ ساتھ ہی دعوت دی ہے کہ یہی نظارے زندگی کی روحِ رواں ہے۔ انھیں میں وہ حوصلے پرورش پاتے ہیں جو کائنات کی تسخیر کا سامان بن سکتے ہیں۔ شہروں اور آبادیوں کی زندگی میں یہ نظارے نہیں مل سکتے لہٰذا یہ ولولے پیدا نہیں ہو سکتے۔

سب سے آخر میں یہ کہ محبّت کا جنون ہر وقت نئے ویرانے کی تلاش میں رہتا ہے۔ آج یہاں ہے، کل وہاں، پرسوں تیسری جگہ اور تو آبادی میں بیٹھا ہوا اپنے کھیتوں اور باغوں کا قیدی بن گیا ہے۔ کسی دوسری جگہ کا خیال بھی تیرے دل میں نہیں آ سکتا۔

اگر حقیقت پر نظر ہو تو واضح ہو جائے کہ زندگی کا پیالہ لگاتار گردش ہی سے زیادہ پختہ ہوتا ہے اور اسے بے خبر! زندگی کے ہمیشہ باقی رہنے کا راز یہی ہے۔

زندگی

چوتھا بند شاعر نے پہلے صحرا نوردی کا سبب پوچھا تھا۔ حضرت خضرؑ نے اس کا جواب تیسرے بند میں دے دیا۔ اس کے بعد میں شاعر کا سوال یہ تھا کہ زندگی کا راز کیا ہے؟ آیندہ دو بندوں میں حضرت خضرؑ زندگی کی حقیقت بیان فرماتے ہیں۔ کہتے ہیں:

شاید تیرے دل میں وسوسہ پیدا ہو کہ زندگی کو ہمیشگی کہاں نصیب ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ مرتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے تعلق میں نفع اور نقصان کا سوال آہی نہیں سکتا۔ یہ اس سے بالا ہے اور دیکھ کہ کبھی جان کی حفاظت زندگی اور کبھی جان کو خدا کی راہ میں سونپنا اور قربان کر دینا زندگی ہے۔

مراد یہ ہے کہ جان کی حفاظت تو بہر حال سب کے نزدیک زندگی کا نشان ہے ہی لیکن اس حقیقت کا اندازہ بہت ہی کم لوگ کرتے ہیں کہ کبھی جان دے دینا بھی زندگی کا نشان بن جاتا ہے۔ خصوصاً اس حالت میں کہ بلند مقاصد کی خاطر ایسی قربانی کے سوا انسان کے لیے چارہ نہ رہے۔

اقبال کے شعروں میں بہتر اور خوب تر کی نشان دہی مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ تمام اشعار زیادہ سے زیادہ پاکیزہ اور پُر معنی ہیں، لیکن یہ مصرع کہ

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی۔

ان کے اشعار میں واقعی اعجاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ آٹھ نو لفظوں میں انھوں نے انتہائی حسنِ بیان سے جو وسیع مضمون ادا کر دیا ہے، کائنات انسانی کی پوری تاریخ حریت و صداقت اس کی شرح و تفسیر ہے۔ حقیقتوں کے بیان میں یہ بلند مقام صرف انھیں ہستیوں کو نصیب ہوتا ہے، جن پر فیضانِ الٰہی کی خاص بارش ہو۔

انسان زندگی کو عام طور پر دنوں، مہینوں اور برسوں سے ناپتے ہیں۔ حضرت خضرؑ فرماتے ہیں کہ زندگی کی پیمائش کے لیے آج اور کل یعنی دنوں کا پیمانہ استعمال کرنا ٹھیک نہیں۔ یہ تو ہمیشہ قائم رہنے والی چیز ہے۔ لگاتار دوڑ رہی ہے اور ہر وقت جوان رہتی ہے۔ تو اگر اپنے آپ کو زندوں میں سمجھتا ہے تو اپنی دنیا آپ پیدا کر۔ زندگی کیا ہے؟ کائنات کا ضمیر ہے۔ حضرت آدمؑ کا بھید ہے یعنی کائنات کی پیدائش اور حضرت آدمؑ کا ظہور زندگی ہی کے کرشمے ہیں۔ جو وجود زندگی کی اس حقیقت سے آشنا ہو، وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرے گا۔

تو زندگی کی حقیقت فرہاد کے دل سے پوچھ۔ وہ تجھے بتائے گا کہ زندگی تیشے، بھاری پتھروں اور جوئے شیر لانے ہی کا دوسرا نام ہے مطلب یہ کہ جن لوگوں نے عظیم الشان کارنامے انجام دیے اور دنیا میں نام پیدا کیا، ان کی سرگزشتِ حیات پر نظر ڈالو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ لگاتار سختیاں اٹھاتے، مشکلات جھیلتے اور مصیبتیں برداشت کرتے رہے، لیکن ہمت کبھی نہ ہاری۔ اس سلسلے میں فرہادؔ

کی زندگی صرف ایک مثال ہے۔

زندگی غلامی اور محکومی کی حالت میں گھٹتے گھٹتے ایک ایسی ندی رہ جاتی ہے جس میں پانی بہت تھوڑا ہو، لیکن آزادی کی حالت میں یہ ایسا سمندر بن جاتی ہے جس کے کناروں کا پتا کوئی نہ بتا سکے۔

اگرچہ زندگی مٹی کے ایک جسم میں پوشیدہ ہوتی ہے لیکن اس کا اظہار تسخیر کی قوت کے ذریعے سے ہوتا ہے یعنی زندگی اسے نہیں کہتے کہ مٹی کا ایک جسم چلتا پھرتا، کھاتا پیتا اور سانس لیتا رہے۔ زندگی کی حقیقی حیثیت معلوم کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ مٹی کے اس جسم میں تسخیر کی قوت کتنی ہے۔

تسخیر سے مراد کائنات کی تسخیر یعنی اس کائنات میں جو کچھ ہے، اس کے بھید معلوم کرنا اور ان پر قابو پانا۔

تو زندگی کے سمندر میں بلبلے کی طرح ابھرا ہے۔ یہ دنیا نقصان کا گھر ہے۔ یہاں تیرا امتحان لیا جاتا ہے جب تک تو خام ہے، اس وقت تک مٹی کا ایک ڈھیر بنا رہے گا۔ اگر پختہ ہو جائے گا تو بے پناہ تلوار بن جائے گا۔

مراد یہ ہے کہ انسان مٹی کا ایک پتلا ہے اس کی حیثیت زندگی کے سمندر میں بلبلے سے زیادہ نہیں، لیکن وہ اپنی قوتوں سے کام لے کر پختگی کی اس منزل پر پہنچ سکتا ہے کہ بے پناہ تلوار بن جائے۔ جس کی کاٹ کو کوئی روک نہ سکے اگر وہ اپنی قوتوں سے کام نہ لے گا تو خام رہ جائے گا اور اس کی حیثیت مٹی کے ایک ڈھیر سے زیادہ نہ ہوگی۔ امتحان یہی ہے۔ کہ انسان اپنی قوتوں سے کام لے کر پختہ ہوتا ہے یا کام نہ لیتے ہوئے خام رہ جاتا ہے۔

پانچواں بند جس دل میں سچائی کے لیے مرنے کی تڑپ ہو۔ اسے چاہیے کہ اپنے خاکی جسم میں وہ جان پیدا کرے جو قربان ہو جانے کو اپنا پہلا اور آخری فرض سمجھے۔ مراد یہ ہے کہ سچائی کے لیے قربانی کی منزل سہل نہیں، بڑی کٹھن ہے۔ اس کے لیے کٹ مرنے کی سچی تڑپ اسی دل میں پیدا ہو سکتی ہے، جو قربانی کے ولولوں سے معمور ہو۔ اس نے اپنے لیے یہ جو عارضی زمین اور آسمان پیدا کر رکھے ہیں اور اپنے تصورات سے ایک عجیب ماحول بنا لیا ہے۔ اسے جلا کر راکھ بنا دینا چاہیے اور اس راکھ سے اپنی دنیا پیدا کرنی چاہیے۔ مراد یہ ہے کہ صداقت کے لیے جن قربانیوں کی ضرورت ہے، وہ ان جھوٹے تصورات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں جو مسلمانوں نے اپنے دماغوں میں پیدا کر رکھے ہیں۔ مثلاً اونچے اونچے عہدے، مال و دولت، عزت و حکومت وغیرہ۔ یہ سب چیزیں بے حقیقت ہیں ان سے اپنے آپ کو بالکل پاک کر لینا چاہیے۔ جب تک ان چیزوں کی طرف سے آنکھیں بند نہ کر لی جائیں اور صداقت کی خدمت کامل بے غرضی سے انجام نہ دی جائے، ہم اپنا فرض کیوں کر ادا کر سکتے ہیں؟

دنیوی اغراض سے بالکل قطع نظر کرتے ہوئے زندگی کی پوشیدہ قوت آشکارا کرنی چاہیے۔ اسی حالت میں یہ چنگاری ہمیشہ قائم رہنے والی روشنی پیدا کر سکتی ہے۔ یہ مشرق کی سرزمین پر سورج کی طرح چمک سکتی ہے اور دنیا

چمک بدخشاں میں دوبارہ ان مول لعل پیدا کر سکتی ہے۔

آخری شعر کا مطلب تھوڑی سی تفصیل کا محتاج ہے۔ لعل اور یاقوت بننے کے متعلق فارسی اور اردو ادب میں ایک روایت چلی آتی ہے جس کی اصل معلوم نہیں۔ روایت یہ ہے کہ بعض اوقات سورج کی کرنیں پہاڑ کے کسی سوراخ میں سے اندر جاتی ہیں تو ان کی حرارت سے پتھر کا ایک حصہ پگھل کر پانی بن جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں زمین کی گردش کے باعث سوراخ کرنوں کے رُخ پر نہیں رہتا۔ اس وجہ سے پگھلا ہوا حصہ ٹھنڈا ہو کر پھر پتھر بن جاتا ہے۔ لیکن ایسا پتھر جس میں کرنوں کی روشنی محفوظ رہتی ہے۔ یہی لعل اور یاقوت ہوتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ زندگی کی قوت ایک چنگاری ہے جس میں ہمیشہ قائم رہنے والی روشنی ہے۔ یہ ایشیا کی سرزمین پر سورج کی طرح چمکنے لگے تو بدخشاں سے پھر بہا بہا قیمتی لعل و یاقوت پیدا ہونے لگیں۔

زندگی کی چھپی ہوئی قوت آشکارا کرنے والے کو چاہیے کہ رات کے نالہ و فریاد کو آسمان کی طرف اپنا ایلچی بنا کر بھیجے تاکہ رات کے تاروں میں اس کے رازدان پیدا ہو جائیں۔

مطلب یہ کہ اسے لگاتار جدوجہد اور ہر قسم کی قربانیوں پر آمادگی کے علاوہ رات کے وقت بارگاہِ باری تعالیٰ میں خلوص سے دعائیں بھی کرنی چاہئیں۔

یہ قیامت کی گھڑی ہے تو قیامت کے میدان میں کھڑا ہے۔ اے غافل! اگر تیرے پاس عمل کا کوئی سرمایہ ہے تو اسے پیش کر

مراد یہ ہے کہ قیامت کا سماں نمودار ہے۔ یہاں عمل کی قوت کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا اور سرتوڑ جدوجہد کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آسکتا۔

سلطنت

چھٹا بند حضرت خضرؑ سے یہ بھی پوچھا گیا تھا کہ سلطنت کیا چیز ہے؟ سوال موجودہ زمانے کے طریق حکمرانی کے متعلق تھا۔ حضرت خضرؑ اسی کی حقیقت واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

آ میں تجھ کو بتاتا ہوں کہ آیۂ اِنَّ الْمُلُوْک کی رمز کیا ہے۔ یعنی جب کوئی قوم دوسری قوم پر غالب آجاتی ہے تو وہ کیا طور طریقے اور کیا رنگ ڈھنگ اختیار کرتی ہے؟ خوب سمجھ لے کہ غلبہ حاصل کرنے والی قوموں کی حکمرانی محض ایک جادوگری ہے۔ وہ کس طرح؟ یوں کہ جب محکوم لوگوں کی آنکھیں کھلتی ہیں اور ان میں بیداری پیدا ہوتی ہے تو حکمران جادو کے زور سے انھیں پھر سلا دیتا ہے۔ حکمران کے جادو کی تاثیر کا یہ عالم ہوتا ہے کہ غلام کی آنکھ غلامی کے طوق کو دینی محبوبیت اور آرائش کا سامان سمجھنے لگتی ہے۔ حکمران کا جادو کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ کبھی کوئی رعایت دے دی۔ کسی کو بڑا عہدہ عطا کر دیا یا قانون ساز مجلس بنا دی۔ حق انتخاب دے دیا۔

اس شعر میں محمود سے مراد حکمران اور ایاز سے مراد محکوم اور غلام ہیں۔

آخر کبھی نہ کبھی محکوم کا خون جوش میں آجاتا ہے اور کوئی موسیٰ جیسا رہنما اٹھ کر حاکم کے سامری طلسم کو توڑ ڈالتا ہے۔ حقیقی شہنشاہی صرف خدا کی بے مثال ذات پاک کے لیے زیبا ہے۔ اصل حکمران وہی ہے، باقی سب آزر کے تراشے ہوئے بُت ہیں، تو اپنی آزاد فطرت کو غلامی میں پھنسا کر ذلیل نہ کر۔ اگر تو کسی کو آقا بنائے گا اور یہ بُت تراشے گا تو سمجھ لے کہ تو برہمن سے بھی بڑا کافر ہوگا۔

یورپ جس جمہوری نظام کو لیے پھرتا ہے۔ یہ کوئی نیا ساز نہیں، وہی پرانا ساز ہے۔ جس کے پردوں سے پہلے شہنشاہی کے ترانے نکلتے رہے اور اب بھی وہی ترانے نکل رہے ہیں۔

جمہوریت کے لباس میں شاہنشاہی اور مطلق العنانی کا جن ناچ رہا ہے، تو سمجھتا ہے کہ یہ آزادی کی نیلم پری ہے مطلب یہ کہ یورپ والوں نے محکوم ملکوں میں جو نمائندہ ادارے قائم کیے تھے، وہ حقیقت میں آزادی کی دستاویز نہ تھے۔ بلکہ انھوں نے اپنی مطلق العنانی کو ایسا لباس پہنا دیا تھا، جسے جمہوری کہا جا سکے۔ محکوموں نے اسے آزادی سمجھ کر خوشی خوشی قبول کر لیا اور وہ حقیقی آزادی کے لیے کوششیں چھوڑ بیٹھے۔

ان شعروں میں ان اصلاحات کی بہ طور خاص اشارہ ہے، جو ہمارے ملک کو ۱۹۲۱ء میں ملی تھیں اور جنھیں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات یا دوعملی کا نظام کہتے تھے۔ اہل ملک کے بڑے حصّے نے ان اصلاحات کا مقاطعہ (بائیکاٹ) کیا۔ یہ ۱۹۳۷ء میں ختم ہوئیں اور ان کی جگہ وہ نظام جاری ہوا جسے صوبائی خود مختاری کا نظام کہتے تھے۔

حاکموں نے کئی اصلاحات پیدا کر لیں مثلاً قانون ساز مجلسیں بنا دیں۔ بعض ایسی چیزیں جاری کر دیں، جنھیں اصلاحات یا رعایات یا حقوق کا نام دیا۔ جیسے نظامِ حکومت میں اصلاح، چھوٹی قوموں کے لیے خاص رعایتیں، خاص طبقوں کے لیے مخصوص حقوق، خاص عہدوں کو اہلِ ملک کے لیے عام کر دینا۔ اقبال فرماتے ہیں کہ یورپی طب کی یہ تمام دوائیں ذائقے میں بہت میٹھی ہیں۔ یہ ایسی گولیاں ہیں جن پر شکر کی تہ چڑھی ہوتی ہے، لیکن ان کا اثر یہ ہوتا ہے کہ کھانے والوں پر غفلت کی نیند طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے اصل حقوق کو بھول جائیں اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھے رہیں۔

پھر قانون ساز مجلسوں کا نقشہ دیکھو، ممبر بڑھ بڑھ کر ایسی پُر زور تقریریں کرتے ہیں کہ الامان والحفیظ لیکن حقیقت کیا ہے؟ یہ کہ سرمایہ داروں نے عوام کو فریب دینے کے لیے یہ طریقے اختیار کر لیے ہیں۔

یہ رنگ اور بُو کا ایک سراب ہے۔ ایک دھوکا اور طلسم ہے، جسے تو نے باغ سمجھ لیا۔ اے غافل! یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ تو نے قفس کو اپنا آشیاں قرار دے لیا یعنی جس پھندے نے تیرے ہاتھ پاؤں باندھ کر

رکھ دیے اسی کو تو اپنا نشیمن سمجھ بیٹھا۔

سرمایہ و محنت

ساتواں بند شاعر نے ایک سوال سرمائے اور محنت کی کشمکش کے متعلق کیا تھا۔ حضرت خضرؑ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

تو مزدور کو میرا پیغام سنا دے۔ یہ خضرؑ کا پیغام نہیں بلکہ وہ آواز ہے جو کائنات کے دل سے اُٹھی ہے۔ پیغام یہ ہے کہ اسے مزدور! تجھے سرمایہ دار کھا گیا۔ صدیاں گزر گئیں اور تیری برات شاخِ آہو پر رہی یعنی تیرا حق تجھے نہ ملا۔

"براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو"۔ فارسی کی ضرب المثل ہے۔ لفظی معنی عاشقوں کا حصّہ ہرن کے سینگ پر۔ محاورے میں مراد یہ ہے کہ عاشقوں کا حصّہ ایسی شاخ سے وابستہ ہو جائے جو پھل نہیں لاتی یعنی مراد حاصل نہ ہونا۔ ناکام رہنا۔

دولت مزدور کی محنت سے پیدا ہوتی ہے لیکن مزدور کے دولت پیدا کرنے والے ہاتھ پر کام کی اجرت اس انداز میں رکھی جاتی ہے جیسے دولت مند آدمی غریبوں کو زکات دیتے ہیں۔ مراد یہ کہ عام طور پر زکوٰۃ کو غریبوں کا حق نہیں سمجھا جاتا بلکہ دولت مند اسے اپنی خیر و بخشش کا کرشمہ سمجھتے ہیں۔ بالکل یہی حالت سرمایہ داروں کی رہی کہ مزدور کی محنت سے دولت پیدا ہوتی تھی لیکن سرمایہ دار ساری دولت خود سمیٹ لیتے اور تھوڑی سی رقم مزدور کو دے دیتے ہیں وہ بھی اس رنگ میں نہیں کہ یہ اس کا حق ہے، محض یہ سمجھتے ہوئے کہ اس پر احسان کر رہے ہیں۔

مبادا کسی کو غلط فہمی ہو۔ زکوٰۃ ان لوگوں کا حق ہے جن کا ذکر قرآن میں آچکا ہے جن لوگوں پر زکوٰۃ واجب ہے۔ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں دیتے۔ غریبوں کا حق ان کے حوالے کرتے ہیں۔ جو زکوٰۃ نہیں دیتے، وہ دوسروں کا حق ہضم کر جانے کے مجرم ہیں۔

کوہِ الموت کے جادوگر نے تجھے بھنگ کی پتّی پلا دی۔ اسے بے خبر! تو نے اسے کوزے کی مصری سمجھ لیا۔ سرمایہ دار آقاؤں نے مزدوروں کو مدہوش رکھنے کے لیے عجیب عجیب چیزیں بنائیں۔ مثلاً نسل اور قومیت کا امتیاز، ذات پات کی تقسیم، کالے گورے کی تفریق، مذہبی نظام جس کی وجہ سے یورپ میں پادری اور ہندوستان میں برہمن صدیوں تک عوام پر مسلّط رہے پھر بادشاہوں نے بڑی بڑی سلطنتیں بنا لیں۔ یورپ والے نئی تہذیب لے کر آگئے۔ یہ تمام ہتھکنڈے جمہور کو اپنے پھندے میں پھانسنے کے حیلے تھے۔ آہ اسے نادان! تو ان خیالی دیوتاؤں کے لیے لڑ لڑ کر جان قربان کرتا رہا اور انھیں کے نشے میں مدہوش ہو کر زندگی کی بازی ہار بیٹھا۔

سرمایہ دار مکر کی چالیں چل چل کر بازی لے گیا اور مزدور اپنی سادگی و سادہ لوحی کی بنا پر مات کھا گیا۔

ماضی کی سرگزشت یہی ہے لیکن اسے مزدور! اب تجھے خوابِ غفلت سے بیدار ہونا چاہیے۔ اب دنیا کی عقل نے اور ہی رنگ اختیار کر لیا ہے۔ سرمایہ داروں کے ہتھکنڈوں کا زمانہ گزر گیا۔ اب شرق و مغرب میں تیرا دور شروع ہوتا ہے۔

آٹھواں بند ہمّتِ بلند ہو تو وہ کسی کے دیے ہوئے دریا بھی قبول نہیں کرسکتی۔ اسے بے سمجھ اقرکلی کی طرح اپنے دامن میں شبنم کے چند قطروں پر کب تک قناعت کیے بیٹھا رہے گا۔

جمہور کی بیداری کے ترانے قلب و روح کے لیے عیش کا سامان ہیں۔ سکندر اور جمشید جیسے بادشاہوں کے وہ قصّے کب تک سنتے رہیں جن کے چھڑتے ہی آنکھوں پر نیند طاری ہو جاتی ہے۔ زمانے کے بطن سے نیا سورج طلوع ہو گیا۔ اسے آسمان! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تک کیا جاتے؟ انسانی فطرت کے لیے جتنی زنجیریں تیّار کی گئی تھیں، وہ سب ٹکڑے ٹکڑے کرڈالی گئیں۔ آخر آدم کی آنکھ کب تک جنّت کی جدائی میں آنسو بہاتی رہتی؟

باغ بان کی سعی و کوشش یہ تھی کہ پھول کے زخم کے لیے مرہم کا بندوبست کرے، لیکن بہار نے آکر یہ پیغام دے دیا کہ ان بے حقیقت تدبیروں سے کیا حاصل ہوگا؟ میں خود ہر زخم کا علاج کرنے کے لیے تیّار ہوں۔

ان تمام اشعار میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ پرانا دور ختم ہو چکا۔ سرمایہ داری اور ملوکیت کے لیے اب کوئی گنجائش نہیں۔ جمہور خوابِ غفلت سے بیدار ہو گئے۔ اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے انسانی فطرت کو آزادی کا جو پیغام دیا تھا، اس کی برکتیں ظاہر ہونے لگیں۔ غرض پرستوں نے اس فطرت کے لیے مختلف ناموں سے جتنی زنجیریں تیار کی تھیں، وہ ٹوٹ گئیں۔ اب کاروبارِ عالم کی باگ ڈور جمہور کے ہاتھ میں ہوگی۔ اب پھول اپنے زخم کے علاج کے لیے باغبان کے پاس نہ جائے گا، بلکہ بہار سب زخموں کا علاج کرے گی یا سورج نکل آیا۔ پرانے ستارے ڈوب گئے۔ اسے نادان مزدور! تو بھی سرمایہ داری کی شمع کے گرد چکّر لگانا چھوڑ دے اور خدا نے تیری فطرت میں جو جلوے رکھے ہیں ان سے فائدہ اٹھا۔

دنیائے اسلام

نواں بند شاعر نے حضرت خضر علیہ السلام سے آخری سوال یہ کیا تھا کہ آبرو مٹ رہی ہے۔ یورپ کی قومیں جنھیں نئی نئی دولت اور سلطنت ملی ہے ہر مقام پر کامیاب ہو رہی ہیں۔ ہاشمی خاندان کا ایک فرد دین کی عزّت بیچ رہا ہے۔ ترک اس عزّت کی حفاظت کے لیے خاک و خون میں مل رہا ہے۔ بتائیے یہ کیا اور کیوں ہو رہا ہے؟ حضرت خضر علیہ السلام فرماتے ہیں:

تو مجھے ترکوں اور عربوں کی کہانی کیا سناتا ہے؟ کیا میری نگاہوں سے مسلمانوں کی کیفیت چھپی ہوئی ہے؟ میں جانتا ہوں کہ عیسائی قومیں اسلامی میراث چھین کر لے گئیں اور حجاز کی خاکِ پاک سے کلیسا کی بنیاد کے لیے اینٹیں بننے لگیں۔

اس شعر میں اقبال یہ بتانا چاہتا ہے کہ مسلمانوں نے مشرق و مغرب میں جو عظیم الشان سلطنتیں قائم کی تھیں۔

وہ ایک ایک کر کے عیسائی حکمرانوں کے قبضے میں چلی گئیں۔ مثلاً اندلس، مراکش، الجزائر، تونیسیا، طرابلس، مصر، شام، فلسطین اور عراق وغیرہ۔ حجاز اجنبی اثرات سے محفوظ تھا شریف حسین نے اسے بھی محفوظ نہ رہنے دیا۔

قزلباشوں کی سرخ ٹوپی زمانے بھر میں ذلیل ہو گئی۔ جن کے روبرو پہلے لوگوں کی گردنیں جھکتی تھیں۔ اب وہ خود مجبوری کی حالت میں دوسرے کے سامنے جھک رہے ہیں۔ ایران یورپ کے شراب فروشوں سے وہ تیز و تند شراب لے رہا ہے جس کی حرارت صراحی کو پگھلا دے سکتی ہے۔

یہ دونوں شعر ایران کے متعلق ہیں جسے برطانیہ اور روس نے آپس میں تقسیم کر لیا تھا اور وہاں یورپی تہذیب و تمدن بہ صد ذوق و شوق اختیار کیا جا رہا تھا۔

یورپ کی پُرفریب چالوں سے ملت اسلامیہ کا وہی حال ہو گیا جس طرح قینچی سونے کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ہے۔

اس شعر میں یورپ کی پُرفریب چالوں سے مراد وہ وطنیت ہے جو یورپی قوموں کی تقلید میں مسلمانوں نے بھی اختیار کر لی تھی۔ یعنی ہر قوم نسل اور جغرافیے کی بنا پر الگ قوم ہونے اور آزادی حاصل کرنے کی دعوے دار بن گئی۔ مذہبی رشتے پسِ پشت ڈال دیے گئے۔ چالیس کروڑ مسلمان جو وحدت کی حالت میں ساری دنیا پر بھاری تھے وہ متعدد قوموں اور حکومتوں میں بٹ گئے۔ تفرقے کے علاوہ ان میں سے بعض باہم لڑتے بھی رہے یوں اسلامی قوت مجروح ہو کر رہ گئی۔

مسلمان کا لہو پانی کی طرح ارزاں ہو گیا۔ تو اس وجہ سے بے چین ہے کہ تیرا دل اصل راز سے آگاہ نہیں۔ تو نے مولانا رومؒ کا یہ قول نہیں سنا؟ کہ جس پرانے مقام کو نئے سرے سے آباد کرنا چاہتے ہیں کیا تو نہیں جانتا کہ سب سے پہلے اس کی بنیاد اکھاڑتے ہیں؟ مولانا روم کا اصل شعر یہ ہے:

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند　　　　اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

اقبال نے اس شعر کو نظم کی اختیار کردہ بحر میں لانے کے لیے پہلے اور دوسرے مصرع میں "گفت رومی" اور "می ندانی" کا اضافہ کر دیا۔

دسواں بند ملک چھن گیا اور ملت غفلت کی نیند سے جاگ اٹھی۔ اے بے خبر! خدا نے تجھے آنکھ عطا کر رکھی ہے، خوب غور سے دیکھ۔

اس شعر کا پہلا مصرع "شمع اور شاعر" کے ایک شعر سے لیا گیا ہے، جسے اقبال نے نظر ثانی کے وقت قلم زد کر دیا تھا۔ شعر یہ تھا:

ملک ہاتھوں سے گیا، ملت کی آنکھیں کھل گئیں　　　　سُرمہ چشم دشت میں گردِ رم آہو ہوا!

بھیک مانگ کر مومیائی حاصل کرنے سے ہزار درجے بہتر ہے کہ انسان اپنے جوڑوں کا شکستہ رہنا گوارا کرلے۔ اگرچہ تو بے پر چیونٹی ہے، لیکن خودداری کا تقاضا یہ ہے کہ کسی سلیمان کے روبرو بھی اپنی غرض نہ لے جائے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان جس مصیبت میں مبتلا ہو چکے ہیں، اس سے نجات پانے کی کیا صورت ہو؟ اقبال خضر کی زبان سے فرماتے ہیں کہ مشرق کی نجات ملت اسلامیہ کے باہم ربط وضبط اور اتحاد پر موقوف ہے۔ افسوس کہ ایشیا والوں نے ابھی تک یہ نکتہ نہیں سمجھا۔ یہ بھید نہیں پایا۔

اے مسلمان! تو سیاست کو ترک کر دے اور دین کے قلعے میں داخل ہو جا۔ یعنی مسلمان کا نصب العین سیاست نہیں، دین ہے۔ اسے ہر وقت دین ہی کے لیے اور دین ہی کی ہدایات کے مطابق سرگرم عمل رہنا چاہیے۔ اسے اگر پہلے سلطنت اور دولت عطا ہوئی تھی تو یہ صرف کعبے کی حفاظت کا ثمرہ تھی۔ اب بھی ملک و دولت اسی حفاظت کی برکت سے نصیب ہوں گے۔ افسوس مسلمان دین کی حفاظت سے غافل ہو گیا اور سیاست کو اس نے اپنا نصب العین بنا لیا۔ جب اس نے دین کو ترک کر دیا یا اس سے غفلت اختیار کر لی تو نہ اس کے پاس ملک رہا نہ دولت۔

مسلمانوں کے لیے کعبے کی نگہبانی اور حفاظت سب سے بڑا فرض ہے۔ اس فرض کی بجاآوری کے لیے دریائے نیل کے کنارے سے کاشغر تک سب مسلمانوں کو متحد ہو جانا چاہیے۔

مشرق میں کاشغر اور مغرب میں نیل سے مراد یہ نہیں کہ دوسرے مسلمانوں پر یہ فرض عاید نہیں ہوتا شاعر نے شرق و غرب کے دو مشہور مقامات کا ذکر کر دیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں جتنے مسلمان آباد ہیں ان سب کو اس نصب العین کے لیے جمع ہو جانا چاہیے۔

ان میں سے جو قوم، جماعت یا فرد رنگ اور نسل کے امتیازات میں الجھا رہے گا، وہ مٹ جائے گا، خواہ وہ شاہی خیموں میں رہنے والا ترک ہو یا اونچے گھرانے کا عرب۔

اگر مسلمان نے نسل کو مذہب پر ترجیح دے دی تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ راستے کے غبار کی طرح اس دنیا سے ہوا ہو جائے گا۔

اُٹھ اور اپنے بزرگوں کا سا دل و جگر کہیں سے ڈھونڈ لا۔ اس کے بغیر دنیا میں اسلامی خلافت کی بنیاد استوار نہیں ہو سکتی۔

تیری حالت کیا ہے؟ تو تو پوشیدہ اور ظاہر، خفی اور جلی، اصولی اور جزوی باتوں میں فرق نہیں کر سکتا اور نہیں سمجھتا کہ بنیادی چیزیں کون سی ہیں اور غیر بنیادی کون سی۔ تو تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کے متعلق جھگڑوں میں گرفتار ہے۔ کیا تو ہوش نہ سنبھالے گا؟

آخری شعر میں اقبال نے مسلمانوں کی فرقہ بندیوں اور باہمی کشمکشوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ فرقہ بندی صرف خلافت کے باب میں اختلافات ہی تک محدود نہیں بلکہ اس کی سینکڑوں شاخیں ہیں۔ پھر ایک ایک فرقہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کئی کئی طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ جو قومیں متحدہ جدوجہد سے اونچے درجوں پر پہنچتی ہیں، ان کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔

گیارھواں بند آخری بند میں اقبال نے حضرت خضرؑ کی زبان سے ملتِ اسلامیہ کا پیغام دیا ہے اور کامیابی کی خوشخبری سنائی ہے۔

عشق کا فرض یہ تھا کہ جو مصیبتیں آ چکی تھیں، ان پر خدا کی بارگاہ میں نالہ و فریاد کرتا۔ یہ کام انجام پا چکا۔ اب ذرا دل تھام کر بیٹھ اور اس فریاد کی تاثیر دیکھ۔

تو رفتارِ دریا کی شان و شوکت کا عروج دیکھ چکا ہے۔ اب ذرا یہ بھی دیکھ کہ بے قرار موج کس طرح اس کے پاؤں میں زنجیر بنتی ہے؟

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، اس شعر میں "شمع اور شاعر" کی مشہور پیش گوئی کی طرف اشارہ ہے:

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل ۔۔۔ موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی

اقبال کی مراد یہ تھی کہ یورپی قومیں طاقت و قوت کی ایسی منزل پر پہنچی ہوئی ہیں، جسے دیکھتے ہوئے کسی کو خیال نہیں آ سکتا کہ ان پر زوال طاری ہوگا، لیکن وہ اپنی دولت اور قوتِ ایجاد کی بنا پر ہلاکت کے جو سامان تیار کر رہی ہیں، وہی انھیں تباہ کر کے رکھ دیں گے۔ یہ پیش گوئی جنگِ یورپ سے دو سال پیشتر کی گئی تھی اور جنگِ یورپ نے اس کے پورا ہونے کا ابتدائی سامان فراہم کیا۔ لہٰذا اقبال نے خضرِ راہ میں کہا کہ تو دریا کے جوش و خروش کا عروج دیکھ چکا۔ اب دیکھ اس کے اندر سے تباہ کار قوتیں کیونکر ابھرتی ہیں۔ ان قوتوں کا مظاہرہ اقبال کی وفات سے تھوڑا عرصہ بعد دوسری جنگِ یورپ میں شروع ہوا، جس نے یورپ کی تہذیب کو ادھ موا کر دیا۔ اس کی دولت کے خزانے ختم ہو گئے۔ اب تیسری جنگ کے خطرے سے یورپ اور امریکہ پر رعشہ طاری ہے۔ اہلِ بصیرت کا خیال ہے کہ یہ جنگ ہوئی تو یورپی تہذیب صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گی۔

اسلام نے عوام کی آزادی کا جو خواب چودہ سو سال پیشتر دیکھا تھا، اے مسلمان! دیکھ آج اس خواب کی تعبیر تیری آنکھوں کے سامنے ہے۔ بیداری کا پیغام برگ و بار لا رہا ہے، جو حجاز کی پاک سرزمین میں دیا گیا تھا۔

سمندر کو دیکھ، وہ جل کر راکھ بنتا ہے۔ وہی راکھ اس کے لیے نئی زندگی کا سامان بن جاتی ہے۔ اسی طرح یہ بوڑھی دنیا بھی مر کر دوبارہ زندہ ہو رہی ہے۔

تو آنکھیں کھول اور میرے کلام کے آئینے میں آنے والے زمانے کی دھندلی سی تصویر دیکھ لے۔

میں تجھے خبردار کرتا ہوں کہ آسمان کے پاس ایک اور آزمایا ہوا فتنہ موجود ہے۔ وہ فتنہ لازماً بپا ہوگا۔ اس کا آنا مقدر ہو چکا ہے۔ روک تھام کی ہر تدبیر اس کے مقابلے میں ناکام رہے گی۔

اس فتنے سے مراد غالباً دوسری جنگِ یورپ تھی یا ممکن ہے کوئی اور جنگ ہو جو ابھی آنے والی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ وہ فتنہ رُک نہیں سکتا۔ تقدیر کے سامنے تدبیر نہیں چل سکتی۔ اپنی حیات مستعار کے آخری دور میں انھیں زیادہ تر یہی خیال رہتا تھا کہ جنگ شروع ہوئی یا نہیں۔ انھیں جنگ کا پختہ یقین تھا۔

تو مسلمان ہے اپنے سینے کو آرزو سے آباد رکھ اور ہر وقت یہ آیت پیشِ نظر رکھ کہ اللہ کا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہو سکتا۔

خلاصۂ مطالب!

اب نظم کے مطالب کا خلاصہ ترتیب وار ملاحظہ فرما لیجیے:

۱۔ اس کے پہلے دو بندوں میں شاعر نے ساحلِ دریا کے منظر کی تصویر کھینچتے ہوئے حضرت خضرؑ کو دیکھا اور ان سے صحرا نوردی، زندگی، سلطنت، سرمایہ و محنت اور دنیائے اسلام کے متعلق سوالات کیے:

۲۔ تیسرے بند میں حضرت خضرؑ نے صحرا نوردی کے مقاصد بیان کیے۔ اقبال کے نزدیک صحرائی زندگی قوم کی جسمانی، اخلاقی، دماغی اور دینی تربیت کا بہترین ذریعہ ہے۔

۳۔ چوتھے اور پانچویں بند میں حضرت خضرؑ نے زندگی کی حقیقت بیان فرمائی اور یہ بتایا کہ صداقت کے لیے مرنے کی تڑپ زندگی کا سب سے بلند مقام ہے۔

۴۔ چھٹے بند میں حضرت خضرؑ نے سلطنت کے متعلق سوال کا جواب دیا اور اس سلسلے میں دنیا دار حکمرانوں کے طریق حکمرانی پر نہایت عمدہ روشنی ڈالی۔

۵۔ ساتویں اور آٹھویں بند میں سرمایہ اور محنت پر بحث فرمائی اور اس سلسلے میں مزدوروں کو یہ بھی بتا دیا کہ پرانا دور ختم ہو چکا۔ اب جمہور کا دور آ گیا ہے۔

۶۔ نویں اور دسویں بند میں یہ بتایا کہ دنیائے اسلام کی حالت کیا ہے۔ یورپ کی چالوں نے کس طرح ملت کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ مسلمان کا نصب العین سلطنت نہیں، دین ہے۔ دین کی حفاظت کے لیے تمام مسلمانوں کو متحد ہو جانا چاہیے اور نسل و رنگ یا فرقہ بندی کا کوئی امتیاز باقی نہ رہنا چاہیے۔

۷۔ آخری بند میں یہ بتایا گیا ہے کہ یورپ کی برتری قائم نہیں رہ سکتی۔ مسلمان کو اللہ تعالیٰ کے عہد پر اعتماد رکھنا چاہیے اور فرض انجام دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے، جو اسلام نے اس کے ذمّے لگایا۔

طلوعِ اسلام

یہ نظم اپریل ۱۹۲۳ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی تھی اور یہ آخری بڑی نظم ہے، جو مرحوم نے خود انجمن کے جلسے میں پڑھ کر سنائی اور اس زمانے میں لکھی گئی جب غازی مصطفیٰ کمال پاشا بے سر و سامانی کے باوجود یورپی سازشوں کی زنجیریں توڑ کر ترکی کو آزاد کرا چکے تھے۔ ایران رضا خاں پہلوی کی رہنمائی میں زندگی کی نئی کروٹ لے رہا تھا۔ یہی رضا خاں دو سال بعد رضا شاہ پہلوی کے لقب سے شہنشاہ ایران بنے۔ افغانستان میں شاہ امان اللہ خاں استقلال کی بنیاد پختہ کر چکے تھے۔ اور افغانستان کی خارجی سیاست انگریزی اثرات سے پاک ہو چکی تھی۔ مصر میں سعد زاغلول پاشا کے زیرِ قیادت آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ مغرب اقصیٰ میں غازی محمد بن عبدالکریم ہسپانوی فوجوں کو شکستیں دے رہے تھے۔ غرض اسلامی دنیا میں زندگی کی امید افزا لہریں دوڑ رہی تھیں اور ہمارے وطن کے مسلمان بھی اپنی آزادی، خلافت کی حفاظت اور عرب کی تطہیر کے لیے نہایت ولولہ انگیز قربانیاں کر رہے تھے۔ لہٰذا یہ نظم سراسر احیائے اسلامیت پر مسرّت کے جذبات سے لبریز ہے۔ گویا اقبال نے ملّت اسلامیہ کی برتری کا جو خواب ۱۹۰۸ء میں دیکھا تھا۔ اس کی تعبیر کا آغاز ہو چکا تھا اور ان کی پیش گوئیاں عملی صورت اختیار کر کے نمودار ہونے لگی تھیں۔

تنک تابی: کم روشنی دینا۔ عروق: عرق کی جمع۔ رگیں اور نسیں۔ برگستواں: پاکھر یعنی وہ جامہ جو گھوڑے کو اس غرض سے پہناتے تھے کہ وہ میدانِ جنگ میں زخموں سے محفوظ رہے۔ جگر تابی: بہادری۔ لم یزل: جسے کبھی زوال نہ آئے۔ شاہینِ قہستان: قہستان خراسان کا ایک علاقہ ہے جہاں کے شاہین مشہور ہیں۔ قندیلِ رہبانی: اس سے مراد ہے راہب کا چراغ۔ عیسائیوں کے جو درویش دنیا کو ترک کر دیتے تھے، وہ عموماً پہاڑوں یا دوسرے بے آباد مقاموں پر جا بیٹھتے اور رات کو ان کی جھونپڑیوں میں چراغ جلتے رہتے تاکہ بھولا بھٹکا مسافر اس روشنی کو دیکھ کر جھونپڑی میں پہنچ جائے، جہاں اس کے کھانے پینے اور آرام کرنے کا سامان ہوتا۔ قندیلِ رہبانی سے مراد ہے وہ روشنی جو اندھیرے میں بھولے بھٹکے لوگوں کا سہارا بن سکے۔ المانی: جرمن۔ تورانی: ترک۔ مصاف: میدانِ جنگ۔ حریر و پرنیاں: ریشم۔ صید زبوں: بے حقیقت شکار۔

خواجۂ بدر و حنین: حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔ بدر و حنین وہ مقام ہیں جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کفار کی لڑائیاں ہوئیں۔ دونوں میں اسلام نے فیصلہ کن فتح حاصل کی۔

پہلا بند ستاروں کی چمک دمک ذرا ماند پڑ جائے تو سمجھنا چاہیے کہ روشن صبح طلوع ہونے والی ہے۔ وہ دیکھو، سورج افق سے نکل آیا اور لمبی تان کر سونے کا زمانہ گزر گیا۔

سرزمین مشرق (ایشیا) کی مُردہ رگوں میں زندگی کا خون دوڑنے لگا۔ یہ وہ بھید ہے جسے بوعلی سینا اور بونصر فارابی جیسے فلسفی نہیں سمجھ نہیں سکتے۔ یعنی مشرقی قوموں میں زندگی کی جو نئی لہر پیدا ہوئی ہے، اس کا صحیح اندازہ وہ لوگ نہیں کر سکتے، جن کی عمریں اسباب و عوامل کے منطقی کھوج میں بسر ہوئیں۔ ان کی نظریں ہمیشہ چیزوں کی حالت پر رہتی ہیں۔ وہ زندگی اور بیداری کی ان کیفیتوں کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے جو قوموں کے ذہنوں، دماغوں اور دلوں میں موج زن ہوتی ہیں۔

یورپ سے اسلامی ملکوں کی فتح و تسخیر کا جو طوفان اٹھا تھا، اس نے مسلمانوں میں اپنی حفاظت کا خاص جوش اور ولولہ پیدا کر دیا اور وہ صحیح معنی میں مسلمان بن گئے۔ سچ ہے، سمندر میں طوفان ہی آتے رہنے سے موتیوں میں آب و تاب اور چمک دمک پیدا ہوتی ہے۔

مشہور ہے کہ جب سمندر میں طوفان آتا ہے تو لہریں سیپیوں کو سطح سے اٹھا کر ساحل کے قریب پھینک دیتی ہیں۔ سیپی میں جو کیڑا ہوتا ہے وہ ساحل کی ریت سے ایک دو ذرّے اندر کھینچ لیتا ہے اور سیپی کا منہ بند ہو جاتا ہے پھر کیڑا انھیں ذرّوں کے ارد گرد اپنے لعاب سے تہیں بناتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ موتی تیار ہو جاتا ہے۔ اگر طوفانوں کے سبب سے سیپیوں کو ساحل کے قریب پہنچنا نصیب نہ ہو تو وہ اپنی گودیوں میں موتیوں کی پرورش نہ کر سکیں۔

اقبال نے اس سے یہ مضمون پیدا کیا کہ مغرب سے طوفان اٹھا اور اس نے مسلمانوں میں سچّی دینی جمیت پیدا کر دی۔ وہ معمولی پوٹ تھے، طوفانوں کی برکت سے موتی بن گئے۔

مومن کو پھر باری تعالیٰ کی بارگاہ سے ترکوں کی سی شان و شوکت، ہندیوں کی سی تیزیٔ ذہن اور عقل و دانائی، عربوں کی سی فصاحت و بلاغت عطا ہونے والی ہے۔ یعنی مسلمان دوبارہ زندگی کے اعلیٰ جوہروں سے زینت پانے والے ہیں۔

اے بُلبل! اگر تو محسوس کرتی ہے کہ تیری کلیوں میں اب تک نیند کا اثر باقی ہے، وہ کھلنے اور اپنی خوشبو سے فضا کو معطّر کرنے کے لیے ابھی تیار نہیں ہوئیں تو مناسب یہ ہے کہ اپنے نغموں کو اور بلند کر دے تاکہ انھیں سننے کا شوق تھمے کم نہ ہونے پائے۔

بُلبل سے اقبال کا اشارہ بظاہر اپنی طرف ہے، جو اپنے باغ کی کلیوں کو بیدار کرنے میں لگے رہے۔ اور کلیوں سے مراد افرادِ ملّت ہیں۔

اے بُلبل! قُدرت نے تڑپنا تیرے ذمے لگا دیا ہے۔ تو باغ کے صحن میں ہو یا گھونسلے میں یا درختوں کی شاخوں پر،

جہاں بھی ہو، تڑپتی رہ تاکہ باغ میں بیداری پیدا ہو۔ تو پارا ہے اور پارے کی فطرت ہی یہ ہے کہ ہر لحظہ تڑپتا رہے یہ فطرت اس سے چھینی نہیں جاسکتی۔

جس حقیقت نگر اور حق شناس آنکھ کو مرد غازی کی بہادری، دلیری اور جاں فشانی نظر آتی ہے اسے یہ دیکھنے کی کیا ضرورت ہے کہ گھوڑوں پر جو پاکھریں پڑی ہوتی ہیں ان کی زیب وزینت اور آرائش کی کیا کیفیت ہے؟

اس شعر میں جن استعاروں سے کام لیا گیا ہے وہ بڑے ہی پاکیزہ ہیں لیکن اندیشہ ہے کہ عام پڑھنے والوں کی نظریں استعاروں سے گزر کر حقیقت تک پہنچ سکیں، اس لیے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ زینتِ برگستواں سے مراد لڑائی کا ساز وسامان ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ بے شک مسلمانوں کے پاس لڑائی کا وہ ساز وسامان موجود نہیں جو اہل یورپ کے پاس ہے لیکن ان میں جاں باز مجاہدوں کی کمی نہیں اور اس کی تازہ مثال وہ ترک غازی پیش کر چکے تھے جنھوں نے مصطفیٰ کمال کی سالاری میں یورپ کی بڑی بڑی طاقتوں کے سازشی پھندے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ ان کے پاس کون سا ساز وسامان تھا؟ وہ اپنی ہمت سے اٹھے اور یونانیوں کو پے درپے شکستیں دے کر اناطولیہ سے نکال دیا، حالانکہ انگریز اور فرانسیسی یونانیوں کی پشت پر تھے۔ یونانیوں سے فارغ ہو کر ترک غازی قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) کی طرف بڑھے تو انگریزوں اور فرانسیسیوں سے جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ترک اس سے ہراساں نہ ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فرانس نے ترکوں سے الگ صلح کرلی۔ انگریزوں کے وزیر اعظم لائڈ جارج نے جنگ کی ٹھانی کسی نے بھی اس کا ساتھ نہ دیا۔ اس کی وزارت ٹوٹ گئی۔ نئی وزارت نے ترکوں سے صلح کی گفتگو شروع کر دی لوزان میں عہد نامہ مکمل ہو گیا اور ترکوں کو آزادی مل گئی۔ اس مثال سے روز روشن کی طرح آشکارا ہے کہ ہمت، دلیری اور جاں فشانی موجود ہو تو بڑے ساز وسامان کے بغیر بھی فتح ونصرت پاؤں چومنے لگتی ہے۔

لڑائی میں بہرحال مرد غازی کا وجود ہر چیز پر مقدم ہے۔ غازی ہوگا تو ساز وسامان سے کام لے گا۔ غازی ہی نہ ہوگا تو ساز وسامان کس کام آئے گا؟

اے بلبل! تو لالے کے ضمیر میں آرزو کا چراغ روشن کر دے اور باغ کے ذرّے ذرّے کو تلاش وجستجو کا شیدائی بنا دے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں میں مقاصد کی نئی لگن کا پیدا ہونا ضروری ہے اور انھیں اپنی کھوئی ہوئی عظمت کی بحالی کے لیے قربانیوں پر آمادہ ہو جانا چاہیے۔

دوسرا بند مسلمان اپنی حالتِ زار پر آنسو بہا رہے ہیں۔ خدا کی بارگاہ میں گڑگڑا رہے ہیں کہ ان کے گناہ معاف ہو جائیں اور انھیں پھر دینی فرائض بجا لانے کی توفیق نصیب ہو۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ ان آنسوؤں میں اس بہار

کی کیفیت نمایاں ہے جس کے برسنے سے سیپیوں کی گود میں موتی پرورش پانے لگتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے سمندر میں پھر موتی پیدا ہوں گے۔ خلیل اللہ کے سمندر سے مراد ملّتِ اسلامیہ ہے۔

ملّتِ اسلامیہ کی کتاب کا شیرازہ نئے سرے سے باندھا جا رہا ہے۔ اس ہاشمی شاخ میں پھر برگ و بار پیدا ہونے والے ہیں۔

وہ شیرازی تُرک تبریز اور کابل کا دل چھین کر لے گیا۔ صبا باغ سے نکلتی ہے تو پھولوں کی خوشبو کو سفر میں اپنا ساتھی بنا لیتی ہے۔

یہ شعر بھی استعاروں سے بھرا ہوا ہے۔ "ترکِ شیرازی" حافظ کی ایجاد کی ہوئی ترکیب ہے : ع

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ مارا

اقبال نے جو انداز اختیار کیا ہے اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ یہ مصرع کہتے وقت خواجہ حافظ کا شعر سامنے تھا۔ ترکِ شیرازی سے اشارہ بہ ظاہر غازی مصطفیٰ کمال کی طرف ہے۔ تبریز سے مراد ایران اور کابل سے مراد افغانستان ہے۔ اقبال کا مدعا یہ ہے کہ ترک غازیوں کے مجاہدانہ کارناموں نے ایران اور افغانستان میں بھی زندگی کا نیا جذبہ پیدا کر دیا۔ ترکوں میں ہمّت تھی وہ تنہا لڑ کر کامیاب ہو گئے۔ ایران و افغانستان میں اتنی ہمت نہ تھی، لیکن ترکوں کے سہارے انھیں بھی فائدہ پہنچا اور اس کی مثال یہ ہے کہ پھول کی خوشبو صبا کے بغیر اِدھر اُدھر بکھر نہیں سکتی۔ صبا چلے تو خوشبو بھی اس کے ساتھ چل نکلتی ہے۔

اگر عثمانی ترکوں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تو غم کیوں کیا جائے؟ کیا قدرت کا یہ دستور تمھیں معلوم نہیں کہ لاکھوں ستاروں کا خون ہو جاتا ہے تو صبح طلوع ہوتی ہے؟ یعنی اگر ترکوں پر مصیبتیں نازل ہوئیں اور ان کے بہت سے مجاہد شہادت پا گئے تو قومیں جذبۂ قربانی ہی کی بدولت اُبھرتی ہیں اور ترقی کرتی ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ستارے فنا ہوتے ہیں تو صبح ظہور میں آتی ہے۔

دنیا پر حکمرانی اتنی مشکل نہیں جتنا زندگی کی حقیقتوں کو پہچاننا مشکل ہے۔ جب تک کلیجا لہو نہ ہو جائے، دل کی آنکھ میں نظر پیدا نہیں ہوتی۔ یعنی سچی بصیرت حاصل کرنے کے لیے جگر کو خون کیے بغیر چارہ نہیں۔

نرگس ہزاروں سال روتی رہتی ہے کہ اس کی آنکھیں بے نور ہیں۔ باغ میں صاحبِ بصیرت بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔

اے بلبل! تو نغمے گائے جا کہ تیرے نغموں سے کبوتر کے نازک جسم میں شاہین کا جگر پیدا ہو جائے۔ مراد یہ ہے کہ اے اقبال! جو مسلمان تیرے مخاطب ہیں وہ کبوتروں کے سے ہیں اور جو منزل درپیش ہے اس کے لیے شاہین درکار ہیں تو اپنا پیغامِ زندگی انھیں سنائے جا۔ اسی طرح ان میں وہ قوت اور دلیری پیدا ہو گی جو شاہینوں میں ہوتی ہے۔

تیرے سینے میں زندگی کا جو بھید چھپا ہوا ہے، وہ ظاہر کر دے اور مسلمانوں کو زندگی کے سوز و ساز کی داستان سنا دے۔

تلمیر انبد اے مسلمان! تو نے کبھی سوچا کہ اس کائنات میں تیرا درجہ کیا ہے؟ تو اس خدائے پاک کی قدرت کا ہاتھ اور زبان ہے جسے کبھی زوال نہیں۔ اے غافل! تجھے گمان نے مغلوب کر رکھا ہے۔ اس سے نجات پا لے۔ دل میں پختہ یقین اور

سچّا ایمان پیدا کر۔

کیا تجھے معلوم نہیں کہ مسلمان کی منزلِ مقصود اس نیلے آسمان سے بھی بہت آگے ہے؟ اس کے قافلے کو اتنی بلندی پر جانا چاہیے کہ ستارے راستے کا غبار بن جائیں۔ سربلندی کے ان منازل و مقامات کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟

یہ دنیا جس میں انسان بستے ہیں فنا ہونے والی ہے اور بسنے والے یہاں تھوڑی دیر کے مہمان ہیں۔ یہ سب کچھ مٹ جائے گا لیکن تو خدا کا آخری پیغام ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔ یقین رکھ کہ دنیا کی پیدائش سے اس کے انجام تک جو کچھ ہے سب تیرا ہے۔

مبادا کسی کو غلط فہمی ہو، اقبال کا مقصد خدا نخواستہ یہ نہیں کہ مسلمان بہ طور ایک وجود کے جاودانی ہے یا ازل و ابد اس کے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں خدا کا آخری پیغام ہے۔ وہ قرآن پاک کی تعلیم دینے کا ذمّے دار ہے۔ اس لحاظ سے اس کا وجود اس وقت تک قائم رہے گا جب تک قرآن کی تعلیم باقی رہے گی۔ نہ کوئی اور تعلیم نازل ہوگی نہ کوئی دوسری قوم بنے گی۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مسلمان اگر خدا کے پیغام کا داعی نہ ہو تو اس کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟ یہی پاک تعلیم اس کے لیے دائمی زندگی کا سامان ہے۔

لالے کی دلہن کے لیے تیرے جگر کے لہو سے مہندی کا سامان مہیّا ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسانی فطرت کی آرائش تیری ہی محنت و مشقّت اور تعلیم و تربیت کی محتاج ہے۔ تیری نسبت ابراہیمی ہے، جنھوں نے کعبہ تعمیر کیا اور دنیا میں خدا کا پہلا اور آخری گھر بنایا۔ اے مسلمان! اسی نسبت کی برکت سے تجھے دنیا کی تعمیر کا کام سونپا گیا ہے اور تجھے یہ انجام دینا چاہیے۔

زندگی میں ترقی اور پھیلاؤ کی جتنی قوّتیں موجود ہیں، ان سب کو امانت کے طور پر تیری فطرت میں رکھ دیا گیا ہے اس دنیا میں جو جوہر پوشیدہ ہیں، اس کے لیے امتحان کی کسوٹی تُو ہے۔ مراد یہ ہے کہ اسلام ہی نے زندگی کے ممکنات فاش کیے۔ معلوم نہیں، کب تک ان ممکنات کے ظاہر ہونے کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اور خدا نے جس مقصد کے لیے یہ دنیا بنائی تھی اس کے پورا ہونے کی کسوٹی مسلمان کے سوا کوئی نہیں۔

حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم اس مادی دنیا سے تشریف لے گئے تو ہمیشہ قائم رہنے والے جہان کی خاطر یہاں سے جو تحفہ لے گئے وہ تیرے سوا کوئی نہ تھا۔ مراد یہ ہے کہ اس دنیا کی بہترین دولت اسلام ہے اور اگلی دنیا کے لیے بھی اس کے سوا کوئی تحفہ نہیں۔

ملّتِ اسلام کی تاریخ سے یہ بنیادی نکتہ آشکارا ہوتا ہے کہ ایشیا کی سرزمین میں جتنی قومیں آباد ہیں۔ ان کی حفاظت کرنے والا مسلمان کے سوا کوئی نہیں۔

اس بند کے اشعار میں مسلمان کو جو اونچا درجہ دیا گیا ہے، اس کی مثال شعر و ادب کی کسی کتاب میں نہیں ملتی لیکن حقیقت میں یہ تعریف مسلمان کی نہیں، خدا کے آخری پیغام اسلام کی ہے اور مسلمان کی ساری عظمت اسلام ہی کی پیروی

پر موقوف ہے۔

اے مسلمان! تو پھر صداقت، عدالت اور شجاعت کا سبق لے۔ یعنی یہ اوصاف اپنے اندر پیدا کر، اس لیے کہ دنیا کی قوموں کو سرداری و امام کی ضرورت ہے اور تو ہی ہے جو یہ فرض انجام دے سکتا ہے۔

صداقت سے مراد یہ ہے کہ مسلمان اس کائنات میں ان سچائیوں کا عملی پیکر ہو، جن کی تصدیق کلام اللہ کر رہا ہے۔ اور وہ دنیا کو انھیں سچائیوں کی دعوت دیتا رہے۔ عدالت سے مقصود یہ ہے کہ خدا کے بندوں کا انتظام اس کے حوالے ہو تو اپنے پرائے میں تمیز کیے بغیر سب سے عدل و انصاف کا برتاؤ کرے۔ شجاعت سے مراد یہ ہے کہ جب خدا کی راہ میں باطل قوتوں سے ٹکراؤ کا موقع آ جائے۔ تو مسلمان عزم و ہمت کی بے پناہ تلوار بن جائے۔ اور دشمنوں کی بڑی سے بڑی قوت بھی اسے ہراساں نہ کر سکے۔ جس قوم میں یہ اوصاف پیدا ہو جائیں، وہی دنیا کی امامت کا فرض انجام دے سکتی ہے اور اسی کے لیے یہ منصب زیبا ہے۔

چوتھا بند اے مسلمان! تو سوچ کہ فطرت کا مقصد کیا ہے اور اسلامی روح کیا پیغام دیتی ہے؟ صرف یہ کہ بھائی چارے کے رشتے ساری دنیا میں پھیل کر عام ہو جائیں۔ ہر خطے اور ہر گوشے میں محبت ہی محبت نظر آئے۔

اقبال نے اسلام کی پیروی میں دنیا بھر کو اخوت اور محبت کا پیغام دیا لیکن خاص اس مقام پر یہ پیغام صرف مسلمانوں کے لیے ہے، جیسا کہ اگلے شعر میں واضح فرما دیا۔

تو رنگ اور خون کے بتوں کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دے اور اسلام کے سوا کوئی رشتہ باقی نہ رہنے دے۔ نہ تورانی و ایرانی کا اور نہ افغانی کا۔ تیرا خدا ایک ہے، تیرا رسولؐ ایک ہے، تیرا قرآن ایک ہے۔ پھر چھوٹے چھوٹے گروہ کیوں بناتا ہے؟ اور کیا وجہ ہے کہ تمام مسلمان ہر تعلق توڑ کر صرف اسلامی تعلق اختیار نہیں کر لیتے؟

تو باغ کے پرندوں کی صحبت اختیار کر کے شاخوں کے اندر کب تک بیٹھا رہے گا۔ تیرے پروں میں وہ قوت موجود ہے جو فقط شاہین کے پروں میں ہوتی ہے اور اسی کی طرح انتہائی بلندیوں پر اڑ سکتا ہے۔

یہ دنیا وہم و گمان سے بھری ہوئی ہے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ اس میں مسلمان کے یقین و ایمان کو وہی درجہ حاصل ہے جو بیابان کی اندھیری رات میں درویش کے چراغ کو حاصل ہوتا ہے۔ یعنی یہی ایمان انسانیت کے لیے پہلا اور آخری سہارا ہے۔ یقین و ایمان ہی سے انسان میں وہ عزم و ہمت پیدا ہوتی ہے جس کی بدولت دنیا کی تاریخ کے عظیم الشان کارنامے انجام پائے۔

قیصر اور کسریٰ یعنی ایران اور روم کی مطلق العنان شہنشاہیوں کو کس نے مٹایا؟ حضرت علیؓ مرتضیٰ کے زور و قوت نے، حضرت ابوذرؓ غفاری کے فقر اور حضرت سلمانؓ فارسی کے صدق نے۔ جو قوم خدا کی راہ میں انتہائی مردانگی سے لڑنے کے واسطے تیار

نہ ہو تو خود کم سے کم چیزوں پر قناعت کر نہ لے اور سب کے سامنے بے باکانہ سچ نہ کہے وہ قوم اس دنیا سے شہنشاہی اور ظلم و جور کو نہیں مٹا سکتی اور اسلامی نظام قائم نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کو زور و قوت، فقر اور صدق کی ضرورت ہے۔

دیکھو، ملت کے بہادر احرار کس شان و شکوہ سے نکلے ہیں؟ جو لوگ صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے چلے آتے ہیں، وہ دروازے کے شگاف سے انھیں دیکھ رہے ہیں۔

احرارِ ملت سے اشارہ ترکوں کی طرف ہے۔ صدیوں کے زندانیوں سے مراد غالباً وہ قومیں ہیں جو مدت دراز سے محکوم چلی آتی ہیں۔

دیکھو اس دنیا میں زندگی کا قیام مضبوط ایمان پر موقوف ہے نہ کہ ساز و سامان کی زیادتی پر۔ اس کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ جرمنی کے ساز و سامان کا مقابلہ کوئی نہ کر سکتا تھا۔ لیکن یہ ختم ہو گیا تو جرمن قوم مقابلے کی تاب لا سکی اور ہار گئی۔ ترکوں کو دیکھو، ان کے پاس ساز و سامانِ جنگ جرمنی سے بہت کم تھا، لیکن بے سامانی کی حالت میں بھی وہ لڑتے رہے۔ جرمن اپنے عہد نامہ صلح کو بدلوا نہ سکے، لیکن ترکوں نے تلوار کے زور سے پہلا عہد نامہ پرزے پرزے کر ڈالا۔ اور نیا عہد نامہ منوایا جو ان کی آزادی کا پروانہ تھا۔ گویا ایمان کی برکت سے ترک جرمنوں کے مقابلے میں زیادہ پختہ اور پائدار نکلے۔

خوب سمجھ لو کہ جب مٹی کے اس پتلے میں، جسے انسان کہتے ہیں، یقین پیدا ہو جاتا ہے تو یہ حضرت جبرئیلؑ کے سے بال و پر پیدا کر لیتا ہے۔

پانچواں بند | غلامی میں نہ تلواریں کام دیتی ہیں نہ چالیں۔ البتہ یقین پیدا ہو جائے اور ایمانی قوت میں استواری آ جائے تو غلامی کی زنجیریں کٹ کر گر جاتی ہیں۔

مومن کے زورِ بازو کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ یہ وہ ہستی ہے جس کی ایک نگاہ سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جس مومن کے محض ایک نگاہ ڈالنے سے انقلاب پیدا ہو سکتا ہے اس کے زورِ بازو سے خدا جانے کیا کچھ ہو جاتا ہے؟

انسان کو اس دنیا میں کن کن درجوں کی آرزو ہو سکتی ہے؟ یہ کہ اسے ولایت کا مرتبہ مل جائے اور وہ خدا کا قرب حاصل کرلے اسے بادشاہی اور حکمرانی نصیب ہو۔ اسے اشیا کا وہ علم عطا ہو جائے جس سے کوئی شے باہر نہ رہے، لیکن یہ سب چیزیں کیا ہیں؟ صرف ایمان کے نکتے کی شرحیں ہیں۔ ایمان پختہ ہو تو سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ ایمان پختہ نہ ہو تو اولاً یہ حاصل نہ ہوں گی اور اتفاق سے ہاتھ آ جائیں تو زیادہ دیر تک باقی نہ رہیں گی۔

صحیح اور پختہ ایمان جیسا حضرت ابراہیمؑ کی حقیقت رس نظروں نے حاصل کیا، آسانی سے ہاتھ نہیں آتا۔ انسان کی حرص آرزوؤں کی تصویریں سینوں میں بنا لیتی ہے اور ان کی پرستش میں لگ جاتی ہے۔ خالص اللہ اور اس کے دینِ پاک کے

لیے قربانیاں کرنا سہل نہیں۔ ہمیں ایسے ہی ایمان کی ضرورت ہے جو ذاتی اغراض کے داغوں سے پاک ہو اور جس میں دین و مخلوق کی خدمت کے سوا کوئی جذبہ نہ ہو۔

انسانوں نے وہ مساوات باقی نہ رہنے دی جو اسلام اس دنیا میں لے کر آیا تھا۔ پہلے کی طرح پھر غلام و آقا، خادم و مالک اور محکوم و حاکم کے امتیازات پیدا کر لیے۔ یہی امتیازات انسانوں کے درمیان فتنے پیدا کرنے کے موجب بن گئے۔ اسے با اختیار لوگو! ان امتیازات سے دور رہو اور ڈرو جو انسانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے۔ مساوات کو توڑتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ فطرت کی سزائیں بڑی ہی سخت ہیں۔ فطرت کی سزائیں کیا ہیں؟ یہی کہ جب حاکموں، سرمایہ داروں اور با اختیار لوگوں نے انسانوں سے برا سلوک کیا تو ان میں بغاوت پیدا ہوئی یہاں تک کہ حاکم، سرمایہ دار اور با اختیار لوگ مٹ گئے۔ مثلاً فرانس کے بادشاہ اور امیر، روس کے زار، اس کے درباری وغیرہ۔

خدا نے سب انسانوں کو یکساں بنایا۔ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے، "تم سب لوگ آدمؑ کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔" کوئی وجود خاکی ہو یا ناری، سب کی اصل ایک ہے۔ اگر ذرّے کا دل چیر کر دیکھیں تو اس میں سے سورج کا خون ٹپکنے لگے۔ مراد یہ ہے کہ اگرچہ ذرّہ سورج کے مقابلے میں ہیچ ہے، لیکن جب ان کی اصل ایک ہے تو پھر فرق کیوں کیا جائے؟

آج کل کی اصطلاحات سے متاثر ہونے والے لوگ کہ سکتے ہیں کہ اقبال نے اس شعر میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کر دی جو بائیس چوبیس برس بعد سائنس کی تحقیقات سے پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی یعنی جوہری قوّت کی ایجاد۔ یہ قوّت ذرّے کی تحلیل سے پیدا ہوتی ہے لیکن اس درجہ بے پناہ ہے کہ بڑی بڑی آبادیوں کو چشم زدن میں بھسم کر کے رکھ دیتی ہے۔

زندگی کے جہاد میں مردانِ خدا کی تلواریں کیا ہیں؟ محض یہ کہ خدا پر اور اپنے مقاصد کی سچّائی پر پکّا ایمان، اس کے مطابق لگاتار کوشش اور ایسی محبّت جو زمانے بھر کو مسخّر کر لے۔ "یہی تلواریں" تھیں جن کی بدولت مسلمان ابتدائی دور میں کامیابی کی معراج پر پہنچے تھے۔ ان کے پاس ساز و سامان نہ تھا۔ بڑے بڑے خزانے بھی نہ تھے، تربیت یافتہ فوجیں بھی نہ تھیں لیکن خدا پر ایمان پختہ تھا۔ کتاب اللہ کی بیان کی ہوئی سچائیوں پر ان کا عقیدہ استوار ہو چکا تھا۔ انھیں سچائیوں کو دنیا میں پھیلانے کے لیے وہ لگاتار جد و جہد کرتے رہے۔ پھر خدا کی مخلوق سے انھیں دلی محبّت تھی۔ جہاں گئے، انسانوں کے لیے راحت و آسائش، عدل و انصاف، بہبود و خیر خواہی کے ایسے سامان فراہم کر دیے جو دنیا نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ یہی چیزیں آج کے مسلمانوں کے لیے کامیابی کے گُر ہیں۔ ان "تلواروں" کا مقابلہ نہ توپیں کر سکتی ہیں نہ ایٹم بم۔

مردِ حق کو کون سے سامان کی ضرورت ہے؟ صرف اس سامان کی کہ اس کی طبیعت بلند ہو۔ اس کے طور طریقے پاک

ہوں۔ اس کا دل خلقِ خدا کی محبت سے گرم ہو، اس کی نگاہ ہمیشہ پاکیزگی پر رہے اور اس کی جان سچائیوں کے پھیلانے کے لیے بیقرار ہو۔ جس کے پاس یہ سامان موجود ہو، اسے کسی دوسرے سامان کی ضرورت نہیں۔

چھٹا بند | تمھیں مسلمانوں کی شانِ استواری اور رتبے کی بلندی میں کوئی شبہ ہے ؟ یہ دیکھو، جرمن جن کے جھنڈوں کا نشان عقاب تھا، عقابی شان سے اپنے دشمنوں پر حملہ آور ہوئے تھے لیکن لڑائی ختم ہوئی تو یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ بال و پر نچوا بیٹھے تھے۔ دوسری طرف نگاہ ڈالو کہ سرزمینِ شام کے ستارے یعنی ترک شفق کے لہو میں ڈوب کر پھر ابھر آئے۔

جیساکہ شرح میں عرض کیا گیا، عقابی شان کے ساتھ جھپٹنے والوں سے اشارہ جرمنوں کی طرف ہے، جن کی ابتدائی فتوحات نے (پہلی جنگ یورپ) ساری دنیا پر کپکپی طاری کر دی تھی لیکن چار سال میں ان کی قوت زائل ہو گئی اور وہ ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گئے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ برطانیہ، فرانس اور امریکہ نے جو صلح نامہ ان کے سامنے پیش کیا، اسے چپ چاپ قبول کر لیا۔ شام کے ستاروں سے مراد ترک ہیں اور لفظ شام وقت اور سرزمین دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ترکوں کے پاس ویسی قوت ہرگز نہ تھی جیسی جرمنوں کے پاس تھی۔ ان بے چاروں کا خون بڑی بے دردی سے بہایا گیا۔ انھوں نے بھی ہتھیار ڈالے لیکن اس شرط پر کہ ان کی آزادی بحال رہے گی۔ جب اتحادیوں نے اس آزادی کو مجروح کرنا چاہا تو ترک تلوار سنبھال کر کھڑے ہو گئے اور آزادی کو محفوظ کر چکنے کے بعد ہی اطمینان سے بیٹھے۔

جن کی آب و زیرِ سمندر کے نیچے ہر جگہ دوڑتی پھرتی تھیں یعنی جرمن، وہ سمندر ہی میں دفن ہو گئے، یعنی اپنے بچاؤ کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے۔ اس کے برعکس ترکوں کو دیکھو کہ وہ ہر جگہ لہروں کے طمانچے کھا رہے تھے اور بظاہر ان کی حالت بہت خستہ نظر آتی تھی، لیکن انھیں مصیبتوں کے طوفانوں میں سختیاں سہتے سہتے وہ موتی بن گئے اور آج ان کی آب و تاب سے دنیا کی نگاہوں میں چکاچوند پیدا ہو رہی ہے۔ اس شعر میں بھی جرمنوں اور ترکوں ہی کا مقابلہ کیجیے اگلے دو شعروں کی بھی یہی کیفیت ہے۔

جس قوم کو سائنس کے علوم میں کمال کا درجہ حاصل تھا وہ راستے کا غبار بن کر رہ گئی، لیکن جس قوم کی پیشانیاں خدائے پاک کے روبرو سجدہ ریز ہوتی تھیں وہ اکسیر بنانے والی ثابت ہوئی۔

کیمیا سے فارسی ادب میں وہ علم مراد ہے جس سے اکسیر بنائی جاتی ہے اور اکسیر مٹّی یا معمولی دھاتوں کو سونا بنا دیتی ہے۔ یہاں کیمیا سے مراد کیمسٹری، طبیعیات اور سائنس کے دوسرے علوم ہیں۔

ہمارا آہستہ آہستہ چلنے والا قاصد ہمارے لیے زندگی کا پیغام لے آیا۔ جو تو پیں بجلیوں کے ذریعے سے خبریں حاصل کرتی تھیں، معلوم ہوا کہ وہ اصل میں بالکل بے خبر تھیں یعنی وہ گر گئیں اور اٹھ نہ سکیں۔ ہمیں گرایا نہ جا سکا بلکہ ہم

میں زندگی کی نئی روح پیدا ہو گئی۔

افسوس کہ کعبے کے محافظ و پاسبان شریف حسین کی کوتاہ نظری کے باعث کعبہ رسوا ہو گیا۔ یعنی اس نے ترکوں کے خلاف اجنبی طاقتوں سے سانہ باز کرلی اور اسلامی مقاصد کو نقصان پہنچایا۔ وہ اپنی بادشاہی کی حرص میں سب کچھ کرنے کے لیے آمادہ ہوا تھا۔ اسے جو بادشاہی ملی، وہ دوسروں کی سرپرستی کی محتاج تھی، لیکن ترک جوانوں کو دیکھو انھوں نے حقیقت حال کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے ہمّت و جواں مردی سے کام لیا اور اپنی آزادی بہ زورِ شمشیر سب سے منوالی۔ یہ ان کی صاحب نظری کا ایک روشن ثبوت ہے۔

جو نوری آسمان پر اڑتے ہیں، وہ زمین سے کہ رہے تھے کہ یہ خاکی بندے یعنی ترک ہم سے زیادہ زندہ، زیادہ پائدار اور زیادہ آب و تاب والے نکلے۔

ایمان والے لوگ اس دنیا میں سورج کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ پرانی دنیا میں ڈوبے تو نئی دنیا میں جا نکلے، نئی دنیا میں ڈوبے تو پرانی دنیا میں آنکلے۔ مراد یہ ہے کہ ان کی کسی شکست کو شکست نہ سمجھنا چاہیے۔ وہ ایک میدان میں شکست کھاتے ہیں تو قوّتِ ایمان کے بل پر دوسرے میدان میں فتح حاصل کر کے پہلی شکست کی تلافی کر لیتے ہیں۔ ان کے لیے سورج کی مثال نہایت پاکیزہ مثال ہے۔

قوم کیونکر بن سکتی ہے؟ صرف اس طرح کہ اس کے افراد میں پختہ یقین اور ایمان پیدا ہو جائے۔ وہ خود اعتمادی کی دولت حاصل کرلے، یقین، ایمان اور خود اعتمادی ہی وہ قوّت ہے جس سے ملت کی تقدیر صورت پکڑتی اور سنورتی ہے۔

ساتواں بند اے مسلمان! تو اس کائنات کا بھید ہے۔ اپنی آنکھوں پر روشن ہو جا۔ یعنی اپنی حقیقت کو پالے۔ تو خودی کا راز دار بن جا اور خدا کا ترجمان ہو جا، یعنی اپنی خودی پختہ کر خدا کی مشیت کے مطابق اس دنیا کے نظام کو چلا اور اس کی تعلیم ہر قوم تک پہنچا دے۔

حرص و ہوس نے بنی نوع انسان کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ وہ گروہوں میں بٹ گئے۔ کہیں نسلی گروہ ہیں، کہیں جغرافیائی، کہیں ذات پات کی تفریق ہے، کہیں رنگ اور مذہب کی۔ اے مسلمان! تو ان سب کو اخوت اور برادری کا پیغام پہنچا اور محبّت کی زبان بن کر انھیں آپس میں جوڑ دے۔

خود مسلمانوں کی حالت دیکھ۔ ایک گروہ ہندیوں کا ہے، دوسرا خراسانیوں کا۔ کوئی اپنے آپ کو افغان کہتا ہے کوئی تورانی، یہ اڈّیں ہیں جو انھوں نے خود کھڑی کرلی ہیں۔ تو سمندر ہے، اچھل اور ان اوٹوں کو توڑتا ہوا ایسی وسعت اختیار کرلے کہ کسی کو تیرے کناروں کا پتا نہ لگ سکے۔ یعنی ان چھوٹی چھوٹی حد بندیوں کو توڑ کر سب کو اسلام کے رشتے میں جوڑ دے اور ایسی ملت بنا دے جو ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہو۔

تو کیسے کا پرندہ ہے، لیکن تیرے بال و پر رنگ و نسل کے غبار سے اَٹ گئے ہیں۔ اے پرندے! تو اڑنے سے پہلے ان پروں کو جھاڑ لے، یعنی رنگ اور نسب کا امتیاز مٹا کر رکھ دے۔

اے غافل! زندگی کا بھید یہ ہے کہ اپنے آپ کو خودی میں گم کر دے۔ اسی طرح تو صبح اور شام کے چکّر سے نکل کر جاودانی ہو جائے گا، یعنی ہمیشہ رہے گا۔

دنیا میں ہر قسم کی صورتیں پیش آ سکتی ہیں اور ہر صورت کے لیے مسلمان کو تیار رہنا چاہیے۔ اگر زندگی کی خاطر میدانِ جنگ کا معاملہ پیش آ جائے تو اپنے اندر فولاد کی سی خصلت پیدا کر لینی چاہیے، لیکن جب محبت کی آرام گاہ میں پہنچے تو حریر و ریشم کی صورت اختیار کر لینی مناسب ہے۔ یہ دراصل اسلامی اوصاف کی وہ تصویر ہے جو قرآن کریم نے پیش کی ہے۔ مثلاً اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ۔ نیز اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ۔

پہاڑ اور بیابان راستے میں آ جائیں تو تیز و تند سیلاب کی طرح گزر جانا چاہیے۔ اگر کہیں باغ سامنے آ جائے تو وہ ندی بن جانا چاہیے جس کی رفتار سے نغمے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ دراصل پہلے شعر کے مضمون کو نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اے مسلمان! تیرے علم اور محبت کی کوئی حد نہیں۔ یہ دو نعمتیں جو تجھے عطا ہوئی ہیں کسی دوسرے کو عطا نہیں ہوئیں یقین رکھ کہ فطرت کے ساز میں تجھ سے بہتر کوئی نغمہ نہیں۔ علم سے مراد وہ علم ہے جو انبیا کے ذریعے سے انسانوں کو ملا اور اس میں حقائقِ اشیا کا علم بھی شامل ہے۔ محبت سے مراد ہے خدائے پاک سے محبت جس کی بدولت انسانوں میں خلقِ خدا کے لیے شفقت پیدا ہوتی ہے۔

آٹھواں بند اے مسلمان! دنیا کی حالت دیکھ۔ آدمی بے چارہ ابھی تک پادشاہی کا شکار بنا ہوا ہے اور اسے ایک لمحے چین نہیں۔ یہ کتنا دردناک منظر ہے کہ انسان اپنے ہی ہم جنسوں کو شکار کرتا پھرے، یعنی سرمایہ داروں اور حکمرانوں نے اپنے اغراض کے لیے انسانوں کو نشانۂ ستم بنا رکھا ہے۔

ملوکیت کے متعلق اقبال کی یہ رائے کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ وہ فرماتے ہیں: یہ امن کے سوا کیا ہے کہ انسان انسان کا شکار کھیلتا ہے۔ یقیناً اسلام کی روح کبھی ملوکیت کی روادار نہیں ہو سکتی اور نہ کسی ایسے نظام کی جو اسلامیت کے خلاف ہو۔

موجودہ زمانے کی تہذیب جو یورپ نے پیدا کی، بلاشبہ بڑی چمکیلی ہے اور اس کی تیز روشنی سے آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو جاتی ہے لیکن یاد رکھو کہ اس کے سب نگ جھوٹے ہیں، جنھیں کاریگری سے جوڑ کر ایک خوبصورت چیز بنائی گئی ہے۔

جس دانائی اور حکمت پر یورپ کے عقل مندوں کو ناز تھا، اس کی حقیقت کیا ہے؟ حرص اور لالچ کے خون سے لتھڑی ہوئی ہاتھ میں جنگ کی ایک تلوار ہے۔ مراد یہ ہے کہ یورپ نے سائنس اور علوم میں جو کمال حاصل کیا، اس سے کیا کام لیا؟

یہ کہ ایک دوسرے کو برباد کرنے کے لیے نہایت خوفناک جنگی ہتھیار بنا لیے اور یورپی جنگوں میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان ہتھیاروں سے انسانوں کا کتنا خون بہا ؟

جس تمدن کی بنیاد سرمایہ داری پر رکھی گئی ہو گا سے دور اندیشی اور عقل مندی کے جادو سے استوار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ لازماً گرے گا۔ آج نہیں تو کل۔ کل نہیں تو پرسوں۔ کیوں ؟ اس لیے کہ سرمایہ داری خود غرضی اور حرص و ہوس کی دلیل ہے۔ خود غرضی اور حرص و ہوس سے انسانوں کے حقوق پامال ہوتے ہیں۔ وہ موقع پاکر اٹھتے ہیں اور تمدن کی بنیادیں ڈھا دیتے ہیں ؟

انسانی زندگی عمل ہی کی بدولت بہشت بھی بنتی ہے اور دوزخ بھی۔ حقیقت میں انسان نہ نوری ہے نہ ناری۔ مراد یہ ہے کہ جو قومیں عمل کے اعتبار سے اچھی ہوتی ہیں خدا کے بتائے ہوئے راستے پر چلتی ہیں، انسانوں کے سلسلے میں اپنے فرائض ٹھیک ٹھیک انجام دیتی ہیں، انھیں دنیا ہی میں بہشت کی راحت مل جاتی ہے لیکن جن کے اعمال اچھے نہیں ہوتے وہ یہیں دوزخ کی سزا پاتی ہیں یعنی کبھی آپس میں لڑ کر ایک دوسرے کا خون بہاتی ہیں۔ کبھی مسکینوں اور کمزوروں کو پامال کرتی ہیں۔ پھر مسکین اور کمزور بدلہ لینے کے جنون میں اٹھ کر انھیں تہس نہس کر ڈالتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ ہمارے سامنے یہی سبق پیش کرتی ہے۔

تو بلبل کو نغمہ سرائی سکھا اور کلی کی گرہ کھول دے۔ اے مسلمان ! تو دنیا کے باغ کے لیے بہار کا موسم ہے۔

ایشیا کے دل سے پھر محبّت کی چنگاری اٹھی ہے۔ دیکھو، زمین کے طول و عرض میں ان ترک جوانوں کے گھوڑے دوڑ رہے ہیں، جنھوں نے اطلس کی قبائیں پہن رکھی ہیں۔

آ کر جانِ ناتواں کے لیے خریدار پیدا ہو گیا ہے۔ اور مدت کے بعد قافلہ ہمارے پاس سے گزرا ہے۔ مراد یہ ہے کہ عرصے کے بعد ہماری آرزوئیں بر آنے کا موقع پیدا ہوا ہے۔

اس شعر کا دوسرا مصرع خواجہ نظیری نیشاپوری کا ہے۔ پورا شعر یوں ہے ؎

بہ ہر جلسے کہ می گیرند اخلاص و وفا خوب است   پس از عمرے گزار افتاد بر ما کاروانے را

اقبال نے "عمرے" کی جگہ "مدت" بنا دیا۔ ممکن ہے ان کے ذہن میں یہ شعر اسی طرح محفوظ ہو۔ اس سے مطلب میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

نواں بند اے ساقی ! آ، شراب کی محفل آراستہ کر۔ شاخوں سے پرندوں کے نغمے اٹھنے لگے۔ بہار آگئی، اس لیے کہ محبوب آگیا اور اس کی وجہ سے دل کو چین نصیب ہوا۔

بہار کے بادل نے اپنا خیمہ وادی اور صحرا میں نصب کر دیا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے آبشاروں کی صدائیں بلند ہوئیں۔ ساقی ! میں تیرے قربان جاؤں، تو بھی انعام و بخشش کا پرانا دستور از سر نو تازہ کر، اس لیے کہ نغمے گانے والوں کے گروہ قطار و قطار چلے آ رہے ہیں۔

تو زاہدوں سے الگ ہو جا اور بے خوفی سے پینا شروع کر دے۔ مدت کے بعد پرانی شاخ سے بلبل کا ترانہ سننے میں آیا ہے۔

بدر و حنین کے آقا، حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر پاک حضورؐ کے مشتاقوں کو سُنا۔ حضورؐ نے پوشیدہ جو تصرّف فرمائے وہ میری آنکھوں پر روزِ روشن کی طرح آشکارا ہیں۔ یعنی مسلمانوں کو اس دور میں جو کامیابیاں حاصل ہوئیں اور زندگی کی جو نئی مہلت انھیں ملی، وہ حضورؐ ہی کے روحانی تصرّف کا کرشمہ ہے۔

حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی شاخ ہمارے خون کی آبیاری سے پھر تر و تازہ ہو رہی ہے۔ محبت کے باغ میں ہماری جنس بالکل کھری نکلی۔

میں شہید کی تربت پر لالے کے پھول چڑھا رہا ہوں۔ اس کا خون ہماری ملّت کے درخت کے لیے بہت راس آیا۔

آ۔ تاکہ ایک دوسرے پر پھول برسائیں اور شراب پیالے میں ڈالیں۔ آسمان کی چھت میں شگاف کر دیں۔ اور نئے دور کی بنیاد رکھ دیں۔

آخری شعر خواجہ حافظ شیرازی کا ہے۔ اس پورے بند میں ملّتِ اسلامیہ کے احیاء پر جوشِ مسرّت کا اظہار کیا گیا ہے اور ضمناً مسلمانوں کو ان کے اصل مقاصد و فرائض کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

خلاصۂ مطالب

پہلی بڑی نظموں کی طرح "طلوعِ اسلام" کے مطالب کو بھی ترتیب وار خلاصۃً پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ پہلے بند میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ ملّت کے مصائب کی رات ختم ہو گئی اور صبح نکل آئی۔ مشرق کی سرزمین جاگ اٹھی۔ یورپ کی یورشوں نے مسلمانوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی۔ بے سامانی کے باوجود وہ کامیاب ہو رہے ہیں۔

۲۔ دوسرے بند کا آغاز بھی اسی مضمون سے ہوا ہے۔ اس میں ترکوں، ایرانیوں اور افغانوں کی بیداری کی طرف اشارے کیے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ ترکوں پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں ان کا ماتم نہ کرنا چاہیے۔ مصیبتیں اٹھانے ہی کے بعد راحت و کشائش کا دور آتا ہے۔

۳۔ تیسرے بند میں مسلمان کو یہ بتایا گیا ہے کہ اس کا درجہ کتنا بلند ہے اور اس کے فرائض کس قدر عظیم الشان ہیں؟

ملتِ اسلامیہ ہی اقوامِ ایشیا کی محافظ ہے۔ مسلمانوں کو پھر صداقت، عدالت اور شجاعت کا پیکر بن جانا چاہیے اس لیے کہ دنیا کی امامت قدرت اسی کے حوالے کر رہی ہے۔

۴۔ چوتھے بند میں اسلامی اوصاف و خصائص بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً اخوت اور محبت۔ رنگ اور نسل سے بے پروا ہو کر فرزندانِ توحید کا اتحاد، بلند ہمتی، یقینِ کامل، زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانؓ، آخر میں یہ اشارہ کیا ہے کہ ترک مسلمان ہونے کی بدولت جرمنوں سے زیادہ پائدار نکلے۔

۵۔ پانچویں بند میں یہ بتایا گیا ہے کہ غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے ساز و سامان اور تدبیر کی اتنی ضرورت نہیں جتنی یقینِ کامل کی ضرورت ہے۔ دنیا کی تمام بلند حیثیتیں صرف ایمان کی تفسیریں ہیں۔ آقا و غلام کے امتیازات مٹ جانے چاہییں۔ مسلمان کا فرض ہے کہ پختہ ایمان، لگاتار عمل اور عالمگیر محبت کو اپنا نصب العین بنا لے۔

۶۔ چھٹے بند میں جرمنوں اور ترکوں کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام کی برکت سے ترک بے سامانی کے باوجود جرمنوں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب رہے ہیں اور یقین و ایمان ہی ملت کی تعمیر کا سامان ہے۔

۷۔ ساتویں اور آٹھویں بند میں مسلمانوں کو ضروری اسلامی اوصاف بتائے گئے ہیں۔ ضمناً یہ حقیقت بھی واضح کر دی ہے کہ یورپی تہذیب باقی نہیں رہ سکتی، اس لیے کہ اس کی بنیاد سرمایہ داری پر رکھی گئی ہے۔ اسلام گلستانِ عالم کے لیے بہار کا حکم رکھتا ہے۔ ایشیا میں ترکوں نے اسلام کی برکتوں سے فائدہ اٹھا کر حیرت انگیز کامیابی حاصل کر لی۔

۸۔ آخری بند میں ملت اسلامیہ کے احیاء پر مسرت و شادمانی کا اظہار کیا گیا ہے۔

غزلیات

١

اے صبح کی ہوا! رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر میری طرف سے یہ گزارش کرنا کہ آپؐ کی امت کے ہاتھ سے دین اور دنیا دونوں چیزیں نکل گئیں۔ مطلب یہ کہ مسلمانوں نے نبی کریمؐ کی اطاعت ترک کر دی جس کی پاداش میں ان سے حکومت بھی چھین لی گئی اور وہ اسلام کی نعمت سے بھی محروم ہو گئے۔ نہ وہ دین کے رہے، نہ دنیا کے۔ گویا — ع

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

ساحل نے بے قرار موج کو یہ پیغام دیا کہ سمندر کا ملاپ تو ابھی دور ہے، تو دریا ہی میں گھبرا گئی۔ مراد یہ کہ خدا سے ملنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ منزل بڑی کٹھن ہے۔ قدم قدم پر بلاؤں اور مصیبتوں کا سامنا ہے۔

اے مجنوں! محبت کی عزت و آبرو محمل کے پردے ہی سے قائم ہے۔ اگر محمل ہاتھ سے نکل گیا تو عزت، غیرت اور لیلا سبھی کچھ جاتا رہے گا۔ یہ شعر نظر بہ ظاہر پردے کی حمایت میں لکھا گیا ہے یعنی اگر پردہ اٹھا تو عزت، غیرت سب کچھ برباد ہو جائے گا

جب قطرے نے دوڑ دھوپ چھوڑ دی تو اسے موتی بن جانے کا احترام اور فخر حاصل ہو گیا۔ اس نعمت کے ملتے ہی اس کی پریشانی طبع اور سمندر کی کھینچ تان سے شدید بے تابی دونوں جاتی رہیں۔

یہ آواز نکلی تو اقبال کی زبان سے ہے لیکن خدا جانے اصل میں کس کی صدا ہے؟ اس سے دل کا سکون و اطمینان بھی حاصل ہو گیا اور اہلِ محفل کے دل تڑپ بھی اٹھے۔ مراد یہ ہے کہ ان غزلوں اور نغموں میں جذبات تو میرے ہی ہیں اور میں نے ہی انھیں تحریر کیا ہے لیکن میرے خیالات چونکہ پیغامِ حق کی ترجمانی کرتے ہیں لہٰذا میرے اشعار روحانی تسلی بخشنے کے علاوہ قلب کو گرما بھی دیتے ہیں۔

٢

فریبِ گوش: کان کو دھوکا دینے والا یعنی جو کچھ کان کو سنائی دے، اس کی حقیقت اس سے مختلف ہو۔

قمری اور بلبل کے نغمے کان کو دھوکا دے رہے ہیں۔ جس باغ میں گوناگوں ہنگامے برپا ہیں اور شور و غل سے کان پڑی

آواز سُنائی نہیں دیتی۔ اس کے باطن کو دیکھو اور حقیقت حال پر نظر کرو تو معلوم ہوگا وہ دراصل چُپ ہے یعنی دنیا کی یہ ہنگامہ آرائیاں عارضی اور چند روزہ ہیں۔ ان کی حقیقت فنا کے سوا کچھ نہیں۔

اسے یورپ کی شراب! تیرے جام نوش کرنے کا اثر یہ ہے کہ ساقی تو ہنس رہا ہے اور محفل کی محفل بے ہوش پڑی ہے۔ مطلب یہ کہ فرنگی تہذیب اختیار کرنے سے ہم ایشیا والے تباہ و برباد ہو گئے۔ اور یورپ والے ہمیں فریب دے کر ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں۔

اسے خدا! اس دنیا میں جو غم و الم کا گھر ہے، تیرا پتا نشان کہیں نہیں ملتا تو کہیں نظر نہیں آتا۔ کیا اس کائنات کو پیدا کرنا بھی کوئی جرم تھا کہ تو اسے بناتے ہی کہیں چھپ گیا ہے۔ اس شعر میں اندازِ بیان کی جدت اور دلکشی حدِ تعریف سے باہر ہے۔

افسوس، دنیا جس چیز کو دل سمجھتی ہے وہ دل نہیں بلکہ آدمی کے ہنگاموں کا سرچشمہ ہے۔ یعنی کائنات میں ہنگامے پیدا کرنے والا یہ خاموش دل ہی ہے۔

اسے مخاطب! زندگی کے راستے پر چل، لیکن بچ بچ کر، بڑی احتیاط سے، پھونک پھونک کر قدم رکھ۔ یوں سمجھ لے کہ تو بوتلوں بھرا شراب خانہ کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔ ذرا بھی پاؤں پھسلا تو سب بوتلیں چکنا چور ہو جائیں گی۔ یعنی دنیا میں زندگی بسر کرنا بے حد مشکل ہے۔ قدم قدم پر بلاؤں اور امتحانوں کا سامنا ہے۔ ذرا بھی لغزش ہو جائے، ذرا بھی قدم ڈگمگا جائیں تو ساری زندگی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ یہ شعر بھی حسنِ اسلوب بیان کی ایک نادر مثال ہے۔

افسوس، اسے اقبال! اب وہ بلبل بھی چُپ ہو گیا، جس کی بدولت دہلی اور لاہور باہم بغل گیر ہو گئے تھے۔

اس شعر میں غالباً ارشد گورگانی دہلوی کے انتقال کی طرف اشارہ ہے۔ مرزا صاحب دہلی کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور عرصے تک یہ سلسلۂ ملازمت لاہور و فیروز پور میں مقیم رہے۔ وہ خاصی مدت تک انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں شریک ہو کر اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرماتے رہے تھے۔ شیدائی ان کے دم سے دہلی و لاہور میں شاعری کا مذاق پیدا ہو گیا تھا۔

۳

مصلحت اندیش: اچھا بُرا سوچنے والی، نیک و بد کی تمیز کرنے والی۔ نفع نقصان کی فکر کرنے والی۔
دہر آشوبی: زمانے بھر میں قیامت کا ہنگامہ اور انقلاب برپا کرنا۔ **زُنّاری:** زُنّار پہننے والا پجاری

کاوشِ انجام: انجام کی پریشانی۔ اندیشہ اور تکلیف۔ **سعیِ پیہم:** لگاتار کوشش۔ **کم و کیفِ حیات:** زندگی کی مقدار اور کیفیت یعنی جتنا عرصہ اور جس حال میں زندگی بسر کی۔ **تنک بخشی:** کنجوس کی طرح بہت تھوڑی چیز دینا۔ **بادہ گردانِ عجم:** غیر عربی ملکوں کی شراب پینے والے۔

اے دیوانی بلبل! تیری فریاد اور فغاں ابھی پختہ نہیں، لہٰذا ابھی اسے کچھ عرصہ اور اپنے سینے ہی میں رہنے دے۔

عقل تو اس وقت پختہ ہوتی ہے، جب وہ اچھے بُرے میں تمیز کرنے کے قابل ہو جائے، لیکن اگر عشق میں یہی بات نظر آئے تو وہ پختہ نہیں بلکہ خام ہوتا ہے۔ یعنی جب عقل درجۂ کمال پر پہنچ جاتی ہے تو وہ انسان کو جان جوکھوں کے کاموں میں ہاتھ ڈالنے سے باز رکھتی ہے۔ برعکس اس کے عشق کامل ہو جانے پر اسے خطرات میں کود کر جان قربان کرنے کا درس دیتا ہے۔ اس شعر میں عقل اور عشق کا فرق بیان کیا گیا ہے۔

عشق نڈر ہو کر نمرود کی جلائی ہوئی آگ میں کود پڑا۔ لیکن عقل ابھی چھت پر کھڑی تماشا دیکھنے میں مگن ہے۔ اس شعر میں حضرت ابراہیمؑ اور نمرود کے واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ممدوح عشقِ الٰہی میں کامل ہونے کے باعث نمرود کے جلائے ہوئے شعلہ افروز الاؤ میں بے باکانہ کود پڑے۔ یہ نادر اور بے مثال کارنامہ کسی فلاسفر سے انجام نہیں پاسکتا۔ وہ دور کھڑا تماشا دیکھنے ہی میں محو رہتا ہے۔ عاشق مصیبتوں سے نہیں ڈرتا۔ عاقل ان سے الگ تھلگ رہ کر بچتا رہتا ہے۔

عشق محبوب کے بھیجے ہوئے قاصد کی ہدایت پر تیزی سے عمل کرتا ہے، لیکن عقل ابھی تک پیغام کا مطلب ہی نہیں سمجھی مراد یہ کہ عاشق تو محبوب کا اشارہ پاتے ہی اس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے نہ لیکن عاقل اپنا نفع نقصان سوچتا رہتا ہے۔ قاصد سے بظاہر اشارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ سچا عشق حضورؐ کے ارشادات سنتے ہی ان پر تیزی سے عمل شروع کر دیتا ہے۔ عقل اس پیغام کا مطلب سمجھنے میں لگی رہتی ہے اور اس کے لیے عمل کی منزل پیش ہی نہیں آتی۔

عشق کا طریقہ یہ ہے کہ آزاد و بے نیاز ہو کر دنیا میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ تو ابھی زمانے کے بت خانے میں زُنّار پہنے بیٹھا ہے۔ اور پجاری بنا ہوا ہے۔ مطلب یہ کہ تجھے عاشق بن کر زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتے ہوئے مشرق و مغرب میں انقلاب کی قیامت برپا کر دینی چاہیے۔ یہ غلاموں جیسی زندگی تیری شان کے شایاں نہیں۔

جب میں شراب پینے سے پرہیز کا عذر پیش کرتا ہوں تو ساقی ناراض ہو کر کہتا ہے کہ ابھی تیرے دل میں مے نوشی کے انجام کی تکلیف کا خدشہ باقی ہے یعنی جب میں عشق کی کٹھن منزل کے سفر میں تھک جانے کا بہانہ کرتا ہوں تو میرا رہنما یعنی مرشد خفا ہو کر مجھے جلد جلد قدم اٹھانے اور بے خطر راستہ طے کرنے پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ سفر کے خاتمے کی جان لیوا

کوفت کا ذرا خیال نہ کر۔

کامیاب زندگی کی کسوٹی لگاتار کوشش ہے لیکن افسوس ہے کہ تو اسے دن اور رات کی گنتی کی ترازو سے تول رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ زندگی کی کامیابی کا اندازہ اس طریق سے نہ کر کہ تو کتنے سال تک جیا، بلکہ یوں کر کہ تو کس طرح جیا اور کتنا عمل کیا؟ یعنی پاؤں توڑ کر بیٹھا اور دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرتا رہا یا سرفروشوں کی طرح انتہائی جدوجہد سے آزاد زندگی گزارتا رہا اور خلقِ خدا کی خدمت میں کوئی دقیقہ بھی اٹھا نہ رکھا۔ زندگی کی اچھائی برائی کا معیار نیک اعمال ہیں نہ کہ عمر کی درازی۔

اے بہار کے بادل! تو کب تک شبنم کے چند قطرے بخشتا رہے گا؟ اس طرح تو پیاس نہیں بجھ سکتی۔ میرے پہاڑوں کے لالوں کے جام ابھی خالی ہیں۔ مطلب یہ کہ اے خدا! میری قوم کے لوگ تیری نظرِ لطف و کرم کے محتاج ہیں۔ ابھی ان میں وہ جوشِ عمل اور وہ حمیت پیدا نہیں ہوئی، جن کے بغیر زندگی میں کام نہیں چل سکتا۔

وہ تو غیر عربی شراب پیتے ہیں اور میری شراب عربی ہے۔ ابھی سے خوار میرے ہاتھ سے جام لیتے ہوئے جھجکتے ہیں یعنی میری قوم کے نوجوان غیر اسلامی علوم و فنون حاصل کر رہے ہیں اور میں کتاب و سنت کا درس دیتا ہوں، اس لیے وہ قطرتاً میرے پیغام سے بدک سکتے ہیں۔

ہوا باغ سے اقبال کی خبر لائی ہے۔ وہ ابھی اس پرندے کی طرح جو نیا نیا پھنسا ہو، جال کے نیچے تڑپ رہا ہے۔

۴

دریوزہ گری: بھیک مانگنا۔ بادیہ پیمائی: جنگل جنگل پھرنا۔

تو اپنے چہرے سے پردہ اٹھا کر محفل کی رونق بڑھا اور سورج، چاند، ستاروں کو جلوہ دکھا یعنی اسے محبوبِ حقیقی! لوگ تجھے پردے میں دیکھ کر تیرے وجود ہی سے انکار کر رہے ہیں۔ ذرا انہیں رُخِ روشن کی ایک جھلک دکھا دے تاکہ دنیا میں ہر مذہب و ملت کے لوگ تجھے حاضر و ناظر تسلیم کر کے تیری بندگی میں مصروف ہو جائیں اور روئے زمین سے کفر و شرک کی لعنت دور ہو جائے۔

اگر تو کلی ہے تو کب تک یوں چھپ چھپ کر آنکھوں سے اشارے کرتا رہے گا؟ بے پردہ ہو کر میرے دل سے دوستی کا اظہار کر۔ مطلب یہ کہ میں تیرے جلوے کی امید اور انتظار میں تھک کر سخت پریشان ہو گیا ہوں۔ اب مجھ میں یہ زحمت برداشت کرنے کی تاب نہیں رہی۔ خلوت سے نکل کر جلوت میں آ اور مجھے اپنا جمالِ جہاں آرا دکھا کر دیوانہ بنا دے۔

گرم سانس اپنے اندر ایسی حیرت انگیز تاثیر رکھتا ہے کہ مردے کو زندہ کر دیتا ہے۔ اگر وہ گرم، حرارت سے بھرا ہوا اور

پُرجوش سانس تیرے سینے میں ہے تو تو بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح معجزہ دکھا کر مُردوں کو زندہ کر دے۔ مراد یہ کہ دنیا مادہ پرست اور مُردہ دل ہو گئی ہے تُو لوگوں کے دلوں میں عشقِ الٰہی کی آگ بھڑکا کر ان کی موت کو زندگی سے بدل دے۔

تو کوہِ طُور پر جا کر حضرت موسیٰؑ کی طرح کب تک دیدارِ الٰہی کی بھیک مانگتا رہے گا۔ اپنی ہی ذات سے سینا پہاڑ کا وہ شعلہ پیدا کر، یعنی اگر قوم کو کوئی بڑا رہبر نہیں مل سکتا تو اسے خود ہی ہمت سے کام لینا چاہیے۔ کسی کا انتظار کیوں کیا جائے ہو مردانگی شرط ہے۔ طُور یا وادیٔ ایمن وغیرہ میں جانے کی ضرورت نہ رہے گی۔ یہ اقبال کا مخصوص اور محبوب مضمون ہے جو اس شعر میں دلکش انداز سے باندھا گیا ہے۔

تُو اپنے دل کو کلیسائیوں کے طریقِ زندگی سے بالکل الگ کر لے۔ تیری خاک کے ذرّے ذرّے سے کعبے کی تعمیر ہونی چاہیئے۔ مطلب یہ کہ مغربی تہذیب سے علیحدگی اختیار کرے اور کافروں کی طرح زندگی بسر کرنا چھوڑ دے تاکہ تیری تمام قوتیں اسلام کی خدمت میں صرف ہو سکیں۔

اس باغ میں حد سے گزر جانا ہرگز مناسب نہیں۔ اگر ناز ہی کرنا ہے تو اپنے حسن و جمال کے انداز سے کے مطابق کر۔ مراد یہ کہ انسان اعتدال اور میانہ روی ہی کا طریقہ اختیار کرنے سے کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اسی درجے اور مقام کی آرزو کرنی چاہیے۔ جہاں تک پہنچنے کی اپنے آپ میں لیاقت ہو۔

تو پہلے سکندر کی طرح اپنے آپ میں خودداری کا جوہر تو پیدا کر لے، پھر دنیا میں دارا کے جاہ و جلال اور شان و شوکت کی خواہش کرنا، یعنی جو شخص جہان میں عزّت، عظمت اور بلند مرتبہ حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے لازم ہے کہ خوددار بن جائے۔ یہی خودداری اسے اختیار و اقتدار، سروری اور سربلندی کے اونچے مقام پر پہنچا دے گی۔

اے اقبال! کبھی نہ کبھی تو لیلا کی منزل مل ہی جائے گی۔ ابھی کچھ عرصہ اور جنگل جنگل پھرنے کا شغل جاری رکھ۔ مطلب یہ کہ دنیا میں دلی مقصد حاصل کرنے کے لیے لگاتار اور سرگرم کوشش کیے جانا لازم ہے۔

۵

اے اقبال! پھر بہار کی خوش گوار ہوا چلنے لگی۔ اگر تو کلی ہے تو پھول ہو جا، پھول ہے تو باغ بن جا۔ مراد یہ کہ انسان کو زندگی میں موقع سے فائدہ اُٹھا کر کامیابی حاصل کرنی چاہیے۔ اگر وہ سستی اور بے پروائی سے کام لے گا تو سنہری موقع ہاتھ سے نکل جائے گا اور اسے افسوس و پشیمانی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا۔

بے شک تو ہے تو مٹھی بھر خاک ہی، لیکن تجھے چاہیے کہ اس کے ہر جزو کی تپش، گرمی اور جوش سے الٹ پلٹ ہو جائے۔

اِدھر اُدھر پھیل جائے اور پھیل کر صحرا بن جائے۔ یعنی خدا نے تیری فطرت میں ترقی اور کامیابی کے جوہر رکھ دیے ہیں، اس لیے تو ان سے کام لے کر سارا جہان مسخّر کر لے۔

تو محبّت کی جنس ہے۔ تیری قیمت بہت زیادہ ہے۔ اس ملک کے سوداگروں کے پاس سرمایے کی بے حد کمی ہے۔ اس لیے تو اپنے آپ کو سستا کر دے۔ مطلب یہ کہ تیرا دل عشقِ الٰہی سے بھرپور ہے، لہٰذا تو ایک اَن مول موتی کی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا والے اس گوہرِ نایاب کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ ان کی فطرت میں اس لعل بے بہا سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت موجود نہیں، اس لیے تو ہندوستان کے بُت خانے میں عشقِ خداوندی کی نعمت عام کر کے انھیں ایمان و توحید کے سیدھے راستے پر چلا دے۔

تیری نے ساز کے پردے میں کیوں چھپی رہے؟ تو رنگین، پُرلطف اور دل کش نغمہ ہے۔ اس کی لَے ہر کان تک پہنچا دے۔ مراد یہ کہ خدا اور رسولؐ کا عشق تیری رگ رگ میں خون بن کر دوڑ رہا ہے۔ تو ساری دنیا کو اس نعمت سے فیض یاب کر دے اور جہان کے کفرستان کو اسلامستان بنا دے۔

اے عقل مند مسافر! اگر تیرے راستے میں باغ آ جائے تو شبنم ہو جا اور بیابان آئے تو طوفان بن جا، یعنی زندگی کے کانٹوں اور پتھروں بھرے راستے میں اس طرح سوچ سمجھ کر قدم اٹھا کہ دوستوں سے واسطہ پڑے تو انھیں تجھ سے فائدہ پہنچے، دشمنوں سے ٹکّر ہو جائے تو وہ تباہ و برباد ہو جائیں۔

ساز و سامان کی محبّت انسان کو سست اور آرام طلب بنا دیتی ہے۔ اگر تو منزلِ مقصود پر پہنچنا چاہتا ہے تو ساز و سامان کو توڑ پھوڑ کر برباد کر دے۔ مطلب یہ کہ دنیا میں کامیابی، ترقی، ظفر یابی اور اقبال مندی کی نعمتیں اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہیں کہ انسان عیش و راحت ترک کر کے زندگی کے میدان کارزار میں سر کٹانے کے لیے تیار ہو جائے۔

۶

حقیقتِ مُنتظَر: وہ حقیقت جس کا انتظار کیا جائے۔ یعنی محبوبِ حقیقی۔ ذاتِ خداوندی۔ **طربِ آشنائے خروش:** شور و غل اور ہنگامے سے خوشی حاصل کرنے والا۔ **دمِ طوف:** چکّر لگاتے وقت۔ **کرمکِ شمع:** چراغ کا پتنگا۔ پروانہ۔ **عفوِ بندہ نواز:** ایسی معافی جس میں بندے پر لطف و کرم کیا گیا ہو۔

اے خدا! کبھی مادّی لباس میں بھی جلوہ دکھا۔ کیونکہ میری عجز سے بھری ہوئی پیشانی میں ہزاروں سجدے بے قرار

ہو رہے ہیں۔ مراد یہ کہ اے محبوبِ حقیقی! تیرے حسن کا جلوہ یوں تو کائنات کے گوناگوں نظاروں میں دکھائی دے رہا ہے اور میں تجھے سجدہ بھی کر رہا ہوں لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ تو کسی مادی شکل میں میرے سامنے آ جائے اور میں ان آنکھوں سے تیرا دیدار کروں۔ پھر میں تیرے قدموں میں گر کر سجدے پر سجدہ کروں اور کیے جاؤں۔

اے مخاطب! تو شور و غل اور ہنگامے سے خوشی حاصل کرنے والا ہے۔ تو آواز ہے، کان سے دوستی پیدا کر۔ بھلا وہ بھی کوئی راگ ہے جو ساز کے پردے کی خاموشی میں چھپا ہوا ہو؟ یعنی عشقِ حقیقی نے تجھ میں حیرت انگیز کمالات بھر دیئے ہیں۔ تو اپنے جوہروں کو دل ہی میں نہ چھپائے رکھ بلکہ زمانے پر ظاہر کر کے لوگوں کو زندگی کا پیغام دے۔

تو اپنا آئینہ ٹھیس اور چوٹ سے بچا بچا کر نہ رکھ کیونکہ یہ ایسا آئینہ ہے کہ اگر ٹوٹ جائے تو آئینہ بنانے والے کی نظروں میں زیادہ پیارا اور پسندیدہ ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ تو اپنے دل کو عشق کی بلاؤں اور مصیبتوں سے چھپا چھپا کر نہ رکھ۔ سچے عشق کے دوران میں دل کو جو تکلیف اور صدمہ پہنچتا ہے اور اس سے دل ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے تو اسے اپنے حق میں مبارک فال سمجھ کیونکہ جب خدا کے عشق میں دل کا آئینہ چور چور ہو جاتا ہے تو وہ اسے اپنا پیارا جان کر اس پر فضل و احسان اور لطف و کرم کا مینہ برسا دیتا ہے۔

پروانے نے شمع کے گرد گھومتے وقت اس سے کہا کہ وہ پرانا اثر نہ تو تیری جلن کی کہانی میں ہے اور نہ میری پگھلاہٹ کے قصے میں۔ مراد یہ کہ موجودہ زمانے میں نہ تو حسن کے اندر پہلی سی کشش پائی جاتی ہے، نہ عشق کے اندر وہ گداز اور تڑپ۔ نہ زمانۂ قدیم جیسے پیشوا اور مرشد نظر آتے ہیں، نہ جاں نثار مرید۔ ساری کی ساری قوم عشقِ الٰہی کے جذبہ سے خالی ہو گئی ہے۔

میرے تباہ و برباد کرنے والے جرم و گناہ کو دنیا میں کہیں پناہ نہ ملی اور اگر ملی بھی تو صرف تیری رحمت کے دامن میں جو گنہگار بندے پر کرم کر کے اس کے جرم و خطا بخش دیتی ہے یعنی انسان سراسر گناہوں سے آلودہ ہے۔ اگر خداوند کریم اس کے گناہ معاف کر کے اسے اپنے دامنِ کرم میں پناہ نہ دے تو جہان میں کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔

اب نہ عشق میں وہ پہلا سا سوز، تڑپ، حرارت، اور جوش و خروش باقی رہا، نہ حسن میں وہ شوخی، عشوہ اور ناز و ادا۔ نہ محمود غزنوی کا دل اپنے محبوب ایاز کے عشق میں تڑپتا ہے۔ اور نہ ایاز کی زلف میں وہ پیچ و خم اور حسن و دلکشی موجود ہے۔ مطلب یہ کہ مسلمان پستی میں اور زوال کے گڑھے میں گرتے جا رہے ہیں نہ ان کے رہنماؤں میں مخلص ہنگامہ آرائی ہے اور نہ عوام میں ایثار و قربانی کا جذبہ۔

اگر میں نے کبھی سجدہ کیا تو زمین سے یہ آواز آنے لگی کہ تیرا دل تو بتوں کا شیدا ہے تجھے نماز سے کیا حاصل ہوگا؟ مراد یہ کہ جب تک انسان اپنے دل کو غیر اللہ سے پاک نہ کر لے اور اسے خدا کے سوا کسی دوسرے سے عشق و محبت نہ ہو، اس وقت تک نہ تو اس کی نماز کو صحیح معنی میں نماز کہہ سکتے ہیں اور نہ اسے یوں سجدے پہ سجدے کرنے سے کسی قسم کا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔

۷

نولے زیر لبی: وہ آواز جو صرف لبوں کے نیچے رہے۔ نہ بلند ہو اور نہ کسی کو سنائی دے۔ **اسد اللّٰہی**: حضرت علی مرتضیٰؓ کی شان۔ **ابو لہبی**: حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چچا ابولہب کے کرتوت جو حضورؐ کا سخت مخالف تھا۔

اگر باغ کے پرندے جال میں پھنسے ہوئے بھی نغمے گاتے رہے تو کیا حاصل؟ جو فریاد دل میں تڑپ رہی تھی وہ تو صرف لبوں تک آ کر ان کے نیچے ہی دبی رہی۔ یعنی اگر عاشقانِ حریّت نے غیر کی غلامی میں رہ کر ملک و قوم کی بھلائی کے لیے کچھ کیا بھی تو اس کی حیثیت کیا ہے کیونکہ وہ برسرِ عام کھلّم کھلاّ دلی جذبات کا اظہار کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کے دل میں جو خیالات موج زن ہوتے ہیں وہ انھیں علانیہ زبان تک نہیں لا سکتے۔

تیرا جلوہ ذرا بھی میرے دلِ بے صبر کی تسلی نہ کر سکا۔ جس طرح میں پہلے صبح کے وقت رویا کرتا تھا، اسی طرح اب بھی رو رہا ہوں۔ جیسے پہلے آدھی رات کو آہیں بھرا کرتا تھا، ویسے اب بھی آہیں بھرا کرتا ہوں۔

مطلب یہ کہ اے محبوب! میں تو تجھے اپنے اندر جذب کر لینا چاہتا ہوں اور اس بات کا آرزو مند ہوں کہ ہم دونوں ایک ہو جائیں۔ دوئی اور من و تو کا فرق و امتیاز مٹ جائے۔ جب تک میرا یہ مقصد پورا نہیں ہوتا، میرے دل کو کیونکر حقیقی سکون اور اطمینان حاصل ہو سکتا ہے؟

مادہ پرستی کے اس زمانے میں نہ تو کہیں خدا کے سچے عاشق نظر آتے ہیں اور نہ بتوں کے وفادار پجاری۔ بت خانے اور کعبے میں غرض کسی جگہ بھی حقیقی محبت کا نشان نظر نہیں آتا۔ نہ تو آج کل حضرت علی مرتضیٰؓ جیسے فدائے خدا و رسولؐ بزرگ دکھائی دیتے ہیں اور نہ ابولہب جیسے اسلام کے جانی دشمن موجود ہیں۔ مراد یہ کہ مسجدیں اور مندر دونوں بے رونق ہو گئے ہیں۔ مذہب کا کسی کو خیال تک نہیں۔ ہر شخص نے دنیا کے زر و مال اور جاہ و جلال ہی کو زندگی کا سب سے بڑا مقصود قرار دے رکھا ہے۔

اگرچہ میرا سازِ عجمی مضرابوں کے ستم سہتا رہا، لیکن میں وفاداری کی لذت پر ایسا مٹا ہوا ہوں کہ عربی نغمے ہی الاپتا رہا۔ یعنی اگرچہ میرے اشعار کی زبان اور انداز عجمی رہے لیکن میں برابر اسلامیات کا پیغام دیتا رہا۔

۸

زندانِ اسباب: ظاہری وسیلوں کا پابند یا محتاج۔ **لا یخلف المیعاد**: خدا ہرگز وعدہ

خلافی نہیں کرتا۔ لسان العصر: لفظی معنی زمانے کی زبان۔ مراد حضرت اکبرالٰہ آبادی سے جن کا یہ لقب تھا۔ انّ وعد اللّٰہ حقّ: اللہ تعالیٰ کا وعدہ یقیناً سچّا ہوتا ہے۔

اے مسلمان! تو اگرچہ مادّی اور ظاہری اسباب کا محتاج ہے، لیکن ذرا دل کو ان اسباب و وسائل سے آزاد رکھ۔

مطلب یہ کہ دل میں ہمیشہ یہی پختہ یقین رکھ کہ کامیابی صرف خدا کے فضل و کرم سے ہوتی ہے۔ اسباب و وسائل کچھ نہیں کر سکتے۔

عقل تو ہر وقت خدا کی ہستی پر اعتراض کرتی رہتی ہے۔ اس کا شغل یہی ہے کہ انسان کو شک و شبہ میں ڈالے۔ اس لیے تو ہمیشہ عشق کی سیدھی راہ پر چل۔ اسی سے کامیابی کی منزل مقصود پر پہنچے گا اور دنیا میں بہترین زندگی بسر کر کے آخرت میں بلند درجے حاصل کرے گا۔

اے مسلمان! تو ہر وقت یہی آیت سامنے رکھ۔ کہ اللہ تعالیٰ ہرگز وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

مراد یہ کہ اے مسلمان! تو خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر پوری طرح عمل کر۔ پھر تجھے دنیا میں ترقی کی سب سے اونچی چوٹی پر جگہ ملے گی۔

حضرت اکبرالٰہ آبادی نے قوم کو یہ پیغام دیا ہے کہ اللہ تعالےٰ کا وعدہ یقیناً سچّا ہوتا ہے۔ تو اسے ہر وقت یاد رکھ۔

یعنی خداوند کریم نے قرآن عزیز میں مومنوں سے جو وعدے کیے ہیں وہ سب کے سب حرف بہ حرف درست ہیں۔ تو کتاب و سنّت کی روشنی میں اس طرح زندگی بسر کر کہ ذاتِ باری تعالیٰ اپنے وہ تمام وعدے پورے کر دے۔

ظریفانہ

اس حصّے کی ابتدائی نظموں میں سے بہت سی انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسے میں پڑھی گئی تھیں پھر اکبری اقبال کے عنوان سے ایک کتابچے کی شکل میں چھپ گئیں۔ بعد کی زیادہ تر نظمیں وقتی مسائل پر اخباروں کے لیے لکھی گئیں۔

۱

اہلِ مشرق کی یہ حالت ہے کہ اصول کو دین کی حیثیت دے دیتے ہیں، یعنی ان کی قدر بہت کی جاتی ہے لیکن ان پر عمل نہیں کیا۔ مغرب میں اصول پرشین کی طرح عمل ہوتا ہے۔ ہم خدا کو ایک ماننے والے ہیں، مگر وہ بھی ہمارے پلے نہیں رہا۔ مغرب والوں نے ایک کے تین خدا بنا لیے اور ان پر بھی ان کا ایمان پکّا ہے۔

آخری شعر میں اقبال نے توحید اور تثلیث سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ یہاں قول ہے اور عمل نہیں وہاں اگرچہ عقیدہ غلط ہے مگر اس پر عمل ہو رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم صحیح عقیدے کے باوجود کامیاب نہیں، وہ عقیدۂ غلط ہوتے ہوئے بھی کامیاب ہیں۔ ایک معنی یہ بھی نکلتے ہیں کہ ہمارے پلّے تو ایک روپیہ بھی نہیں رہا اور وہ ایک کے تین تین بنا رہے ہیں۔

۲

لڑکیاں انگریزی پڑھنے لگی ہیں۔ قوم نے اپنی بہبود کا راستہ ڈھونڈ لیا ہے یعنی سمجھ لیا کہ لڑکیوں کو انگریزی کی تعلیم دیے بغیر فلاح کی کوئی صورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان لڑکیوں کے والدین مغربی طرزِ معاشرت کو پسند کرتے ہیں اور مشرقی طور طریقوں کو اچھا نہیں سمجھتے بلکہ گناہ جانتے ہیں۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جو ڈراما ہمارے سامنے ہو رہا ہے اس کا آیندہ منظر کیا ہوگا۔ نگاہوں کو صرف پردہ اٹھنے کا انتظار ہے۔

پردہ اٹھنا دو معنی میں استعمال ہوا ہے: اوّل تھیٹر میں سٹیج پر ایک خوب صورت پردہ پڑا رہتا ہے۔ ڈراما شروع ہوتے ہی اسے اٹھا لیتے ہیں۔ دوسرے معنی شرعی پردہ اٹھنے کے ہیں یعنی لڑکیاں انگریزی پڑھ کر مغربی طور طریقے اختیار

کریں گی تو پردہ بھی چھوڑ دیں گی۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس وقت کیا حال ہوگا اور کون سی صورت پیش آئے گی؟

۳

ہمارے شیخ بھی تو پردے کے چنداں حامی نہیں۔ خدا جانے کس وجہ سے کالج کے لڑکوں میں ان کے متعلق بدگمانی پیدا ہوگئی؟ آپ نے کل وعظ میں صاف صاف کہہ دیا کہ عورتیں کس سے پردہ کریں؟ پردہ مردوں ہی سے کرنا ضروری ہے۔ جب مرد ہی زن بن گئے تو پردے کی ضرورت کہاں باقی رہ رہی۔

آخری مصرع اکبر کا ہے۔ اس کے دو معنی ہیں: اوّل یہ کہ مردوں نے عورتوں کے سے اوصاف اختیار کر لیے یعنی بال سنوارنا، پوڈر لگانا، بن ٹھن کر نکلنا، مردانہ کھیلوں اور کارناموں سے نفرت کرنا، مجلس آرائی کو سب سے بڑا کام سمجھنا وغیرہ۔ دوسرے معنی یہ کہ مردوں نے ڈاڑھی مونچھیں منڈا کر عورتوں کی سی شکلیں پیدا کر لیں۔

۴

اے عقل مندو! حالات بدلے ہوئے نظر آتے ہیں اور زمانے کی جو رفتار ہے، اس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ تری غیرت اور عورت کا پردہ تھوڑے دن کا مہمان ہے۔ وہ وقت قریب آگیا ہے۔ جب نہ عورت پردے کی خواہش مند رہے گی اور نہ تجھے اس حالت پر کوئی غیرت آئے گی۔ اب تو وہ زمانہ آرہا ہے۔ جب عورت کو اولاد کی خواہش نہ ہوگی بلکہ وہ کونسل کی ممبری کے لیے ووٹ مانگتی پھرے گی۔

اقبال کے نزدیک عورت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اولاد پیدا کرے اور بچوں کو صحیح تربیت دے۔ جس عورت کو اولاد کی آرزو نہ ہو، اقبال کے نزدیک وہ وضع قطع میں عورت ہونے کے باوجود نسوانی جوہر سے خالی ہے یہ بحث تفصیل سے "رموز بے خودی" میں آئے گی۔ وہ سمجھتے تھے کہ زندگی تقسیم فرائض کا نام ہے۔ عورت کا دائرہ گھر اور کنبہ ہے جب وہ اپنا دائرہ چھوڑ کر دوسرے دائرے میں جائے گی۔ تو اپنی اصل خصوصیتیں کھو بیٹھے گی۔

۵

مغربی تعلیم لڑکوں کو دریدہ دلیر بناتی ہے۔ اس کا پہلا سبق یہ ہے کہ کالج میں بیٹھ کر شیخی بگھاری جائے۔ ہندوستان میں صنعت و حرفت تو ہے نہیں۔ ہر قسم کا سامان باہر ہی سے آتا ہے۔ حد یہ ہے کہ افغانستان جیسے پس ماندہ صنعت ملک سے خان صاحب ہینگ لے کر یہاں آجاتے ہیں۔ میرا حال تو یہ ہے کہ حاکم کے بوٹ کی ٹو کو چاٹتا ہوں اور حاکم کے غرور کا یہ عالم ہے کہ کہتا ہے۔ میرے فرش پر نہ رینگ ہمہ فرش خراب ہو جائے گا۔ یعنی حاکم کو میری انتہائی خوشامد بھی پسند نہیں۔ انگریز کہتے ہیں کہ اونٹ تو بھدا سا جانور ہے۔ گائے اچھی ہے۔ اس کے سینگ کیا نکیلے ہیں۔ اس شعر میں اونٹ سے اشارہ مسلمانوں کی طرف ہے اور گائے سے ہندوؤں کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ مسلمان انگریزوں کے خلاف تحریکوں میں زیادہ حصّہ

نہیں لینے اور ہندو ہر وقت تنگ کرتے رہتے ہیں، تاہم انگریزوں کی زیادہ توجہ ہندوؤں ہی کی طرف رہتی ہے۔ نہ کہ مسلمانوں کی طرف۔

۶

اگر واعظ صاحب کے پاس پیسے نہیں اور افلاس نے انھیں تنگ کر رکھا ہے تو اس پر خشمگین ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ انھیں اور نئی تہذیب کے سامنے سر جھکا لیں۔ جہاد کے رد میں تو بہت کچھ لکھا جا چکا۔ واعظ صاحب کے لیے مناسب یہ ہوگا کہ حج کے رد میں کوئی رسالہ لکھ ماریں۔ انھیں کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا۔

اس شعر میں اشارہ وقت کے ایک مشہور عالم اور ایک نئے گروہ کے بانی کی طرف ہے۔ ایک عالم نے جہاد کے رد میں ایک مستقل رسالہ لکھا اور انھیں مربعے ملے۔ دوسرے صاحب بھی عمر بھر جہاد کی مخالفت میں لگے رہے اور حاکموں میں معزز مانے گئے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ کام تو بہت ہو چکا ہے۔ اب حج کے خلاف کوئی تحریک چلانی چاہیے۔ اس لیے کہ جہاد کی طرح حج بھی جو مسلمانوں کا بہت بڑا قومی اجتماع ہے، حاکموں کی نظر میں کھٹکتا رہتا ہے۔

۷

اہلِ ملک کی ذہنیت اس قدر بگڑ چکی ہے اور نئی تہذیب ان پر اس طرح چھا گئی ہے کہ وہ دواؤں کے لیے اپنی زبان کے نام بھی پسند نہیں کرتے۔ مثلاً کبھی نہ کہیں گے کہ ہم نے گولی کھائی، گولی کی جگہ پل کا لفظ استعمال کریں گے۔

اقبال فرماتے ہیں کہ جس شخص کو تہذیب کی بیماری لگ چکی ہو، اسے گولی دینے سے فائدہ نہ ہوگا۔ اس کی خدمت میں دوا کو پل کہہ کر پیش کریں گے تو مرض دور ہو جائے گا۔

ایک زمانے میں ہمارے ہاں استادوں کی ایسی قدر و منزلت کی جاتی تھی، ان کی خدمت کے بدلے دل کو بہ طور نذر پیش کر دیا جاتا۔ اب زمانہ ایسا بدل گیا کہ لڑکا سبق پڑھ چکنے کے بعد ماسٹر سے کہتا ہے کہ بتائیے آپ کا بل کتنا ہوا؟

اس شعر میں کمال یہ کیا ہے کہ پہلے دور کے استاد کو استاد کہا اور دوسرے دور کے استاد کو ماسٹر سے تعبیر کیا۔

۸

ہماری غفلت کی کوئی حد بھی ہے؟ آخر ہم کب تک چھتریاں، رومال، مفلر اور کپڑے جاپان سے خریدتے رہیں گے؟ اگر ہم اسی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے اور یہ حالت قائم رہی تو کچھ عجب نہیں کہ مُردوں کو غسل دینے کے لیے کابل سے مُلّا بلائے جایا کریں گے اور کفن جاپان سے منگوائے جائیں گے۔

۹

ہم مشرق کے رہنے والے لوگوں کا دل یورپ میں جا اٹکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں سب کنٹر بلوز کے

اس دور میں سب مٹ جائیں گے۔ صرف وہی باقی رہ جائے گا جو اپنے طریقے پر قائم ہے اور مضبوطی سے ہیں جو دل کو بہت اچھے لگتے ہیں اور یہاں ایک پرانا مٹکا ہے جو کسی کو بھی پسند نہیں آسکتا۔ جا کھڑا ہے۔ زمانے کے حالات بدلتے دیکھ کر وہ اپنا طریقہ بدلنے پر تیار نہیں ہوتا۔

خود اقبال نے اپنے ایک مکتوب میں یہ شعر استعمال کرتے ہوئے جو عبارت لکھی اس سے بھی اس کے معنی کا اندازہ ہو سکتا ہے فرماتے ہیں: "مذہب کا مقصود عمل ہے نہ کہ اس کے عقلی اور دماغی تقاضوں کو پورا کرنا۔ مذہب کا مقصود عملی تقاضوں کو پورا کرنا ہو بھی (جیسا کہ ہنود کے رشیوں اور فلسفیوں نے خیال کیا ہے) تو زمانہ حال کی خصوصیات کے اعتبار سے اسے نظر انداز کرنا چاہیے۔ اس وقت وہی قوم محفوظ رہے گی جو اپنی عملی روایات پر قائم رہ سکے گی:

اس دور میں سب مٹ جائیں گے ہاں باقی وہ رہ جائیگا
جو اپنی راہ پر قائم ہے جو پکا اپنی ہٹ کا ہے۔"[1]

اے مسلمانو اور ہندوؤ! سنتے ہو کہ بصیرت والے لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ کہہ رہے ہیں کہ آسمان نے ان دو قوموں کو کتنی بلندی سے زمین پر دے مارا ہے؟ ایک زمانہ تھا، جب ان دونوں میں محبت کا دستور قائم تھا۔ باہم پیار کے جلسے ہوتے تھے۔ اب کیا حالت ہے؟ اب یا تو اُردو اور ہندی کا جھگڑا ہے یا قربانی اور جھٹکے کا۔

۱۰

شہود، شاہد اور مشہود کی اصل ایک ہے۔ جب غالب کا یہ قول درست ہے تو پھر غیر کا کیا ذکر؟ شہود سے مراد ہے کسی چیز کا ظاہر ہونا۔ شاہد کے معنی ہیں دیکھنے والا اور مشہود کے معنی دیکھا گیا۔ یہ مصرع غالب کا ہے۔ پورا شعر یوں ہے:

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

جناب شیخ! کیا آپ نے بھی سنا کہ دیر کے رہنے والے کعبے والوں سے کل کیا کہہ رہے تھے؟ کہہ رہے تھے کہ ہم عاشق مزاج مسلمان سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں، جب بتوں سے الفت ہے تو برہمن سے بیر کا مطلب؟ بتوں کے دو معنی ہو سکتے ہیں: اوّل یہ کہ مسلمان خود ایسی ہی چیزوں کی پوجا میں لگ گیا، جیسے بت ہوتے ہیں۔ دوسرے معنی محبوبوں کے ہو سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ بتوں سے خاص تعلق پیدا کر لیا تو برہمن سے دشمنی کیوں ہے؟ اس سے بھی دوستی کرو۔ لطف یہ کہ یہ قول اہلِ دیر کا ہے۔

۱۱

ہمارے ہاتھوں سے دنیا کا دامن نکل گیا یعنی دنیا کی کوئی چیز ہمارے پاس نہ رہی اور دلوں سے آخرت کا خیال

---

[1] مکاتیبِ اقبال، شایع کردہ بزمِ اقبال صفحہ ۶۔

بھی رخصت ہو گیا۔ ہمارے شیخ صاحب قانونِ وقف کے لیے لڑ رہے ہیں یعنی چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی جائداد یں اولاد پر وقف کرنے کا حق ملنا چاہیے تاکہ جائدادیں محفوظ ہو جائیں بھلا ان سے یہ پوچھا جائے کہ وقف کے لیے آپ کے پاس کوئی جائداد بھی رہی ہے؟

قانونِ وقف سے مراد وقف علی الاولاد کا قانون ہے جس کے لیے مولانا شبلی نے خاص کوششیں فرمائی تھیں اور قائد اعظم محمد علی جناح نے مسودۂ قانون مرکزی کونسل میں پیش کیا تھا۔ اس قانون کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی اولاد متروکہ جائیداد سے اپنے حصّے کے مطابق فائدہ اٹھاتی رہے مگر اسے بیع یا رہن نہ کرسکے۔

۱۲

میں نے جب خودکشی کا ارادہ کیا تو میری محبوبہ مس بولی۔ اے عاشق! اگر تو مہذّب ہے تو پھر قدم حد سے باہر نہ رکھ جب میں نے تجھے ٹھکرا دیا تو بیشک تجھے اپنی ناکامی پر بہت رنج ہوا ہوگا اور اسی وجہ سے تو نے خودکشی کا ارادہ کر لیا، مگر نہ تجھ میں حوصلہ ہے کہ اپنی جان لے لے، نہ تیرے پاس تلوار ہے، پھر خودکشی کا ارادہ کیسا؟ میں نے کہا کہ اے جانِ جہاں! کچھ پیسے دلوا دیجیے تو میں سرحد سے کسی پٹھان کو کرایے پر منگوا لوں گا۔

ان شعروں میں اقبال کے پیشِ نظر کئی مقصد تھے:

۱۔ ان نوجوانوں کی گمراہیوں پر طنز جو ولایت جا کر فرنگستانی لڑکیوں پر مرتے تھے۔

۲۔ اہلِ ملک کی انتہائی بے بسی کہ ان کے پاس خودکشی کے لیے بھی کوئی تلوار نہیں اور نہ تلوار سے کام لینے کا حوصلہ۔

۳۔ سرحدی پٹھانوں کی کیفیت کہ چند روپے دے کر جو شخص چاہے ان سے کسی انسان کو قتل کرا دے۔

۱۳

ترکوں نے کس قدر بے سمجھی سے کام لیا۔ انھوں نے عربوں کی قدر نہ پہچانی۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ وہ دشمن کی مار پیٹ سے نہ بچ سکے۔ یورپ والے اونٹ کو بیابان کا جہاز کہتے ہیں۔ افسوس! ترکوں نے اس بیڑے سے کام نہ لیا۔ فلیٹ جنگی بیڑے کو کہتے ہیں۔ اقبال نے اہلِ مغرب کے قول کے مطابق اونٹ کو جہاز کہا تو بہت سے اونٹوں کو بیڑا قرار دے لیا۔ وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ اگر ترک جنگ کے دوران میں اونٹوں سے رسد رسانی کا کام لیتے تو انھیں زیادہ پریشانیوں کا سامنا نہ ہوتا۔

۱۴

ہندوستان میں کونسلیں حکومت کا جزو ہیں۔ کونسلیں بن جانے کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے سیاسی کمال کا آغاز ہو گیا۔

ہم تو فقیر تھے ہی، ہمارا کام ہی یہ تھا کہ سوال کرتے رہیں۔ اب امیروں کو بھی "سوال" کا سلیقہ سیکھنے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔

یہاں سوال کا لفظ دو معنی میں استعمال ہوا ہے: اوّل سوال بہ معنی مانگنا جو فقیروں کا عام طریقہ ہے۔ دوم سوال بہ معنی پوچھنا یا استفسار کرنا جو عام طور پر کونسلوں کے ممبر کرتے رہتے ہیں۔

•

۱۵

امپیریل کونسل کی ممبری حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں، ہم ووٹ لے ہی لیں گے۔ پوچھنے کی بات یہ ہے کہ اس ممبری کے سلسلے میں سرکار کچھ پیسے بھی دلوائے گی تاکہ کھانے پینے کا سامان کر سکیں؟ میرزا غالب کو خدا بخشے، کیا خوب فرما گئے ہیں کہ

"ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا"

امپیریل کونسل سے مراد وہ مرکزی کونسل ہے جو وائسرائے کو مشورے دینے کے لیے بنی تھی اور دلّی اس کا مرکز تھا۔

۱۶

ہماری محبت اور وفاداری کی دلیل اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ اگر آپ سے الفت نہ ہو تو آپ کے ظلم کیوں برداشت کریں؟ اس شعر میں خطاب حاکم سے ہے۔

ہمارے علاقے کے لوگ اصرار کر رہے ہیں کہ بھئی تمھیں ممبر بنایا تھا۔ کمیٹی کے جلسے میں تم بھی کچھ بولا کرو۔ مگر ہماری مصلحت یہ ہے کہ جب تک ڈپٹی کمشنر صاحب کی خواہش کا اندازہ نہ کر لیں، تو کیونکر لب ہلائیں؟

بھئی! اپنی خدمات کی سند تو حاصل کر لو۔ یہ اولاد کے کام آئے گی۔ حاکم اس وقت مہربان ہے خدا جانے کل مہربان رہے یا نہ رہے۔

زمین پر تو ہندوستانیوں کو جگہ نہیں ملتی۔ ہاں سمندر کی تہیں خالی پڑی ہیں۔ وہاں چاہیں تو جا بسیں۔ اس شعر میں اشارہ غالباً جنوبی افریقہ کے واقعات کی طرف ہے، جہاں سے ہندوستانیوں کو نسلی تعصب کی بنا پر نکالا جا رہا تھا۔

میں تو بے حس کشتی کی طرح فرمان بردار ہوں۔ آپ فرمائیں تو ساحل سے چمٹا رہوں فرمائیں تو دریا میں بیٹھ لگوں۔

۱۷

جناب واعظ مسلمانوں کے طریق عمل پر وعظ فرماتے ہوئے کہ رہے تھے کہ ہندوستان کے کافر تجارت میں بڑے سرگرم ہیں لیکن جو لوگ مشرکوں سے لین دین رکھتے ہیں۔ وہ خود مشرک ہیں۔ افسوس کیا کہیں، ہماری قوم عقل اور ہوش سے محروم ہو چکی ہے۔ ہمارے لوگوں کو یہ تک معلوم نہیں کہ کافر کے ہاتھ کی چیز ناپاک ہوتی ہے۔ مسلمانوں میں سچی بات کے قبول کرنے کا ذوق ہو تو سن لیں۔

وعظ کی محفل میں ایک شراب فروش بھی بیٹھا تھا، اسے واعظ صاحب کی یہ بات بہت بری معلوم ہوئی۔ وہ بول اٹھا کہ کھانے پینے کے سامان کی تجارت پر ایسی پابندیاں لگانا سراسر ظلم ہے۔

میں نے کہا کہ آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟ آپ کو تو کوئی مشکل پیش ہی نہیں آ سکتی۔ آپ کو شراب کی ضرورت ہے اور ہندوستان میں ایسے کلمہ گو بھی ہیں جو شراب بیچتے ہیں۔

۱۸

مشرق دین کے بدلے شراب کے پیالے اور صراحیاں لیتا ہے۔ دیکھیں یہ تجارت کب تک چلتی ہے؟ ہمارے دل میں دین کے لیے فداکاری کا جو جنون تھا، اس کا علاج نئی تعلیم کا نشتر ہے، یعنی نئی تعلیم نے فداکاری کے جذبے کو ختم کر دیا اور دینی حس کُند ہو گئی۔ گویا ہم جس سرجن سے علاج کرا رہے ہیں۔ وہ ملت کی رگ سے خون لیتا ہے اور اسے بے حس کر رہا ہے۔

۱۹

ایک روز گائے اونٹ سے کہنے لگی۔ دنیا کی کوئی بھی شے ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ میں تو اس وجہ سے بدنام ہوئی کہ اپنی رسّی توڑ بیٹھی ہوں۔ سنتی ہوں، آپ نے بھی مہار توڑ ڈالی ہے۔ آپ ہندوستان میں تو اپنے آپ کو سیاسی حیثیت سے بہت اہم بتا رہے ہیں لیکن عرب کے بیابان میں ریل چلنے لگی تو آپ بے کار ہو گئے۔ کل تک آپ گائے کی محفل سے دور بھاگتے تھے اور آپ کے لٹکتے ہونٹوں پر پناہ بہ خدا کی صدا تھی۔ آج کیا بات ہے کہ ہم پر عنایت ہو رہی ہے اور دل کا آئینہ پرانے غبار سے پاک ہو چکا ہے؟

اونٹ نے گائے کی یہ تقریر سُنی تو شرماتے ہوئے کہا کہ ہم بھی آپ کے چاہنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اے گائے! تیری ایک کھلیل اونٹ کے سوشتر غمزوں کے لیے باعث رشک ہے۔ ہم تو ایسی کلیلوں کے پرانے شیدائی ہیں۔ تو نے وہ ہنگامے بپا کیے جن کا اثر جنگل میں پھیلا تو گونگوں کو بھی بولنا آ گیا۔ مدت سے ایک ہی جنگل میں ہمارا اور آپ کا بسیرا ہے۔ اگرچہ ہمارے پاس کچھ ہے نہیں اور چارا بھی اُدھار کھاتے ہیں۔ بکری، اونٹ، گائے، چیتا اور لنگڑا گدھا ایک ہی رنگ میں رنگے جائیں۔ تو ہماری عزت قائم ہو۔ باغبان یک رنگی کا سبق پڑھائے تو پرندوں کو باغ میں ہم زبان ہو کر ہی رہنا چاہیے۔ مناسب یہ ہے کہ ہمیں بھی شراب کا وہی پیالا پلا۔ تو بھی نشے میں چُور ہو اور تیرے ساتھی بھی۔ حافظ کی گدڑی کس کام کی ہے۔ اسے شراب میں ڈبو کر رنگین بنا دے۔ بعد ازاں خود حافظ کو مست اور بدحال سر بازار گھسیٹتا ہوا لا۔

اس نظم میں گائے سے مراد ہندو ہیں۔ اونٹ سے مراد مسلمان اور گائے کی محفل سے مراد کانگرس۔

۲۰

رات جھینگر نے اپنی ناکامی کا ماجرا مجھے سنا دیا۔ وہ بولا کہ رات بھر کی پیاس کے بدلے میں مجھے لہو کی ایک بوند ملتی ہے اور زمیندار کو دیکھو، یہ محنت مشقت اٹھائے بغیر اسامی کا سارا لہو پی جاتا ہے۔

پسوہ دار کے معنی زمیندار، اسامی سے مراد کاشتکار ہے۔

۲۱

جیل سے مجھ پر یہ آیت نازل ہوئی کہ گیتا میں قرآن ہے، قرآن میں گیتا یعنی دونوں کے مطالب میں یکسانی ہے۔
اس میں اشارہ پنجاب کے ایک کانگرسی کی طرف ہے جس نے ترکِ موالات کے زمانے میں قید سے رہا ہوتے ہی اس قسم کا بیان دیا تھا۔ مسلمان اور ہندو کی صلح خوب ہوئی۔ اس جنگ میں آخر نہ ہندو ہارا نہ مسلمان جیتا۔
بدری (ہندو) تو پہلے ہی مندر سے بیزار تھا، لیکن مسیتا (مسلمان) ایسا ضدی ہے کہ مسجد سے نکلتا ہی نہیں۔
مراد یہ کہ ہندو نے تو اپنا مذہب مدت سے چھوڑ رکھا ہے، لیکن مسلمان اب تک مذہب سے چمٹا ہوا ہے۔

۲۲

جان بے شک چلی جائے لیکن سبح ہاتھ سے نہ جائے۔ ہر مذہب کی روح بھی ایک بات ہے۔ ساہوکاری، زمینداری اور سلطنت یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں یعنی سب کی حیثیت ایک ہے۔ ساہوکار مقروض کا خون چوستا ہے — زمیندار کاشتکار کا، سلطنت رعایا کے لہو پر پلتی ہے۔

۲۳

محنت اور سرمایہ دنیا میں ایک دوسرے کے مقابل صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ دیکھیں اس جنگ میں کس کس کی تمناؤں کا خون ہوتا ہے۔ خواہ کتنی ہی حکیمانہ تجویزیں سوچی جائیں اور کتنی ہی تدبیریں اختیار کی جائیں یہ طوفان بپا کرنے والا فتنہ ٹل نہیں سکتا۔ یہ بری عذاب ہے، جس کے لیے تم عجلت اور جلدی سے کام لے رہے تھے۔ یاجوج اور ماجوج کے تمام لشکروں کی بیڑیاں کھل گئیں۔ اے مسلمان! یہ حرف ینسلون کی تفسیر ہے۔
محنت و سرمایہ سے مراد مزدور اور سرمایہ دار ہیں۔ وقد کنتم به تستعجلون قرآن مجید کی آیت کا ایک ٹکڑا ہے۔ آخری شعر میں سورۂ انبیا کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے: حتّٰی اذا فتحت یاجوج و ماجوج وھم من کل حدب ینسلون (یہاں تک کہ یاجوج اور ماجوج کے لشکر کھول دیے جائیں اور ہر وہ بلندی سے ڈھلکتے ہوئے چلے آئیں)

یاجوج اور ماجوج اصل میں دو قوموں کے نام ہیں۔ یاجوج سے مراد یواہ چی ہیں جو چین کی ایک قوم تھی اور مدت تک وسط ایشیا پر قابض رہی۔ یواہ چی نے عبرانی میں یاجوج کی شکل اختیار کی۔ ماجوج کی اصل موگ ہے جس سے ہمارے ہاں کا مغل بنا۔ اس سے مراد منگولیا کی وہ قومیں ہیں جو کئی مرتبہ دنیا کو تہس نہس کر چکی ہیں۔ اور خدا جانے کب تک کرتی رہیں گی۔ موگ نے عبرانی میں ماجوج کی شکل اختیار کی۔

قرآن میں ان کے آشوب کا ذکر آیا ہے۔ بعض مفسروں نے اس آشوب کو چنگیز خانیوں کے ظہور سے تعبیر کیا۔ یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کس ظہور کی خبر ہے۔ مسلمانوں میں اس کے متعلق جو کہانیاں مشہور ہیں، ان کی کوئی اصل معلوم نہیں۔ اقبال کا یہ نادر ترین قول خاص طور پر یاد رکھیے کہ سرمایہ اور محنت کی جنگ ٹل نہیں سکتی۔ یہ ۲۳-۱۹۲۱ء کا قول ہے۔ کم و بیش چونتیس پینتیس برس گزر گئے اور اس کی صداقت کے ثبوت روز بروز سامنے آ رہے ہیں۔

۲۴

شام کی سرحد سے وہ رندِ لم یزل رخصت ہو گیا اور اس نے مے خانے کے تمام قاعدے بالائے طاق رکھ دیے۔ اگر یہ صحیح ہے تو بڑی عبرت کا مقام ہے۔ یہ نیلا آسمان پل بھر میں رنگ بدل لیتا ہے۔ لارڈ کرزن کو اب علاج کی فکر ضرور کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ حکم برداری کے معدے میں اتنا شدید درد شروع ہو گیا ہے جو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ سر آغا خان ہندوستان سے مسلمانوں کا وفد بلا رہے ہیں۔ کیا اس وفد کو فلسطین اور عراق ہضم کرنے کے لیے چورن سمجھنا چاہیے؟

اس نظم کا مطلب سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل واقعات سامنے رکھ لینے چاہئیں۔

۱۔ پہلی جنگِ یورپ کے دوران میں شریف حسین نے اس امید پر ترکوں سے بغاوت کر کے انگریزوں اور ان کے اتحادیوں کا ساتھ دیا کہ پورے عرب کی بادشاہی اسے مل جائے گی۔

۲۔ اتحادیوں نے جنگ کے بعد عرب کے کئی ٹکڑے کر ڈالے۔ حجاز کی بادشاہی شریف حسین کو دی، شام کا بادشاہ شریف کے بیٹے امیر فیصل کو بنایا۔ شریف کے دوسرے بیٹے امیر عبداللہ کے لیے شرق اردن کی سلطنت پیدا کی۔ عراق کی بادشاہی کے لیے شریف کے سب سے چھوٹے بیٹے امیر زید کو تجویز کیا۔ فلسطین اپنے قبضے میں رکھا۔ فلسطین و عراق دونوں کے لیے وہ طریقِ حکومت تجویز کیا جسے سیاسی اصطلاح میں مینڈیٹ (MANDATE) کہتے تھے یعنی حکم برداری یا انگریزوں کی نگرانی میں ان کی مرضی کے مطابق سب کچھ کرنا۔

۳۔ شامی عربوں نے امیر فیصل کی بادشاہی اس لیے نامنظور کر دی کہ یہ فرانسیسیوں کی حکم برداری کا ایک پردہ تھی۔ جنگ شروع ہوئی تو فرانسیسیوں نے اپنی فوجیں شام سے ہٹا لیں اور امیر فیصل بھی وہاں سے نکل گئے۔ انگریزوں نے انھیں عراق کا بادشاہ بنا دیا۔ رندِ لم یزل سے اشارہ اسی کی طرف ہے۔

۴۔ کچھ مدت بعد فرانسیسی پھر زبردست فوج سے کر آگئے اور شام پر بزور قابض ہو گئے۔ اقبال کی نظم اس واقعے سے پیشتر لکھی جا چکی تھی۔

۵۔ لارڈ کرزن اس وقت انگلستان کے وزیر خارجہ تھے۔ چونکہ عراق میں بھی انگریزی حکم برداری کی مخالفت شروع ہو گئی تھی، اس لیے اقبال نے لکھا کہ حکم برداری کے معدے میں ناقابل برداشت درد شروع ہو گیا، لہٰذا آغا خان کو اشارہ ہوا کہ ہندوستان سے مسلمانوں کا وفد بلایا جائے تاکہ وفد کو اطمینان دلا کر فلسطین و عراق ہضم کر لیے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے وفد کو چورن کہا۔

●

۲۵

کاشت کار اور مالک میں ایک روز تکرار ہو رہی تھی۔ دونوں کہ رہے تھے کہ زمین میری ملکیت ہے کاشتکار کا دعویٰ یہ تھا کہ کھیت اسی کا ہے جو کھیتی باڑی کرے۔ مالک یہ جواب دیتا تھا کہ تیری عقل ٹھکانے ہے ؟ میں نے زمین سے پوچھا کہ تو بتا، مال کس کا ہے ؟ اس نے جواب دیا۔ مجھے صرف اس بات کا یقین ہے کہ مالک ہو یا بدحال کاشت کار۔ اس آسمان کے نیچے سب دھرتی کا مال ہیں۔ یعنی سب مرکر میری آغوش میں دفن ہوں گے۔

۲۶

نئی تہذیب کے سب انڈے گندے ہیں۔ انھیں اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دو۔ انڈوں سے اشارہ ان چیزوں کی طرف ہے جو نئی تہذیب سے پیدا ہوئیں۔ ان کی تشریح اگلے شعر میں فرمادی ہے۔
انتخابات، ممبری، کونسل، کونسل کی صدارت یہ سب چیزیں پھندوں کی حیثیت رکھتی ہیں اور انھیں نام آزادی کا دیا گیا ہے۔

یورپ کے رندے نہایت تیز ہیں۔ بڑھئی نے ان سے چھیلنے کا کام لیا تو آپ بھی ساتھ ہی چھل گیا۔
اقبال کے نزدیک انتخابات، ممبری، کونسل، صدارت وغیرہ کو آزادی کا نام دینا غلط تھا۔ ان کے نزدیک یہ چیزیں آزادی کے پھندوں کی حیثیت رکھتی تھیں اور حق یہ ہے کہ جب تک انگریز یہاں موجود رہے۔ یہ چیزیں پھندے ہی بنی رہیں۔ اب بھی ان کی حالت کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ بڑھئی سے مراد وہ لوگ ہیں جنھیں ان چیزوں سے کام لینے کا موقع ملا۔ فرماتے ہیں کہ وہ ان رندوں سے جو کام لینا چاہتے تھے اس میں خود بھی رگڑے گئے۔

۲۷

کارخانے کا مالک ایک حقیر سا آدمی ہے۔ اس نے کبھی کام نہیں کیا۔ وہ عیش کا پتلا ہے۔ محنت اسے راس نہیں آتی۔ خدا کا حکم ہے کہ انسان اسی شے کا حق دار ہے جس کے حصول کے لیے وہ کوشش کرے۔ پھر سوال یہ ہے کہ مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار کیوں کھائے؟

لیس للانسان الا ما سعیٰ قرآن مجید کی آیت ہے۔

۲۸

میں نے سنا ہے کل کارخانے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ کاریگروں کا ٹھکانا پرانے جھونپڑوں میں ہے، مگر حکومت نے کونسل کا ہال خوب بنا دیا۔ اچھا ہوا کہ یہ بن گیا۔ سرمایہ داروں کے جمع ہونے کا تکیہ کوئی نہ تھا۔ یہی انھیں تکیے کا کام دے گا۔

۲۹

تمہیدی نوٹ

یہ نظم اقبال نے اس موقع پر لکھی تھی جب لاہور کے مسلمانوں نے اچانک جمع ہو کر ایک رات میں شاہ عالمی دروازے کے باہر مسجد بنا کر کھڑی کر دی۔ اس مسجد کے لیے مدت سے درخواست دے رکھی تھی اور وہ درخواست منظور نہ ہوتی تھی۔ انھوں نے چپکے چپکے سارا مسالا فراہم کر لیا۔ شام کے بعد بنانے لگے اور صبح سے پہلے پہلے مسجد مکمل کر دی۔ کچھ مدت بعد حکومت نے فوج کھڑی کر کے اس مسجد کو گروا دیا۔ پھر باقاعدہ منظوری حاصل کر کے یہ از سر نو تعمیر ہوئی۔ وہ موجود ہے۔

امیر فیصل: ابن شریف حسین جو بعد میں بادشاہ حجاز بنا۔ عام مسلمانوں کی طرح اقبال کو بھی امیر فیصل سے اس لیے اختلاف تھا کہ اس نے انگریزوں سے مل کر ترکوں کی مخالفت کی پھر اپنی بادشاہی کے لیے عرب میں انگریزوں کا عمل دخل قبول کیا۔ سنوسی: حضرت شیخ سنوسی جو طرابلس کے جہادِ آزادی میں بہت پیش پیش رہے۔ طریقۂ سنوسیہ کے مشہور شیخ تھے۔ اپدیشک: واعظ۔

ایمان کی حرارت والوں نے رات بھر میں مسجد بنا کر کھڑی کر دی۔ ہمارا دل پرانا پاپی ہے۔ یہ برسوں میں نمازی نہ بن سکا۔

شیخ سنوسی نے امیر فیصل کو کیا خوب پیغام دیا کہ تو نام اور نسب کا حجازی تو ہے لیکن دل کا حجازی نہ بن سکا۔ اگر دل کا حجازی ہوتا تو اسلام و مسلمین اور حرمتِ عرب کے خلاف غیروں کا ساتھ کیوں دیتا۔

بھلا اس رونے میں کیا لذّت ہے جس سے صرف آنکھیں تر ہو جاتی ہیں۔ حقیقی رونا تو وہ ہے کہ جگر کا خون آنسوؤں میں مل کر انھیں پیازی رنگ کا بنا دے، یعنی ان میں سُرخی پیدا ہو جائے۔

اقبال بڑا کامیاب واعظ ہے۔ باتیں کر کے دل موہ لیتا ہے۔ لیکن یہ صرف باتوں کا غازی ہے عمل کا غازی نہیں بنا۔

مذاق العارفین
ترجمہ احیاء العلوم
از: امام غزالیؒ
ترجمہ: مولوی محمد احسن صدیقی
تقطیع ۱/۴ ۷″×۱۱″ ضخامت ۲۵۰۰ صفحات قیمت ۴۵۰/-
شعبۂ انسانی کی ہمہ گیری اس کے اخلاق و کردار کی اعلیٰ ترین منازل کی حامل ہے
جس کا مطالعہ انسان کو دنیا و آخرت کی ایک ایک منزل سے آگاہ کر دیتا ہے جس میں
رسوم خانہ داری، سیاستِ مدنی، معاشرت، تہذیب و تمدن، عقل و شعور کی
ترقی پسند شاہراہوں، شریعت اسلام کے جگمگاتے جلووں کے سائے میں بصیرت افروز بحث
کی گئی ہے کتاب کا ہر موضوع اپنی وسعت ہمہ گیری جامعیت اور افادیت کے لحاظ سے
اپنی مثال آپ ہے اور علم و عرفان کا ایک ایسا سمندر ہے جو مذاق العارفین کے
صفحات پر ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔
شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز
لاہور ○ حیدر آباد ○ کراچی

زندہ جاوید کتابیں
جوہرِ اقبال
عبدالرحمٰن طارق
ضخامت: ۵۶۰ صفحات۔ قامت: ۵½"×۹"
حکیم الامت علامہ اقبال کے ایسے رفیع الشان اور معرکۃ الآراء موضوعات فکر و نظر کی تفصیل سے تشریح و توضیح کی گئی ہے جو مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح میں ایک بنیادی عظمت و اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک مستند اور جامع کتاب، چوتھا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ قیمت: ۸۰ روپے
اقبال کا فلسفۂ سیاست
ڈاکٹر پروین شوکت علی
ضخامت: ۵۲۰ صفحات۔ قامت: ۵½"×۹"
اسلامی ریاست میں اصول و آئین کا جائزہ لیا گیا ہے جسے علامہ اقبال نے فلسفیانہ تفکر کے مختلف مراحل طے کرنے کے بعد اپنا محورِ فکر بنایا۔ علامہ اقبال کی عملی سیاسی زندگی کی ترجمان، اور فلسفۂ سیاست پر مستند کتاب۔ قیمت: ۸۰ روپے
حیاتِ اقبال
ایم۔ ایس۔ ناز
ولادت سے رحلت تک کی زندگی کا ورق ورق ایک نئے اور فکر انگیز انداز میں۔ اس کتاب سے ایسے کئی مغالطے دور ہو جائیں گے جو نئی نسل کے ذہنوں کو مسموم کرنے کیلئے پیدا کئے جاتے رہے۔ ایک مکمل سوانح حیات۔ قیمت: ۵۰ روپے
آدابِ خود آگاہی
اے۔ رحمٰن
تصوف کے مثبت پہلوؤں کو لے کر کلامِ اقبال کے بیانات کی مزید وضاحتیں یا تائیدیں فاضل مصنف نے صوفیاء کی کتابوں سے حاصل کی ہیں۔ ان مماثلتوں کی وضاحت بھی کی جو اقبال اور صوفیاء کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ قیمت ۴۵ روپے
اسرارِ شہنشاہی
اے۔ رحمٰن
ماضی کے عروج و زوال کی داستان اور حال و مستقبل کے جملہ حالات و امکانات اور جزئیات وار باب کے ساتھ یہ داستان ایسی دردمندی اور جاں سوزی کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ اسے پڑھ کر آنکھیں پُرنم، ذہن متوحش اور دل افسردہ ہو جاتا ہے۔ قیمت: ۴۵ روپے
ان کتب کے علاوہ
• اقبال کے ہم صفیر • اقبال کا ادبی نصب العین • اوزانِ اقبال • اقبال اور تحریکِ پاکستان جیسی کتب بھی شائع کی ہیں۔ آج ہی مکمل فہرست مطبوعات طلب فرمائیں اور پسندیدہ کتب کا انتخاب کیجئے۔
شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز،
۱۹۹۔ سرکلر روڈ، چوک انارکلی، لاہور ۲ /۵۴۰۰۰